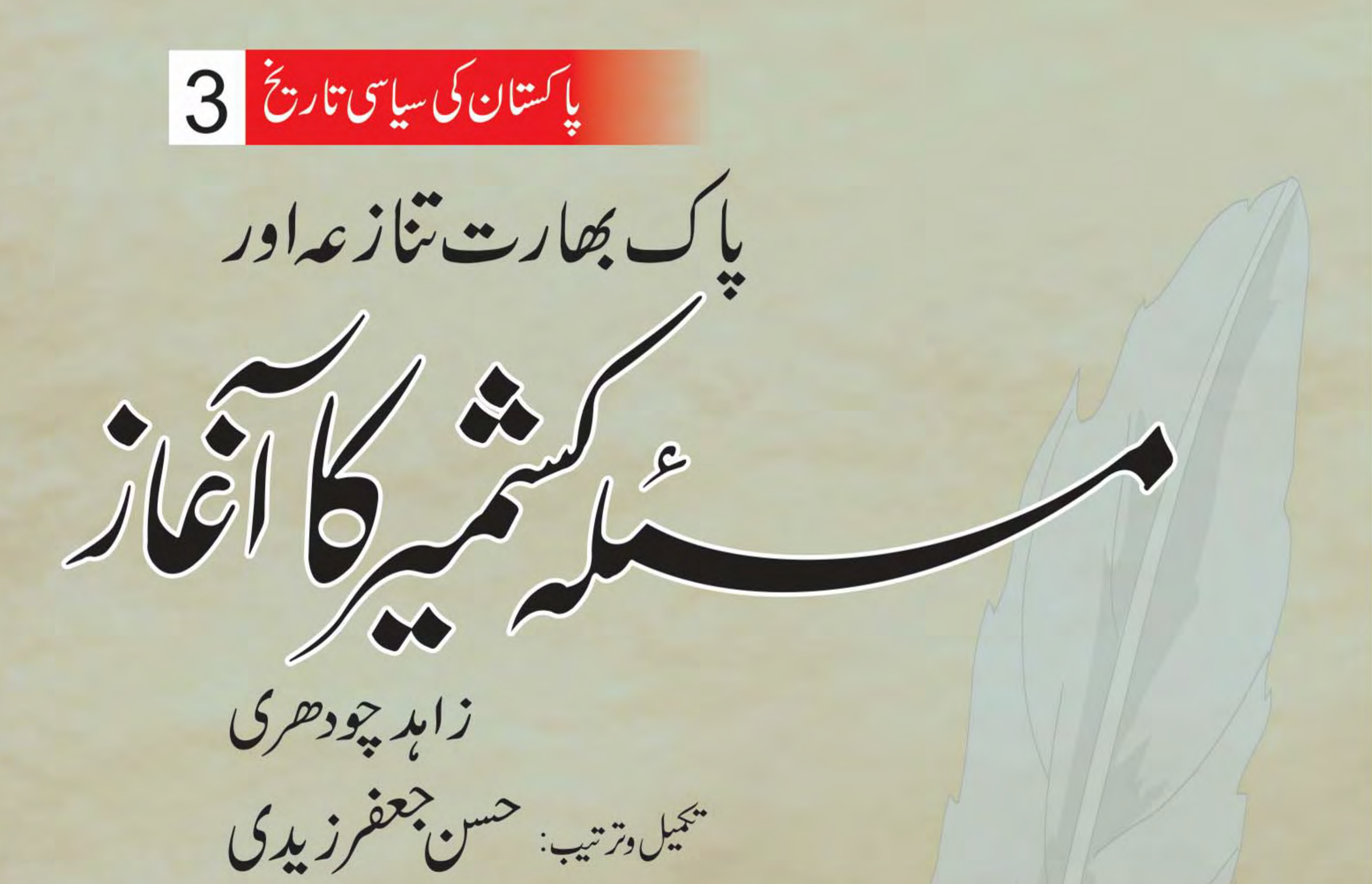


پاکستان کی سیاسی تاریخ 3

# پاک بھارت تنازعہ اور
# مسئلہ کشمیر کا آغاز


زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعۂ تاریخ

# پاکستان کی سیاسی تاریخ

## جلد 3

پاک بھارت تنازعہ

اور





زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:

حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-25-4



ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ، 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

**Ph:** + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42 35183166
**E-mails:** hjzaidi@tehqeeq.org
khalidmehboob@tehqeeq.org
**Website:** www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: 2012ء

قیمت: -/550 روپے

قیمت بیرون ملک: -/30 $

# فہرست

# دیباچہ ایڈیشن دوم

22 سال قبل 1990ء میں جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا تب سے اب تک پاک بھارت تنازعہ میں کئی اتار چڑھاؤ آئے ہیں اور مسئلہ کشمیر بھی ناحل پذیر ہے۔ اس دوران 1998ء میں بھارت اور پاکستان کے ایٹمی دھماکے، 1999ء میں کارگل کی لڑائی، 2001ء میں بھارتی پارلیمنٹ اور 2008ء میں ممبئی پر دہشت گردوں کے حملوں اور 2007ء میں سمجھوتہ ایکسپریس کی آتشزدگی سے دونوں ملکوں کے درمیان تناؤ میں شدت آئی جبکہ اس دوران کشیدگی کم کرنے کیلئے 1999ء میں لاہور میں سربراہوں کا اجلاس اور اعلانِ لاہور، 2001ء میں آگرہ کا سربراہی اجلاس، لاہور۔دہلی بس سروس اور اعتماد کی بحالی کے چند اقدامات بھی ہوئے جن میں ایک دوسرے کو تجارت میں پسندیدہ ترین ملک قرار دینے اور ویزا پالیسی نرم کرنے کے فیصلے بھی شامل ہیں۔ لیکن دونوں ملکوں کے مابین اچھے ہمسایوں جیسے تعلقات نہ کبھی قائم ہوئے اور نہ ہونے کی کوئی امید نظر آتی ہے۔ دونوں ملک تاریخ کے جبر سے نکلنے پر تیار نہیں ہیں۔

1991ء میں سقوط سوویت یونین کے بعد سرد جنگ کا خاتمہ ہوا اور پر طاقت کا توازن مکمل طور امریکی سامراج کے حق میں ہوگیا۔ 11 ستمبر 2001ء میں نیو یارک اور واشنگٹن پر القاعدہ کے مبینہ حملوں کے بعد دنیا ایک نئی طرح کی جنگ میں داخل ہوگئی جسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کہا جاتا ہے۔ اس سے کشمیر کاز کو بہت نقصان پہنچا۔ ایک سیدھی سادی قومی آزادی کی جدوجہد جس میں چند جہادی عناصر بھی شامل تھے یا شامل کر دیئے گئے تھے، ان کی وجہ سے اس جدوجہد پر اسلامی دہشت گردی کا لیبل لگا دیا گیا۔ اس جدوجہد کو جو عالمی حمایت ہمیشہ حاصل ہوا

کرتی تھی وہ اس سے کسی حد تک محروم ہوگئی۔ چنانچہ بھارتی اسٹیبلشمنٹ کو اس کا بہت فائدہ ہوا اور مسئلہ کشمیر عالمی امن کے ایجنڈے میں بہت پیچھے چلا گیا۔

ان حالات میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک عارضی خاموشی نظر آتی ہے لیکن یہ اس خاموش سمندر کی مانند ہے جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس بظاہر خاموشی کے باوجود وہاں بھارتی افواج کی اسی (80) لاکھ کی کثیر تعداد مستقل طور پر موجود ہے۔ بوکر (Booker) انعام یافتہ ارون دھتی رائے کا کہنا ہے کہ کشمیر پر دنیا کا طویل ترین خون آشام غلبہ قائم ہے۔ ارون کا موقف ہے کہ کشمیر کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔ ارون کو کئی بار کشمیر پر اپنے خیالات کے اظہار پر بھارتی اسٹیبلشمنٹ کے ظلم و جبر کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ انسانی حقوق کی بہت سی تنظیمیں بھی وقتاً فوقتاً کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف آواز اٹھاتی رہتی ہیں۔

کشمیری انتفادہ بھی وقتاً فوقتاً ابھر کر سامنے آتا رہتا ہے۔ کشمیری نوجوان گلیوں اور سڑکوں پر گشت کرتے جدید اسلحہ سے لیس بھارتی فوجیوں پر پتھراؤ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان نوجوانوں کا جہادیوں یا لشکر طیبہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ حق خود اردیت مانگتے ہیں۔ وہ جہادیوں کو اپنی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اُدھر کشمیری قیادت ہمیشہ کی طرح دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں کی اسٹیبلشمنٹ اس دھڑے بندی کو اپنے اپنے مفاد میں استعمال کرتی رہتی ہے۔

پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر ایسے جاری و ساری مسائل ہیں کہ جن کا پس منظر جاننے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ ادارہ مطالعہ تاریخ نے زیر نظر کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کر کے اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جب تک یہ مسائل موجود ہیں اس کتاب کی افادیت برقرار رہے گی اور حقائق کا پس منظر جاننے اور سمجھنے کی ضرورت کو پورا کرتی رہے گی۔

حسن جعفر زیدی

24/نومبر 2012ء

# دیباچہ ایڈیشن اوّل

''پاکستان کیسے بنا؟''......اس سوال کا پہلی اور دوسری جلد میں احاطہ کرنے کے بعد پاکستان کی سیاسی تاریخ اب اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں قیام پاکستان کے ساتھ ہی پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کا آغاز ہو گیا تھا۔ برصغیر کا تاریخی ہندو مسلم تضاد جس کے نتیجے میں برصغیر تقسیم ہوا تھا، اب پاک بھارت تضاد میں ڈھل گیا تھا۔ مسئلہ کشمیر بھی اسی تضاد کا آئینہ دار تھا۔ برطانوی سامراج کے نمائندے ماؤنٹ بیٹن نے ہندو بورژوا کو برصغیر کی بالا دست طاقت کی حیثیت سے اقتدار منتقل کرتے ہوئے سامراجی مفادات کے پیش نظر جہاں تقسیم پر عملدر آمد اور حد بندی میں ڈنڈی ماری تھی وہاں بھاری مسلم اکثریت پر مشتمل وادی کشمیر بھی بھارت کے حوالے کر دی تھی۔ اس سے پیشتر انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی سامراج نے اس کو یہاں کے عوام سے پوچھے بغیر 75 لاکھ روپے کے عوض جموں کے ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ جبکہ قبل ازیں یہاں کے عوام سکھوں اور افغانوں کے مظالم اور بربریت کا شکار بھی رہ چکے تھے۔

جہاں ظلم ہوتا ہے وہاں مزاحمت بھی ہوتی ہے...... چنانچہ کشمیری عوام کی مزاحمت بھی جاری ہے......طویل اور صبر آزما......کبھی سست اور مدھم پڑ جاتی ہے اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک چنگاری پورے گیاہستان میں آگ لگا دے گی۔ ان کی جدوجہد میں کئی نشیب وفراز آئے۔ کبھی ان کی عاقبت نااندیش قیادت نے بھارتی حکمرانوں کی منافقانہ سیکولرازم کے ساتھ سودے بازی کر لی تو کبھی پاکستان کے حکمرانوں نے نیم دلانہ اور بزدلانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے

عین اس وقت دھوکہ دیا جب ''دو چار ہاتھ'' ہی ''لب بام'' تک پہنچنے میں رہ گئے تھے۔ اس دوران کبھی کشمیری حریت پسندوں کو تختۂ دار پر چڑھایا گیا اور کبھی پوری وادی ان کی قربانیوں کے خون سے لالہ زار بن گئی اور کبھی ان کو قید و بند اور جلاوطنی سے دو چار ہونا پڑا۔ جہاں تک عالمی طاقتوں کا تعلق ہے تو ان کی اولین ترجیح ہمیشہ بھارتی حکمران رہے ہیں۔ کشمیری عوام کبھی بھی کسی طاقت کے مفاد کے چوکھٹے میں فٹ نہیں بیٹھے۔ چنانچہ انہیں کسی بلاک کی جانب سے بھی بھرپور حمایت حاصل نہیں ہوسکی...... تاہم ان تمام نشیب و فراز کے باوجود ہر بار کشمیری عوام پہلے سے زیادہ جوش اور جذبۂ حریت سے سرشار ہوکر ابھرتے ہیں کہ ان کا مسئلہ حقیقی اور Genuine ہے۔ یہ بے بنیاد یا مصنوعی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی بیرونی عنصر یا طاقت کی شہ پر ابھرتا ہے۔

زیرنظر جلد میں پاک بھارت تنازعہ کے ابتدائی برسوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پنجاب میں فرقہ وارانہ قتل عام، واجبات اور اثاثوں کی تقسیم، تجارتی محاذ آرائی اور نہری پانی کی تقسیم کے معاملات پر دونوں ملکوں کے مابین قومی تضاد پوری طرح ابھر کر سامنے آیا جو درحقیقت برصغیر میں گذشتہ ایک ہزار سال سے جاری و ساری ہندو مسلم تضاد کا ایک تسلسل تھا اور ہے اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ لیکن جس مسئلہ پر یہ تضاد سب سے زیادہ نمایاں ہوا اور زیادہ شدت کے ساتھ ابھرا وہ مسئلہ کشمیر تھا۔ 95 فیصد سے زائد مسلم اکثریت پر مشتمل وادی کشمیر کو برطانوی سامراج اور ہندو بورژوا نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر جس طریقے سے بھارت میں شامل کیا، زیرنظر جلد میں اس کی تفصیل سے آگاہ کیا گیا ہے۔ کانگرسی رہنماؤں نے شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو جس طرح اپنے مذموم مقاصد کی خاطر استعمال کیا اور یہ لوگ اپنی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے استعمال ہوئے، اس کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آزاد جموں و کشمیر کی سیاست میں کشمیری رہنماؤں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔ عالمی طاقتوں کی باہمی آویزش کے نتیجے میں دنیا کے دوسرے مسئلوں کی طرح مسئلہ کشمیر پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بارے میں اینگلو امریکی سامراج کی پالیسی میں اتار چڑھاؤ اور سوویت یونین کے

رویے میں ردوبدل کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کی اینگلوامریکی سامراج کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری نے کشمیری کاز کو کس قدر زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

عموماً کشمیر پر بھارت کے قبضے کا ذمہ دار بجا طور پر برطانوی سامراج اور بھارتی حکمران طبقے کو قرار دیا جاتا ہے۔لیکن جس عنصر کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا جاتا وہ خود مسلم لیگ کی غیرعوامی اور غیر حقیقی ریاستی پالیسی تھی۔ زیرنظر جلد میں اس پہلو سے بھی زیادہ پردہ اٹھایا گیا ہے اور مسئلہ کشمیر کو عوامی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے کہ اس کتاب کا مقصد عوامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنا ہے۔

پاک بھارت تضاد اور مسئلہ کشمیر کے بارے میں تخیل پرستی پر مبنی دو انتہا پسندانہ نظریات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ایک دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتوں اور ملاؤں کا ہے جو ایک ہی سانس میں بخارا اور سمرقند سے لے کر کابل، سری نگر اور دلی کے لال قلعے تک اپنے جھنڈے گاڑنے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ وہ قرون وسطیٰ کی سوچ کے حامل ہیں اور آج کے جدید دور میں بھی قرون وسطیٰ کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ان کی اس بڑھک بازی سے کشمیریوں کو تو کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا البتہ ان جماعتوں کی چندے کی تجوریاں خوب بھر جاتی ہیں۔

دوسرا نظریہ چند بھارت نواز عناصر کا ہے جو کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ سمجھتے ہوئے اسے بھارت کا داخلی معاملہ قرار دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ پاکستان کو بھی بھارت کا اٹوٹ انگ بن جانا چاہیے کہ اس طرح ''تاریخ کی اس غلطی کا ازالہ ہو جائے گا جو اگست 1947ء میں تقسیم ہند کی صورت میں سرزد ہوئی تھی۔'' وہ کشمیریوں کی حمایت اور بھارت کی مخالفت کرنے کو 'Fundamentalism' کا نام دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ مشہور مورخ اور سیاستدان پنڈت پریم ناتھ بزاز جیسے کشمیری پنڈتوں نے کشمیر کے حق خودارادیت کی حمایت میں کلمۂ حق بلند کیا تھا اور آج خوشونت سنگھ جیسے روشن خیال صحافی اعلانیہ طور پر کہہ چکے ہیں کہ اگر کشمیر میں

استصواب رائے کرایا جائے تو بھارت بری طرح ہار جائے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی نہ تو بخارا اور سمرقند سے لے کر دلی کے لال قلعے تک جھنڈا گاڑنے کی پان اسلام ازم کی کوئی تحریک ہے اور نہ ہی اسے کسی اعتبار سے Fundamentalism کی تحریک قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی قومی آزادی کی تحریک ہے۔ ایک قوم کے لوگ اس ملک سے علیحدگی چاہتے ہیں جس نے ان کی مرضی کے خلاف ان پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے۔ وہ حق خودارادیت مانگتے ہیں جسے اقوام متحدہ کا ادارہ تسلیم کر چکا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی قومی آزادی کی جنگ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ماضی قریب میں ایسی ہی جنگیں ویت نام، کمپوچیا، لاؤس، انگولا اور موزمبیق میں فتح یابی سے ہمکنار ہو چکی ہیں۔ حال میں نمیبیا کی آزادی ایسی ہی مثال ہے۔ یہ ہی صورت حال فلسطین، جنوبی افریقہ، اری ٹیریا، آرمینیا، کردستان، کوسووا (یوگوسلاویہ)، باسک (سپین)، شمالی آئرلینڈ، کیرن (برما)، تامل (سری لنکا)، مورو (فلپائن)، ترک (قبرص) کی ہے۔ شمالی امریکہ کی سامراجی بالادستی کے خلاف لاطینی امریکہ کے ہسپانوی نژاد ملکوں میں آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ اسی طرح سوویت یونین کی بالادستی کے خلاف مشرقی یورپی ممالک کے قومی تضاد اور لتھوانیا، لٹویا اور استونیا کے قومیتی تضاد کی نمود اور جارجیا اور آذربائیجان کے ہنگاموں سے اسی قسم کی صورت حال کی غمازی ہوتی ہے۔ خود بھارت میں سکھوں کی قومی آزادی کی خونچکاں جدوجہد ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں سے واپسی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ناگا، میزو، منی پور، آسام، اروناچل، تری پورہ کے قبائل اور جھاڑکھنڈ مکتی مورچہ اپنی آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر جہاں برصغیر جنوبی ایشیا مزید ٹکڑوں میں تقسیم ہونے یعنی Balkanization کے دہانے پر کھڑا ہے، یہ سوچنا کہ طاقت کے بل پر تاریخ کے اس رجحان کو دبایا جا سکتا ہے، ایک انتہائی احمقانہ سوچ ہوگی۔

زیر نظر جلد میں واقعات کا تسلسل 1958ء تک آ کر رک جاتا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں

گے کہ پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر میں ملوث فریقین کے جو رویے اور رجحانات ابتدائی برسوں کے دوران متعین ہو گئے تھے، بہت تھوڑے ردوبدل کے ساتھ آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ اس لیے زیرنظر کتاب نہ صرف ان مسائل کے پس منظر سے پردہ اٹھانے میں مدد دے گی بلکہ اس کے تسلسل پر مبنی ایک علیحدہ جلد بھی آئندہ کسی موقع پر پیش کر دی جائے گی۔

حسب سابق اس جلد کی تیاری میں بھی ڈاکٹر مبشر حسن صاحب جو تحقیق و تالیف کے اس منصوبے کے محرک تھے، ان کا دست تعاون اور دست شفقت ہر لمحہ میرے شامل حال رہا۔ ہمیشہ کی طرح خالد محبوب اس مرتبہ بھی میرے شانہ بشانہ رفاقت اور معاونت کا دم بھرتے رہے ہیں۔ پروف ریڈنگ کے علاوہ اشاریہ بھی ان کی محنت شاقہ کا مرہون منت ہے۔ سمیع اللہ ظفر اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہمہ وقت میرے شریک سفر رہے اور یوں ہم ایک ٹیم کی طرح کام کرتے رہے۔

تحقیق و تالیف کے اس منصوبے کے جن خیر خواہوں اور سرپرستوں کی طرف سے مجھے بدستور شفقت، محبت اور حوصلہ افزائی ملتی رہی اور جن کی بدولت میں منزل بہ منزل رواں دواں ہوں ان میں صدیق درانی صاحب، صفدر علی قریشی صاحب، میاں دلاور محمود صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، اورنگ زیب صاحب، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب اور اطہر ندیم صاحب شامل ہیں۔

تحقیقی کام کو پیش کرنے کے مسلمہ قواعد کے سلسلے میں ڈاکٹر کے۔ کے عزیز صاحب نے بعض قیمتی مشورے دیے، میں ان کا ممنون ہوں۔ اس جلد کے حوالہ جات ان قواعد کے مطابق ترتیب دیے گئے ہیں۔

اس جلد کی تیاری میں جن لائبریریوں اور اداروں سے استفادہ کیا گیا اور جن کے عملے نے بھرپور تعاون کیا ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، برٹش کونسل لائبریری لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لائبریری لاہور اور پاکستان ٹائمز ریفرنس سیکشن لاہور شامل ہیں۔

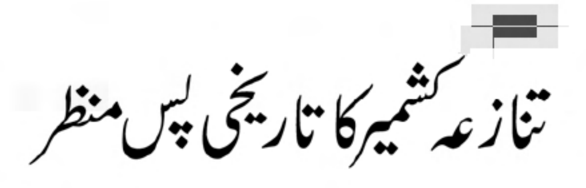
آخر میں مصطفیٰ وحید صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن کی ہمت کی بدولت یہ کام طباعت اور اشاعت کے مراحل سے گزر کر تقسیم و تشہیر کے مرحلے تک پہنچ رہا ہے۔

قارئین نے ہماری کاوش کی ابتدائی دو جلدوں بعنوان ''پاکستان کیسے بنا؟'' کا جس پرتپاک انداز میں خیر مقدم کیا ہے اس نے ہمیں وہ حوصلۂ تازہ عطا کیا ہے کہ ہم اگلی جلد پیش کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ اس کے لیے قارئین کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

اس جلد میں ترتیب و تدوین، انگریزی اقتباسات کے تراجم اور پروف کو ہر اعتبار سے غلطیوں سے پاک رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اگر کوئی غلطی رہ گئی ہے تو میں اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے معذرت خواہ ہوں۔

حسن جعفر زیدی

لاہور۔ 7۔ جون 1990ء


تنازعہ کشمیر کا تاریخی پس منظر


گلگت ایجنسی
گلگت
بلتستان
سکردو
لداخ
وادی کشمیر
سری نگر
پونچھ
جموں
پاکستان
ہندوستان
ڈوگروں نے
لیہہ
مغربی تبت کے
ڈوگرہ سرزمین

# جزو اوّل

## پاک بھارت تنازعہ کا آغاز

باب: 1

# مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام اور قومی تضاد کی نمود

14 راگست کو کراچی میں حکومت پاکستان کی تشکیل بہت ہی بے سروسامانی کی حالت میں ہوئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا حلف اٹھانے کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خان کی سربراہی میں وزراء کی کونسل کا اعلان کیا۔ مگر ان وزراء کے کوئی دفاتر نہ تھے۔ انتظامی مشینری فی الحقیقت ناپید تھی۔ سرکاری محکموں کے لیے عمارتیں نہیں تھیں۔ فرنیچر نہیں تھا۔ سٹیشنری نہیں تھی۔ ٹائپ رائٹرز نہیں تھے اور چھوٹا بڑا عملہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ غرضیکہ ماؤنٹ بیٹن کے بیان کے مطابق پاکستان کی نئی ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی حیثیت ایک خیمے کی سی تھی جس کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے دہلی میں حکومت ہندوستان کے بیشتر محکموں میں مسلمان چھوٹے چھوٹے ملازموں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ لیکن ان میں سے بھی 90 فیصد کی نقل مکانی کے لیے اس وقت تک کوئی معقول بندوبست نہیں ہوا تھا۔ بٹوارا کونسل کا فیصلہ یہ تھا کہ سرکاری ملازمین کی نقل مکانی ریل گاڑیوں کے ذریعے ہوگی مگر اس فیصلے پر عمل نہ ہوسکا کیونکہ پاکستان کے وجود میں آنے سے تقریباً دو ہفتے پہلے ہی مشرقی پنجاب میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سکھوں کی اکالی قیادت نے فیروز پور، جالندھر، امرتسر اور گورداسپور کے مسلمانوں کی نسل کشی اور بے دخلی کے منصوبے کی ابتدا کر دی تھی۔ اس منصوبے میں مسلمان سرکاری ملازمین کی سپیشل ریل گاڑیوں کو اڑانا بھی شامل تھا۔ چنانچہ اس قسم کی پہلی ریل گاڑی 11 راگست کو ضلع فیروز پور میں گیدڑ باہا ریلوے سٹیشن کے نزدیک ڈائنا مائٹ سے اڑا دی گئی تھی اور 14 راگست کو مشرقی

پنجاب کے مختلف اضلاع سے ہزاروں مسلمان مہاجرین لاہور پہنچ چکے تھے۔

چونکہ پاکستان کے قدامت پسند مسلم لیگی ارباب اقتدار کے پاس نئی ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے کوئی انقلابی منصوبہ نہیں تھا اور وہ ملک کا نظم ونسق پرانے نوآبادیاتی طریقے سے ہی چلانا چاہتے تھے، اس لیے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے کے باعث ابتدا ہی سے ان کے کاروبار حکومت میں بے شمار مشکلات پیدا ہوئیں۔ وقتی طور پر یوں لگتا تھا کہ برطانوی سامراج اور ہندوستان کے قومی بورژوا طبقے نے پاکستان کے پیدا ہوتے ہی جان بحق ہونے کے بارے میں جو پیش بینی کی تھی وہ صحیح ثابت ہو جائے گی۔ اگر ان دنوں ملک میں اناج کی فراوانی نہ ہوتی اور پاکستانی عوام نے ابتدائی چند مہینوں کے دوران بے مثال عزم وہمت، نظم وضبط، صبر وتحمل اور خلوص ودیانت کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو مسلم لیگی وزراء اور اعلیٰ سرکاری حکام روایتی طریقوں سے اس ملک کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ پرائیویٹ محفلوں میں اکثر لوگ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ پاکستان کے قائم رہنے سے خدا کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت نہ کرتا تو اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ روس کے ملحد ارباب اقتدار بھی پاکستان کے زندہ رہنے سے خدا کے وجود کے قائل ہو گئے ہیں۔ یہ لنگڑی لولی، نوزائیدہ ریاست خدائی امداد کے بغیر مشرقی اور مغربی پنجاب میں لاکھوں بے گناہوں کے قتل عام اور کروڑوں کی خانماں بربادی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ہندوستان کے بیشتر مؤرخین تقسیم ہند کے بعد پنجاب کے ہولناک فسادات کی تمام تر ذمہ داری پاکستان پر عائد کرتے ہیں۔ ان کے اس یک طرفہ فیصلے سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان معاندانہ تضاد کی شدت کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ یہ قومی تضاد اس قدر شدید ہے کہ وی۔ پی۔ مینن جیسا مصنف بھی، جو اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتا تھا، پنجاب کے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے حقائق کو توڑنے مروڑنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ لکھتا ہے کہ ''17 راگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب کے سارے ہندوؤں اور سکھوں کو بے دخل کرنے کی زبردست مہم چلائی گئی۔ لاہور، شیخوپورہ، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اضلاع میں بہت فسادات ہوئے۔ شیخوپورہ میں فقید المثال قتل عام ہوا۔ چنانچہ اس کا پہلے امرتسر میں اور پھر مشرقی پنجاب کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف پرتشدد ردعمل رہا۔''[1] سردار پٹیل کا

سوانح نگار کے۔ ایل۔ پنجابی رقم طراز ہے کہ چونکہ ریڈ کلف ایوارڈ میں ضلع گورداسپور ہندوستان کو دیدیا گیا تھا اس لیے پاکستان میں بہت شوروغوغا ہوا۔ کہتے تھے کہ پاکستان کے ساتھ یہ بے انصافی ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن کی سازش کا نتیجہ ہے۔ پاکستانیوں کے ہجوم انتقام لینے کے نعرے لگاتے تھے۔ چنانچہ مغربی پنجاب میں وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے۔ ہندو اور سکھ اپنی جانیں بچانے کے لیے دیہات سے شہروں کی طرف بھاگے مگر انہیں وہاں بھی امان نہ ملی انہیں لوٹا گیا، انہیں اذیتیں پہنچائی گئیں اور انہیں اس طرح قتل کیا گیا جیسے بھیڑ بکریوں کو بوچڑ کے چھرے سے ذبح کیا جاتا ہے۔ ان مظالم کی اطلاع مشرقی پنجاب پہنچی تو ہندوؤں نے بھی اتنی ہی شدت سے جوابی کاروائی کی۔''[2] جی۔ ڈی کھوسلہ اور دوسرے بہت سے ہندو مورخین نے تقسیم ہند کے بعد پنجاب میں فسادات کی اسی قسم کی وجوہ بیان کی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پنجاب کے فسادات دراصل کلکتہ، نواکھلی اور بہار کے فسادات کا نتیجہ تھے۔ ہندوستانی مؤرخین کا یہ بیان سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ قومی یا مذہبی تضاد انسان کو کس قدر اندھا کر سکتا ہے۔ اس قسم کے متعصب اور تنگ نظر ہندو دانشور متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تضاد کی خلیج کو وسیع تر کرنے کی ذمہ دار تھے اور ایسے ہی دانشوروں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کو شدید سے شدید تر کر دیا ہے۔ اگر وی۔ پی۔ مینن (V. P Menon) جیسا شخص یہ لکھے کہ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی ابتداء مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام کے ردعمل کے طور پر ہوئی تھی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان میں کون سے مصنف سے پاکستان کے بارے میں تھوڑی بہت سچائی کی امید کی جائے۔ یہ شخص وائسرائے ہاؤس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ سردار پٹیل اور ماؤنٹ بیٹن کا معتمد خاص تھا۔ یہ ساری چھوٹی بڑی کانفرنسوں میں شریک ہوتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ سارے سرکاری کاغذات اس کی نظر سے گزرتے تھے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پنجاب کے گورنر ایوان جینکنز (Evan Jenkins) نے اپنی مسلم دشمنی کے باوجود مارچ سے لے کر 15 / اگست 1947ء تک اپنی تحریری رپورٹوں میں وائسرائے کو متنبہ کیا تھا کہ سکھوں نے پنجاب میں وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا ہوا ہے اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ پنجاب کی خفیہ پولیس کے انگریز افسر نے جب اگست کو وائسرائے کے روبرو سکھوں

کے اس خطرناک منصوبے کی تفصیلات پر مشتمل فائل پیش کی تھی تو جناح اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں نے سکھ لیڈروں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا تھا مگر ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگی مؤقف سے اتفاق کرنے کے باوجود سردار پٹیل اور گورنر پنجاب ایوان جینکنز کی مخالفت کی بنا پر مطلوبہ کارروائی نہیں کی تھی۔''[3] ہوڈسن (Hodson) لکھتا ہے کہ جب ماؤنٹ بیٹن نے 15/اگست سے تقریباً چار ماہ قبل 25/اپریل 1947ء کو مہاراجہ نابھہ سے ملاقات کے دوران اس سے پوچھا تھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ سکھ پنجاب میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور وہ لڑنے پر آمادہ ہیں تو مہاراجہ کا جواب یہ تھا کہ ''مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ''وہ فی الحقیقت لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں'' جب ماؤنٹ بیٹن نے اس کی وجہ دریافت کی تو مہاراجہ نے کہا کہ ''ان کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا انتقام لینے کے لیے۔ اب سکھ لڑائی سے صرف اسی صورت میں باز رہ سکتے ہیں کہ مسلمان اعلانیہ توبہ کریں اور اپنے دلوں میں مکمل تبدیلی لائیں۔''[4] 30/اپریل کو گورنر پنجاب ایوان جینکنز نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ رپورٹ دی تھی کہ ''سکھ ایک بڑے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان کے لیڈروں کی ترجیح یہ ہے کہ یہ حملے جولائی 1947ء یا اس کے بعد ہوں لیکن لیڈروں کے لیے اپنے پیروکاروں کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے امرتسر کے نواح یا کسی اور مقام پر مسلم اکثریت کی آبادی پر سکھوں کے جوابی حملے کی افواہوں کا ذکر بھی کیا اور لکھا کہ ''سکھ نوجوان اب پنجاب کی تقسیم پر اس قدر تل گئے ہیں کہ کوئی انہیں اس راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔'' اس نے یکم مئی کو ماؤنٹ بیٹن کے نام اپنے ایک اور مراسلے میں ان خدشات کا ذکر کیا جو انتقال اقتدار کے مجوزہ منصوبہ کا اعلان ہوتے ہی لاحق ہو جائیں گے۔ اس نے لکھا کہ پنجاب کی تقسیم کا پرامن ہونا بالکل ناممکن ہے۔ اس کا خیال تھا کہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے فوج کو طلب کرنا پڑے گا جس کے لیے اس نے لکھا کہ اعلان سے پہلے ہی فوج کو اپنی پوزیشن سنبھالنا ہوگی۔ اس نے 3 اور 4/مئی کو ماؤنٹ بیٹن کو بھیجے گئے مراسلوں میں مجوزہ منصوبے کے بارے میں اپنی طرف سے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور لکھا کہ اس کے نتیجے میں کسی بھی فریق کو پنجاب کا اتنا حصہ نہ مل سکے گا جتنا کہ وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے اس منصوبے پر عمل درآمد صرف فوج کی مدد سے ہی ممکن ہوگا۔''[5]
6/مئی کو ماؤنٹ بیٹن نے بلدیو سنگھ کے ساتھ ملاقات کے دوران اسے تنبیہہ کی تھی کہ ''اگر سکھوں نے گڑبڑ پھیلانے کی یا فرقہ وارانہ لڑائی شروع کرنے کی کوشش کی تو میں اپنے ماتحت تمام تر طاقت

کو بروئے کارلاتے ہوئے انہیں کچل کرر کھ دوں گا اور تمہیں حکم دوں گا کہ تم بطور وزیر دفاع افواج اور فضائیہ کو ان کے خلاف حرکت میں لے آؤ۔"[6] لیکن مینن ان حقائق اور دوسرے اسی قسم کے بے شمار حقائق سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود کہتا ہے کہ چونکہ تقسیم ہند کے بعد مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کو جبراً بے دخل کرنے کی مہم چلائی گئی تھی اس لیے مشرقی پنجاب میں اس کا پر تشدد ردعمل ہوا تھا۔

برصغیر کی تاریخ کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ جب جناح نے کانگرس اور سکھوں کے اصرار پر بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر بہ امر مجبوری رضا مندی ظاہر کی تھی تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس بنا پر دونوں ملکوں کے کروڑوں عوام خانماں برباد ہو جائیں گے اور پنجاب میں اتنا زیادہ خون خرابہ ہوگا۔ ہوڈسن (Hodson) لکھتا ہے کہ جناح نے 23/جون کو وائسرائے سے استدعا کی تھی کہ لاہور اور امرتسر میں بدامنی کو کچلنے کے لیے بالکل بے رحمی سے کاروائی کی جائے انہوں نے کہا تھا کہ مجھے اس امر کی کچھ پرواہ نہیں کہ مسلمانوں کو گولیاں ماری جائیں۔ کچھ بھی کیا جائے بدامنی بہر صورت ختم ہونی چاہیے۔[7] چنانچہ ان دونوں شہروں میں کچھ سختی کی گئی تو پورے صوبے میں فرقہ وارانہ سکون ہو گیا۔ پھر بدامنی کا آغاز جولائی کے اواخر میں ہوا جب سکھوں نے پروگرام کے مطابق اپنے منصوبے پر عملدرآمد شروع کیا۔ تاہم جناح کے ذہن میں اس وقت بھی ایسا خیال نہیں آسکتا تھا اور نہ آیا کہ دونوں ملکوں میں اتنا زیادہ خون خرابہ ہوگا اور اتنی بڑی آبادی کو اپنی جانوں اور عزت وآبرو کے تحفظ کے لیے ہجرت کرنا پڑے گی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے پہلے تو 27/جولائی کو دہلی سے جاری کردہ ایک بیان میں دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کی وفادار رہیں اور پھر 11/اگست کو پاکستان دستور ساز اسمبلی میں اپنی پہلی تاریخی تقریر میں پاکستان کی قومیت کو مذہبی عقائد سے بالاتر قرار دیا۔ یہ عجیب تضاد تھا کہ جب "سیکولر" ہندوستان کا اقتدار رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ پر "سوشلسٹ" نہرو کے سپرد کیا گیا تھا تو بہت سے برہمنوں نے سینکڑوں من گھی جلا کر جنتر منتر پڑھے تھے لیکن جب "تھیوکریٹک" پاکستان میں اقتدار کی منتقلی "فرقہ پرست" جناح کو کی گئی تھی تو ملاؤں نے کوئی مذہبی رسوم ادا نہیں کی تھیں۔[8] جناح نے ریڈکلف ایوارڈ کو غیر مشروط طور پر منظور کرکے پاکستانی عوام کو صبر وتحمل سے اس کھلی بے انصافی کو برداشت کرنے کی تلقین کی تھی۔ ان کی قومی پالیسی کی بنیاد یہ تھی

کہ پاکستان میں سارے شہریوں کو بلا لحاظ دین و مذہب، رنگ و نسل اور ذات پات بالکل مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ کسی بھی شہری سے اس کے مذہبی عقائد کی بنا پر امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ لیکن لیونارڈ موسلے (Leonard Mosley) کے بیان کے مطابق سردار پٹیل نے اسی دن یعنی 11 راگست کو ہی قائد اعظم محمد جناح پر ''ٹھنڈے پانی کی بالٹی'' پھینک دی تھی۔[9] اس نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ملک کے موجودہ حالات میں اس کا تقسیم ہونا ہی اچھا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ تقسیم عارضی ہوگی۔ جو لوگ ہندوستان سے الگ ہو رہے ہیں وہ بہت جلد اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ ان کا واپس ہندوستان کے ساتھ ملنا یقینی ہے۔ بھگوان نے جس چیز کو ایک بنایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے منقسم نہیں رہ سکتی۔ آج ہندوستان کی تقسیم ایک طے شدہ حقیقت ہے لیکن یہ حقیقت مصنوعی ہے۔ تقسیم نے ہندوستان کے جسد سیاست سے زہر کو نکال دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو علاقے الگ ہو رہے ہیں وہ بہت جلد ہندوستان سے پھر ملنے کی خواہش ظاہر کریں گے۔ ہندوستان ایک ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت سمندر کو یا دریا کے بہتے پانی کو تقسیم نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں جڑیں ہیں۔ ان کے مقدس مقامات اور ان کے ثقافتی مراکز ہندوستان میں واقع ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ پاکستان میں کیا کریں گے۔ وہ بہت جلد واپس آنا شروع ہو جائیں گے۔''[10]

پنجاب میں وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کا بیج دراصل 1946ء کے اوائل میں عام انتخابات کے بعد بویا گیا تھا جب کہ کانگرس نے انگریز گورنر کے تعاون سے مسلم لیگ کو صوبائی اقتدار سے محروم رکھا تھا۔ کانگرس نے اس مقصد کے لیے یونینسٹ پارٹی کے مٹھی بھر مسلمان جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے سکھوں کی فرقہ پرست اکالی پارٹی سے اتحاد کرنے میں کوئی تامل کیا تھا۔

پنڈرل مون (Penderel Moon) لکھتا ہے کہ اس غیر قدرتی اور ناپاک گٹھ جوڑ سے نہ صرف مسلم لیگ بلکہ صوبہ کے سارے مسلمانوں کو بہت غصہ آیا تھا۔ جناح کو ہمیشہ جس چیز کا خدشہ لاحق رہتا تھا اور جو پاکستان کے مطالبے کی محرک تھی یہ اس کی ایک مثال تھی۔ جناح کا خدشہ یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مکار ہندو ہمیشہ مسلمانوں کے کسی نہ کسی ٹولے کو ساتھ ملا کر ملت اسلامیہ کے وسیع تر مفادات کے راستے میں حائل ہوں گے۔ خضر حیات اب اپنے سابقہ ریکارڈ

اور شہرت کے باوجود ایک غدار تھا جو مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کر کے اقتدار سے چمٹا ہوا تھا[11]۔ ہوڈسن کی رائے یہ ہے کہ کانگرس، اکالی اور یونینسٹ عناصر پر مشتمل اس مخلوط وزارت کے قیام سے مسلم لیگ کو پاکستان کے پراپیگنڈا کے لیے ایک ترپ کا پتا مل گیا تھا۔ اب مسلم لیگی لیڈر کہہ سکتے تھے کہ ''اگر ہندوستان متحد رہا تو مکار ہندو پنجاب میں بھی، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، سکھوں اور چند مسلمان پٹھوؤں کی امداد سے حکومت کر سکیں گے۔ لہٰذا ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے لیے ایک آزاد وطن حاصل کریں۔[12] ائین سٹیفنز (Ian Stephens) کہتا ہے کہ پنجاب میں کانگرس، یونینسٹ اور اکالی گٹھ جوڑ سے مسلم لیگیوں کو قدرتی طور پر بہت غصہ آیا تھا۔ ان کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ تھی کہ برصغیر کی تاریخ کے ایسے دور میں، جب کہ نہایت اہم سیاسی اور آئینی فیصلے ہو رہے تھے، انہیں پاکستان کے اہم ترین صوبے میں اقتدار سے ناجائز طور پر محروم رکھا جا رہا تھا۔ یہ بات بعد ازاں اس صوبے کے فرقہ وارانہ تعلقات میں کشیدگی پیدا کرنے کا موجب بنی اور بالآخر تباہی خیز ثابت ہوئی۔[13] اس غصے کا اظہار اپریل کے اوائل میں پورے ہندوستان کے مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے کنونشن میں ہوا جبکہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ نے بتایا کہ کس طرح صوبے کے انگریز گورنر سر برٹرینڈ گلینسی (Bertrand Glancy) نے کانگرس کے ساتھ عملی تعاون کر کے مسلم لیگ کو صوبائی اقتدار سے محروم رکھا حالانکہ اسمبلی میں مسلم لیگ کو اکثریت کی تائید و حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ ملک فیروز خان نون اور سردار شوکت حیات خان نے اس موقع پر بہت اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ فیروز خان نون نے کہا کہ ''اگر مسلمانوں سے اسی طرح بے انصافی ہوتی رہی تو وہ یہاں چنگیز خان اور ہلاکو خان سے بھی زیادہ تباہی مچائیں گے اور سردار شوکت حیات خان نے کہا کہ پنجاب کے فوجی نسل کے مسلمان صرف حکم کے منتظر ہیں۔ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ برطانوی فوج کی موجودگی اور پنجاب میں کانگرس حکومت کے باوجود آزمائشی ریہرسل دکھا دیں گے[14] لیکن مسلم لیگی لیڈروں کی انگریزوں اور کانگرس کے خلاف ان شعلہ بیانیوں کے باوجود 1946ء کا سارا سال صوبے میں خیریت سے گزر گیا۔ اس دوران کلکتہ، نواکھلی بہار اور گڑھ مکتیشر میں فرقہ وارانہ قتل عام ہوا لیکن پنجاب میں غیر متوقع طور پر امن وامان رہا حالانکہ فریقین نے اپنی جانوں اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے ہر قسم کے ہتھیار جمع کر رکھے تھے اور صوبائی مسلم لیگ نے 16 راگست 1946ء کو

ڈائریکٹ ایکشن ڈے بھی منایا تھا۔

پنجاب میں فرقہ وارانہ خون خرابہ کی ابتدا مارچ 1947ء کے اوائل میں ہوئی جب کہ خضر حیات خان نے برطانوی سامراج کی جانب سے دستبرداری کے قطعی اعلان کے پیش نظر استعفیٰ دے دیا۔ کانگرس اور اکالی پارٹی کے زعماء نے اس موقعہ پر صوبے میں مسلم لیگ کے خلاف بڑی ہی اشتعال انگیز تقریریں کیں اور بار بار اعلان کیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر مسلم لیگ کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اپنے اخباری بیانات میں پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنی ''بندوقوں کو سنبھال کر رکھو، خندقیں کھودلو، اپنے دفاع کو مضبوط کرو، تیار کردہ مورچوں میں چلے جاؤ، اپنی موت سے پہلے مت مرو اور اپنی راکھ کو دریائے گنگا میں مت پھینکو۔[15] ان کا یہ رویہ افسوسناک تھا لیکن ناقابل فہم نہیں تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ایسے حالات میں جب کہ برطانوی سامراج برصغیر سے پسپا ہونے کا قطعی اعلان کر چکا تھا، صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کا اقتدار ہندوؤں اور سکھوں کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ بالخصوص سکھوں کی قیادت بہت ہی سراسیمہ ہوگئی تھی۔ وہ مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کے تصور سے ہی خوفزدہ تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ مسلم لیگ کی قیادت برصغیر میں ہندوؤں کے سیاسی غلبہ کے تصور سے خوفزدہ تھی 20 رفروری 1947ء کو برطانوی حکومت نے برصغیر سے دستبرداری کا جو باقاعدہ اعلان کیا اس کا مسودہ دیکھ کر 16 رفروری کو گورنر پنجاب ایوان جینکنز نے وائسرائے ویول اور وزیر ہند پیتھک لارنس کو اپنا اختلافی نوٹ ارسال کیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ''مجوزہ شکل میں اس اعلان نامے سے پنجاب میں زبردست تشدد پھوٹ پڑے گا۔ اس اعلان نامے کو فیصلہ کن فرقہ وارانہ جنگ کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ اگر اس وجہ سے گڑبڑ شروع ہوئی تو وہ بدترین صورت کی حامل ہوگی۔ مثلاً سکھ مرکزی پنجاب پر، بشمول لاہور قبضہ کرنے اور وہاں اپنی عارضی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔[16] گویا سکھوں نے انگریزوں کی دستبرداری کے بعد مسلم غلبہ کے خدشہ کے پیش نظر بزور شمشیر اپنی حکومت کے قیام کے لیے منصوبہ بندی کر لی تھی جس کا علم جینکنز کو خفیہ اطلاع کے ذریعے پہلے ہی ہو چکا تھا اور پھر یہ منصوبہ اتنا خفیہ بھی نہیں تھا۔ دہلی کے اخبار ہندوستان ٹائمز کی 5 رمارچ کی اشاعت میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق سکھوں نے خانہ جنگی کے امکان کے پیش نظر مسلم عصبیت کے خلاف جوابی کاروائی کے طور پر سکھ ریاستوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ

پنجاب میں ریاست پٹیالہ کی زیر سرکردگی ساری سکھ ریاستوں کی ایک فیڈریشن قائم کی جائے۔

انہیں یقین تھا کہ جب صوبے میں مختلف فرقوں کے دعاوی کے بارے میں بزورقوت فیصلے کا وقت آئے گا تو ہندوؤں کی مسلح تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ ان کا ساتھ دے گی۔'' جب یہ رپورٹ چھپی تھی اس وقت تک راولپنڈی اور کیمبلپور کے دیہاتی علاقوں میں کھتری سکھوں کے خلاف فساد شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ مؤقف صحیح نہیں کہ سکھوں کی قیادت نے مسلمانوں کے خلاف مسلح اقدام انتقامی جذبے کے تحت کیا تھا۔ اگر ان اضلاع میں بے گناہ سکھوں کا قتل عام نہ بھی ہوتا پھر بھی سکھوں کے جاگیرداراور درمیانہ طبقے، مسلمانوں کے جاگیرداراور درمیانہ طبقے کے سیاسی غلبے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت تک ان دونوں فرقوں کے درمیان تضاد کی نوعیت اس قدر معاندانہ ہو چکی تھی کہ اس کے پرامن حل کی بظاہر کوئی صورت نہیں تھی اور اگر کوئی صورت ہو سکتی تھی تو کانگرس اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ کانگرس کی جانب سے 1946ء کے اوائل میں یونینسٹ پارٹی اور اکالی پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ مسلم لیگ اور اکالی پارٹی میں کوئی سیاسی مفاہمت نہ ہونے پائے۔ حکومت پنجاب کے چیف سیکرٹری نے انہی دنوں سکھوں کے عزائم کے بارے میں صوبائی گورنر کو جو رپورٹ پیش کی تھی اس سے ہندوستان ٹائمز کی رپورٹ کی تائید ہوتی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ ''سکھوں نے جو منصوبے بنائے ہیں وہ صوبے کی ساری سکھ آبادی کے بارے میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان میں سکھ ریاستوں کو بھی ملوث کیا گیا ہے۔ سکھوں کی جتھہ بندی کی جا رہی ہے۔ انہیں مسلح کیا جا رہا ہے اور انہیں زبانی اور تحریری پراپیگنڈے سے مشتعل کیا جا رہا ہے۔[17] تاہم مارچ کے فساد پر تقریباً دو ہفتہ میں بیس ہزار فوج کی مدد سے قابو پا لیا گیا۔ ہندو اور سکھ لیڈروں کی خواہش کے مطابق صوبے میں گورنر راج قائم ہو گیا اور پھر ڈیڑھ دو مہینے تک پنجاب کے کسی علاقے میں کوئی بڑا فساد نہ ہوا۔ البتہ دریں اثنا کانگرس کی مجلس عاملہ نے 8/مارچ کو ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا کہ پنجاب کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس قرارداد کا بھی بظاہر مقصد یہی تھا کہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تضاد کی آگ کو ہوا دی جائے۔ یہ وہی حربہ تھا جو برطانوی سامراج حسب ضرورت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضاد میں شدت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا اور جس کے خلاف کانگرس پارٹی شدید احتجاج کیا کرتی تھی۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر صرف برطانوی

سامراج کی ہی اجارہ داری نہیں تھی۔ کانگرس کی بورژوا قیادت بھی حسب ضرورت یہ ابلیسی پالیسی اپنانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔

3 رجون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہوا تو اکالی پارٹی کی قیادت میں اور بھی زیادہ سراسیمگی پھیل گئی حالانکہ مرکزی حکومت میں سکھ نمائندہ بلدیو سنگھ اس منصوبے کی منظوری دے چکا تھا۔ 4 رجون کو ماسٹر تارا سنگھ نے ایک بیان میں اس منصوبے پر شدید تنقید کی اور کہا کہ اس میں سکھوں کے اقتدار یا منصب یا ان کی حیثیت اور مفادات کے تحفظ سے مکمل اغماض برتا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ سکھ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گے ''جب تک دریائے چناب کو حد بندی کی لکیر قرار نہیں دیا جاتا'' اور یہ کہ وہ اپنے مقصد کے حصول تک جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اس نے کہا کہ سکھوں کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے اور یہ کہ خالصہ کی طرف سے ''دنیا پر یہ ثابت کر دیا جائے گا کہ گورو گوبند سنگھ کی روح ابھی ہمارے اندر زندہ ہے۔[18] ایلن کیمبل جانسن (Alan Campbell Johnson) 14 رجون کو اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ''پنجاب میں سکھوں کی بے چینی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سکھوں کو 3 رجون کے منصوبے کے نتائج کا احساس ہو گیا ہے۔ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا مطلب سکھوں کی تقسیم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انہیں مسلمانوں کے عزائم اور ہندوؤں کی موقع پرستی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے...... ان کے لیڈر سیاسی کشمکش میں بری طرح مات کھا گئے ہیں اور انہوں نے پرانے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے ہیں...... طاقت تارا سنگھ جیسے وحشی لوگوں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔''[19] حکومت پنجاب کے چیف سیکرٹری نے اپنی اس مہینے کی رپورٹ میں سکھوں کی قیادت کے خطرناک عزائم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''شرومنی اکالی دل کے ایک گشتی مراسلے میں پاکستان کو سکھ پنتھ کی موت قرار دیا گیا ہے اور اس عزم کا اظہار کیا گیا ہے کہ سکھ چناب سے لے کر جمنا تک آزاد و خودمختار ریاست قائم کریں گے۔ مراسلے میں سارے سکھوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اکالی دل کے جھنڈے تلے اس مقصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کریں۔[20] اکالی دل کی جانب سے اشتعال انگیز گشتی مراسلہ لاہور کے نیڈوز ہوٹل میں سکھ لیڈروں کی ایک خفیہ میٹنگ کے بعد جاری کیا گیا تھا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اس میٹنگ میں انتہائی اشتعال انگیز تقریر کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ''او سکھو! تمہاری سرزمین پر حملہ ہونے والا ہے۔ تمہاری عورتوں کی عزت

وآبرو مٹنے والی ہے۔ اٹھو! اور ایک مرتبہ اور مغل حملہ آور کو تباہ و برباد کردو۔ ہماری مادر وطن خون مانگتی ہے۔ ہم اس کی پیاس اپنے اور اپنے دشمنوں کے خون سے بجھائیں گے۔'' ماسٹر تارا سنگھ نے 19 رجون کو دہلی میں اپنے ایک کھلے بیان میں بھی تقریباً اسی قسم کی باتیں کہی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ حکومت برطانیہ کے 3 رجون کے اعلان سے سکھوں کے مکمل خاتمے کا زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کو ان کے حصے سے زیادہ پاکستان مل گیا ہے اور باقی ہندوستان پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ سکھوں کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کا زبردست خطرہ ہے۔ مسلمانوں نے پاکستان کو ترجیح دی چنانچہ انہوں نے اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ مگر سکھوں کی حالت ابتر ہو رہی ہے۔ اس طرح نہ تو سکھوں کو اسٹیج ملنے کی امید ہے اور نہ ہی ان کی یکجہتی قائم رہے گی۔ حالات اس قدر نازک ہیں کہ سکھوں کو رائے عامہ کو منظم کر کے اپنی آئندہ پالیسی اور پروگرام کے متعلق بہت جلدی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اب یہ افواہ بھی پھیل رہی ہے کہ ننکانہ صاحب کو پاکستان میں شامل کر دیا جائے گا۔ سکھ ایسی خطرناک پالیسی کی سخت مخالفت کریں گے۔[21]

ماسٹر تارا سنگھ اور دوسرے اکالی لیڈروں کی اس قسم کی اشتعال انگیزیوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اگرچہ مرکزی وزیر دفاع بلدیو سنگھ 3 جون کے منصوبے کی رسمی طور پر منظوری دے چکا تھا تاہم اس نے 8 رجولائی کو دہلی میں سکھوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا اگر حد بندی کمیشن کا ایوارڈ سکھوں کے خلاف ہوا تو وہ اس کی مزاحمت کریں گے اور وہ پنتھ کے وقار کے تحفظ کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے[22] اور پھر 10 رجولائی کو شرومنی اکالی دل کے صدر گیانی کرتار سنگھ نے پنجاب کے گورنر ایوان جینکنز سے ملاقات کے دوران اسے متنبہ کیا کہ اگر حد بندی کمیشن کا ایوارڈ سکھوں کے لیے اطمینان بخش نہ ہوا تو وہ پرتشدد کارروائی کریں گے۔ وہ مواصلاتی اور نہری نظام کو تباہ کر دیں گے۔ گورنر نے اسی دن وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو اس ملاقات کے بارے میں جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ ''آج گیانی کرتار سنگھ مجھے ملنے کے لیے آیا۔ وہ قانون آزادئ ہند اور حد بندی کمیشن کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے آیا۔ وہ یہ بات صاف صاف کہنا چاہتا تھا کہ اگر تقسیم کے معاملے میں سکھوں کی سالمیت کا خیال نہ رکھا گیا تو سکھ گوریلا جنگ لڑیں گے۔ اس نے کہا کہ انگریز ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اقلیتوں کا خیال رکھیں گے۔ لیکن اس کا عملی نتیجہ کیا ہوا؟ سکھوں کے ساتھ انگریزوں نے بدعہدی کی ہے۔ میں نے

اسے بتایا کہ مجھے سکھوں کی بے اطمینانی کا احساس ہے۔لیکن جب کسی ملک میں آزادی آتی ہے تو بعض طبقوں کو جو بیرونی حکومت کے ماتحت اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے رہے ہوں، نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔علاوہ بریں موجودہ صورت حال کے لیے سکھ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ سکھوں نے خود پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کرنے میں پہل کی تھی اور بلدیو سنگھ نے سکھوں کی جانب سے 3/جون کے پلان کو قبول کیا ہے۔گیانی نے کہا کہ سکھوں یا بلدیو سنگھ کا یہ خیال نہ تھا کہ پنجاب کی تقسیم محض مسلم اور غیر مسلم آبادی کی تعداد کی بنا پر ہوگی۔تقسیم کے سلسلے میں جائیدادوں اور املاک کا بھی اس طرح لحاظ کرنا ضروری ہے جس طرح آبادی کا۔سکھوں کو ننکانہ صاحب لازماً ملنا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہیں کم ازکم ایک نہری سسٹم ملنا چاہیے۔گیانی نے مزید کہا کہ اگر حکومت برطانیہ اور وائسرائے نے اور پارٹی لیڈروں نے اس بات کا احساس نہ کیا کہ سکھوں کی قسمت کا سوال ایک اہم حل طلب مسئلہ ہے تو سکھ مرنے مارنے کے لیے تیار ہیں۔وہ ہر انقلابی طریقے سے لڑیں گے۔ افسروں کو قتل کریں گے۔ریلوے لائنوں کو کاٹ دیں گے۔نہروں کے ہیڈ ورکس کو تباہ کریں گے وغیرہ وغیرہ۔میں نے اسے سمجھایا کہ سکھوں کے لیے اس قسم کی پالیسی بہت بڑی غلطی ہوگی۔اس نے جواب دیا کہ اگر کوئی طاقت انگلستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی تو انگریز اپنے لیے اس قسم کی پالیسی اختیار کرنا غلط نہ سمجھتے۔آخر میں گیانی نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اس آڑے وقت میں سکھوں کی مدد کروں۔ورنہ پنجاب خون اور آنسوؤں کی دنیا بن کر رہ جائے گا۔گیانی یہ کہہ رہا تھا تو خود اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس ملاقات میں گیانی کرتار سنگھ نے پنجاب میں بڑے پیمانے پر تبادلۂ آبادی کی تجویز بھی پیش کی اور کہا کہ اگر سکھوں کی یک جہتی کا لحاظ نہ کیا گیا تو لڑائی ناگزیر ہو جائے گی۔جینکنز نے پوچھا کہ اپنی لڑائی کب شروع کریں گے۔گیانی نے جواب دیا کہ ''ہم اس کے لیے دو تین سال انتظار نہیں کریں گے۔انگریزوں کے رخصت ہوتے ہی ہم اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیں گے۔''[23] لیکن وی۔پی۔مینن یہی کہتا ہے کہ چونکہ تقسیم ہند کے بعد مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں اور سکھوں کی جبری بید خلی کی مہم چلائی گئی تھی اس لیے مشرقی پنجاب میں اس کا پرتشدد ردعمل ہوا۔

اسمے (Ismay) لکھتا ہے کہ میں نے اور ایرک میول (Eric Mieville) نے دو یا تین مرتبہ سکھ لیڈروں گیانی کرتار سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ سے بات چیت کی۔انہوں نے بڑی

خوفناک قسم کی تلواریں لٹکائی ہوئی تھیں اور ان کے پاس برطانوی پارلیمنٹ کی کاروائی کے کتابچوں کی بہت سی جلدیں تھیں۔ انہوں نے بات چیت کے دوران اپنے پہلے سے قائم کردہ نظریات سے سرموانحراف نہ کیا اور کبھی کبھی دھمکی آمیز زبان استعمال کی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اگر انہوں نے تشدد کیا تو ان سے بڑی سختی سے نمٹا جائے گا۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ ان پر ہماری ان تنبیہوں کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔[24] 10ر جولائی کو وائسرائے کے معاون جارج ایبل (George Abell) نے بھی گورنر پنجاب سے بات چیت کرنے کے بعد وائسرائے کو رپورٹ دی تھی کہ سکھ فی الحقیقت بڑے ہی خطرناک موڈ میں ہیں اور 13ر جولائی کو گورنر پنجاب نے ایک مرتبہ اور وائسرائے کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ سکھ مسلح بغاوت کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ان انتباہی رپورٹوں پر کوئی احتیاطی اقدام تو نہ کیا البتہ اس نے ماسٹر تاراسنگھ اور مہاراجہ پٹیالہ کو بلا کر کہا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی۔ قبل ازیں اس نے ابوالکلام آزاد کو یقین دلایا تھا کہ ''میں کوئی خونریزی اور فساد ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ میں سپاہی ہوں، سویلین نہیں ہوں...... میں حکم جاری کر کے اس امر کا انتظام کروں گا کہ سارے ملک میں کوئی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں۔ میں اس فتنے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی سخت ترین اقدامات کر کے کچل دوں گا۔ میں مسلح پولیس استعمال نہیں کروں گا۔ میں بری فوج اور ہوائی فوج کو کاروئی کرنے کا حکم دوں گا اور میں ٹینک اور ہوائی جہاز استعمال کر کے ہر اس شخص کو کچل دوں گا جو کوئی شرارت کرے گا۔''[25] لیکن اس کی یہ تنبیہیں اور یقین دہانیاں بے اثر اور کھوکھلی ثابت ہوئیں۔

قدرتی طور پر اس صورت حال کے پیش نظر قائداعظم محمد علی جناح کو بہت پریشانی لاحق تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان دنوں کئی مرتبہ ماؤنٹ بیٹن کی توجہ سکھوں کے خطرناک عزائم کی طرف مبذول کرائی اور ماؤنٹ بیٹن نے ہر مرتبہ وعدہ کیا کہ وہ مناسب اقدام کرے گا لیکن اس نے اپنے ان وعدوں کی کبھی بھی عملی طور پر تکمیل نہ کی۔ ہوڈسن کے بیان کے مطابق ماؤنٹ بیٹن کی بے عملی کی وجہ یہ تھی کہ سردار پٹیل اور گورنر جینکنز سکھوں کے خلاف مطلوبہ کاروائی کے خلاف تھے۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن پنجاب کی صورت حال کا موقعہ پر جائزہ لینے کے لیے 20ر جولائی کو لاہور پہنچا۔ یہاں اس نے گورنر کے علاوہ بٹوارا کمیٹی کے ارکان سے تبادلۂ خیالات کیا اور دو دن بعد واپس دہلی

پہنچ کر اس نے بٹوارا کونسل کو تجویز پیش کی کہ پنجاب میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک خاص سرحدی فوج کی تشکیل کی جائے۔ یہ تجویز فوراً منظور کر لی گئی اور مجوزہ باؤنڈری فورس یکم اگست کو قائم ہوئی۔ اس کے ارکان کی تعداد تقریباً 55 ہزار تھی۔ ایک انگریز میجر جنرل ٹی۔ ڈبلیو۔ ریس (T.W.Ress) اس کا اعلےٰ کمانڈر مقرر ہوا۔ پاکستان کی طرف سے بریگیڈئر محمد ایوب خان اور ہندوستان کی طرف سے بریگیڈئر ڈگمبر سنگھ اس کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس خاص فوج کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ یہ تاحکم ثانی سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور (موجودہ فیصل آباد)، منٹگمری (موجودہ ساہیوال)، لاہور، امرتسر، گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر، فیروز پور اور لدھیانہ کے اضلاع میں امن وامان قائم رکھے گی۔ ان اضلاع کا کل رقبہ 29 ہزار مربع میل تھا تاہم بٹوارا کونسل کے اس فیصلے سے پہلے ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر انچیف فرانسس ٹکر نے (Francis Tuker) اپنی حکومت کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ ''پنجاب میں مستقل امن قائم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہاں تمام گورکھا بٹالینوں، مدراسیوں اور دوسرے قابل اعتماد افراد کو تعینات کر دیا جائے اور انہیں بندوقوں اور ٹینکوں سے پوری طرح لیس کیا جائے تا کہ وہ سکھوں کو پچھاڑ دیں اور اکھاڑے سے نکال باہر کریں۔ اس علاقے میں مارشل لاء نافذ کیا جائے اور ایک فوجی گورنر مقرر کیا جائے...... '' اور یہ کہ ''گورکھے کسی کو بھی گولی مار سکتے ہیں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان...... '' لیکن اسے بتایا گیا کہ ''ہندوستانی کابینہ تمام گورکھا بٹالینیں حاصل کرنا چاہتی ہے تا کہ وہ انہیں پاکستان کے خلاف جنگ میں استعمال کر سکے۔ اسے بتایا گیا کہ انڈین یونین پاکستان سے خوفزدہ ہے۔''[26] درحقیقت فرانسس ٹکر نے متذکرہ تجویز وائسرائے کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے (Ismay) کو پیش کی تھی۔ مگر لارڈ اسمے نے اس تجویز کو محض اس لیے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا کہ یہ نہرو کو منظور نہیں ہوگی۔[27] فرانسس ٹکر لکھتا ہے کہ اگست کے ابتدائی دنوں میں جنرل ریس سے انبالہ میں ہماری بات چیت ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جیسے ہی باؤنڈری فورس کے فیصلے کا اعلان ہوگا مشرقی پنجاب میں قیامت برپا ہو جائے گی...... ہمیں پورا یقین تھا کہ امرتسر سے جو فتنہ اٹھے گا اس سے سارے شمال میں تباہی و بربادی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور مقامی نظم ونسق درہم برہم تھا...... شہری حکام اور پولیس کے فرقہ پرستانہ رویے نے شروع ہی سے فوج کے کام کو ناممکن بنا دیا

تھا۔[28] پنڈرل مون (Penderal Moon) کی رائے تھی کہ باؤنڈری فورس سے کوئی زیادہ امید وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ سکھ جب بھی موقع پائیں گے مسلمانوں پر دھاوا بول دیں گے۔ اگر باؤنڈری فورس حقیقت میں طاقتور ہوئی تو وہ اس وقت تک صبر کریں گے جب تک کہ اسے ہٹا نہ لیا جائے اور اگر وہ کمزور ہوئی تو وہ اسے خاطر میں نہیں لائیں گے۔[29] پینڈرل مون کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ بٹوارا کونسل کے اس فیصلے سے 9 دن بعد اس سرحدی فوج کے باقاعدہ وجود میں آنے سے ایک دن پہلے یعنی 31 رجولائی کو سکھوں نے پورے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کا بگل بجا دیا۔ پہلا حملہ امرتسر کے گڑھوال، تلونڈی ارائیاں اور بعض دوسرے مسلم دیہات پر ہوا۔ ان کا یہ حملہ ان کے مسلح گشتی جتھوں نے طے شدہ حکمت عملی کے مطابق کیا۔ ان کا دوسرا حملہ 4 راگست کو امرتسر کے ایک مقام مجیٹھہ میں ہوا۔ مسلمانوں کے دو گاؤں کو گھیر لیا گیا اور پھر انہیں جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ اس میں بہت سے مسلمان مارے گئے اور متعدد عورتیں اغوا ہوئیں۔ یہاں سے ان کے دستے ترن تارن پہنچے اور وہاں بھی انہوں نے مسلمانوں کا بے دریغ خون بہایا۔

دریں اثنا 27 رجولائی کو شرومنی اکالی دل کے صدر گیانی کرتار سنگھ اور بعض دوسرے سکھوں کو گوردوارہ ننکانہ صاحب کے نزدیک گرفتار کر لیا گیا تھا۔ الزام یہ تھا کہ انہوں نے اس علاقے میں غیر قانونی مظاہرے کر کے امن وامان میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ پولیس نے جب ان گرفتار شدگان سے پوچھ گچھ کی تو سکھوں کے ایک خوفناک منصوبے کا انکشاف ہوا۔ بہت سے خطوط، گشتی مراسلے اور دوسری دستاویزات برآمد کی گئیں جن سے یہ معلوم ہوا کہ اکالی دل کے لیڈروں نے پورے صوبے میں تخریب کاری اور قتل و غارت کا وسیع منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ایک سازش مغربی پنجاب میں نہروں کے ہیڈ ورکس کو بموں سے تباہ کرنے کی تھی۔ ایک سازش یہ تھی کہ 7 راگست کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے دیہات پر حملے کر کے آگ لگا دی جائے اور جب مسلمان اپنے گھروں سے بھاگیں تو انہیں گھیر کر قتل کر دیا جائے۔ ایک اور سازش یہ تھی کہ پاکستان جانے والی ریل گاڑیوں پر حملے کئے جائیں گے اور ایک سازش یہ بھی تھی کہ 14 راگست کو کراچی میں جب قائداعظم کا جلوس نکلے گا تو ان کی کار پر بم مارا جائے گا۔[30] چونکہ گیانی کرتار سنگھ 10 رجولائی کو ہی گورنر پنجاب کو اپنے اس قسم کے عزائم سے مطلع کر چکا تھا اس لیے جب خفیہ

پولیس نے سکھوں کے اس خطرناک منصوبے کی تفصیلات پر مشتمل فائل اس کے سامنے پیش کی تو اسے اس کی صداقت پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اس نے پنجاب خفیہ پولیس کے ایک انگریز افسر کی وساطت سے یہ فائل ماؤنٹ بیٹن کو بھیج دی۔ 5 راگست کو جب بٹوارا کونسل کی میٹنگ ختم ہوئی تو یہ فائل ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے نہرو، پٹیل، جناح اور لیاقت سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جائیں۔ پھر اس نے وہ فائل ان لیڈروں کے سامنے پیش کر دی اور اس پولیس افسر کو بھی کمرے میں بلایا جس نے دستاویزی شہادتوں کے ساتھ سکھوں کے خطرناک منصوبے کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ جناح نے مطالبہ کیا کہ ان سارے سکھ لیڈروں کو جو اس منصوبے میں ملوث ہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن کو بظاہر جناح کی اس رائے سے اتفاق تھا لیکن پٹیل کا خیال تھا کہ اس طرح صورت حال مزید خراب ہو جائے گی۔ تاہم یہ طے پایا کہ ماسٹر تارا سنگھ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔[31] 16 راگست کو وائسرائے کے معاون جارج ایبل کے ساتھ ملاقات میں جناح نے یہ خدشہ صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ ''پٹیل چاہتا ہے کہ سکھ وسطی پنجاب میں گڑبڑ پھیلائیں۔[32] پھر مشرقی پنجاب کے نامزد گورنر تریودی (Trivedi) کے مشورے سے جس میں دراصل پٹیل کا مشورہ شامل تھا، فیصلہ کیا گیا کہ تارا سنگھ کو گرفتار کرنے کے فیصلے کو مؤخر کر دیا جائے۔ جناح نے پٹیل پر الزام لگایا کہ اس کے ایما پر اس فیصلے کو مؤخر کیا جا رہا ہے۔ جبکہ یہ متفقہ فیصلہ تھا اور اس پر فوری عمل درآمد ہونا چاہیے تھا۔ اس بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے 8 راگست کو جینکنز کو لکھا کہ ''اگر آپ تارا سنگھ کی گرفتاری کو مؤخر کرنے کے حق میں ہوں تو میں اتفاق کرتا ہوں۔'' 9 راگست کو جینکنز نے ماؤنٹ بیٹن کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا کہ ''تارا سنگھ کو اب ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد گرفتار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ 15 راگست کے بعد مغربی اور مشرقی پنجاب کی حکومتیں خود سکھوں سے نمٹیں۔'' ماؤنٹ بیٹن نے اتفاق کر لیا۔[33] لہٰذا کوئی کارروائی نہ ہوئی اور اکالی دل کے قائدین اپنے منصوبے پر عمل درآمد میں مصروف ہو گئے۔ ان کا مرکزی مقصد یہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو جبراً بے دخل کیا جائے اور مغربی پنجاب سے سکھ آبادی کو بحفاظت مشرقی پنجاب میں منتقل کیا جائے۔ انہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو بہت سے مسلح گشتی دستے منظم کیے تھے ان کے ارکان کی اکثریت مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں کے فوجیوں یا ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل تھی۔ یہ جتھے مسلمانوں کے دیہات پر عموماً رات

کوحملہ کرتے تھے۔ پہلے گھوڑوں پر سوار ایک جتھہ حملے کے لیے مخصوص دیہات کا جائزہ لیتا تھا اور پھر اس کی رپورٹ پر سینکڑوں مسلح افراد کا بڑا جتھہ دھاوا بول دیتا تھا۔ سب سے پہلے مکانوں کو آگ لگائی جاتی تھی اور پھر قتل وغارت اور لوٹ مار کی جاتی تھی۔ یہ قتل عام ساری رات جاری رہتا تھا۔ عام طور پر جوان لڑکیوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ وہ جن حملہ آوروں کے ہتھے چڑھتی تھیں وہ انہیں اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ یہ ساری کاروائی فوجی تدابیر کے تحت ہوتی تھی اور اس میں جدید قسم کے خودکار ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے۔ چونکہ منصوبے میں کلیدی کردار پٹیالہ، کپورتھلہ، فریدکوٹ اور بھرت پور کی سکھ ریاستوں کے فوجیوں کا تھا، اس لیے ان ریاستوں کے اندر بہت ہی ظلم ہوا۔ ان کے کئی علاقوں میں تو تھوڑے ہی دنوں میں مسلمان آبادی کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔

8 راگست کو بٹھنڈا کے نزدیک ریلوے لائن کو بم سے اڑا دیا گیا جس کی وجہ سے پاکستانی سرکاری ملازمین کی ایک اسپیشل ریل گاڑی پٹڑی سے اتر گئی۔ اس گاڑی کو کلی طور پر تباہ کرنے کے لیے بہت سے بم رکھے ہوئے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے ان میں سے صرف ایک پھٹا۔ اس لیے کوئی زیادہ نقصان نہ ہوا۔ ایک عورت اور اس کا چار سالہ بچہ مارا گیا اور تقریباً ایک درجن مسافر زخمی ہوئے۔ خفیہ سرکاری رپورٹ کے مطابق جن سکھوں نے ریلوے لائن کو اڑایا تھا وہ ایک جیپ میں بیٹھ کر ریاست فریدکوٹ کے علاقے میں فرار ہو گئے تھے۔[34] 9 راگست کو لاہور کے چھ مسلمان ایڈیٹروں نے ایک مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا کہ مشرقی پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں کئی روز سے جو منظم غنڈہ گردی جاری ہے وہ اب ناقابل برداشت ہو چکی ہے۔ غنڈوں کے مسلح گروہ امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور اور مشرقی پنجاب کے دوسرے اضلاع کے دیہاتی علاقوں میں بسنے والے بے گناہ لوگوں پر وحشیانہ مظالم ڈھا رہے ہیں۔ ان اضلاع میں سرکاری مشینری اقلیتوں کی جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت میں قطعاً ناکام رہی ہے۔ ہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر زور دیتے ہیں کہ اپنی اولین فرصت میں یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس قتل عام سے بچائیں۔ صوبہ لیگ کے لیڈروں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو اس قیامت صغریٰ میں بے یار و مددگار نہ چھوڑیں، ہم خان افتخار حسین آف ممدوٹ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمانان پنجاب کے رہنما کی حیثیت سے مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ رہنماؤں ڈاکٹر گوپی چند اور سردار سورن سنگھ کو غیر مبہم الفاظ میں تنبیہہ کر دیں کہ اگر منظم

غنڈہ گردی اور شیطانی چکر کو نہ روکا گیا تو اس کا ردعمل خطرناک ہوگا اور اس کے نتائج کی ساری ذمہ داری ڈاکٹر گوپی چند، سردار سورن سنگھ اور ان کے لیڈر تارا سنگھ پر عائد ہوگی۔[35] اس بیان پر فیض احمد فیض (پاکستان ٹائمز) ملک نور الٰہی (احسان) عبدالحمید (ایسٹرن ٹائمز) اختر علی (زمیندار) ملک عنایت اللہ (شہباز) اور حمید نظامی (نوائے وقت) کے دستخط تھے۔ ان ایڈیٹروں نے قائداعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام اس مضمون کے تار بھی بھیجے جن میں دردمندانہ اپیل کی گئی تھی کہ مشرقی پنجاب میں معصوم مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ 11 راگست کو ضلع فیروز پور میں گیدڑ باہا ریلوے اسٹیشن کے نزدیک پاکستانی سرکاری ملازمین کی اسپیشل ریل گاڑی کو ڈائنا میٹ سے اڑایا گیا اور 15 راگست کو امرتسر کے ہندو اور سکھ غنڈوں نے بہت سی مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے پہلے شہر میں ان کا جلوس نکالا پھر ان کی آبروریزی کی اور پھر تلواروں اور کلہاڑیوں سے ان کے ٹکڑے کر دیئے...... یہ ''سیکولر'' ہندوستان کی آزادی وخود مختاری کا پہلا دن تھا۔

اگر مشرقی پنجاب میں سکھوں کی وحشیانہ کارروائی محض انتقامی جذبے کے تحت ہوتی تو اسے آزادی کے بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ بلکہ قتل و غارت، لوٹ مار، آتشزدگی، آبروریزی اور اغوا کی وارداتوں کا سلسلہ پہلے سے زیادہ ہو گیا اور 17 راگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے فوراً بعد پتہ چل گیا کہ آزاد ہندوستان کے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ 18 راگست کو عید تھی۔ جب مسلمان عوام حسب روایت عید کی نماز پڑھنے کے لیے کھلے میدان میں جمع ہوئے تو بہت سی جگہوں پر سکھوں کے مسلح جتھے ان پر ٹوٹ پڑے۔ بے شمار نہتے مسلمان جاں بحق ہوئے۔ بعد میں ان کے دیہات کو نذر آتش کر کے ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ اسی دن ضلع گورداسپور میں بھی بدامنی شروع ہوگئی۔ اس ضلع میں سب سے پہلا حملہ موضع گھوالا میں ہوا جہاں 30 مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ پھر بٹالہ اور دھاریوال کے گردونواح کے 30 دیہات نذر آتش کئے گئے۔ فیروز پور شہر میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے ''سورماؤں'' نے 35 نہتے مسلمانوں کو چاقوؤں سے قتل کیا اور ساٹھ کو زخمی کیا۔ اس ضلع کے موضع رسول پور پر حملے میں 200 مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور دھرم کوٹ میں 21 مسلمان گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ رام گڑھ، راجپورہ، کھٹانہ اور دوسرے بے شمار دیہات کی گلیاں اور کھیتیاں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے

لالہ زار کر دی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجرین کا تانتا بندھ گیا۔ نوائے وقت کی ایک رپورٹ کے مطابق 20 راگست کو یعنی آزادی کے پانچ دن بعد لاہور کے امدادی کیمپوں میں مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار سے زیادہ تھی۔ 21 راگست کو شرومنی اکالی دل کے صدر گیانی کرتار سنگھ نے ایک بیان میں اس عزم کا اظہار کیا کہ سکھوں کو پاکستان کی غلامی میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ پاکستان میں چودہ لاکھ سکھ محصور ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم ان کی آزادی و خودمختاری کے لیے لڑیں گے۔ مشرقی پنجاب کے مسئلہ کا ایک حل تبادلۂ آبادی ہے۔ میں نے امرتسر میں یہ تجویز لیاقت علی خان اور پنڈت نہرو کے روبرو رکھی تھی۔ دونوں وزرائے اعظم نے اس پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا تھا اور تبادلہ آبادی کی تجویز سے اتفاق کیا تھا، اگرچہ محدود پیمانے پر اور اسی دن مغربی پنجاب کے وزیر مال سردار شوکت حیات نے جالندھر ڈویژن کے کمشنر کے نام ایک خط میں لکھا کہ اگر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے مال و جان کی حفاظت کے لیے فی الفور انتظام نہ کیا گیا تو مغربی پنجاب میں بھی حالات پر کنٹرول رکھنا مشکل ہو جائے گا۔[36]

سردار شوکت حیات خان کے اس خط کا مضمون لاہور کے اخباروں میں بھی شائع ہوا اور قارئین نے یہ نتیجہ فوراً اخذ کر لیا کہ اب مغربی پنجاب میں بھی بے گناہ ہندوؤں اور سکھوں کا منظم طریقے سے انتقامی قتل عام ہوگا۔ اس شخص پر مارچ 1947ء میں بھی یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے راولپنڈی اور کیمبل پور کے اضلاع میں مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام پر اکسایا تھا۔ لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے شہروں میں غیر مسلموں کو قتل کرنے اور ان کے گھروں کو آگ لگانے کی اکا دکا وارداتیں تو کئی دن سے ہو رہی تھیں۔ لیکن 21 راگست کے بعد منظم طریقے سے ہندوؤں اور سکھوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اور اس وقت تک مشرقی پنجاب سے پولیس کے بہت سے مسلمان سپاہی بھاگ کر لاہور پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے متعدد مقامات پر مقامی پولیس کے ساتھ مل کر ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کئے۔ ان حملوں میں بندوقوں کا آزادانہ استعمال ہوا اور خوب لوٹ مار ہوئی۔ لاہور میں شاہ عالمی دروازے کا سارا علاقہ نذر آتش کر دیا گیا۔ بہت سے ہندو اور سکھ مارے گئے اور ان کی دکانوں اور گھروں کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ ضلع شیخوپورہ سکھوں کا گڑھ تھا۔ یہاں مسلمانوں کے مسلح گروہوں نے بہت خون بہایا، ہندوؤں اور سکھوں کی

بہو بیٹیوں کی آبرو ریزی کی اور پھر انہیں اغوا کر کے مویشیوں کی طرح فروخت کیا۔ یہ مظلوم غیر مسلم عورتیں مسلمان اغواء کنندگان کے گھروں میں شب و روز اپنے ماں باپ اور ویروں کے نام لے لے کر بین کرتی تھیں۔ وہ خون کے آنسو بہاتی تھیں۔ ان کے پیاروں کو ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔ مسلح مسلمان گروہوں نے جن میں پولیس پیش پیش تھی راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور اور منٹگمری کے اضلاع میں ریل گاڑیوں پر حملے شروع کر دیے۔ ہندو اور سکھ مسافروں کو چن چن کر مارا گیا۔ ان کی عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی اور ان کا سامان لوٹ لیا گیا۔ کئی مسلمان افسروں نے بھی ''مال غنیمت'' میں اپنے حصے وصول کیے۔ شیخوپورہ میں سینکڑوں ہندوؤں اور سکھوں کو ایک گودام میں جمع کر کے ان سب کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔

دونوں پنجابوں میں وحشت و بربریت کا یہ مظاہرہ تقریباً دو مہینے تک ہوتا رہا۔ فریقین نے دیہات میں وحشیانہ حملے کرنے کے علاوہ شہروں میں بھی آگ و خون کے دریا بہائے۔ بہت سی اسپیشل ریل گاڑیوں اور لاریوں کا صفایا کر دیا گیا۔ مہاجروں اور شرنارتھیوں کے متعدد قافلوں کو دستی بموں، گولیوں، تلواروں، کلہاڑیوں اور نیزوں کا نشانہ بنایا گیا۔ کسی کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ شیر خوار بچوں کے اعضاء کاٹ دیے گئے اور بعض جگہوں پر عورتوں کو بڑی اذیتیں پہنچا کر ہلاک کیا گیا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمان عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی لاریاں ایسی جگہ لا کر روک دی جاتی تھیں جہاں ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھے ان کے منتظر ہوتے تھے۔ وہ فوراً لاریوں کو روک کر جوان لڑکیوں کو اغوا کر لیتے تھے اور باقی سب کو قتل کر دیتے تھے۔ مہاجروں کی اسپیشل گاڑیوں کے چلنے کے کوئی اوقات نہیں تھے۔ ریلوے ملازمین کی مرضی پر چلائی اور روک دی جاتی تھی۔ اکثر موقعوں پر ریل گاڑیاں غنڈوں کے کہنے پر روک دی جاتی تھیں یا انہیں ایسی جگہ پر کھڑا کر دیا جاتا تھا جہاں خانماں برباد مہاجروں کو بڑی بے دردی سے بآسانی قتل کر دیا جاتا تھا۔ امرتسر کے قریب ایک گاڑی کا اس قدر باقاعدگی سے صفایا کیا گیا کہ 1500 مسافروں میں سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکا۔ لاہور اسٹیشن پر جو گاڑی پہنچتی تھی وہ یا تو زخمیوں اور لاشوں سے بھری ہوئی ہوتی تھی یا اس میں خون ہی خون ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں اس قسم کے لرزہ خیز مناظر دیکھے تھے وہ آج بھی ان کا تصور کرتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لندن ٹائمز کے نامہ نگار ائین موریسن (Ian Morrison) نے ان دنوں اپنی رپورٹ میں مشرقی پنجاب کی قیامت

صغریٰ کا بڑا ہی ہولناک نقشہ کھینچا تھا اس کی یہ رپورٹ اخبار کی 24 ر اگست کی اشاعت میں چھپی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ''آج کل مشرقی پنجاب میں جو قتل عام ہو رہا ہے۔ وہ تجربہ کار برطانوی اور ہندوستانی افسروں کی رائے میں اس سے زیادہ ہولناک ہے جو انہوں نے جنگ کے دوران دیکھا تھا۔ سکھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو جبراً نکال رہے ہیں۔ وہ روزانہ سینکڑوں مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور ہزاروں کو بھاگنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے دیہاتوں کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر کر رہے ہیں۔ یہ تشدد سکھوں کی اعلیٰ ترین قیادت کی ہدایت پر ہو رہا ہے۔ اس کا ارتکاب بڑی باقاعدگی سے علاقہ بہ علاقہ کیا جا رہا ہے۔ امرتسر اور جالندھر جیسے بڑے شہروں میں اب نسبتاً سکون ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہاں کوئی مسلمان نہیں رہے۔ میں نے ہوائی جہاز سے ضلع جالندھر کے دیہاتی علاقے کا تقریباً دو گھنٹے تک معائنہ کیا ہے۔ میں نے جن دیہات میں شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں ان کی تعداد پچاس سے کم نہیں ہوگی۔ مسلح سکھوں کا ہر جتھہ پچاس سے لے کر سو افراد تک مشتمل ہوتا ہے۔ یہ لوگ پہلے گوردواروں میں جمع ہوتے ہیں اور پھر پروگرام کے مطابق گردونواح کے مسلم دیہات پر حملے کرتے ہیں، بہت سے جتھے قریبی سکھ ریاستوں سے آتے ہیں مسلمانوں کے پاس لاٹھیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب حملہ ہوتا ہے تو وہ اپنی چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں اور پھر ڈھول بجا کر گردونواح کے مسلمانوں کو اپنی امداد کے لیے بلاتے ہیں۔ وہ لاٹھیوں کے علاوہ اینٹوں اور پتھروں سے بھی اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے خودکار ہتھیاروں سے گولیاں چلائی جاتی ہیں تاکہ مسلمان اپنی چھتوں سے اتر جائیں۔ پھر کچھ دیواروں کے اوپر سے دستی بم پھینکتے ہیں اور جب بموں کے دھماکوں سے افراتفری پھیل جاتی ہے۔ تو جتھہ کے باقی ارکان تلواروں، کلہاڑیوں اور نیزوں سے دھاوا بول دیتے ہیں۔ جب لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں تو لمبی سفید داڑھیوں والے فوجی پینشنروں کی باری آتی ہے۔ یہ لوگ آگ لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے پاس مشعلیں ہوتی ہیں۔ برطانوی افسروں نے سکھوں کے ایسے جتھے بھی دیکھے ہیں جن میں عورتوں اور بچوں کے پاس بھی بلمیں تھیں۔ بڑے ہی لرزہ خیز مظالم ہو رہے ہیں۔ کسی کو بھی نہیں معاف کیا جاتا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی سنگدلی سے ہلاک کیا جاتا ہے پھر ان کی لاشوں کو مسخ کیا جاتا ہے۔ ایک گاؤں میں 50 لاشوں میں سے 30 لاشیں عورتوں کی تھیں۔ ایک افسر نے چار شیر خوار بچوں کی لاشیں آگ میں جلتی ہوئیں دیکھی

ہیں۔[37] لیکن ہندوستانی مؤرخین نے مشرقی پنجاب میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ ان کا یہی اصرار تھا کہ مشرقی پنجاب میں جو فساد ہوا تھا وہ محض مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے منظم قتل عام کا ردعمل تھا۔

چونکہ سکھوں کی جانب سے اس قدر منظم غارت گری کا مقصد ہی آبادی کا تبادلہ کرنا تھا۔ اس لیے اگست کے تیسرے ہفتے میں دونوں صوبوں کے وزراء کی ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ دونوں حکومتیں مہاجروں اور شرنارتھیوں کے بحفاظت انخلاء میں ممد و معاون ہونگی۔ دونوں ملکوں کے وزیر اعظم دو ایک دن پہلے امرتسر میں اپنی میٹنگ کے دوران اس کاروائی پر اصولاً اتفاق کر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تبادلۂ آبادی محدود پیمانے پر کیا جائے گا حالانکہ سکھوں کی قیادت مکمل تبادلے کا عزم رکھے ہوئے تھی۔ 29 راگست کو لاہور میں مشترکہ ڈیفنس کونسل کا اجلاس ہوا، جس میں قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن نے بھی شرکت کی۔ جب دونوں صوبوں کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا تو اس رائے پر فوراً اتفاق ہو گیا کہ جنرل ریس کی سرحدی فوج بالکل بے سود ثابت ہوئی ہے۔ اتنے وسیع علاقے میں اتنی منظم غارت گری کا سدباب کرنا 55 ہزار کی فوج کے بس کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی روز بروز یہ خطرہ بڑھ رہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی اس مشترکہ فوج کے جوان کسی دن بھی فرقہ وارانہ جذبات سے مغلوب ہو جائیں گے اور خون خرابے کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اس فوج کو یکم دسمبر سے توڑ دیا جائے گا اور آئندہ دونوں ملکوں کی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ دار ہوں گی۔ تاہم فیلڈ مارشل آکن لیک (Auchin Leck) نے جنرل ریس کے نام ایک خط میں اس کی اور اس کی فوج کی خدمات کی تعریف کی اور لکھا کہ ''حد بندی کمیشن کے ایوارڈ کے اعلان سے پہلے امرتسر میں قتل و غارت، آتشزنی اور بدامنی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کا حد بندی یا اس سے متعلقہ کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلاشبہ اس ساری کاروائی کا بہت پہلے منصوبہ بنایا گیا تھا اور اس کا ناگزیر طور پر مغربی پنجاب میں فوراً ہی ردعمل ہوا۔ لہٰذا تمہاری فوج کے لیے ایک ایسی مشکل پیدا ہو گئی تھی جس کی پیش بینی نہیں کی گئی تھی اور جس پر قابو پانا تمہارے بس میں نہیں تھا۔[38] لیکن وی۔ پی۔ مینن اور دوسرے ہندوستانی مؤرخین کا موقف یہی ہے کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام کسی منصوبے کے تحت نہیں ہوا تھا بلکہ یہ محض مغربی پنجاب میں غیر مسلموں کے قتل عام کا ردعمل تھا۔

آبادی کا تبادلہ بھی محض اس لیے ہوا کہ مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے جبری انخلا کی مہم چلائی گئی تھی۔

لاہور میں مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس کے بعد دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم نے امرتسر، پٹیالہ، ہوشیار پور، لاہور اور شیخوپورہ کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ جگہ جگہ مہاجروں اور شرنارتھیوں کے کیمپ تھے۔ جن میں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ ان کے لیے کھانے پینے اور علاج معالجے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے آسمان کا سینہ پھٹ رہا تھا اور مرد ہاتھ جوڑ جوڑ کر التجا کر رہے تھے کہ انہیں بلا تاخیر محفوظ مقامات پر پہنچایا جائے۔ دورے کے بعد دونوں وزرائے اعظم کی ایک کانفرنس 3 ستمبر کو لاہور میں منعقد ہوئی جس کے بعد ایک مشترکہ اعلان میں دونوں مرکزی اور دونوں صوبائی حکومتوں کی طرف سے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں ہر قسم کی بدامنی کو بلا تاخیر کچل دیں گی۔ مگر اگلے ہی دن 4 ستمبر کو ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں قیامت برپا کر دی گئی جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھوں نے یکا یک مسلمانوں کی دکانوں اور گھروں پر دھاوا بول دیا۔ شام تک بہت سے مکانات نذر آتش کر دیے گئے اور مختلف گلیوں میں اور سڑکوں پر مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ 6 ستمبر تک صورت حال اس قدر خراب ہوگئی کہ حکومت ہندوستان کی ساری انتظامی مشینری بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گئی۔ پورے شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں مکمل لاقانونیت، بدامنی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ مسلمانوں کے ہزاروں خاندان برباد ہو گئے اور انہوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے پرانے قلعے میں پناہ لی۔ ان میں سے بیشتر پاکستان کے سرکاری ملازمین تھے اور وہ اس وقت تک دہلی میں محض اس لیے مقیم تھے کہ ان کو بحفاظت کراچی پہنچانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ ان کے لیے کوئی اسپیشل گاڑی نہیں چل سکتی تھی کیونکہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کے جتھے ان پر حملہ کرتے تھے۔

ایلن کیمبل جانسن لکھتا ہے کہ ان دنوں ماؤنٹ بیٹن آرام کے لیے شملہ گیا ہوا تھا۔ ہندوستانی ارباب اقتدار اس کی غیر حاضری میں اتنے پریشان ہوئے کہ انہوں نے اسے فوراً واپس آنے کی درخواست کی اور جب وہ 6 ستمبر کو دہلی پہنچا تو نہرو نے اسے کہا کہ ہنگامی صورت حال پر قابو پانے کے لیے آپ سرگرمی سے اعلیٰ اختیارات کا استعمال کریں۔ ماؤنٹ بیٹن نے دو تین

گھنٹے تک دہلی کے بحران کی تفصیلات سنیں اور پھر ایک ایمر جنسی کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی۔ نہرو اور پٹیل نے فوراً یہ تجویز مان لی اور ان کے اصرار پر ماؤنٹ بیٹن نے اس کمیٹی کی صدارت کے فرائض سنبھال لیے۔ [39] ہوڈسن کہتا ہے کہ دراصل دہلی کی صورت حال ناتجربہ کار ہندوستانی لیڈروں کے قابو سے باہر چلی گئی تھی اور انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے استدعا کی تھی کہ وہ محض اپنے آئینی فرائض سرانجام نہ دے بلکہ کاروبار حکومت چلانے میں عملی طور پر ان کی امداد کرے۔ ان کا یہ فیصلہ اس حقیقت کا مظہر تھا کہ انہیں ماؤنٹ بیٹن پر مکمل اعتماد تھا۔ [40] لاری کولنز (Larry Collins) اور ڈومینیک لپیئر (Dominique Lapierre) نے دہلی کے وائسرائے ہاؤس میں 6 ستمبر کے اس ڈرامے کی دو اڑھائی صفحوں میں تفصیل لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہرو اور پٹیل نے اپنی ناتجربہ کاری، بے بسی اور نااہلیت کا اعتراف کر کے حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کر دی تھی۔ [41] تاہم ماؤنٹ بیٹن نے اقتدار کی منتقلی کے تین ہفتے بعد جب 6 ستمبر کو دوبارہ عنان اقتدار سنبھالی اس وقت تک سرکاری اندازے کے مطابق دہلی میں تقریباً دو ہزار مسلمان قتل کیے جا چکے تھے۔ غیر سرکاری اندازہ اس سے بہت زیادہ تھا۔

ابوالکلام آزاد نے دہلی میں بے گناہ مسلمانوں کے کشت وخون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سردار پٹیل کا دامن دہلی کے مسلمانوں کے خون سے بری طرح آلودہ تھا۔ وزیر داخلہ کی حیثیت سے دہلی میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی لیکن اس نے دانستہ طور پر اس المیے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ مسلمانوں کے قتل عام کی خبروں کو مبالغہ آمیز کہتا تھا اور مسلمانوں کو ہی فساد کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ دہلی انتظامیہ کے اکثر ارکان کھلم کھلا فسادیوں کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ وہی کرتے تھے جس سے وزیر داخلہ خوش ہوتا تھا۔ سردار پٹیل کہتا تھا کہ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں۔ وہ مسلمانوں پر جھوٹا الزام لگاتا تھا کہ انہوں نے اپنے گھروں میں اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ جب مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی تھی تو سبزی کاٹنے والے چھوٹے چھوٹے زنگ آلود چاقوؤں کے سوا کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ [42]

اسی اثنا میں دونوں پنجابوں میں کشت وخون اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا۔ جگہ جگہ مہاجرین اور شرنارتھیوں کے کیمپ بن گئے۔ ریل گاڑیوں، بسوں کی آمدورفت بند ہو گئی تھی۔ کیونکہ دونوں فریقوں کے مسلح گروہ راستے میں حملے کرتے تھے۔ البتہ پیدل قافلوں کا سفر جاری

تھا۔ حالانکہ قدم قدم پر بہت خون ہوتا تھا۔ بیس ہزار، چالیس ہزار اور بعض اوقات ایک لاکھ مرد، عورتیں اور بچے گھر کی بچی کھچی چیزیں اٹھاتے ہوئے ان قافلوں میں شامل ہوتے تھے۔ بیشتر قافلے دس میل سے تیس میل تک پھیلے ہوتے تھے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک تقریباً پندرہ پندرہ میل کی منزلیں طے کرتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ قافلے کا اگلا سرا منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے لیکن پچھلا سرا ابھی اپنے آخری پڑاؤ پر موجود ہے۔ ہر منزل میں قافلے کو آرام کے لیے چند گھنٹے دیے جاتے تھے اور وہ صبح چار بجے پھر روانہ ہو جاتے۔ لندن ٹائمز نے 4 ستمبر کو مسلمانوں کے ایک ایسے ہی قافلے کی رپورٹ شائع کی تھی جس میں لکھا تھا کہ تقریباً بیس ہزار خانماں برباد مسلمان پیدل پاکستان کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان کا قافلہ تقریباً بیس میل لمبا ہے۔ ان کے پاؤں زخمی ہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ وہ بھوکے ہیں۔ وہ نحیف و نزار ہیں۔ ان سے چلا نہیں جاتا۔ ان کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ انہوں نے جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ بھی پھٹے ہوئے ہیں وہ ہر قسم کے مصائب سے گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنے سامنے شیر خوار بچوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ ان کی عورتوں کی ان کے سامنے آبروریزی کی گئی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ انہیں موت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے ہزاروں یا تو بھوک اور بیماری سے مر گئے ہیں یا انہیں سکھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور بہت سے لوگ پاکستان کی سرحد پر پہنچتے ہی جان دے دیتے ہیں۔[43] ماؤنٹ بیٹن کا چیف آف سٹاف لارڈ اسمے (Ismay) حکومت پاکستان کو دہلی کی صورت حال سے مطلع کرنے اور اقلیتوں کے بارے میں ہندوستان کی ''نیک نیتی'' کا یقین دلانے کے لیے 11 ستمبر کو کراچی آیا تو اس نے محسوس کیا کہ جناح کو بے گناہوں کی خونریزی پر بہت دکھ تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''جناح بہت پروقار اور غمگین نظر آتا تھا۔ اس کی باتوں سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بالکل ناامید ہو چکا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب لڑنے مرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ جب ہم اس کے مطالعہ کے کمرے میں چلے گئے تو وہ پھٹ پڑا۔ کہنے لگا کوئی بھی شخص کس طرح یقین کر سکتا ہے کہ حکومت ہندوستان امن و امان کی بحالی اور اقلیتوں کی حفاظت کے لیے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ کوشش کر رہی ہے۔ اس کے برعکس گذشتہ تین ہفتوں کے واقعات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے پیدا ہوتے ہی وہ اس کا گلا گھونٹنے کے درپے ہیں۔[44]

لارڈ اسمے واپس دہلی پہنچا تو ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور دو تین دوسرے وزراء کے ہمراہ

ہوائی جہاز سے پنجاب کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے 21 ستمبر کو شہنشاہ معظم کو جو رپورٹ بھیجی اس میں لکھا تھا کہ دونوں طرف پیدل قافلوں کی صورت حال میں بہت تضاد ہے۔ مغربی پنجاب سے شرنارتھیوں کا جو پچاس میل لمبا قافلہ آ رہا ہے، اس میں بیشتر سکھ ہیں۔ وہ منظم طریقے سے اچھی حالت میں سفر کر رہے ہیں۔ ان کے پاس اپنی بیل گاڑیاں ہیں اور دوسرے مویشی ہیں۔ اس کے برعکس مشرقی پنجاب سے جو قافلے جا رہے ہیں ان کی حالت بہت بری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں جبراً گھروں سے نکالا گیا ہے اور وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھے ہیں۔ ان کے پاس بیل گاڑیوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ [45] دونوں طرف قافلوں کی صورت حال میں اس قدر فرق ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اکالی دل کی قیادت نے سکھوں کے بحفاظت انخلاء کا بڑی دیر سے منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ان کے برعکس مشرقی پنجاب کے مسلمان بے خبری میں مارے گئے تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ انہیں زبردستی نقل مکانی کرنا پڑے گی۔ پنجاب مسلم لیگ کی جاگیردارانہ قیادت نے اس سلسلے میں انتہائی مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی اس لاپرواہی سے صورت حال اتنی زیادہ خراب ہو گئی تھی کہ دونوں ملکوں میں جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ 21 ستمبر کو دونوں حکومتوں نے ایک مشترکہ اعلان کے ذریعے اس خطرے کا سدباب کرنے کی کوشش کی۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کا تصور نہ صرف اخلاقی لحاظ سے غیر پسندیدہ ہے بلکہ اس لیے بھی کہ جنگ دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن ہو گی۔ لہٰذا دونوں حکومتیں جنگ کے اسباب کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔ لیکن اس اعلان کے دوسرے ہی دن 22 ستمبر کو امرتسر کے نزدیک مسلمان مہاجرین کی ایک پوری ریل گاڑی کا صفایا کر دیا گیا۔ تقریباً 1500 مارے گئے۔ ان میں وہ چند پاکستانی فوجی جوان بھی شامل تھے جو مہاجرین کی حفاظت کے کام پر مامور تھے۔ اس واقعہ کے بعد فیلڈ مارشل آکن لیک نے ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ ''آج کل مشرقی پنجاب میں مسلمان مہاجرین کی اسپیشل ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کے بارے میں اطلاعات دینے کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے اور ان گاڑیوں پر بلا روک ٹوک حملے ہوتے ہیں۔ [46] چنانچہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کا خطرہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ خطرہ کتنا شدید اور حقیقی ہو گیا تھا اس کا اندازہ گاندھی کے اس بھاشن سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے 26 ستمبر کو دہلی میں اپنی پرارتھنا کے دوران دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''اگرچہ میں ہمیشہ ہر قسم

کی جنگ کے خلاف رہا ہوں لیکن اگر پاکستان سے انصاف کے حصول کا کوئی طریقہ نہیں ہے اور اگر پاکستان اپنی مسلمہ غلطی کو نہیں دیکھتا اور اس کی سنگینی کو بدستور کم کر کے دکھاتا رہتا ہے تو حکومت ہندوستان کو اس کے خلاف جنگ کرنا پڑے گی۔ جن مسلمانوں کی وفاداری پاکستان کے ساتھ ہے انہیں ہندوستان میں نہیں رہنا چاہیے۔[47] گویا ''مہاتما'' نے اپنے شیطانی چہرے کو مزید بے نقاب کر دیا تھا۔ عدم تشدد کا ''دیوتا'' کھلم کھلا نوزائیدہ پاکستان کو جنگ کی دھمکی دے رہا تھا۔ اسے اس کی منافقانہ سیاست نے اس قدر اندھا کر دیا ہوا تھا کہ اسے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان کے جبری انخلاء کے بارے میں اکالی دل اور راشٹر یہ سیوک سنگھ کے کئی ماہ پہلے تیار کردہ منصوبے کی کوئی غلطی نظر نہیں آتی تھی۔ اسے صرف پاکستان اور مسلمانوں کی انتقامی کاروائی کی غلطی کا احساس ہوتا تھا۔

باب: 2

# پنجاب کا قتل عام اور فوجی ساز وسامان کی تقسیم میں بے انصافی

برطانوی سامراج اس صورت حال سے بہت پریشان ہوا۔ اسے تشویش تھی کہ اگر آزادی کے فوراً بعد اور سیاسی استحکام پیدا ہونے سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہوگئی تو برصغیر کا سیاسی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور اس بنا پر ایشیا کے بارے میں اس کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ برطانوی پریس نے گاندھی کی جنگ بازی پر سخت نکتہ چینی کی۔ لندن کے بعض ہفت روزہ جریدوں نے لکھا کہ ''اب مہاتما پاکستان کے خلاف جنگ کی تند و تیز باتیں کر رہا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنی پرارتھنا کی میٹنگ میں اپنے آپ کو پہلی مرتبہ بطور جنگ باز بے نقاب کیا ہے۔[1] ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک نے بھی گاندھی کی جانب سے پاکستان کے خلاف جنگ کی باتوں کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ اس نے 28 ستمبر کو وزیر اعظم ایٹلی (Attlee) کے نام اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی بہت ہی بڑھ گئی ہے اور اس امر کا حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ دونوں ملک کسی وقت بھی تھوڑے سے نوٹس پر کھلم کھلا جنگ میں ملوث ہو جائیں گے۔[2] اس نے مزید لکھا ہے ''اگر ہندوستان اور پاکستان کی افواج میں کھلم کھلا جنگ تک نوبت پہنچ جائے، جس کا کافی امکان ہے تو ان افواج میں ملازم تمام انگریز افسروں اور دوسرے عملہ کو یہ حکم دینا ناگزیر ہو جائے گا کہ وہ ان افواج کی کمان اور انتظام سے فی الفور کنارہ کش ہو جائیں۔ اس حکم پر مختصر نوٹس پر عمل درآمد کرنے کے لیے انتظامات کر لیے گئے ہیں

اور متعلقہ کمانڈروں کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ دونوں حکومتوں کو بھی مشترکہ دفاعی کونسل کی وساطت سے سرکاری طور پر اس مؤقف سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔''[3]

حکومت پاکستان نے انتہائی تشویش ناک صورت حال کے پیش نظر برطانیہ اور دولت مشترکہ کے دوسرے ممالک سے مداخلت کی درخواست کی مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا کیونکہ حکومت ہندوستان بین المملکتی تنازعہ کے تصفیے کے لیے ہر قسم کی بیرونی مداخلت کے خلاف تھی۔ اسے پاکستان کی یہ تجویز بھی منظور نہیں تھی کہ مہاجروں کے کیمپوں کی نگرانی کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے مبصروں کا تقرر کیا جائے۔ 25/اکتوبر کو پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے رائٹر سے ایک انٹرویو کے دوران ہندوستانی ذرائع سے اس پراپیگنڈے کی پرزور مذمت کی کہ پاکستان محض مسلم لیگ کے پاگل پن کی وجہ سے وجود میں آیا ہے یہ بہت جلد پھر ہندوستان میں شامل ہو جائے گا اور یہ کہ پنجاب میں دوقومی نظریہ کی وجہ سے خون خرابہ ہو رہا ہے۔ قائداعظم نے کہا کہ'' پاکستان کسی صورت میں بھی ہندوستان کے ساتھ کسی قسم کی آئینی یونین پر آمادہ نہیں ہوگا۔ وہ دونوں خود مختار ملکوں کے ایک مشترکہ مرکز کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ پنجاب میں جو کچھ ہوا ہے وہ دوقومی نظریے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بڑے منظم طریقے سے کیا گیا ہے۔ اس بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔''[4] پھر قائداعظم نے 30/اکتوبر کو ایک نشری تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ 29/اگست کو اقلیتوں کے تحفظ کے لیے جو بین المملکتی فیصلہ ہوا تھا اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ چونکہ پاکستان میں ریڈکلف کے غیر منصفانہ ایوارڈ پر بہت غم وغصہ پایا جاتا تھا، مشرقی پنجاب سے لاکھوں خانماں برباد مہاجرین پاکستان میں داخل ہو رہے تھے اور خود پاکستان میں بھی ہندوؤں اور سکھوں پر حملوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا، اس لیے انہوں نے پاکستانی عوام سے اپیل کی کہ وہ صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں، اقلیتوں کے خلاف انتقامی کاروائی نہ کریں، بلکہ ان کے تحفظ کو ایک مقدس فریضہ تصور کریں اور ریڈکلف ایوارڈ کو من وعن تسلیم کر لیں۔ انہوں نے کہا'' ہندوستان کی تقسیم اب قطعی اور ناقابل تنسیخ ہے۔ بلاشبہ اس عظیم آزاد مسلم مملکت کی تشکیل میں ہمیں سخت ناانصافیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جہاں تک ممکن تھا ہمیں سکیڑ دیا گیا ہے اور جو آخری ضرب ہمیں لگائی گئی ہے وہ سرحدی کمیشن کا ثالثی فیصلہ ہے۔ یہ ثالثی فیصلہ نامنصفانہ، ناقابل فہم بلکہ کج رائے ہے۔ یہ غلط سہی کج رائے سہی، عدالتی

نہیں بلکہ سیاسی سہی لیکن ہم نے اسے قبول کرنے کا عہد کر رکھا ہے اور ہم اس کے پابند ہیں۔ باعزت قوم کی طرح ہمیں لازماً اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہو تو ہو لیکن اس ایک ضرب کو بھی ہمیں استقامت، ہمت اور امید کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔"[5] لیکن قائداعظم کی اس اپیل کے دو چار دن بعد نومبر کے اوائل میں انبالہ کے تقریباً پانچ ہزار مہاجرین کی ایک اسپیشل گاڑی گوجرہ ضلع لائل پور میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان میں 85 فیصد پیچش میں مبتلا تھے۔ تقریباً دو ہزار کی حالت نازک تھی جب کہ تقریباً ایک سو راستے میں ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ چنانچہ شبہ کی بنا پر انبالہ کے مہاجر کیمپ کے آٹے کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا اور پتہ چلا کہ اس میں گندھک کی ملاوٹ تھی۔ لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے بھی پتہ چلا کہ مہاجرین کو آٹے کے ساتھ گندھک کا زہر دیا گیا تھا۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے ہندوستان سے رسمی طور پر سخت احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ اس الزام کی مشترکہ طور پر تحقیقات کرائی جائے۔ مگر حسب توقع یہ احتجاج بے سود ثابت ہوا۔ 11/نومبر کو دہلی سے لاہور آنے والی مہاجرین کی ایک اسپیشل گاڑی پر ہندوستانی فوج کی کمپنی نے حملہ کیا۔ حملہ آوروں نے بہت سے مہاجرین کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور نوجوان لڑکیوں کی برسر عام آبروریزی کی۔ حکومت پاکستان نے 6/دسمبر کو اس واقعہ کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت ہندوستان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ یہ واردات کسی بے قابو ہجوم نے نہیں کی تھی بلکہ اس وحشت و بربریت کا مظاہرہ ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے سپاہیوں نے کیا تھا مگر احتجاج کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یہ عین ممکن ہے کہ مہاجرین کے آٹے میں وسیع پیمانے پر گندھک کا زہر ملانے کا الزام سو فیصد صحیح نہیں تھا اور اگر صحیح تھا تو یہ شیطانی کارروائی ہندوستان کے اعلیٰ ارباب اقتدار کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کی گئی تھی۔ لیکن پاکستانی مسلمانوں کو صحیح یا غلط طور پر یہ یقین تھا کہ حکومت ہندوستان نے یہ سب کچھ مسلمانوں کی نسل کشی کے لیے اور پاکستان کی دشمنی کے تحت کیا تھا اور ان کے اس صحیح یا غلط یقین کی بنا پر دونوں ملکوں کے درمیان تلخی اور تضاد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

تاہم دونوں ملکوں کے درمیان ہمہ گیر جنگ کا خطرہ کسی نہ کسی طرح وقتی طور پر ٹل گیا اور دونوں پنجابوں کے درمیان آبادی کا تبادلہ بھی دسمبر میں مکمل ہو گیا۔ اس دوران کتنے لوگ مارے گئے اس کا جواب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اندازہ دو لاکھ سے دس لاکھ تک تھا۔ لیکن یہ محض اندازہ ہی تھا۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد نہ کسی کو معلوم ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ کون جان سکتا تھا کہ مشرقی اور

مغربی پنجاب کے دور دراز دیہات میں کتنے معصوم لوگ تہ تیغ ہوئے تھے۔ بے شمار لاشیں کھلے میدانوں میں بڑی دیر تک گلتی سڑتی رہیں اور لیونارڈ موسلے کے بیان کے مطابق بے شمار گدھ انسانی لاشوں پر کئی ہفتے جشن مناتے رہے۔ جہاں تک مہاجرین اور شرنارتھیوں کی تعداد کا تعلق تھا اس کے بارے میں بھی کسی کو صحیح اعداد وشمار نہ معلوم ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ حکومت پاکستان کے 10 دسمبر کے اعلان کے مطابق گذشتہ چار مہینوں میں 90لاکھ کی آبادی کا جبری تبادلہ ہوا تھا۔ 55 لاکھ مسلمان مہاجرین نے پاکستان میں پناہ لی تھی اور 35لاکھ غیر مسلم شرنارتھی ہندوستان گئے تھے۔ لیکن 20 دسمبر کو حکومت ہندوستان نے جو اعداد وشمار شائع کیے ان کے مطابق 15 دسمبر تک کل تقریباً85لاکھ افراد نے ہندوستان اور پاکستان کی بین المملکتی سرحدوں کو عبور کیا تھا۔ تقریباً43لاکھ غیر مسلموں نے پاکستان کو خیر باد کہا اور تقریباً41لاکھ مسلمانوں نے ہندوستان سے ہجرت کی تھی۔

بلاشبہ پنجاب میں وحشیانہ کشت وخون اور جبری تبادلۂ آبادی کے دوران مسلمانوں کا مقابلتاً بہت زیادہ جانی اتلاف ہوا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کا سیکورٹی کونسل کے روبرو الزام یہ تھا کہ ''مشرقی پنجاب میں یکم اگست سے لے کر 21 دسمبر تک تقریباً5لاکھ مسلمان شہید کئے گئے۔'' اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ سکھ زیادہ وحشی یا بہادر تھے اور مسلمان زیادہ مہذب یا بزدل تھے۔ نہیں یہ بات ہرگز نہیں تھی۔ سکھوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کے دوران بہادری کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے حملے نہایت بزدلانہ ہوتے تھے۔ وہ نہتے اور بے خبر مسلمانوں کے دیہات پر عموماً رات کو حملے کرتے تھے اور ان کی قیادت سکھ ریاستوں کے باقاعدہ فوجی دستوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ وہ اپنے حملے میں دستی بم، آتش گیر اور خودکار ہتھیار استعمال کرتے تھے جبکہ مسلمانوں کے پاس لاٹھیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مسلمان دراصل بے خبری میں مارے گئے تھے۔ شرومنی اکالی دل کی قیادت نے سکھ ریاستوں کے حکمرانوں سے ساز باز کر کے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی جبری بے دخلی کا منصوبہ بڑی دیر سے بنایا ہوا تھا اور اس حقیقت کا وائسرائے ہاؤس اور متحدہ پنجاب کے گورنر ہاؤس میں ہر ایک کو پتہ تھا۔ مسلم لیگ کی قیادت نے بار بار مطالبہ کیا تھا کہ سکھ لیڈروں کے خلاف مناسب اقدام کیا جائے مگر ماؤنٹ بیٹن اور اس کے عملے نے سکھ لیڈروں اور سکھ ریاستوں کے حکمرانوں کو زبانی طور پر متنبہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سردار پٹیل سکھوں کے اس خوفناک

منصوبے میں ملوث تھا، ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق ''اس کا دامن بے گناہ مسلمانوں کے خون سے بری طرح آلودہ تھا۔'' اس کا خیال تھا کہ نوزائیدہ پاکستان سکھوں کے حملے کی تاب نہیں لاسکے گا۔ چنانچہ اس دوران ہندوستان میں اس مضمون کا وسیع پیمانے پر پراپیگنڈا ہوتا رہا کہ پاکستان ختم ہوا کہ ہوا۔ صبح گیا یا شام گیا۔

سکھ لیڈروں کا نقطۂ نگاہ یہ تھا پاکستان ختم نہ ہوا تو بھی فرقۂ سکھاں فائدے میں رہے گا۔ پنجاب میں سکھوں کی کل آبادی 40 لاکھ سے کسی صورت زیادہ نہیں تھی۔ ان کا یہ خدشہ سراسر بے بنیاد نہیں تھا کہ اگر یہ چھوٹی سی آبادی دوملکوں میں تقسیم ہوگئی تو سکھوں کی سیاسی اہمیت بالکل ختم ہوجائے گی اور وہ آزاد خودمختار خالصتان کا جوخواب دیکھ رہے تھے اس کی کبھی تعبیر نہیں ہوگی۔ تقسیم ہند کے بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں تھا اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ انہوں نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام اوران کی جبری بیدخلی کا جومنصوبہ بنایا تھا وہ ان کے نقطۂ نگاہ سے صحیح تھا۔ اگر سکھ دونوں ملکوں میں تقسیم ہوجاتے تو ہندوستان میں اپنے لیے الگ پنجاب صوبہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سیاسی مستقبل کا تقاضا یہ تھا کہ ان کا مختصر سا فرقہ دوملکوں میں منتشر نہ رہے بلکہ ایک جگہ جمع ہوجائے۔ ان کے درمیان معاندانہ تاریخی تضاد کا بھی یہی تقاضا تھا۔

بایں ہمہ سکھوں میں ایسے شریف النفس انسان موجود تھے جنہوں نے نہایت نامساعد حالات میں مظلوم مسلمانوں کو نہ صرف اپنے ہاں پناہ دی بلکہ انہیں محفوظ مقامات تک پہنچایا۔ کئی سکھوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر مسلمانوں کی حفاظت کی۔ بہت سوں نے بعد میں ہزاروں مسلمان مغویہ عورتوں کی برآمدگی کے سلسلے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ بعض دوسرے سکھوں نے اپنی نیکی وشرافت کا نہایت اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ انہوں نے مظلوم مغویہ مسلمان لڑکیوں کوخریدا، انہیں اپنے گھروں میں بیٹیوں کی طرح رکھا اور پھر وہ انہیں ان کے والدین کے پاس چھوڑنے کے لیے لاہور تک آئے۔ ان شریف النفس سکھوں کا ان ''مذہبی'' سکھوں سے کوئی تعلق نہیں تھا جو گورونانک کی عالمگیر صلح پسندی کے علم بردار ہونے کے باوجود وحشت وبربریت کا مجسمہ تھے البتہ ان میں سے کئی ایک کا کمیونسٹ پارٹی سے گہرا تعلق تھا۔

لاکھوں مسلمانوں کے مؤثر مزاحمت کے بغیر بھیڑ بکریوں کی طرح قتل ہوجانے کی ایک بڑی وجہ پنجاب مسلم لیگ کی جاگیردارانہ قیادت کی مجرمانہ غفلت، نااہلی، سنگدلی اور خودغرضی میں

پنہاں تھی۔ 1947ء میں مسلم لیگ معروف طرز کی کوئی بورژوا سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ یہ مسلمانوں کے درمیانہ طبقے کی ایک ایسی سیاسی تحریک تھی جسے بوجوہ مسلمان مزدوروں اور غریب کسانوں کی بھی تائید وحمایت حاصل ہوگئی تھی اور پنجاب کے بعض موقع پرست جاگیرداروں نے علامہ اقبال اور ملک برکت علی کی جگہ اس کی قیادت پر قبضہ کرلیا تھا۔ چونکہ تاریخی وجوہ کی بنا پر پنجاب کے مسلم درمیانہ طبقے کے سیاسی شعور کا معیار بہت پست تھا اس لیے اسے اس وقت یہ احساس نہ ہوا کہ یہ جاگیردار طبقہ اسے کہاں لے جائے گا۔ ویسے بھی مسلمانوں کے بعض سرکردہ اخبارنویس اور نامور دانشور اپنی مفاد پرستی کی بنا پر جاگیرداروں کی حاشیہ برداری میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان جاگیرداروں نے مسلم لیگ کو سائنسی بنیادوں پر منظم نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے ازخود ہی اپنے اپنے علاقوں میں اس کی بری بھلی تنظیمیں قائم کر لی تھیں۔ ان تنظیموں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا رابطہ نہیں تھا اور ان کے پاس ہمہ وقتی سیاسی کارکن نہیں تھے۔ لہٰذا یہ کوئی بھی بڑا کام منظم طریقے سے نہیں کرسکتی تھیں۔ پنجاب مسلم لیگ کے جاگیردار لیڈروں کو سکھوں کے شیطانی منصوبے کا پہلے سے علم تھا۔ لیکن یہ صرف بڑھکیں مارتے رہے۔ انہوں نے اس منصوبے کی مؤثر مزاحمت کے لیے نہ تو مشرقی پنجاب کے دیہات میں رہنے والے مسلمان عوام کو بروقت خبردار کیا اور نہ ہی انہیں منظم کیا تھا۔ مسلم لیگ کے برعکس اکالی پارٹی کی قیادت سکھوں کے درمیانہ طبقہ کے ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کے پاس گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے بے شمار تنخواہ دار کارکن تھے۔ انہوں نے کئی مہینے تک گشتی مراسلوں اور پمفلٹوں کے ذریعے انتہائی اشتعال انگیز پراپیگنڈا کیا تھا، سکھ ریاستوں سے ہر قسم کا اسلحہ حاصل کیا تھا اور 9 راگست کے بعد ریاستی سکھ فوجیوں کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ انہوں نے علاقہ بہ علاقہ سائنسی طریقوں سے مسلمانوں کے دیہات پر حملے کئے تھے۔

مسلم لیگی لیڈروں نے ان کے سدباب کے لیے نہ تو سیاسی سطح پر اور نہ ہی جماعتی سطح پر کوئی مؤثر کاروائی کی تھی البتہ انہوں نے 22 راگست کے بعد مغربی پنجاب میں پولیس کے ذریعے بے گناہ ہندوؤں اور سکھوں کو مروانے کی مکروہ انتقامی کاروائی ضرور کی تھی۔ لیکن مغربی پنجاب کے بہت سے شریف النفس مسلمان اس انتقامی کاروائی کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے ہندو اور سکھ ہمسایوں کو اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر پناہیں دیں۔ وہ مغویہ غیر مسلم عورتوں کی برآمدگی

میں بھی بہت مدد ومعاون ثابت ہوئے۔ بعد میں انہی لوگوں کی نیکی، شرافت اور دیانت پاکستان کے استحکام کا باعث بنی جبکہ مسلم لیگ کے متعدد قائدین، ان کے بہت سے کارندے اور خویش و اقارب اور کئی سرکاری افسر غیر مسلموں کی منقولہ وغیر منقولہ جائیدادیں لوٹنے میں مصروف تھے اور سرحدی فوج کا پاکستانی مشیر بریگیڈئر ایوب خان جو بعد میں پاکستان کا آمر مطلق بنا، ایک فرعون مزاج انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خان کے ڈرائنگ روم کے جھولے میں لیٹ کر وہسکی پیتا رہتا تھا۔ جب مشرقی پنجاب کے محصور مسلمانوں کے رشتے دار آہ وزاری کرتے ہوئے اس کے پاس جاتے تھے تو یہ ان کو دھتکارتا تھا اور کہتا تھا کہ جاؤ! پاکستان بنایا ہے تو اس کے لیے قربانی دو۔ میں تمہاری کوئی امداد نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس مظلومین کے لیے ہمدردی کے لیے دو بول بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس کے برعکس پاکستانی فوج کے چھوٹے افسروں اور جوانوں نے خانماں برباد مہاجرین کی ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے بہت تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود نہ صرف مہاجرین کے لمبے لمبے قافلوں کی حفاظت کی بلکہ انہیں جس طرح بھی ممکن ہوسکا کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کیا۔ وہ مہاجرین کے کیمپوں اور قافلوں پر حملہ کرنے والے مسلح سکھوں اور ہندوؤں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے تھے۔ بالخصوص بلوچ رجمنٹ نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ محصور مہاجرین ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور رو رو کر التجائیں کرتے کہ ہماری حفاظت کے لیے بلوچ رجمنٹ کو بھیجو۔ اس رجمنٹ کے جوان جس جگہ پہنچ جاتے تھے وہاں فوراً امن وامان ہو جاتا تھا۔ مہاجر عورتیں دوپٹے اٹھا اٹھا کر انہیں دعائیں دیتی تھیں۔ آج بھی اگر کسی عمر رسیدہ پنجاب مہاجر سے بلوچ رجمنٹ کا ذکر کیا جائے تو اس کی آنکھوں سے شکر گزاری کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور وہ ان مسلم لیگی لیڈروں پر لعنت بھیجتا ہے جو ان دنوں مہاجرین کی حالت زار سے بے پرواہ ہو کر لوٹ کھسوٹ اور اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھے۔

ایس۔ ایم۔ اکرام جیسے پاکستانی مؤرخین دو ایک ہندو کمیونسٹوں کی تحریروں کے حوالے سے یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ پنجاب میں اتنے وسیع پیمانے پر کشت وخون کی ذمہ داری صوبے کے انگریز گورنر اور بعض انگریز ڈپٹی کمشنروں پر عائد ہوتی تھی۔[6] یہ الزام کلی طور پر صحیح نہیں۔ اس لیے اس کی نوعیت ایسی ہی ہے جیسی کہ کانگرس کی بورژوا قیادت کے اس الزام کی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تنازعہ کی ذمہ داری برطانوی سامراج پر عائد ہوتی ہے۔ یہ

صحیح ہے کہ صوبہ کے بدطینت انگریز گورنراور بعض انگریز ڈپٹی کمشنروں کا فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں رویہ نہایت سنگدلانہ تھا۔ جب کبھی مظلوم مسلم عوام ان کے پاس فریاد لے کر جاتے تھےتو وہ کہتے تھے کہ پاکستان کے مطالبے کا یہی نتیجہ ہوگا۔ جاؤ جناح سے کہوتمہاری امداد کرے، اور جب مظلوم غیر مسلم عوام ان سے امداد طلب کرتے تھےتو یہ انہیں نہرواور پٹیل کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں زہر بھرا ہوتا تھااور ان کا لب ولہجہ طنز آمیز ہوتا تھا۔ یہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کوآزادی کا سبق سکھانا چاہتے تھےاور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ برصغیر کےعوام آزادی کے مستحق نہیں ہیں۔ انہیں برطانوی سامراج کے زوال پر سخت صدمہ تھا۔ یہ جب اپنی شہنشاہی کوختم ہوتا دیکھتے تھےتو ان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ پورے برصغیر کوآگ لگ جائے۔لیکن ان سب باتوں کے باوجود پنجاب کےفسادات کی ذمہ داری صرف انہی پر عائدنہیں ہوتی۔ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان تضاد کی تاریخ تین ساڑھے تین سوسال پرانی تھی۔ برصغیر کی تقسیم جن تلخ حالات میں ہورہی تھی ان میں ان دونوں کے تضاد کے لاوے کا پھوٹنا ناگزیر تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ کانگرس کی بورژوا قیادت بھی ان کے تضاد سے فائدہ اٹھانے کے درپے تھی۔ پنجاب میں اتنے وسیع پیمانے پرخونریزی کی بنیاد دراصل پہلے 1946ء کے اوائل میں کانگرس، اکالی، یونینسٹ گٹھ جوڑ کے موقع پر رکھی گئی تھی اور پھر یہ 8/مارچ 1947ءکو استوار ہوئی جبکہ کانگرس نے پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ انگریز گورنر اور دوسرے انگریز افسروں کا گناہ یہ تھا کہ ان بدبختوں کو بہت پہلے اچھی طرح معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہےلیکن انہوں نے کوئی احتیاطی اقدام کرنے سے دانستہ طور پر گریز کیا۔ اگر یہ بروقت مطلوبہ کاروائی کرتے تو شاید خون خرابہ اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوتا۔ یہ برصغیر کی آزادی کے موقع پر پنجاب میں خونی ڈرامہ دیکھنا چاہتے تھےاور انہوں نے جی بھر کر دیکھا۔

چوہدری محمد علی جیسے پاکستانی مؤرخین الزام عائد کرتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرسی لیڈروں نے اقتدار کی منتقلی جون 1948ء کی مقررہ تاریخ سے بہت پہلے کرنے کی جو سازش کی تھی، پنجاب کےفسادات اس کی پیداوار تھے۔[7] یہ الزام بھی سوفیصد صحیح نہیں ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اقتدار کی منتقلی یکم جون 1948ء کی بجائے 15/اگست 1947ءکو کرنے کا فیصلہ صرف ماؤنٹ بیٹن نےنہیں کیا تھا اور نہ ہی اس فیصلے کی ساری بنیاد کانگرسی لیڈروں کی خواہش پر تھی۔

برطانوی سامراج کی یہاں سے اتنی عجلت کے ساتھ روانگی کے اسباب کا ''پاکستان کیسے بنا؟'' میں مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔ برصغیر کی حالت اتنی زیادہ خطرناک ہو گئی تھی کہ ان کے لیے یہاں سے فوراً بھاگنا ہی مناسب تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ مزید کچھ عرصہ یہاں رہتے اور تقسیم کا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی کوشش کرتے تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ اس وقت تک ہندوستانی افواج فرقہ وارانہ کشیدگی سے بالاتر رہتیں۔ جیسا کہ لارڈ اسمے نے ہوڈسن کو بتایا تھا۔ 1947ء میں ہندوستانی افواج کا فرقہ وارانہ خانہ جنگی میں ملوث ہونے کا ہر لمحہ خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اگر تقسیم سے پہلے افواج میں فرقہ وارانہ تضاد کا لاوا پھوٹ پڑتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔ اس صورت میں نہ صرف پورا پنجاب مکمل طور پر تباہ و برباد ہو جاتا بلکہ پورا برصغیر خانہ جنگی کی آگ میں بھسم ہو جاتا۔ برطانوی سامراج کا مفاد اس میں تھا کہ ''اعتدال پسند'' قیادت کو بلا تاخیر اقتدار منتقل کر کے یہاں سے بھاگ جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے 15 راگست 1947ء سے پہلے از خود کوئی کام نہیں کیا تھا اس نے اپنی ہر کارروائی کے لیے پہلے حکومت برطانیہ کی منظوری حاصل کی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سکھ لیڈروں کو گرفتار نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے لیے بھی لندن سے منظوری حاصل کی تھی۔ اس کا ثبوت جولائی 1948ء میں ملا جبکہ پاکستان کے وزیر خزانہ نے ماؤنٹ بیٹن کو پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام کا کلی طور پر ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ وزیر خزانہ نے کہا تھا کہ ''ماؤنٹ بیٹن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سکھوں نے مسلمانوں کی نسل کشی کر کے پاکستان کا گلا گھونٹنے کی گہری سازش کر رکھی تھی لیکن اس نے اسے روکنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔'' حکومت برطانیہ کے دفتر کامن ویلتھ ریلیشنز کی طرف سے غلام محمد کے اس الزام کی فوراً تردید کی گئی تھی اور یہ وضاحت کی گئی تھی کہ ''ماؤنٹ بیٹن نے سکھ لیڈروں کے خلاف کارروائی نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اسے حکومت برطانیہ کی تائید حاصل تھی اور گورنر پنجاب نے بھی اس کی تائید کی تھی۔''[8] ہوڈسن کا بیان تو یہ ہے کہ سر فرانسس موڈی بھی جسے مسلم لیگ نے تقسیم ہند کے بعد مغربی پنجاب کا گورنر مقرر کیا تھا سکھ لیڈروں کو گرفتار نہ کرنے کے فیصلے کے حق میں تھا۔ جب مسلم لیگ کی جانب سے 15 راگست کو سکھ لیڈروں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا تھا تو گورنر جینکنز نے سر فرانسس موڈی سے مشورہ کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو یہ رائے دی تھی کہ ان کی گرفتاری مناسب نہیں ہوگی۔''[9]

حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے اس عظیم قتل عام کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ اس کے پس پردہ

وہ سارے عوامل کارفرما تھے جن کے باعث برصغیر تقسیم ہوا تھا۔ کانگرس کی بورژوا قیادت بڑی ہی کوتاہ اندیش تھی۔ انہوں نے ہندو مسلم تضاد کو سائنسی اور حقیقت پسندانہ طریقے سے حل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کی سنگینی کا کبھی احساس نہیں کیا تھا۔ پینڈرل مون کے بقول 1937ء کے بعد "مسلمانوں کے جذبات میں جو بنیادی تبدیلی آئی اس کے ذمہ دار غیر شعوری طور پر کانگرسی لیڈر تھے۔ اگر 1937ء اور 1947ء کے درمیانی عرصے پر نگاہ ڈالیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کانگرسی لیڈروں پر خدا کی پھٹکار پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اکثر و بیشتر ایسے اقدامات کرتے تھے کہ نتائج ان کی خواہش کے بالکل برعکس نکلتے تھے۔ وہ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی زبردست خواہش رکھتے تھے لیکن انہوں نے اس کے ساتھ ہی مسلسل ایسے کام کئے کہ تقسیم یقینی ہو گئی۔"[10] جب انہیں مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان بہ امر مجبوری تسلیم کرنا پڑا تو انہوں نے برطانوی سامراج کے ساتھ ساز باز کر کے برصغیر کی تقسیم کچھ اس طرح سے کروائی کہ پنجاب میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ انہوں نے شرومنی اکالی دل کے لیڈروں اور سکھ ریاستوں کے حکمرانوں کو محض اس خیال سے اکسایا تھا کہ نوزائیدہ پاکستان ان کے حملے کی تاب نہیں لا سکے گا۔ لندن ٹائمز کی 5رجون 1947ء کی رپورٹ یہ تھی کہ "کانگرس برصغیر کی تقسیم کے منصوبے پر اس امید میں عمل کریگی کہ ہندوستان کی یکجہتی وسالمیت بالآخر بحال ہو جائے گی۔" اخبار کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "کانگرس ابھی تک غیر منقسم ہندوستان پر اپنا عقیدہ رکھتی ہے اور وہ اس نصب العین کی تکمیل کے لیے کوشش کرتی رہے گی...... گاندھی کو پورا یقین ہے کہ ہندوستان کے دونوں حصے بالآخر پھر متحد ہو جائیں گے" اور نیویارک ہیرلڈ ٹربیون نے اسی دن گاندھی سے یہ بیان منسوب کیا تھا کہ "مسلم لیگ پھر ہندوستان میں شامل ہونے کی درخوست کرے گی۔ وہ جواہر لال نہرو سے واپسی کی درخواست کریں گے اور وہ انہیں واپس لے لیگا۔"[11]

سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی اور متعدد دوسرے کانگرسی زعماء بھی کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ مسلمان اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور گھٹنوں کے بل واپس ہندوستان میں آئیں گے۔ انتہا پسند ہندوؤں کی جماعت ہندو مہاسبھا کی 8 رجون کی قرارداد یہ تھی کہ "کانگرس نے ریفرنڈم کے بغیر ہندوستان کی تقسیم پر جو رضامندی ظاہر کی ہے ہندو عوام اس کے پابند نہیں ہوں گے۔ ہندوستان

ایک ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جو علاقے ہم سے الگ ہو رہے ہیں جب تک وہ واپس ہندوستان میں نہیں آئیں گے اس وقت تک کبھی امن قائم نہیں ہو گا۔"[12] دہلی کے روزنامہ "سٹیٹس مین" کی 17 /جون کی رپورٹ کے مطابق جواہر لال نہرو نے برصغیر کی تقسیم پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندوستان کا دل ٹوٹ گیا ہے لیکن اس کا اصل اتحاد تباہ نہیں ہوا...... اب ہمیں سوچنا یہ ہے کہ اس ٹوٹے ہوئے دل کو کیسے جوڑا جائے۔[13] نہرو کا سوانح نگار مائیکل بریچر لکھتا ہے کہ "نہرو سمیت کانگرس کے بیشتر لیڈروں کا خیال تھا کہ پاکستان سیاسی، معاشی، جغرافیائی اور فوجی لحاظ سے قائم نہیں رہ سکتا اور جو علاقے الگ ہوئے ہیں وہ زود یا بدیر حالات سے مجبور ہو کر پھر ہندوستان میں شامل ہو جائیں گے۔"[14] سردار پٹیل کا 12 /اگست کو بیان یہ تھا کہ "اگرچہ آج ہندوستان کی تقسیم ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ تقسیم سے ہندوستان کے جسد سیاست سے زہر نکل جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو علاقے ہم سے الگ ہوئے ہیں وہ ہندوستان کے ساتھ متحد ہونے کے خواہاں ہوں گے۔ سمندر کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی بہتے پانی کے ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں۔"[15] جب 14 /اگست کو پاکستان میں اقتدار کی منتقلی ہوئی تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر اچاریہ کرپلانی نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "یہ دن ہندوستان کے لیے رنج والم اور تباہی کا دن ہے۔"[16] جب 15 /اگست کو ہندوستان میں اقتدار منتقل ہوا تو اچاریہ کرپلانی نے کہا تھا کہ "اب ہمیں اپنی ساری توانائیاں اپنی سرزمین کو دوبارہ متحد کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں۔"[17] 18 /اگست کو اچاریہ کرپلانی نے کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا سے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "نہ تو کانگرس اور نہ ہی قوم متحدہ ہندوستان کے دعوے سے دستبردار ہوئی ہے۔"[18]

لیکن یہ سب دشمنان پاکستان برصغیر کے سیاسی حقائق سے بالکل بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کے محرک تھے وہی اس کے استحکام کا موجب بنیں گے۔ پنجاب کے قتل عام سے پاکستان تو ختم نہ ہوا البتہ دونوں ملکوں کے درمیان قومی تضاد کی ایک ایسی خونی خلیج حائل ہوگئی جو معلوم نہیں کون کب اور کیسے عبور کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے ذرائع ابلاغ گاہے گاہے پنجاب کے مسلمان صوفی شعراء کی کافیاں گا گا کر واہگہ کی لکیر مٹانے کا جو پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں وہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو گا۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کے جدائی کے گیت گانے اور طرح طرح سے پنجابی شونزم کی

حوصلہ افزائی کرنے سے دوقومی نظریے اور واہگہ کی لکیر کونہیں مٹایا جا سکتا۔ کوئی تضاد مکارانہ طریقے سے حل نہیں ہوسکتا۔ ہر تضاد کے پائیدارحل کے لیے انصاف اور حقائق کی روشنی میں سائنسی طریقے سے مخلصانہ کوشش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان کے بعض بھارت نواز عناصر یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس ملک کے جاگیرداراورسرمایہ دارحکمران کس طرح اور کیوں قومی تضاد سے فائدہ اٹھا کر پنجاب کے عوام کا سیاسی استحصال کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ عناصر دراصل خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان معاندانہ قومی تضاد کی حقیقت کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا جس کی بنیاد 1947ء میں مشرقی پنجاب کے لاکھوں مسلمانوں کے خون سے استوار ہوئی تھی۔

یہ نام نہاد دانشور جب اپنے افسانوں، صحافتی مضامین، نظموں اورغزلوں میں پنجاب میں 1947ء کے قتل عام کا بظاہر بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تو یہ حق اور باطل کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتے اور اپنے ''جذبۂ انسان دوستی'' کے تحت یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عظیم المیہ محض پاکستان کے قیام کی وجہ سے رونما ہوا تھا۔ انہیں یہ تاریخی حقیقت نظر نہیں آتی کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا منظم قتل عام اکالی دل، راشٹریہ سیوک سنگھ اور سکھ ریاستوں کے حکمرانوں کے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا تھا اور جبری تبادلہ آبادی بھی گیانی کرتار سنگھ اور دوسرے سکھ لیڈروں کے اصرار پر ہوا تھا۔ انہوں نے یہ منصوبہ 15 راگست سے کئی ماہ پہلے قابل فہم سیاسی وجوہ کی بنا پر بنایا تھا اور انہیں کانگرس کے طاقتور پٹیل گروپ کی بھرپور تائیدوحمایت حاصل تھی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ نے مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے منظم قتل عام کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا تھا۔ اس قسم کا شیطانی منصوبہ جناح کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ پاکستان میں بے گناہ غیر مسلموں کی نسل کشی کی جائے گی یا انہیں جبراً ملک بدر کر دیا جائے گا۔ جناح کے غیر فرقہ وارانہ سیاسی اندازفکر کا اندازہ اسی حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان سے الگ ایک آزاد خودمختار متحدہ بنگال کی تجویز پر بلا تامل رضامند ہو گئے تھے لیکن گاندھی نے محض فرقہ وارانہ جذبہ کے تحت اس تجویز کو سبوتاژ کر دیا تھا کیونکہ وہ متحدہ بنگال میں 45 فیصد ہندو اقلیت کے لیے غیر معمولی تحفظات کا مطالبہ کرتا تھا۔ جناح پنجاب کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کے بھی سخت خلاف تھے۔ جب کبھی ماؤنٹ بیٹن اس سلسلے میں ان سے کانگرس کے مطالبے کا ذکر کرتا تھا تو وہ

پریشان ہوجاتے تھے۔انھوں نے 13 رجولائی کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس کومحض یہ یقین دہانی کرانے کے لیے خطاب کیا تھا کہ پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی اور اس میں غیر مسلم اقلیتوں کے مذہب، عقیدے، جان و مال اور ثقافت کا تحفظ ہوگا۔ وہ ہر لحاظ سے پاکستان کے شہری ہوں گے اور ان سے کسی طرح کا بھی کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا البتہ انہیں بلاشبہ پاکستانی شہریت کی ذمہ داریاں بھی ادا کرنا ہوں گی۔ اقلیتوں کو ریاست کا حقیقی وفادار ہونا پڑیگا۔'' اس پریس کانفرنس میں جب جناح سے یہ پوچھا گیا تھا کہ پاکستان کی ریاست ''سیکولر'' ہوگی یا تھیوکریٹک'' تو ان کا جواب یہ تھا کہ یہ سوال احمقانہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ''تھیوکریٹک'' ریاست کا کیا مطلب ہے؟ اس پر جب ایک نامہ نگار نے کہا کہ ''تھیوکریٹک'' ریاست کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں مسلمان پورے شہری ہوں گے اور غیر مسلم پورے شہری نہیں ہوں گے تو جناح نے کہا تھا کہ '' تو پھر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ سب رائیگاں گیا ہے۔ خدا کے لیے اس قسم کے بیہودہ خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔''[19] پھر قائداعظم جناح نے 11 راگست کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں جو پہلی پالیسی تقریر کی تھی وہ پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں اقلیتوں کو مکمل شہری حقوق حاصل ہوں گے اور اس ملک میں سیاست کا مذہب، رنگ و نسل اور ذات پات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔
لیکن ہمارے بعض پاکستانی ''محبان انسانیت'' یا تو ان تاریخی حقائق سے ناواقف ہیں یا ان کے فکر کی پرواز اتنی ''اونچی'' ہے کہ وہ انہیں درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ ان میں سے بعض افراد سامراجی پادریوں کی طرح وطنیت اور طبقات سے بالاتر اخوت ومحبت کا منافقانہ پرچار کرتے ہیں اور بعض دوسرے افراد طبقاتی تضاد کو ہمہ وقت اور ہر حالت میں ہر قسم کے قومی تضاد سے بالاتر قرار دیکر واہگہ کی لکیر کو عملی طور پر مٹانے کے حق میں ہیں۔ لیکن یہ افراد یہ نہیں بتاتے کہ اگر آج کل کی دنیا میں طبقاتی تضاد ہمہ وقت ہر قسم کے قومی تضاد سے بالاتر ہے تو پھر مشرقی یورپ اتنی قومی ریاستوں میں منقسم کیوں ہے؟ روس اور چین کے درمیان تضاد کی بنیاد کیا ہے؟ اور ہند چینی کے تین حصے کیوں ہوئے ہیں حالانکہ فرانسیسی سامراج کے تحت یہ علاقہ انتظامی وسیاسی لحاظ سے ایک ہی ملک تھا؟ ان کی سمجھ میں یہ باتیں اس لیے نہیں آتیں کہ وہ یہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ دراصل شعوری یا غیر شعوری طور پر وطن عزیز کے خلاف ناپاک مقاصد کے حامل ہیں۔ یہ پاکستان میں ہندوستان کی توسیع

پسندیت کے لیے راستے ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کا یہ ناپاک مقصد پاکستانی عوام کے بنیادی مفادات کے منافی ہے اس لیے اس کی تکمیل نہ ہوئی ہے اور نہ کبھی ہو سکے گی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس ملک کا عوام دشمن جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ ابھی تک سیاسی میدان میں دندنا رہا ہے اور رجعت پسند ملائیت ابھی تک عوام کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ ابھی تک ایسے باشعور انقلابی عناصر کی نمود و تنظیم نہیں ہوئی جو قومی جدوجہد اور طبقاتی جدوجہد کو مربوط کر کے وطن عزیز کے مزدوروں، غریب کسانوں اور دوسرے مظلوم محب الوطن عوام کو صحیح معنوں میں ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کر سکیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کی نشوونما دسمبر 1947ء میں پنجاب کے قتل عام کے خاتمے کے بعد رک نہیں گئی تھی بلکہ اس میں بوجوہ اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس تضاد میں ایک نمایاں اضافہ جولائی 1948ء میں ہوا جبکہ حکومت ہندوستان نے مغربی پاکستان کے شہریوں کے ہندوستان میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ حکم یہ تھا کہ مغربی پاکستان کا کوئی شہری ہندوستانی ہائی کمشنر سے اجازت نامہ حاصل کئے بغیر ہندوستان میں داخل نہیں ہو سکتا اور اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پنجاب سے جو مسلمان مہاجرین مغربی پنجاب میں آئے ہوئے تھے ان میں متروکہ جائیدادوں کے متعلق دونوں حکومتوں کے بعض مشترکہ فیصلوں کے پیش نظر یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ ان کی ہجرت عارضی ہے اور وہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے۔ ان میں سے متعدد مہاجرین اپنی واپسی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے اپنے آبائی وطن کا دورہ بھی کر آئے تھے۔ لیکن ان کے برعکس مغربی پاکستان سے جو سکھ نقل مکانی کر کے مشرقی پنجاب میں گئے تھے ان کا اپنے گھروں کو واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ متروکہ جائیداوں کے بارے میں غیر یقینی صورت حال ان کی مستقل آبادکاری کے رستے میں حائل تھی لہٰذا مغربی پاکستان کے شہریوں کی آمدورفت پر پابندی عائد کرنا ضروری تھا۔ حکومت ہندوستان کی جانب سے یہ اقدام دراصل دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ سسٹم کے نفاذ کی ابتدا تھی۔ واہگہ کی لکیر عارضی نہیں تھی بلکہ یہ مستقل اور انمٹ تھی۔ یہ صندل کی لکیر نہیں تھی۔ یہ خونی لکیر تھی۔

حکومت ہندوستان کی جانب سے دوسرا معاندانہ اقدام اکتوبر 1949ء میں کیا گیا جبکہ دہلی سے پورے ہندوستان کی صوبائی حکومتوں کے نام یہ حکم جاری ہوا کہ مسلمانوں کی

جائیدادوں کومتروکہ قرار دینے کے لیے مناسب قوانین نافذ کئے جائیں۔اس حکم سے تقریباً نو ماہ پہلے یعنی جنوری 1949ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان یہ فیصلہ ہوا تھا کہ حکومت پاکستان پورے مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ جائیدادوں کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ہوگی اور حکومت ہندوستان مشرقی پنجاب، دہلی، ہماچل پردیش، پٹیالہ، کپورتھلہ، بھرت پور، الور، بیکانیر کی متروکہ زرعی جائیدادوں اور اجمیر مارواڑ، اتر پردیش کے چار شمالی اضلاع، راجستھان یونین اور اس علاقے کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی شہری غیر منقولہ متروکہ جائیداد کی دیکھ بھال کرے گی۔ یہ فیصلہ حکومت ہندوستان کے لیے اس حقیقت کی بنا پر غیر تسلی بخش تھا کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلموں نے جومنقولہ اورغیر منقولہ جائیدادیں چھوڑی تھیں ان کی مالیت مسلمانوں کی طے شدہ علاقوں میں متروکہ جائیدادوں کی مالیت سے زیادہ تھی لہٰذا بھیے نے اپنا گھاٹا پورا کرنے کے لیے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی ہر قسم کی جائیدادوں کو زبردستی متروکہ قرار دے کر ان پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا۔طریقہ یہ اپنایا گیا کہ پورے ہندوستان میں ہر صاحب جائیداد مسلمان کے بارے میں یہ تصور کرلیا جاتا تھا کہ یہ پاکستان جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور پھر اس تصور کی بنیاد پر اس کی جائیداد کومتروکہ قرار دے کر اس پر قبضہ کرلیا جاتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ہندوستان سے صاحب جائیداد مسلمانوں کی پاکستان کو ہوائی جہازوں کے ذریعے ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان جانے کا ارادہ رکھنے والوں میں چھوٹے مالکان اراضی اور غریب کسان بھی شامل تھے۔ چنانچہ سندھ کے بے آب و گیاہ صحرا کے راستے ان خانماں برباد مسلمان کسانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ان کے پیدل قافلے براستہ کھوکھراپار کئی مہینے تک آتے رہے۔1950ء میں ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ ہوگئی تھی۔

حکومت ہندوستان کو جائز طور پر یہ بھی شکایت تھی کہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں غیر مسلم ساہوکاروں نے مسلمانوں سے جو کروڑوں روپے کا قرضہ لینا تھا اس کی ادائیگی کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کو مغربی پاکستان کی تجارت وصنعت پر جو اجارہ داری حاصل تھی اس کی بحالی کا بھی اب کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ ہندوستان سے جو مسلمان مہاجرین آئے تھے انہوں نے متروکہ دکانوں اور کارخانوں پر قبضہ کر کے کامیابی سے اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ان مہاجرین کو یکایک اتنی خوشحالی نصیب ہوگئی تھی کہ تقسیم ہند سے پہلے وہ

اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یوں تو 15 راگست 1947ء سے پہلے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی حالت بہت خستہ تھی لیکن پنجاب کے مسلمان بالخصوص معاشی لحاظ سے بہت پسماندہ تھے۔صوبے کی تجارت وصنعت میں ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھااور سرکاری محکموں میں بھی ان کی نمائندگی بہت کم تھی۔غیر سرکاری کارخانوں اور تجارتی اداروں میں ان کے لیے ملازمتوں کے سارے دروازے بند تھے۔وہ پاکستان میں آئے تو انہیں اپنی معاشی ترقی کے لیے کھلا میدان ملا۔ ہرقسم کی تجارتی مال سے بھری ہوئی دکانیں ملیں۔ چلتے چلاتے کارخانے ملے اور سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں چھوٹی بڑی ملازمتیں ملیں۔بعض لوگوں کا خیال تھا کہ تجربہ کار ہندوؤں اور سکھوں کے چلے جانے کے باعث پاکستان کی معیشت چل نہیں سکے گی مگر یہ خیال فوراً ہی غلط ثابت ہوگیا۔آزادی کے پہلے ہی سال کے دوران نہ صرف اندرونی تجارت وصنعت کو فروغ حاصل ہوا بلکہ بیرونی تجارت کا توازن بھی پاکستان کے حق میں رہا۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پاکستان میں اناج کی فراوانی تھی۔اس وقت تک قحط کے دیوتا امریکی سامراج نے اس ملک کی طرف پوری توجہ نہیں کی تھی وہ یورپ میں مصروف تھا۔

بین المملکتی قومی تضاد کی شدت میں تیسرا نمایاں اضافہ اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان نے ہندوستانی افواج اور ان کے ساز وسامان کی تقسیم کے دوران دھاندلی بلکہ غنڈہ گردی کی ۔ پاکستان کے ساتھ یہ بے انصافی بڑی شدت سے محسوس کی گئی اور پاکستانی عوام میں یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی اس نوزائیدہ ریاست کے بارے میں قدم قدم پر بے انصافی، دھاندلی اور دشمنی کے سوا کسی اور چیز کی توقع نہیں کی جاسکتی۔بالخصوص پنجاب کی رائے عامہ پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا۔اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ پاکستان کی افواج کا کم ازکم 90 فیصد حصہ پنجابیوں پر مشتمل تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پاکستان کی بری فوج کی خاصی تعداد لاکھوں مسلمان مہاجرین کی دیکھ بھال میں مصروف تھی لہٰذا عوام کو ان سے چھوٹی سے چھوٹی بے انصافی پر بھی بہت دکھ ہوتا تھا۔عوام الناس کو یہ یقین تھا کہ پاکستان کے خلاف یہ دھاندلی بھی کانگرس اور برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی ہندوستانی افواج کی تقسیم کے سخت خلاف تھے۔جب مسلم لیگ کی جانب سے اپریل 1947ء میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستانی افواج کی تقسیم کا منصوبہ ابھی تیار کرلیا جائے تو دونوں نے ہی اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کردیا تھا کہ

ہندوستانی افواج ناقابل تقسیم ہیں۔لارڈ اسمے اور فیلڈ مارشل آکن لیک تو ہندوستانی افواج کی تقسیم کا ذکر سننے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہندوستانی افواج کی تقسیم کو ایک بہت بڑا گناہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ جب ماؤنٹ بیٹن نے مئی میں دونوں ڈومینینوں کے لیے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز پیش کی تھی تو اس کے ساتھ یہ تجویز بھی نتھی تھی کہ دونوں ملکوں کی فوج بھی مشترکہ ہوگی اور جب جناح نے یہ تجویز 2 رجولائی کو قطعی طور پر مسترد کر دی تو ماؤنٹ بیٹن اس قدر برہم ہوا تھا کہ اس نے نہ صرف املاک کی تقسیم میں دھاندلی کرنے بلکہ خود پاکستان کو تباہ وبرباد کرنے کی بھی دھمکی دی تھی۔اس کی اس دھمکی کے بارے میں دنیا کا کوئی مؤرخ شک وشبہ کا اظہار نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے یہ الفاظ حکومت برطانیہ کے تاریخی ریکارڈ کا حصہ ہیں اور یہ شائع ہو چکے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن یا حکومت برطانیہ نے کبھی ان کی تردید نہیں کی۔لہٰذا اس پس منظر میں ہندوستانی افواج اور ان کے ساز وسامان کی تقسیم کے دوران ہندوستان کی دھاندلی غیر متوقع نہیں تھی۔ برصغیر کی تقسیم جن تلخ حالات میں ہوئی تھی ان کے پیش نظر ہندوستانی ارباب اقتدار سے کسی انصاف کی توقع کرنا عبث تھا۔تاہم پاکستان کے رائے عامہ اس دھاندلی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

پاکستان کے ساتھ یہ بے انصافی اس لیے ممکن ہوئی کہ برطانوی سامراج نے شمال مغربی ہندوستان میں اسلحہ سازی کی کوئی صنعتیں قائم نہیں کی ہوئی تھیں اور نہ ہی اس علاقے میں فوجی ساز وسامان کے کوئی خاص ذخائر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس علاقے سے صرف افرادی قوت حاصل کرتا تھا۔اسلحہ بنانے اور اس کا ذخیرہ کرنے کا انتظام وسطی اور جنوبی ہندوستان میں تھا۔اس پالیسی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جبکہ ہندوستان میں اسلحہ سازی کی صنعتیں قائم کی گئی تھیں اور فوجی ساز وسامان کا ذخیرہ کیا گیا تھا،سوویت یونین برطانیہ کا اتحادی تھا اس لیے وقتی طور پر برصغیر کے شمال مغربی علاقے کو برطانیہ کے اس روائتی دشمن سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جنگ کے دوران برصغیر کو ایک ایسے انتظامی پل کی حیثیت میں تبدیل کر دیا گیا تھا جہاں سے جنوب مغربی ایشیا کو دوبارہ فتح کرنے کا کام انجام دیا جانا تھا۔اتحادی افواج کو ہر قسم کی رسد یا تو براستہ بمبئی جاتی تھی یا پھر مدراس اور کلکتہ کے راستے کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ فوجی ساز وسامان اور گولہ بارود کے سارے بڑے ذخیرے انہی علاقوں میں تھے۔ جو چند ذخیرے پاکستان کی سرحد کے اندر واقع تھے ان میں محض اتنا ہی سامان تھا جو شمال مغربی علاقے

میں اندرونی امن و امان قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ جب 1945ء میں جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان کے سارے ڈپوز میں اندازاً چار لاکھ بیس ہزار ٹن آرڈیننس سٹور اور گولہ بارود اور گاڑیوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ اس کے علاوہ بارہ انجینئر سٹور ڈپو تھے جن میں مختلف قسم کے انجینئر سٹورز اور مشینری سے متعلق پانچ لاکھ ٹن سامان موجود تھا۔ سترہ آرڈیننس فیکٹریاں قائم ہو چکی تھیں جن میں سے کوئی ایک بھی پاکستانی علاقے میں نہیں تھی۔ برطانوی سامراج اس علاقے سے پٹ سن، کپاس اور دوسری زرعی اجناس کے علاوہ صرف افرادی قوت حاصل کیا کرتا تھا۔ اسے اس علاقے میں کسی قسم کی صنعت کاری کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ فوجی بھرتی کے لیے اس علاقے کو معاشی طور پر پسماندہ رکھنا ضروری تھا۔

برطانوی سامراج نے جب 3رجون کو برصغیر کی تقسیم کا اعلان کر کے یہاں سے اپنی روانگی کا بگل بجایا تو اس وقت تک ہندوستانی افواج اور ان کے ساز و سامان کی تقسیم کے لیے ذرا سی بھی کارروائی نہیں ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت تک مسلم لیگ کے سوا کسی نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ برطانوی سامراج اور کانگرس دونوں کو ہی امید تھی کہ جناح مشترکہ گورنر جنرل اور مشترکہ فوج کی تجویز کو بالآخر منظور کر لیں گے۔ دونوں کے نقطۂ نگاہ سے برصغیر کو سوویت یونین اور چین کے سرخ انقلاب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ہندوستانی افواج کا متحد و یکجا رہنا ضروری تھا۔ فیلڈ مارشل آکن لیک اور ہندوستان کے نامزد کمانڈر انچیف جنرل کریاپا کی آخری وقت تک کوشش یہی تھی کہ برصغیر کی سیاسی تقسیم کے باوجود ہندوستانی افواج کے اتحاد کو برقرار رکھا جائے۔ لہٰذا 15راگست 1947ء تک تقریباً پانچ لاکھ کی نفری کی افواج اور ان کے ساز و سامان کی تقسیم کے کام کے مکمل ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ یہاں سے برطانوی افواج کے انخلا کا کام ہو رہا تھا اور پنجاب میں عظیم قتل عام کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان برطانوی افواج کے ساتھ تقریباً 70 ہزار ٹن سامان اور تقریباً 7 ہزار گاڑیاں بھی تھیں اور برطانوی سامراج کو اصرار تھا کہ سب سے پہلے اس سامان کو برطانیہ بھجوانے کا کام مکمل کیا جائے۔ اگرچہ اس مقصد کے لیے چھ ماہ کی مدت مقرر کی گئی تھی لیکن وہ مقررہ مدت سے بہت پہلے یہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ برصغیر کی وسیع و عریض سرزمین بالآخر اس کے لیے بہت تنگ ہو گئی تھی۔

بٹوارا کونسل کے فیصلے کے مطابق 16 راگست کو ایک مشترکہ دفاعی کونسل کا قیام عمل میں آیا اور انڈین یونین کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کو اس کا ''غیر جانبدار'' صدر مقرر کیا گیا۔ یہ کونسل دونوں ملکوں کے وزرائے دفاع اور برصغیر کے سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک پر مشتمل تھی۔ کونسل کے فرائض مختصراً یہ تھے کہ ہندوستانی افواج کے عملے اور اثاثے کو دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم کرے، ان کی نامزدگی اور تبادلہ کرے اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے۔ یہ کونسل خودمختار تھی اور سوائے ان معاملات کے جن کے بارے میں اتفاق رائے نہ ہو سکے اور جن کو بٹوارا کونسل کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو جائے وہ اپنے فیصلوں میں آزاد تھی۔ علاوہ بریں تین ججوں پر مشتمل ثالثی ٹربیونل قائم کیا گیا تھا اور یہ طے کیا گیا تھا کہ جو تنازعات دفاعی کونسل اور بٹوارا کونسل سے حل نہیں ہو سکیں گے انہیں قطعی فیصلے کے لیے ٹربیونل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ دونوں فوجوں کی تنظیم نو کی بھی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کا صدر سپریم کمانڈر آکن لیک تھا۔ آزاد ہندوستان کے پہلے کمانڈر انچیف سر رابرٹ لوکہارٹ کا بیان ہے کہ سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکن لیک کو ہندوستانی فوج کی تقسیم پر سخت صدمہ تھا۔ وہ یوں محسوس کرتا تھا کہ جیسے اسے اپنے بچے کے ٹکڑے کرنے کو کہا جا رہا ہے۔[20] اس کی کمیٹی میں بحریہ اور فضائیہ کے اعلیٰ افسر بھی شامل تھے اور ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دفاعی کونسل اور بٹوارا کونسل کی ہدایات کے مطابق افواج کی تقسیم کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گی۔ جب تک یہ کام نہیں ہو گا اس وقت تک اس کا مشترکہ فوجی اداروں پر کنٹرول ہو گا اور وہ یونٹوں، سپاہیوں، گاڑیوں، ہتھیاروں اور دوسرے فوجی ساز و سامان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرے گی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ سارا کام یکم اپریل 1948ء تک مکمل ہونا تھا لیکن کمیٹی کے صدر آکن لیک کو دو تین ہفتے میں ہی پتہ چل گیا کہ یہ سب کچھ دھوکہ تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستانی ارباب اقتدار افواج اور ان کے ساز و سامان کی تقسیم کے کام کو منصفانہ طریقے سے انجام دینے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ آکن لیک اس سلسلے میں جو بھی تجاویز پیش کرتا تھا وہ ہندوستانی ارباب اقتدار کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی تھیں اور وہ ماؤنٹ بیٹن سے شکایتیں کرتے تھے کہ یہ شخص تو پاکستان کی حمایت کر رہا ہے۔

جب ستمبر کے اوائل میں دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور آکن لیک کے ہیڈکوارٹر کے سارے مسلمان عملے کو پرانے قلعہ میں پناہ لینا پڑی تو ہندوستانی ارباب اقتدار کے

لیے میدان بالکل ہی صاف ہوگیا۔ اب پاکستان کی طرف سے فوجی سامان کی تقسیم کے کام کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ لیکن آکن لیک کی خواہش اور کوشش کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ وہ ہندوستان سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا اور پاکستان سے بے لوث محبت کرتا تھا اور نہ ہی اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ سیدھے سادے سپاہی کی حیثیت سے یہ کام غیر جانبداری اور وفاداری سے انجام دینا چاہتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی اس سلسلے میں منصفانہ رویے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ وہ سر اولف کیرو، سر فرانسس موڈی اور سر فرانسس ٹکر کی طرح برطانیہ کے ان سامراجی عناصر سے تعلق رکھتا تھا جو برصغیر کے شمال مغربی علاقہ کو فوجی لحاظ سے بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس علاقہ میں فوجی خلا پیدا ہوا تو سوویت یونین اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر پاکستان کی ایام طفلی میں ہی موت واقع ہوگئی تو یہ علاقہ بہت دیر تک بدامنی کا شکار رہے گا۔ سوویت یونین اس سے مزید فائدہ اٹھائے گا اور خلیج فارس میں تیل کے ذخائر خطرے میں پڑ جائیں گے۔ لیکن ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار اس کے مؤقف سے متفق نہیں تھے۔ وہ اپنے آپ کو برطانوی سامراج کے حقیقی وارث کی حیثیت سے خود کو پورے برصغیر کی ملکیت کا حق دار سمجھتے تھے۔ ان کی کھلم کھلا خواہش اور کوشش یہ تھی کہ پاکستان کے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ یہ خواہش کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ آل انڈیا کانگرس نے 16 رجون کو اس کا برملا اظہار کیا تھا اور پھر پٹیل، کرپلانی اور دوسرے کانگریسی زعماء جگہ جگہ یہی کہتے پھرتے تھے اور وہ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے آکن لیک کی بڑی شکایتیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص نوزائیدہ پاکستان کو ہتھیار اور گولہ بارود مہیا کر کے تقویت دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبکہ وہ خود کوشش کر رہے تھے کہ یہ بچہ شیر خواری کے زمانے میں ہی راہی ملک عدم ہو جائے۔ وہ آکن لیک کو ''پاکستان کا ایجنٹ'' کہتے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے کانگریسی لیڈروں کی اس شکایت کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ اس نے 26 رستمبر 1947ء کو آکن لیک کے نام ایک چٹھی میں لکھا کہ ہندوستانی وزراء سپریم ہیڈ کوارٹرز کے سربراہ کے طور پر تمہاری موجودگی کو پسند نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک معتدل مزاج وزیر نے حال ہی میں مجھے شکایت کی ہے کہ تم پاکستان کے مفادات کی علمبرداری کرتے ہو۔ یہ تمہاری غیر جانب داری کا صلہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تم

اپنے ہیڈکوارٹرز ختم کرنے کی تجویز پیش کردو۔ میں نے اس سلسلے میں وزیراعظم ایٹلی سے بات کرلی ہے اوراس نے حسب ضرورت مناسب وقت پر مناسب اقدام کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ باالفاظ دیگر ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی لیڈروں کے کہنے پر سپریم کمانڈر کے ہیڈکوارٹرز کو بند کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ حالانکہ 16 راگست کے بین المملکتی فیصلے کے مطابق اسے یکم اپریل 1948ء تک قائم رہنا چاہیے تھا۔ وہ محض آکن لیک کا بھرم رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا کہ تم استعفیٰ دے دو۔ قدرتی طور پر آکن لیک کو یہ بات اچھی نہیں لگ سکتی تھی۔ اس نے اپنے ہیڈکوارٹرز کی کارکردگی کے بارے میں 28 رستمبر کوحکومت برطانیہ کوایک رپورٹ بھیجی جس میں اس نے اپنے پاکستان نواز رویے کی صفائی پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہندوستان کے موجودہ وزراء کا مصمم عزم یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے پاکستان کی ڈومینین کے مستحکم بنیادوں پر قائم ہونے کے راستے میں حائل ہوں گے۔ ہندوستان کے لیڈروں، وزیروں، سول حکام اور دوسرے لوگوں نے مسلح افواج کی تقسیم کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ مجھ پر اور میرے افسروں پر مسلسل اور تلخی سے یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ ہم پاکستان نواز ہیں اور جانبدار ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے محض اپنے فرائض غیر جانبداری سے بلاخوف وخطر اور ہر قسم کے رورعایت سے بالاتر ہوکر سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ میرے اور میرے افسروں کے لیے اس کام کو جاری رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ اگر ہمیں الگ کردیا گیا تو ہندوستانی افواج کی منقولہ املاک کی منصفانہ تقسیم کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔ دوسری طرف پاکستان نے شروع ہی سے معقولیت اور معاونت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ موجودہ حالات میں پاکستان کوقدرتی طور پر یہی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ پاکستان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے اوراس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی ضرورت کو ہندوستان کے ذخائر سے پورا کرے۔[21]

آکن لیک نے اس رپورٹ کے چند دن بعد یعنی 6 راکتوبر کو اپنا استعفیٰ پیش کردیا اور تجویز پیش کی کہ سپریم کمانڈر کے ہیڈکوارٹرز کو 30 رنومبر سے بند کردیا جائے۔ مشترکہ دفاعی کونسل نے 26 راکتوبر کو یہ تجویز منظور کرلی۔ اس موقعہ پر پاکستان کے نمائندوں نے بہت اصرار کیا کہ 16 راگست کے بین المملکتی فیصلے کے مطابق اس ہیڈکوارٹرز کو یکم اپریل 1948ء تک قائم رہنا چاہیے تاکہ افواج کے سازوسامان کی منصفانہ تقسیم ہوسکے۔ مگر فیصلہ تو 26 رستمبر کو ہی ہوچکا تھا۔ اس

کے بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چند دن کے بعد حکومت برطانیہ کی طرف سے بھی یہ حکم آ گیا کہ سپریم کمانڈر اور اس کے برطانوی عملے کے ارکان نومبر کے دوسرے ہفتے میں واپس لندن آ جائیں اور پاکستان کے ارباب اقتدار یہ سوچتے رہے کہ اب کس سے منصفی طلب کریں۔

بالآخر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف رجوع کیا گیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے شکایت کی کہ بین المملکتی فیصلے کے مطابق پاکستان کو ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی ساز و سامان ملنا چاہیے تھا لیکن اسے 31/ مارچ 1948ء تک 4703 ٹن سامان ملا۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن سامان کی منتقلی ہنوز باقی تھی۔ صرف 3 فیصد سامان آیا تھا۔ لندن ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق ''پاکستان کو 150 شرمن ٹینک ملنے چاہیے تھے لیکن ان میں سے اسے کوئی ایک بھی نہیں ملا۔ جو سامان ملا ہے وہ بھی ناکارہ، شکستہ اور پرانا ہے۔[22] میجر جنرل فضل مقیم لکھتا ہے کہ ''یکم دسمبر 1947ء سے قبل جو سامان وصول ہوا وہ خالصتاً سپاہیوں کی ریکروٹمنٹ اور یونٹوں کے سٹورز اور ساز و سامان پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد جو چیزیں آئیں ان میں سب کچھ ملا جلا سامان تھا۔ ٹینکوں، توپوں، معمولی اور سپیشلسٹ گاڑیوں اور ان کے پرزوں کا جہاں تک تعلق تھا وہ سرے سے ملے ہی نہیں۔ جو سامان ملا وہ صرف عام نوعیت کی چیزوں پر مشتمل تھا اور اس میں بھی زیادہ تر ایسی اشیا شامل تھیں جو بہت جلد خراب ہو جانے والی تھیں۔ اینٹی گیس اور واٹر پروف کا دقیانوسی اور غیر ضروری سامان، ان سائزوں کے چھوٹے چھوٹے یا بہت بڑے بڑے جوتے جو گورکھے پہن سکتے تھے یا مغربی افریقہ کے حبشی۔ سپاہیوں کی ریکروٹمنٹ کی بیشتر چیزیں ایسی تھیں جو پاکستانی سپاہیوں کے لیے یا تو بہت بڑی تھیں یا بہت چھوٹی، بہت سے ایسے بکس بھی ملے جن میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔[23] پرسیول گرفتھس (Percival Griffiths) لکھتا ہے کہ ''ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی اور تنازعہ کشمیر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات حیرت انگیز نہیں ہوگی کہ ہندوستان نے فی الحقیقت وہ ہتھیار پاکستان کو نہیں دیئے تھے جو اسے دینے چاہیے تھے'' ...... پاکستان کو ابتدا ہی سے اپنے طاقتور ہمسایہ سے خطرہ محسوس ہوتا تھا وہ اس کی نیت کے بارے میں شبہ کرتا تھا اور اس خطرے اور شبہ کے احساس میں اس یقین کی بنا پر اضافہ ہو گیا تھا کہ اس سے املاک اور فوجی ساز و سامان کی تقسیم کے سلسلے میں بے انصافی کی گئی ہے۔[24] پاکستانیوں پر یہ حقیقت بالکل عیاں تھی کہ یہ ساری دھاندلی ہندوستان کے محض چھوٹے افسروں اور کلرکوں کی

حب الوطنی کا نتیجہ نہیں تھی۔ بڑے بنیوں نے جان بوجھ کر ڈنڈی ماری تھی۔ پٹیل کا خیال تھا کہ جو
لوگ ہم سے الگ ہوئے ہیں وہ پچھتائیں گے اور گھٹنوں کے بل بہت جلد واپس آجائیں گے۔
پٹیل کی یہ تمنا تو پوری نہ ہوئی البتہ جو لوگ الگ ہوئے تھے وہ اس بنا پر اور بھی الگ ہو گئے۔
ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔

باب: 3

# واجبات کی عدم ادائیگی، نہری پانی کی بندش اور معاشی جنگ

جو بنیے فوجی سامان کی ریوڑیاں بار بار اپنے آپ کو ہی دے رہے تھے ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نقدی کی تقسیم میں انصاف کریں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بھی انصاف نہ کرنا تھا نہ کیا۔ بورژوا سیاست میں حقیقی انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ انصاف کا ڈھونگ بڑے زور وشور سے رچایا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار نے پاکستان کے واجبات کی ادائیگی سے کچھ اس طرح انکار کیا کہ ان کے بورژوا انصاف کے ڈھونگ کا پردہ بھی ساری دنیا کے سامنے چاک ہوگیا۔ انہوں نے پہلے تو دسمبر 1947ء کے اوائل میں باقاعدہ معاہدہ کیا کہ پاکستان کو 55 کروڑ روپے ادا کئے جائیں گے۔ لیکن پھر اسی مہینے کے اواخر میں یکا یک خود ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ پاکستان کو ادائیگی نہیں کی جائے گی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ چونکہ پاکستان کشمیر میں ہندوستان کے خلاف نبرد آزما ہے اس لیے اسے کوئی پیسہ نہیں دیا جائے گا۔ انہیں کہا گیا کہ بابا! کشمیر کی جنگ آزادی تو اکتوبر سے جاری ہے۔ جب تم نے دسمبر کے اوائل میں 55 کروڑ روپے کی ادائیگی کے معاہدے پر دستخط کئے تھے یہ لڑائی اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ اب نئی بات کیا ہوئی ہے کہ تم بین المملکتی معاہدے سے منحرف ہو گئے ہو۔ لیکن وہ بڑی ڈھٹائی سے انکار ہی کرتے رہے حالانکہ ماؤنٹ بیٹن نے بھی برطانیہ کے نہایت تجربہ کار بورژوا طبقے کے نمائندہ کی حیثیت سے انہیں سمجھایا کہ اس قسم کی کھلی غنڈہ گردی مت کرو! بورژوا سیاست میں معقولیت اور انصاف کا ڈھونگ ضروری ہوتا ہے! پاکستان کو ادائیگی نہ کرنے کا فیصلہ بظاہر آبرومندانہ نہیں ہے۔

پاکستان کو واجبات کی عدم ادائیگی کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ جناح نے 2 ر جولائی کو یہ تجویز تو قطعی طور پر مسترد کر دی تھی کہ تقسیم ہند کے بعد کچھ عرصے کے لیے دونوں ڈومینینوں کا گورنر جنرل مشترکہ ہوگا اور ان کی فوج بھی مشترکہ ہوگی لیکن انہوں نے یہ تجویز بہ امر مجبوری منظور کر لی تھی کہ دونوں ملکوں کی کرنسی 31 ر مارچ 1948ء تک مشترکہ رہے گی۔ اس کے بعد پاکستان چھ مہینے کے اندر ہندوستانی کرنسی کی جگہ اپنی کرنسی رائج کرے گا۔ گویا 30 ر نومبر 1948ء تک پاکستان میں ہندوستانی کرنسی چلتی رہے گی۔ جب یہ فیصلہ ہوا تھا تو اس وقت حکومت ہندوستان کے پاس تقریباً 400 کروڑ روپے کی کرنسی تھی۔ پاکستان کے نمائندوں کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں ان کے ملک کی آبادی، رقبے اور دوسرے ذرائع کا لحاظ کرتے ہوئے اس رقم کا 25 فیصد حصہ دیا جائے۔ لیکن پٹیل نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور صرف 20 کروڑ روپے کی فوری ادائیگی پر آمادگی ظاہر کی۔ بقیہ مطلوبہ رقم کی ادائیگی کا تنازعہ ثالثی ٹربیونل کے سپرد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن دسمبر کے اوائل میں پاکستان کے نمائندہ چوہدری محمد علی کی تحریک پر دہلی میں ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس ہوئی جس میں پاکستان کے وفد کی قیادت وزیر خزانہ غلام محمد نے کی اور ہندوستانی وفد وزیر داخلہ سردار پٹیل کی سرکردگی میں شریک ہوا۔ خلاف توقع یہ کانفرنس بظاہر کامیاب ہوگئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پاکستان کو 400 کروڑ روپے کی کل رقم کا 18.75 فیصد حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ باقاعدہ معاہدہ ہوا جس پر ہندوستان کی طرف سے سردار پٹیل نے دستخط کئے اور یہ طے ہوا کہ پاکستان کے حصہ کی 75 کروڑ روپے کی رقم میں سے 55 کروڑ روپے کی رقم دے دی جائے گی۔ 20 کروڑ روپے پاکستان کو پہلے ہی دیئے جا چکے تھے۔ پاکستان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ موجودہ رقم کی ادائیگی فوراً کر دی جائے کیونکہ کراچی کے خزانے میں سرکاری اخراجات کے لیے کوئی پیسہ نہیں رہا تھا۔ لیکن غیر مبہم وعدے کے باوجود کئی دن تک کوئی ادائیگی نہ ہوئی۔ جب تقریباً دو ہفتے بعد تقاضا کیا گیا تو دہلی سے موعودہ رقم کی بجائے کورا جواب آ گیا۔ ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے پہلے تو 9 ر دسمبر کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے واجبات کی ادائیگی کے معاملے کو کشمیر کے تنازعے کے تصفیے کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی اور پھر اس نے 12 ر جنوری 1948ء کو ایک پریس کانفرنس میں کھل کر اعلان کر دیا کہ کشمیر میں لڑائی کے دوران ہندوستان کی جانب سے پاکستان کو کسی ادائیگی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کی دلیل یہ تھی

کہ اگر موعودہ رقم دیدی گئی تو پاکستان اسے کشمیر میں ہندوستان کے خلاف لڑائی پر خرچ کرے گا۔ بہ الفاظ دیگر ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار ریاست جموں وکشمیر کا تقریباً 50 لاکھ آبادی پر مشتمل علاقہ محض 55 کروڑ روپے کی بلیک میلنگ کے ذریعے ہتھیانا چاہتے تھے۔ برطانوی سامراج نے تقریباً ایک سو سال قبل 1846ء میں یہ علاقہ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کے صوبیدار راجہ گلاب سنگھ کے پاس 75 لاکھ روپے میں فروخت کیا تھا۔

بہت سے مؤرخین کا بیان ہے کہ اگرچہ پاکستان کے واجبات کی ادائیگی نہ کرنے کا فیصلہ بظاہر ہندوستانی کابینہ کے اجلاس میں کیا گیا تھا لیکن دراصل یہ فیصلہ تنہا پٹیل ہی کا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کی طرح نہرو اس فیصلے کے خلاف تھا۔ وہ اس رائے سے اتفاق کرتا تھا کہ اس طرح ساری دنیا میں ہندوستان کی بڑی بدنامی ہوگی۔ پٹیل اور نہرو کے اختلاف رائے کا یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ ان دونوں کے درمیان تضاد بڑا پرانا تھا۔ ابوالکلام آزاد نے اس تضاد کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''پٹیل گاندھی کے رازداروں میں سے تھا اور گاندھی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ دراصل پٹیل کا سیاسی وجود سراسر گاندھی کا مرہون منت تھا۔ کانگرس میں ایسے بہت سے لیڈر تھے جنہوں نے اپنی سیاسی زندگی گاندھی کے سیاسی افق پر نمودار ہونے سے پہلے شروع کی تھی لیکن سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد ان پرانے لیڈروں میں شامل نہیں تھے۔ یہ دونوں ہی محض گاندھی کی پیداوار تھے۔ عدم تعاون کی تحریک سے پہلے سردار پٹیل گجرات کا ایک معمولی وکیل تھا جس کو ملک کی عوامی زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔ جب گاندھی نے احمد آباد میں رہائش اختیار کی تو اس نے اس کو اٹھایا اور رفتہ رفتہ اسے بڑا لیڈر بنا دیا۔ گاندھی نے ہی اسے مجلس عاملہ کا رکن بنایا اور وہ گاندھی ہی کی وجہ سے 1931ء میں کانگرس کا صدر بنا تھا۔''[1] اس کے برعکس جواہر لال نہرو الٰہ آباد کے ایک رئیس خاندان کا چشم و چراغ تھا اور اسے سیاست ورثے میں ملی تھی۔ اس نے برطانیہ کے ایک نہایت اعلیٰ معیار کے پبلک سکول میں تعلیم پائی تھی اور وہ یورپ کے جدید بورژوا نظریات سے بہت متاثر تھا۔ وہ مغربیت کے سانچے میں پوری طرح ڈھلا ہوا تھا۔ وہ خواب میں بھی انگریزی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ اسے ابتدا میں گاندھی کی مہاتمیت اور قدامت پسندی بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ ایک ترقی پسند بورژوا تھا۔ لہٰذا اس کے اور گاندھی کے درمیان تضاد ناگزیر تھا۔ گاندھی نے پندرہ بیس سال تک نہرو کا توڑ کرنے کے لیے پٹیل کو کامیابی

سے استعمال کیا۔ جب 1946ء میں ابولکلام آزاد نے کانگرس کی صدارت سے استعفیٰ دیا تو گاندھی پٹیل کوصدر بنانے کے حق میں تھا۔لیکن وہ محض اس لیے صدر نہ بن سکا کہ ابولکلام آزاد نے اپنے استعفیٰ کے اعلان کے ساتھ ہی نئے صدر کے لیے نہرو کا نام تجویز کر دیا تھا اور اس بنا پر ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ گاندھی اور پٹیل کے لیے نہرو کی اعلانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ تاہم نہرو کے صدر منتخب ہونے کے باوجود کانگرس میں پٹیل کا پلہ بدستور بھاری رہا کیونکہ اسے ہر معاملے میں گاندھی کی تائیدوحمایت حاصل ہوتی تھی۔ پنجاب کی تقسیم کی قرارداد پٹیل نے ہی منظور کرائی تھی۔اسی نے ہی گاندھی کو برصغیر کی تقسیم پر رضامند کیا تھا اور پھر اس نے ہی 16رجون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے تقسیم کے منصوبے کی منظوری حاصل کی تھی۔آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک ہر معاملے میں پٹیل کا غلبہ رہا۔اسے نہ صرف گاندھی کی حمایت بدستور حاصل تھی بلکہ اسے اچاریہ کرپلانی کی وساطت سے کانگرس کی تنظیم پر بھی مکمل کنٹرول حاصل تھا۔نہرو اپنے آپ کو یکہ وتنہا محسوس کرتا تھا اور اس کا زیادہ تر انحصار ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے قوم پرست مسلمانوں پر تھا۔اچاریہ کرپلانی نے آزادی کے چند ہفتوں بعد کانگرس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور الزام عائد کیا کہ نہرو کی حکومت اپنے فیصلوں کے بارے میں کانگرس سے کوئی مشورہ نہیں کرتی۔ کرپلانی کے اس الزام کو گاندھی اور بہت سے دوسرے کانگرسی لیڈروں کی تائید حاصل تھی۔ چنانچہ نئے صدر کے انتخاب کے لیے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جو اجلاس ہوا اس میں نہرو پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور کرپلانی کی جگہ سردار پٹیل کے نمائندہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کا انتخاب ہوا۔نہرو اس انتخاب پر بہت ناخوش تھا۔کانگرس میں اس کے حامیوں کو بتدریج ختم کیا جارہا تھا۔پٹیل کا نہ صرف کابینہ میں بلکہ کانگرس کی تنظیم میں بھی پوری طرح غلبہ ہوگیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ نہرو کا ستارہ غروب ہونے والا ہے۔پٹیل کانگرس میں قوم پرست مسلمانوں، بالخصوص ابوالکلام آزاد سے بہت توہین آمیز سلوک کرتا تھا۔ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔کیونکہ یہ سب نہرو کے وفادار تھے اور بھارت ماتا سے ان کی وفاداری مشکوک تھی۔

نہرو کا سوانح نگار مائیکل ایڈورڈز لکھتا ہے کہ اس حال میں نہرو نے روزانہ گاندھی کے پاس جانا شروع کر دیا۔اس کا نتیجہ نہرو کے حق میں بہت اچھا نکلا کیونکہ ستمبر 1947ء کے بعد گاندھی بظاہر فرقہ وارانہ فسادات، رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیوں کی وجہ سے کچھ بددل ہوگیا

تھااور وہ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں پٹیل کی تقریروں سے بھی ناخوش تھا۔نہرو ہر شام کو گاندھی سے ملنے کے بعد واپس آتا تھا تو اس کے چہرے پر رونق ہوتی تھی۔[2] ابوالکلام آزاد کی رائے میں ''گاندھی کی پٹیل سے بددلی کی وجہ یہ تھی کہ پٹیل بہت خودسر اور گستاخ ہو گیا تھا۔ وہ گاندھی سے توہین آمیز لہجے میں بات کرتا تھا۔ گاندھی جب پوچھتا تھا کہ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں بے گناہ مسلمانوں کا کشت وخون بند کیوں نہیں ہوتا تو وزیر داخلہ پٹیل گستاخی کے لہجے میں جواب دیتا تھا کہ آپ کو اس کے بارے میں جتنی خبریں مل رہی ہیں وہ انتہائی مبالغہ آمیز ہیں۔مسلمانوں کے پاس خوفزدہ ہونے یا شکوہ وشکایت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔''
ابوالکلام آزادلکھتا ہے کہ ''ایک موقعہ پر نہرو نے میری اور پٹیل کی موجودگی میں گاندھی سے کہا تھا کہ میں دہلی کی صورت حال کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔مسلمانوں کو کتوں اور بلیوں کی طرح قتل کیا جارہاہے۔ میں بالکل بے بس ہوں۔ میں ان کی کوئی امداد نہیں کرسکتا۔میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دیتا۔لیکن پٹیل پر نہرو کی اس شکایت کا کوئی اثر نہ ہوا۔اس نے کہا کہ ''نہرو کی شکایتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ممکن ہے کہ مسلمانوں کے قتل کے کوئی اکادکا واقعات ہوئے ہوں۔حکومت ان کے جان و مال کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کارروائی کررہی ہے۔اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ وزیراعظم نہرو حکومت کے اقدامات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔'' نہرو پر چندلمحوں کے لیے سکتہ طاری ہوگیااور پھراس نے بڑی مایوسی کی حالت میں گاندھی کی طرف رجوع کیا۔نہرو نے کہا کہ ''اگر سردار پٹیل کے یہی نظریات ہیں تو میں ان پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔''[3]

وزیراعظم نہرو کی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام جاری رہنے پر پریشانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ سارے ہندوستان اور بالخصوص یو۔پی کی مسلم اقلیت اس کی سیاسی قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ تھی۔ اسے جائز طور پر خدشہ تھا کہ اگر اس کے راج میں مسلمانوں پر اسی طرح ظلم وستم جاری رہا تو وہ سیاسی طور پر بہت کمزور ہو جائیگا اور پٹیل مزید طاقتور ہو جائے گا۔دوسری وجہ جس سے گاندھی کو اتفاق تھا، یہ تھی کہ دارالحکومت دہلی میں، جہاں غیر ممالک کے سفارت خانے موجود تھے، مسلم اقلیت کے کئی ماہ تک قتل عام جاری رہنے سے ساری دنیا میں ہندوستان کی بدنامی ہورہی تھی اور پاکستان کو سیاسی طور پر فائدہ پہنچ رہا تھا۔ بالخصوص تنازعۂ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کے مؤقف کو تقویت مل رہی تھی جبکہ پاکستان کا وزیر خارجہ ظفراللہ خان جگہ جگہ ہندوستانی مسلمانوں کی

نسل کشی کے لرزہ خیز واقعات بیان کر رہا تھا۔ یکم جنوری 1948ء کو ظفر اللہ خان کا ایک اخباری بیان یہ تھا کہ "گذشتہ مہینوں میں حکومت ہندوستان کی پالیسی کا مقصد یہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کرنے کی جو جرأت کی ہے انہیں اس کی سزا دی جائے ان کی بظاہر خواہش یہ ہے کہ پاکستان کو اتنا پیٹا جائے کہ یہ گھٹنے ٹیک کر پھر ہندوستان کی گود میں پناہ لینے کی درخواست کرے۔"[4] 5 رجنوری کو لندن ٹائمز کی رپورٹ یہ تھی کہ "ہندوستان میں اس امکان کا بہت چرچا ہو رہا ہے کہ دونوں ڈومینینوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہے۔ یہ بات محض گلیوں اور بازاروں میں عام لوگ ہی نہیں کہتے بلکہ ایسے ذمہ دار افراد بھی جنہیں صورت حال کا بہتر طور پر پتہ ہونا چاہیے، یہی کہتے ہیں۔ پاکستان میں یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان سرحدی جھڑپوں سے مشتعل ہو کر پاکستان میں گھس آئے گا" اور پھر چند دن بعد اس اخبار کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "فضا جنگ کی باتوں سے بھرپور ہے۔ سردار پٹیل نے مسلمانوں کے دیرینہ جبر کو فراموش نہیں کیا اور اس کی زیر قیادت اینٹی پاکستان پارٹی نے کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔"[5] ظاہر ہے کہ نہرو کے لیے یہ صورت حال قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے پٹیل کے روز افزوں سیاسی عروج میں اپنا سیاسی زوال نظر آتا تھا۔ پٹیل کی مسلمانوں کے قتل عام اور پاکستان کے ساتھ محاذ آرائی کی پالیسی ہندوؤں میں بہت مقبول تھی۔ اس نے 6 رجنوری کو ایک تقریر میں کہا تھا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجودہ غیر تسلی بخش تعلقات کا سلسلہ جاری رہا تو بین المملکتی جنگ ناگزیر ہوگی۔

وہ 12 رجنوری 1948ء کو حسب معمول شام کو گاندھی کے پاس گیا اور اس کی واپسی کے تھوڑی ہی دیر بعد "مہاتما" نے اعلان کر دیا کہ "چونکہ دہلی میں مسلمانوں کا کشت و خون جاری ہے اور سردار پٹیل وزیر داخلہ کی حیثیت سے امن و امان بحال کرنے میں ناکام رہا ہے اس لیے میں کل یعنی 13 جنوری سے برت رکھوں گا جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک صورت حال ٹھیک نہیں ہوتی۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ گاندھی نے نہرو اور پٹیل کے درمیان تضاد کو نہرو کے حق میں حل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابوالکلام آزاد کہتا ہے کہ "اس برت کا رخ دراصل سردار پٹیل کے خلاف تھا اور سردار پٹیل کو اس کا پتہ تھا۔ برت کے پہلے ہی دن شام کو پٹیل، آزاد اور نہرو حسب معمول "باپو" کے چرنوں میں بیٹھے تھے۔ پٹیل دوسرے دن صبح بمبئی جانے والا تھا۔ اس نے بڑے رسمی طریقے سے گاندھی سے باتیں کیں اور شکایت کی کہ اس کے برت کا کوئی جواز نہیں

ہے...... اس نے تلخ لہجے میں کہا کہ ''گاندھی جی جو کچھ کر رہے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''میں مسلمانوں کے قتل کا ذمہ دار ہوں۔'' اس پر جب گاندھی نے کہا کہ میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو جھوٹا قرار نہیں دے سکتا تو پٹیل بولے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا۔ اس موقعہ پر ابوالکلام آزاد سے خاموش نہ رہا گیا اور اس نے پٹیل سے کہا کہ بمبئی جانے کا پروگرام منسوخ کر دو۔ دہلی ہی میں رہو۔ گاندھی جی نے برت رکھا ہوا ہے۔ معلوم نہیں حالات کیا رخ اختیار کر لیں۔ سردار پٹیل چیخ کر بولا ''میرے یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گاندھی جی میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ ساری دنیا کے سامنے ہندوؤں کے نام پر دھبہ لگانے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے لیے کچھ فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ میں اپنا پروگرام تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں بمبئی ضرور جاؤں گا۔''[6] مائیکل ایڈورڈز کہتا ہے کہ اس موقعہ پر پاکستان کے واجبات کی ادائیگی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا۔ گاندھی یہ واجبات ادا کرنے کے حق میں تھا اور نہرو اور آزاد کی بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ پٹیل بہت برہم ہوا تھا۔ اس کی انا بہت مجروح ہوئی تھی اور اس بنا پر اس نے مبینہ طور پر کہا تھا کہ ''بڈھا سٹھیا گیا ہے۔''[7] اگلے دن جب کابینہ کے اجلاس میں پاکستان کے واجبات ادا کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو نہرو اور پٹیل کے درمیان بہت جھڑپ ہوئی جس کے دوران نہرو نے بہت برہمی کا اظہار کیا۔ اب کابینہ میں نہرو کا غلبہ ہو گیا تھا کیونکہ گاندھی کی تائید وحمایت پٹیل کے بجائے اس کو حاصل ہو گئی تھی۔ یہ صورت حال پٹیل کے لیے قابل برداشت نہیں تھی۔ اس نے 15 جنوری کو بمبئی کے دورے پر روانہ ہونے سے پہلے گاندھی کو ایک چٹھی لکھی جس میں وزارت داخلہ کے عہدے سے استعفیٰ پیش کیا گیا تھا۔ تاہم پاکستان کو اس دن 50 کروڑ روپے کی ادائیگی کر دی گئی۔ 5 کروڑ روپے ہندوستان کے بعض متوقع واجبات کی پیشگی ادائیگی کے طور پر روک لیے گئے تھے۔ گو یا بنیا آخری وقت بھی ڈنڈی مارنے سے باز نہیں رہا تھا۔

16 رجنوری کو ماؤنٹ بیٹن شکار کے لیے بیکانیر گیا تو وہاں اس کے پبلک ریلیشنز آفیسر ایلن کیمبل جانسن کی ریاست بیکانیر کے دیوان کے۔ ایم۔ پانیکر سے ملاقات ہوئی۔ پانیکر نے جانسن سے معلومات افزا باتوں کے دوران کہا کہ 'گاندھی کے برت کا رخ بلاشبہ پٹیل کی طرف ہے اور اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔'' اس نے مزید کہا کہ ''جب تین ماہ قبل گاندھی دہلی آیا تھا تو اس کے اور پٹیل کے درمیان تصادم ہو گیا تھا۔'' اس موقع پر گاندھی نے کہا تھا کہ ''ولبھ بھائی میں

نے ہمیشہ یہ خیال کیا تھا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں اور ہم یکجان دو قالب ہیں۔ لیکن اب مجھے پتہ چل رہا ہے ہم دو ہیں۔'' پانیکر کا خیال تھا کہ اگرچہ مشین پٹیل کے کنٹرول میں ہے تاہم اسے اچھی طرح پتہ ہے کہ عوام الناس گاندھی کے قابو میں ہیں اور وہ چاہے بھی تو مہاتما کے اثر کو نہیں توڑ سکتا۔ گاندھی نہرو کو تقویت دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس عمل میں پٹیل کو ختم بھی نہیں کرنا چاہتا۔ گاندھی صرف یہ چاہتا ہے کہ پٹیل گھٹنے ٹیک دے۔''[8] چوہدری محمد علی کے بیان کے مطابق گاندھی کے پٹیل کے ساتھ تضاد کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ جب گاندھی نے اکتوبر 1946ء میں نواب بھوپال کی تجویز پر اس مضمون کے بیان پر دستخط کر دیئے تھے کہ کانگرس یہ تسلیم کرتی ہے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت کی نمائندہ تنظیم ہے اور اس بنا پر جمہوری اصولوں کے مطابق صرف وہی ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا حق رکھتی ہے۔ تو پٹیل، نہرو اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان نے اس بیان کی توثیق کرنے سے کھلم کھلا انکار کر دیا تھا۔ پٹیل اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی گاندھی کے خلاف یہ پہلی کامیاب بغاوت تھی اور وہ کھلم کھلا کہتے تھے کہ بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور وہ تاریخ میں دوسرا مہاتما بدھ بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ گاندھی نے اس واقعہ پر اپنی بڑی ہتک محسوس کی۔ جس کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے اپنے جسم پر راکھ ملی اور بوریا لپیٹ کر پرارتھنا سبھا میں آیا اور یہ اعلان کیا کہ میں نے تین دن قبل ایک غلطی کی تھی۔ میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔ اگرچہ اس اقبال جرم سے میرے ذہن پر سے بوجھ اتر گیا ہے لیکن مجھے اپنا اعتماد بحال کرنے میں بہت وقت لگے گا اور وہ اس مقصد کے لیے نواکھلی کے فساد زدہ علاقے میں چلا گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ کانگرس میں اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔[9] پانیکر نے کیمبل جانسن سے بات چیت میں پٹیل اور گاندھی کے درمیان تین ماہ قبل کے جس تصادم کا ذکر کیا تھا اس کا تعلق اسی واقعہ سے تھا اور اب گاندھی برت کے ذریعے پٹیل کو نیچا دکھا کر کانگرس میں اپنی اعلیٰ ترین حیثیت کو بحال کر رہا تھا۔ نہرو پہلے ہی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ کانگرس کی قیادت کے اس داخلی بحران سے پاکستان میں پٹیل گروپ کے عزائم کے بارے میں اور بھی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ 16 / جنوری کو نیویارک ہیرلڈ ٹربیون کے نامہ نگار نے کراچی سے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ ''پاکستان میں ہندوستان کے توسیع پسندانہ عزائم کے بارے میں بہت خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ پاکستانیوں کو یقین ہے کہ

ہندو لیڈروں نے برصغیر کی تقسیم کو دل سے قبول نہیں کیا اور وہ 15 / اگست 1947ء کے بعد سے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ اس نوزائیدہ ریاست کا ابتدا ہی میں گلا گھونٹ دیا جائے...... اگرچہ میں پاکستانیوں کے اس بیان کو فرمانِ الٰہی کی طرح سو فیصد مبنی بر حقیقت تو تصور نہیں کرتا لیکن ان کی جانب سے جو حقائق پیش کئے جاتے ہیں ان سے ان کے اس مؤقف کی عمومی طور پر تائید ہوتی ہے کہ ہندوستان پاکستان کو جتنی جلدی ہو سکے تباہ و برباد کر کے اسے دہلی کی ڈومینین میں شامل کرنا چاہتا ہے۔"[10]

18 / جنوری کو گاندھی نے اپنا برت ختم کر دیا کیونکہ ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور ابوالکلام آزاد نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب دہلی میں امن و امان ہو گیا ہے۔ آئندہ دارالحکومت میں مسلمانوں کا قتل عام نہیں ہوگا، بلوائیوں نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی مرمت کر دی جائے گی اور مسلمان مہاجرین کی ریل گاڑیوں پر حملے نہیں ہوں گے۔ لیکن اس کے برت کا اولین مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ ابوالکلام آزاد کے بقول سردار پٹیل بدستور خودسر تھا۔ اس نے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔ اس نے بمبئی سے واپس آ کر جب گاندھی سے ملاقات کی تو اس میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے روکھا پن ٹپکتا تھا۔ حالانکہ گاندھی اس سے بہت مشفقانہ طور پر پیش آیا تھا۔[11] اس رسمی سی ملاقات سے واضح ہو گیا تھا کہ ابھی پٹیل اور نہرو کے اختلافات دور ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پٹیل کو بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے بورژوا طبقے کی مکمل تائید و حمایت حاصل تھی۔ سرکاری مشینری اور کانگرس کی تنظیم میں اس کی بالادستی تھی۔ اسے آسانی سے نیچا نہیں دکھایا جا سکتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو بھی اس حقیقت کا شدید احساس تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ نہرو اور پٹیل میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کانگرس دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور پورا ملک انتشار و لاقانونیت کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے گاندھی کا برت ختم ہونے کے بعد "شہنشاہ معظم" کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ "بلاشبہ گاندھی کے برت کا ایک مقصد نہرو اور پٹیل میں صلح کرانا تھا۔ چند ہفتوں سے نہرو اور پٹیل کے تعلقات میں بہت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور ہر لمحہ یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ ان میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ دونوں اکثر ایک ہی جگہ اور ایک ہی موضوع پر تقریریں کرتے تھے لیکن ایک دوسرے کا کوئی حوالہ نہیں دیتے تھے۔ جو بات ایک کہتا تھا دوسرا اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ

معلومات مہاتما گاندھی سے ملتی تھیں۔ برت کے دوسرے دن جب پٹیل مجھے ملنے کے لیے آیا تو اس کا رویہ عجیب وغریب تھا۔ اسے برت رکھنے کے بارے میں گاندھی کے یک طرفہ فیصلے پر غصہ تھا۔ اسے اس قسم کا غصہ زندگی میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس مقصد کے لیے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ برت کا مہاتما کی امید کے برعکس نتیجہ نکلے گا اور اس سے اس (پٹیل) کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی ہے۔ اس کے خیال میں فرقہ وارانہ تعلقات کو بہتر بنانے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ مغربی پاکستان سے سارے ہندوؤں اور سکھوں اور مشرقی پنجاب اور اس کے قریب متاثرہ علاقوں سے سارے مسلمانوں کو نکال لیا جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا امکان ختم ہونے سے بقیہ ہندوستان کے بقیہ مسلمانوں کو تحفظ کی ضمانت مل جائے گی...... نہرو بھی مجھے برت کے دوسرے دن ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس کا موقف پٹیل سے بالکل مختلف تھا۔ اسے مہاتما گاندھی کے اقدام پر خوشی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لوگوں کو ہوش میں لانے کے لیے اس قسم کے اقدام کی ضرورت تھی۔ نہرو نے بتایا تھا کہ اس نے برت کے اعلان سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے گاندھی سے ملاقات کی تھی۔"[12]

ابوالکلام آزاد لکھتا ہے کہ "گاندھی کے برت رکھنے پر صرف پٹیل کو ہی غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اور بھی بہت سے متعصب ہندو، جنہیں گاندھی کا یہ اقدام پسند نہیں تھا، بہت برہم تھے۔ مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ سے تعلق رکھنے والے ہندو کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ گاندھی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی امداد کر رہا ہے۔ وہ گاندھی کی پرارتھنا کے دوران قرآن اور انجیل کی تلاوت کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ انہوں نے گاندھی کے خلاف اشتعال انگیز اشتہار اور پمفلٹ چھاپے تھے جن میں گاندھی کو ہندوؤں کا دشمن قرار دیا گیا تھا اور ایک پمفلٹ میں تو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر گاندھی نے اپنا راستہ نہ بدلا تو اسے غیر موثر کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں گے۔"[13]

پاکستان کے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے پٹیل کی 6/جنوری کی تقریر اور اس کے بعد انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز پراپیگنڈے کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ اس نے 19/جنوری کو ایک بیان میں کہا کہ انڈین یونین کے جن لیڈروں نے ہندوستان کی تقسیم کو دل سے قبول نہیں کیا ہے وہ پاکستان کی پیدائش کے دن سے

ہی اسے ختم کرنے کے لیے بڑے لمبے چوڑے منصوبے بناتے رہے ہیں۔ سردار پٹیل کی زبردست خواہش ہے کہ پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو اور وہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتا رہا ہے۔"[14]

اگلے دن یعنی 20 ر جنوری کو گاندھی کی پرارتھنا کی میٹنگ میں ایک بم کا دھما کا ہوا۔ خوش قسمتی سے کوئی شخص زخمی تو نہ ہوا لیکن یہ پتہ چل گیا کہ کوئی منظم گروہ گاندھی کے قتل کے درپے ہے۔ خیال تھا کہ اس واقعہ کے بعد دہلی کی پولیس اور سی۔آئی۔ڈی گاندھی کی حفاظت کا معقول انتظام کریگی۔ مگر ایسا نہ ہوا اور 30 ر جنوری کی شام کو جب گاندھی حسب معمول برلا ہاؤس کے کھلے میدان میں آیا تو گجرات کے ایک ہندو نوجوان نتھورام گوڈسے نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ خبر سن کر نہرو، پٹیل اور دوسرے کانگریسی لیڈر فوراً موقع پر پہنچے اور تھوڑی دیر بعد ماؤنٹ بیٹن بھی وہیں پہنچ گیا۔ اس نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر نہرو اور پٹیل کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے دونوں سے کہا کہ "اب گاندھی کی خواہش کے مطابق صلح کرلو۔ آج شام دونوں ہی ریڈیو پر تقریریں کرو اور اس طرح یہ ثابت کر دو کہ آئندہ تم دونوں شانہ بشانہ چل کر گاندھی کی پالیسی پر عمل کرو گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو سے کہا کہ تم پٹیل کو پیار کرو اور صلح کرو۔ چنانچہ وہ دونوں بغل گیر ہوئے۔ اس وقت ان دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔"[15] لیکن یہ صلح صفائی بالکل عارضی ثابت ہوئی۔ اگلے ہی دن ایک تعزیتی جلسے میں نہرو کے ایک حامی جے پرکاش نارائن نے پٹیل پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس نے الزام عائد کیا کہ گاندھی کے قتل کی ذمہ داری پٹیل پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اس نے وزیر داخلہ کی حیثیت سے باپو کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں کیا تھا۔ پروفولا چندر گھوش اور بعض دوسرے کانگرسی لیڈروں نے بھی پٹیل کی مذمت کی۔

ہندوستان کے اکثر بورژوا مؤرخین جب گاندھی کے قتل کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نہرو اور پٹیل تضاد کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔ وہ اپنا سارا زور قلم یہ ثابت کرنے پر لگاتے ہیں کہ گاندھی کوئی عام قسم کا بورژوا سیاسی لیڈر نہیں تھا بلکہ وہ ایک عظیم انسان اور مہاتما تھا۔ وہ عدم تشدد اور صلح و آشتی کا دیوتا تھا۔ اس کی شخصیت دین و مذہب، رنگ و نسل اور ذات پات سے بالاتر تھی۔ وہ اعلیٰ ترین سیاسی، معاشی، معاشرتی ثقافتی اور مذہبی اصولوں کا علمبردار تھا۔ وہ عالمگیر اخوت ومحبت کا پیامبر تھا۔ اس نے پاکستان اور مسلمانوں کے لیے جان دی تھی۔ وہ شہید اعظم تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان

کے بورژوا طبقے کی جانب سے گاندھی کے بارے میں اس قسم کے گمراہ کن یا مبالغہ آمیز پراپیگنڈے کا مقصد وہی ہے جو ہر ملک کے حکمران طبقے کو ہمہ وقت عزیز ہوتا ہے۔ یعنی ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو جوں کا توں رکھا جائے۔ ہندوستانی بورژوا مؤرخین، اخبار نویس اور دوسرے دانشور شب و روز یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان کی ساری مشکلات کا حل مہاتما گاندھی کی تعلیمات پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔ ان تعلیمات میں مرکزی تعلیم یہ ہے کہ ہر حالت میں عدم تشدد کے اصول پر عمل کیا جائے۔ یعنی مزدوروں، غریب کسانوں، اچھوتوں اور دوسرے مظلوم عوام کو طبقاتی جدوجہد کے دوران تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ طبقاتی جدوجہد ہی نہیں کرنی چاہیے۔ ان دانشوروں کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہندوؤں کے اس سیاسی اور مذہبی لیڈر کو پہلے مسلمانوں کا خیر خواہ ثابت کیا جائے اور پھر یہ ثابت کیا جائے کہ جناح کا دوقومی نظریہ غلط تھا اور گاندھی کا ایک قومی نظریہ صحیح تھا۔ تاہم اس سارے پراپیگنڈے سے نہ تو ہندوستان میں طبقاتی انقلاب کا عمل رکا ہے اور نہ ہی دوقومی نظریہ غلط ثابت ہوا ہے۔ چونکہ 12 رجنوری 1948ء کو گاندھی کے برت کا پاکستان اور مسلمانوں کی خیر خواہی سے فی الحقیقت کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق دراصل کانگرس کے اندر دو دھڑوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی سے تھا اس لیے جب 30 رجنوری کو اس کی ہلاکت ہوئی تو اس کا ہندوستان اور پاکستان کے کشیدہ تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے اس موقع پر جو تعزیتی پیغام بھیجا تھا اس میں گاندھی کو محض ''ہندو فرقے کی عظیم شخصیت کہا گیا تھا اور یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اس نے پاکستان اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں اپنی جان دی ہے۔

گاندھی کی ہلاکت سے ہندوستان کے تعلقات میں کوئی بہتری نہ ہوئی بلکہ بین المملکتی حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے چلے گئے۔ ہندوستان میں پاکستان کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈا جاری رہا اور پاکستانی عوام شب و روز اس خطرے میں مبتلا رہے کہ ہندوستان کسی وقت بھی پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ لہٰذا لندن ٹائمز کی 26 رفروری 1948ء کی ایک رپورٹ میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی کہ ''ہر پاکستانی کو صحیح یا غلط طور پر یہ یقین ہے کہ اس کے ملک کی خودمختاری کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ اسے خوف ہے کہ بڑی ڈومینین پاکستان کو تباہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ وہ تقسیم کی سکیموں کو منظم طریقے سے تباہ کر رہی ہے۔ کوئلہ، ریلوے کا سامان اور دوسری

ضروریات زندگی کے روکنے، فوجی ساز وسامان کو دانستہ طور پر نہ بھیجنے اور مسلمانوں کے قتل عام کی کاروائیاں دراصل ہندوستان کو زبردستی دوبارہ متحد کرنے کے طے شدہ خفیہ منصوبے کا حصہ ہیں۔"[16] مارچ 1948ء میں راؤنڈ ٹیبل کی رپورٹ یہ تھی کہ "پاکستان کے لوگوں میں یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ آیا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کو زیادہ دیر روکا جاسکتا ہے۔"[17]

تاہم اگر کہیں کسی حلقے میں گاندھی کی ہلاکت کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کی کوئی امید پیدا ہوئی بھی تھی تو وہ یکم اپریل 1948ء کو خاک میں مل گئی جبکہ حکومت ہندوستان نے راوی اور ستلج سے مغربی پنجاب کو سیراب کرنے والی نہروں کا پانی یکا یک بند کر دیا۔ نوزائیدہ پاکستان کی معیشت کے لیے یہ اچانک حملہ فی الحقیقت جان لیوا تھا۔ نہر اپر باری دوآب اور نہر دیپالپور ان دریاؤں سے نکلتی تھیں اور ان سے لاہور، منٹگمری (ساہیوال)، ملتان اور بہاولپور کے اضلاع کا تقریباً 17 لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا تھا۔ علاوہ بریں لاکھوں لوگ اس نہری نظام سے اپنے اور اپنے مویشیوں کے لیے پینے کا پانی بھی حاصل کرتے تھے کیونکہ ان کے علاقوں کا زیر زمین پانی بہت کھاری تھا۔ جب نہری پانی یکا یک بند ہو گیا تو ان کے لیے قیامت برپا ہو گئی۔ پورے پاکستان میں واویلا ہونے لگا۔ ہر طرف سے یہی آوازیں آتی تھیں کہ دشمن بہت کمینہ ہے۔ یہ نہیں چھوڑے گا۔ مغربی پنجاب کا وسیع علاقہ بنجر ہو جائے گا۔ ہرے بھرے کھیت بے آب وگیاہ صحرا بن جائیں گے۔ خانماں برباد مہاجرین کی تعداد میں لاکھوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ سب کہاں جائیں گے؟ کہاں سے کھائیں گے؟ اتنا بڑا قحط پڑے گا کہ دنیا 1943ء کے بنگال کے قحط کو بھول جائیگی۔

حکومت ہندوستان کی اس انتہائی سنگدلانہ کاروائی کی بنیاد سراسر دغا بازی، دھاندلی اور غنڈہ گردی پر تھی۔ اگرچہ ریڈ کلف ایوارڈ میں ان دونوں دریاؤں کے ہیڈ ورکس ہندوستان کے حوالے کر دیئے گئے تھے لیکن پنجاب کی بٹوارا کمیٹی میں ہندوستان کے نمائندوں نے یقین دلایا تھا کہ مغربی پنجاب کو نہری پانی کی اتنی ہی سپلائی ہوتی رہے گی جتنی کہ تقسیم ہند سے پہلے ہوتی تھی۔ ریڈ کلف نے بھی اپنے ایوارڈ میں اس قسم کی امید ظاہر کی ہوئی تھی۔ لہٰذا مغربی پنجاب کے نمائندے مطمئن رہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ کسی باقاعدہ بین المملکتی معاہدے کی عدم موجودگی میں نہری پانی کی تقسیم کے بارے میں مشرقی پنجاب کے نمائندوں کی

یقین دہانی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے پنجاب کی نہروں کی مالیت کے تنازعہ کو ثالثی ٹربیونل کے سپرد کر دیا لیکن نہری پانی کی سپلائی کے بارے میں ثالثی کروانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ پنجاب کے مسلم لیگی جاگیرداروں سے اس سے بہتر کارکردگی کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ حکومت ہندوستان نے ان جاگیرداروں کی مجرمانہ غفلت اور غیر ذمہ داری سے فائدہ اٹھایا۔ 31/مارچ 1948ء کو ثالثی ٹربیونل کی میعاد ختم ہوئی تو اس نے یکم اپریل کو راوی اور ستلج کی نہروں کا پانی بند کر دیا۔ پاکستان ایام طفلی میں ہی فی الحقیقت زندگی و موت کے مسئلے سے دوچار ہو گیا۔ حکومت پاکستان نے پہلے تو اخباری بیانات اور سرکاری خط و کتابت کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی مگر جب دو تین ہفتے تک کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وزیر خزانہ غلام محمد کی زیر سرکردگی ایک وفد تصفیہ کے لیے دہلی گیا۔ وہاں کئی دن تک بے سود بات چیت ہوتی رہی جس کے دوران ہندوستان کے نمائندوں کا مؤقف یہ تھا کہ مغربی پنجاب کو ان نہروں کے پانی کی سپلائی صرف اسی صورت میں بحال کی جائے گی کہ پہلے راوی اور ستلج کے سارے پانی پر ہندوستان کا حق تسلیم کیا جائے۔ انہوں نے اس تنازع کو بین الاقوامی عدالت کے روبرو پیش کرنے کی تجویز اس بنا پر مسترد کر دی کہ انہیں برطانوی کامن ویلتھ کے دو ملکوں کے باہمی تنازعے کو بین الاقوامی عدالت سے تصفیہ کرانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل وہ پاکستان کو کھلم کھلا بلیک میل کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مغربی پنجاب ان نہروں کے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

غلام محمد نے اس صورت حال کے پیش نظر ماؤنٹ بیٹن سے امداد کی اپیل کی تو 4/مئی کو اس سے ایک معاہدے پر دستخط کروا لیے گئے جس میں کہا گیا تھا کہ مشرقی پنجاب کی حکومت سنٹرل باری دوآب اور دیپالپور کی نہروں کے لیے پانی کی سپلائی میں بتدریج کمی کرے گی تاکہ مغربی پنجاب کی حکومت کو متبادل ذرائع کا بندوبست کرنے کے لیے مناسب وقت مل سکے۔ اب ان نہروں میں پانی کی سپلائی بحال کی جارہی ہے۔ حکومت مغربی پنجاب بعض متنازعہ واجبات کی پیشگی ادائیگی کے لیے ہندوستان کے وزیر اعظم کی مقرر کردہ رقم ادا کرے گی اور اس تنازعہ کے قانونی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے دونوں ملکوں کے نمائندوں کے درمیان اس امید میں ملاقاتیں ہونگی کہ اس کا دوستانہ طریقے سے تصفیہ ہو جائے گا۔ اس معاہدے کا صاف مطلب یہ تھا کہ حکومت ہندوستان نہری پانی کے سلسلے میں حکومت پاکستان کو بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ہندوستان نے راوی، بیاس اور ستلج کے سارے پانی پر اپنا حق تسلیم کروالیا تھا۔ پاکستان نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے اور اب لاہور، منٹگمری (ساہیوال)، ملتان اور بہاولپور کی بیشتر آبادی ہندوستان کے رحم و کرم پر تھی۔ ہندوستان نے پاکستان کی شہ رگ پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ نہروں میں پانی کی سپلائی عارضی طور پر بحال کر کے دراصل پاکستان سے کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی۔ ایسا محض اس لیے کیا گیا تھا کہ اس وقت تک مشرقی پنجاب میں اس فالتو پانی کے استعمال کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بھاکڑا ڈیم کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور نہریں بھی نہیں تھیں۔ اس شرمناک معاہدے پر مغربی پنجاب کی حکومت کی طرف سے ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات نے بھی دستخط کئے تھے۔

معاہدے میں دوستانہ تصفیے کی امید کا ذکر تو محض رسمی تھا۔ دوستانہ تصفیہ نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ کئی سال تک دونوں ملکوں کے نمائندوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہر ملاقات میں ہندوستان کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور ہر سال پانی کی سپلائی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہندوستان نے 1952ء میں نہر اپر باری دوآب سے ایک ذیلی نہر کی تعمیر کا کام مکمل کرلیا اور مغربی پنجاب کو راوی کے پانی کی سپلائی تقریباً بند ہوگئی۔ 1953ء میں جب مغربی پاکستان میں غذائی قلت پیدا ہوئی تو اس وقت مشرقی پنجاب میں اناج کی فراوانی تھی۔ چنانچہ پاکستان نے عالمی بنک کی طرف رجوع کیا تو وادی سندھ کے پانی کے تنازعہ پر سہ طرفی گفت وشنید کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس کے دوران پاکستان کے بعض بڑے افسروں اور انجینئروں کی موج لگ گئی۔ انہوں نے اپنی پسماندہ اور غریب قوم کے مفاد سے بالکل بے پرواہ ہوکر واشنگٹن اور نیویارک میں خوب دادِعیش دی۔ ان کے اسکینڈلوں کی خبریں پاکستان میں بھی پہنچیں لیکن یہاں انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ پنجاب کا جاگیردار طبقہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوکر بڑی بے شرمی سے اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھا۔ اسے ان بدکردار افسروں سے باز پرس کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ان میں سے ایک بڑا افسر تو جاگیردار طبقے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے کون پوچھ سکتا تھا۔ پاکستان کے عوام میں ابھی اس حقیقت کا احساس وشعور پیدا نہیں ہوا تھا کہ یہاں کا رجعت پسند جاگیردار طبقہ ان کا اتنا ہی بڑا دشمن ہے جتنا کہ ہندوستان کا توسیع پسند بورژوا طبقہ۔

پانی کے تنازعے کا ''دوستانہ تصفیہ'' نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم ہند کے فوراً بعد پیدا شدہ تجارتی کشیدگی نے ستمبر 1949ء میں شدید معاشی جنگ کی

صورت اختیار کر لی تھی۔ تقریباً دو سال تک بین الملکتی تجارت معطل رہی تھی۔ اس عرصے میں ہندوستان میں پٹ سن اور پارچہ بافی کے متعدد کارخانے بند پڑے رہے کیونکہ انہیں پاکستان سے خام پٹ سن اور کپاس مہیا نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان میں کوئلے، لوہے، سیمنٹ، کھانڈ اور بعض دوسری اشیائے صرف کی بہت قلت رہی کیونکہ اسے یہ اشیا بڑے دور دراز ممالک سے درآمد کرنا پڑتی تھیں۔ وہ اس معاشی جنگ سے اس لیے بچ نکلا کہ کوریا کی جنگ کی وجہ سے اس کی خام زرعی اشیا کی بین الاقوامی منڈی میں مانگ اور قیمت یکا یک بہت بڑھ گئی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے عوام نے ان دنوں اپنی قومی آزادی کے تحفظ کے لیے بڑی ہمت سے ہر قسم کی مشکلات برداشت کیں۔ بالخصوص مشرقی پاکستان کے عوام نے بہت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ کی وجہ سے نہ صرف ان کی پٹ سن کا مندا ہو گیا تھا بلکہ ان کے لیے متعدد ضروریات زندگی بالکل نایاب ہو گئی تھیں۔

دونوں ملکوں کے درمیان اس معاشی جنگ کی ابتدا دراصل آزادی کے فوراً ہی بعد ہو گئی تھی جبکہ ہندوستان نے پٹ سن اور اس کی مصنوعات کی برآمدی ڈیوٹی میں سے پاکستان کو کوئی حصہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان نے یہ مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ چونکہ چٹا گانگ کی بندرگاہ بہت چھوٹی ہے اور یہاں بحری جہازوں کی آمد و رفت کے لیے بہت کم سہولتیں مہیا ہیں اور چونکہ ہندوستان کلکتہ کی بندرگاہ سے پٹ سن اور اس کی مصنوعات کی جو برآمدی تجارت کرتا ہے اس کا 90 فیصد انحصار مشرقی پاکستان سے خام پٹ سن کی سپلائی پر ہے اس لیے پاکستان کو برآمدی ڈیوٹی میں سے مناسب حصہ ملنا چاہیے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ پاکستان میں سرکاری آمدنی کے دوسرے ذرائع بہت محدود ہیں۔ لیکن ہندوستان کے لیے یہ مؤقف قابل قبول نہیں تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ تقسیم ہند سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کے تحت پاکستان حسب معمول ہندوستان کو پٹ سن اور دوسری خام زرعی اشیا سپلائی کرنے کا پابند ہے اور اسے برآمدی ڈیوٹی میں سے کوئی حصہ نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے 13 نومبر 1947ء کو مشرقی پاکستان سے ہندوستان اور دوسرے غیر ممالک کو پٹ سن کی برآمد پر 15 روپے فی گانٹھ کے حساب سے ڈیوٹی عائد کر دی۔ اس سلسلے میں جو سرکاری بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ سال رواں کے بجٹ میں پٹ سن کی برآمدی ڈیوٹی کی آمدنی کا تخمینہ ساڑھے

پانچ کروڑ روپے ہے۔ اس میں سے تقریباً 90 فیصد رقم کلکتہ کی بندرگاہ پر وصول ہوگی اور تقریباً 10 فیصد کی وصولی چٹاگانگ کی بندرگاہ پر ہوگی۔ حکومت پاکستان اتنی بڑی رقم کے بغیر گزارا نہیں کر سکتی۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ ہو جائے لیکن حکومت ہندوستان کے مسلسل انکار کی وجہ سے ہم یہ ڈیوٹی عائد کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر ہندوستان نے پاکستان کی اس کاروائی پر بہت برا منایا۔ کلکتہ میں پٹ سن کے کارخانوں کے مارواڑی مالکان یہ ''نقصان'' برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ہندوستان نے جوابی کاروائی کے طور پر یکم مارچ 1948ء کو پاکستان کو ''غیر ملک'' قرار دے کر اس کے ساتھ ہر قسم کی تجارت پر کسٹم ڈیوٹی اور ایکسائز ڈیوٹی عائد کر دی اور یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ پاکستان کے ساتھ ہر قسم کی تجارت درآمدی و برآمدی کنٹرول ایکٹ کے تحت ہوگی۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ہندوستان میں پٹ سن، کپاس اور دوسری خام زرعی اشیا کی قلت ہو گئی اور پاکستان میں لوہے، کوئلے، سیمنٹ، کھانڈ، تیل اور کپڑے کی کمی ہو گئی۔

یہ صورت حال تقریباً دو ماہ تک جاری رہی۔ بالآخر مئی میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک سال کے لیے تجارتی معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ پاکستان ہندوستان کو پٹ سن، کپاس، خوردنی اجناس اور چمڑا مہیا کریگا اور ہندوستان اس کے بدلے پاکستان کو کوئلہ، لوہا، کپڑا کاغذ اور ریلوے کا سامان دے گا۔ لیکن بین المملکتی تعلقات تنازعۂ کشمیر اور دوسرے متعدد تنازعات کی بنا پر اس قدر کشیدہ ہو چکے تھے کہ اس پہلے تجارتی معاہدے پر تسلی بخش طریقے سے عمل نہ ہوا۔ باہمی اعتماد کی عدم موجودگی میں فریقین کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہوتی تھی اور کسی نہ کسی چیز کی سپلائی رک جاتی تھی۔ اکتوبر میں ایک بین المملکتی کانفرنس ہوئی جس میں تجارتی مشکلات دور کرنے کے مسئلے پر غور کیا گیا مگر اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور قومی تضاد شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ماہنامہ راؤنڈ ٹیبل نے اپنی جون 1948ء کی اشاعت میں لکھا کہ ہندوستان میں بہت سے لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ پاکستان ایک غیر قدرتی اور مصنوعی پیداوار ہے۔ یہ بہت جلدی تباہ و برباد ہو جائے گا اور ہمیں ہر قسم کی چھیڑ چھاڑ سے اس کے تباہ ہونے کے عمل کو تیز کرنا چاہیے۔[18] 30 / جون 1949ء کو ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت بین المملکتی تجارت پر عائد کردہ پابندیوں کو کچھ نرم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وجہ یہ تھی

ان پابندیوں سے ہندوستان کا زیادہ نقصان ہوا تھا۔ چونکہ 49-1948ء میں تجارت کا توازن پاکستان کے حق میں رہا تھا اس لیے اب ہندوستان اپنی ہی طرف سے عائد کردہ ساری تجارتی پابندیوں کو ختم کر کے کسٹم یونین کے حق میں ہو گیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ تجارتی ناکہ بندی سے پاکستان کی زرعی معیشت تباہ نہیں ہوگی۔ پاکستان کے عوام روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لیں گے لیکن ہندوستان کی غلامی قبول نہیں کریں گے۔ لیکن اس معاہدے سے بھی بین المملکتی کشیدگی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان نے ماؤنٹ بیٹن کے ذریعے برطانوی سامراج پر زبردست سفارتی دباؤ ڈال کر پہلے تو مارچ میں تنازعۂ کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل سے اپنے حق میں قرارداد منظور کرائی تھی اور پھر اس نے مئی میں کشمیر کے سارے علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے بھرپور حملہ کر دیا تھا اور اس بنا پر پاکستان کی باقاعدہ فوج کو مدافعتی جنگ میں شریک ہونا پڑا تھا۔ ہندوستان کا وزیراعظم نہرو ان دنوں حسب معمول دوغلی باتیں کرتا تھا۔ کبھی تو وہ تنازعہ کشمیر اور دوسرے تنازعات کے پرامن تصفیہ کے لیے دوطرفہ کانفرنس کی تجویز پیش کرتا اور کبھی کھلم کھلا جنگ کی دھمکی دیتا تھا۔ پاکستان کی وزارت خارجہ نے نہرو کی اس منافقانہ اور دوغلی پالیسی کا سخت نوٹس لیا اور 29 / جولائی کو ایک بیان میں ساری دنیا کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ ”پنڈت نہرو نے ابھی تک تقسیم کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ اب یہ بات روز بروز واضح ہو رہی ہے کہ پنڈت نہرو اور دوسرے ہندوستانی لیڈروں نے ذہنی تحفظات کے ساتھ تقسیم کی منظوری دی تھی۔ جب تک ان کا یہ رویہ قائم ہے اس وقت تک خواہ کتنی ہی کانفرنسیں کی جائیں دونوں کے درمیان باقاعدہ اور ہمسائیگی کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے اگرچہ پاکستان ایسے تعلقات کا خلوص دل سے خواہاں ہے۔“[19]

باب: 4

# لیاقت ۔ نہرو معاہدہ اور بھرپور بین المملکتی جنگ کے خطرات

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوسرے تجارتی معاہدے پر ابھی دو اڑھائی ماہ تک ہی عمل ہوا تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے بین المملکتی تجارت میں یکا یک تعطل پیدا کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ جب برطانیہ نے ستمبر 1949ء میں اپنی کرنسی کی قیمت میں تقریباً 30 فیصد کی کمی کی تو ہندوستان نے فوراً اس کی تقلید میں اپنی کرنسی کی قیمت میں بھی اسی تناسب سے کمی کر دی مگر پاکستان نے اپنی کرنسی کی قیمت میں کوئی کمی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ پاکستان کے ایک سو روپے کی مالیت ہندوستان کے ایک سو چوالیس روپے کے برابر ہوگی۔ بین المملکتی تجارت میں ہندوستانی اشیا کی قیمت اسی تناسب سے کم ہوگی اور پاکستانی اشیا کی قیمت اسی شرح مبادلہ کے مطابق زیادہ ہوگی۔ عالمی بنک نے پاکستانی معیشت کے اعداد و شمار کا جائزہ لے کر اس حق کو تسلیم کر لیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے سکے کی قیمت برقرار رکھ سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی حکومت نے پہلے تو 28 ستمبر کو بذریعہ تار پاکستان کی کرنسی کی نئی شرح مبادلہ کو تسلیم کر لیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے نئی شرح کے مطابق تجارت کرنے سے انکار کر دیا اور اس بنا پر دونوں ملکوں کے درمیان ایک اور معاشی جنگ شروع ہوگئی۔ حکومت ہندوستان کا خیال تھا کہ پاکستان کی معیشت تجارتی بائیکاٹ کی زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکے گی۔ اسے اپنی پٹ سن طوعاً و کرہاً ہندوستان کے پاس ہی بیچنا پڑے گی۔ بین الاقوامی منڈی میں پٹ سن کے گاہکوں کی کمی تھی اور جو گاہک تھے وہ بھی پاکستان کی کرنسی کی نئی شرح مبادلہ کے مطابق قیمت ادا کرنے پر آمادہ نہیں تھے

ویسے بھی چٹا گانگ کی چھوٹی سی بندرگاہ سے پاکستان کی ساری پٹ سن کی بروقت برآمد نہیں ہوسکتی تھی اور مشرقی پاکستان کے اندر اس کی کھپت اس لیے ممکن نہیں تھی کہ وہاں پٹ سن کی مصنوعات بنانے کا کوئی کارخانہ ہی نہیں تھا۔ پٹ سن کے سارے کارخانے کلکتہ کے گردونواح میں واقع تھے۔ ان کارخانوں کے مارواڑی مالکان نے ڈھاکہ اور چٹا گانگ میں اپنے دفاتر کھولے ہوئے تھے اور مشرقی پاکستان میں پٹ سن کی تھوک تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ وہ کسانوں اور چھوٹے مالکان اراضی کو قرضہ دیتے تھے اور پھر فصل کے موقع پر اپنی ہی مقرر کردہ قیمت پر ساری پٹ سن خرید لیتے تھے۔ حکومت ہندوستان کو امید تھی کہ جب یہ مارواڑی نئے نرخوں پر پٹ سن خریدنے سے انکار کریں گے تو پورے مشرقی پاکستان میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ مشرقی پاکستان کے غریب کسان اور چھوٹے مالکان اراضی اپنی فصل کا ذخیرہ نہیں کر سکتے تھے اور حکومت مشرقی پاکستان کی پاس بھی پٹ سن کا بڑے پیمانے پر ذخیرہ کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ہندوستان کے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل کا اعلان یہ تھا کہ اگر ہمارے کارخانے بند رہیں تو ہمیں کچھ پرواہ نہیں۔ ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ ایک سو روپے کی مالیت کی پاکستانی پٹ سن کے 145 روپے ادا کریں۔ [1]

حکومت ہندوستان کے اس رویے کی بنا پر 1949ء کا بین المملکتی تجارتی معاہدہ عملاً ختم ہو گیا۔ پاکستان کی 60 فیصد بیرونی تجارت ہندوستان کے ساتھ تھی اور ہندوستان بیرونی ممالک کو جو مال بھیجتا تھا اس کا 30 فیصد حصہ پاکستان آتا تھا۔ ہندوستان نے پاکستان کو کوئلے کی سپلائی اس بنا پر بالکل بند کر دی کہ حکومت پاکستان نے ہندوستانی گاہکوں کو پٹ سن کی تین لاکھ گانٹھیں پرانے نرخوں پر سپلائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہندوستان نے فیروز پور ہیڈ ورکس سے دیپالپور نہر کو پانی کی سپلائی بھی بند کر دی اور پٹرول، تیل اور دوسری اشیائے صرف کی تجارت کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ہندوستان کی طرف سے دھمکی دی گئی کہ مغربی پنجاب کو نہروں کے پانی کی سپلائی بالکل بند کر دی جائے گی اور جوگندر نگر سے بجلی کی سپلائی بھی روک لی جائے گی۔ پاکستان کی جوابی دھمکی یہ تھی کہ مشرقی پنجاب کو کراچی اور لاہور کے راستے سے پٹرول اور تیل کی سپلائی نہیں ہوگی اور مغربی بنگال اور آسام کے درمیان مشرقی پاکستان کے علاقے سے ریلوے کا جو رابطہ قائم ہے اسے ختم کر دیا

جائے گا۔ ہندوستان میں پٹ سن اور پارچہ بافی کے تقریباً ایک سو کارخانے بند ہو گئے اور پاکستان میں بہت سی ضروریات زندگی تقریباً نایاب ہو گئیں۔

حکومت پاکستان نے اکتوبر میں ایک جیوٹ بورڈ کی تشکیل کی۔ یہ ادارہ کسانوں سے مقررہ نرخوں پر پٹ سن خرید کر مسلمان تاجروں کی وساطت سے اس کی برآمد کا بندوبست کرتا تھا۔ یہ نیا انتظام دو تین مہینوں میں خاصا مستحکم ہو گیا اور جنوری 1950ء میں ظاہر ہونے لگا کہ ہندوستان کی تجارتی ناکہ بندی پاکستان کی معیشت کے لیے کمر توڑ نہیں ہے۔ بلکہ یہ پاکستان کے لیے سودمند ثابت ہو رہی ہے۔ پاکستان کو پٹ سن، کپاس، چمڑے اور دوسری زرعی اشیا کے لیے نئی بین الاقوامی منڈیاں مل رہی تھیں اور پاکستان کی کوئلے، لوہے اور اشیائے صرف کی ضروریات چین، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ممالک سے کسی حد تک پوری ہو رہی تھیں۔

جون 1950ء میں کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو پانسہ ہی پلٹ گیا۔ پاکستان کی زرعی اجناس کی مانگ اور قیمت میں یکا یک بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ جب یہ سال ختم ہوا تو پاکستان بہت سا زرمبادلہ کما چکا تھا اور ملک میں ضروریات زندگی کی قلت بھی بہت حد تک دور ہو چکی تھی۔ اب پاکستان کی معاشی زندگی اور موت کا ہندوستان کے ساتھ تجارت پر انحصار نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ہندوستان نے 25 رفروری 1951ء کو گھٹنے ٹیک دیئے۔ ہندوستان کے وزیر خزانہ نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ چونکہ دنیا کی معاشی صورت زرعی اجناس پیدا کرنے والے ممالک کے حق میں ہو گئی ہے اس لیے ہندوستان بدلے ہوئے حالات میں پاکستان کی کرنسی کی نئی شرح مبادلہ کو تسلیم کرتا ہے اور اس سے اس شرح کے مطابق تجارت کرنے پر آمادہ ہے۔ پاکستان کے وزیر خزانہ نے ہندوستان کے اس حقیقت پسندانہ اعلان کا خیر مقدم کیا اور اس طرح یہ بین المملکتی معاشی جنگ پاکستان کے حق میں انجام پذیر ہوئی۔ سیاسی طور پر پاکستان کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ ساری دنیا میں اس کے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات ختم ہو گئے۔

تقریباً ڈیڑھ دو سال کی اس معاشی جنگ کے دوران دونوں ملکوں کے درمیان ہمہ گیر خونی جنگ کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ یہ خطرہ اس قدر شدید تھا کہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے بیان کے مطابق دونوں ملک مکمل تباہی کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستان نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان کی سرحد پر جمع کر دی تھیں اور ساری دنیا میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ

ہندوستان مشرقی پاکستان پر بالکل اسی طرح حملہ کردے گا جس طرح اس نے اکتوبر 1947ء میں کشمیر پر کیا تھا۔ کلکتہ میں مشرقی پاکستان کی ''عبوری حکومت'' بھی بن گئی تھی۔ بالکل ایسی ہی حکومت جیسی کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی بنی تھی۔ پاکستان میں شہری دفاع اور زخمیوں کی دیکھ بھال کی تربیت کے لیے بہت سے مراکز کھل گئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ بین المملکتی جنگ کے شعلے کسی وقت بھی بھڑک اٹھیں گے۔

15 راگست 1947ء کے بعد جنگ کا دوسرا خطرہ بنیادی طور پر حکومت پاکستان کے اپنی کرنسی کی قیمت کم نہ کرنے کے فیصلے کی پیداوار تھا۔ چونکہ اس فیصلے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان ہر قسم کے تجارتی روابط بالکل ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے ڈھاکہ، چٹاگانگ اور مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں میں ہندوؤں کے بہت سے تجارتی مراکز بند ہو گئے تھے اور چونکہ معاشی کاروباری ہندو اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے نقل مکانی کر کے کلکتہ چلے گئے تھے۔ ان میں وہ مارواڑی بھی شامل تھے جن کے کاروباری مفادات پر جیوٹ بورڈ کی تشکیل سے مہلک ضرب لگی تھی۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ آئندہ مشرقی پاکستان میں ان کے لیے پٹ سن کے انتہائی منافع بخش کاروبار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ جب یہ لوگ کلکتہ پہنچے تو مقامی اخبارات میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ان کا پراپیگنڈہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہندو اقلیت کو دانستہ طور پر بیدخل کیا جارہا ہے اور پاکستانی اخبارات کا جوابی پراپیگنڈہ یہ تھا کہ ہندو سرمایہ دار محض اس خیال سے اپنے سرمائے سمیت کلکتہ چلے گئے ہیں کہ ان کے بغیر مشرقی پاکستان کی معیشت تباہ ہو جائے گی۔ ان کی نقل مکانی دراصل ہندوستان کی طرف سے جاری کردہ معاشی جنگ کے ایک حربے کے طور پر عمل میں آئی ہے۔

فریقین کے اس پراپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال کے دونوں صوبوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ پہلا چھوٹا سا فساد کھلنا میں ہوا جو پاکستانی اور برطانوی اخبارات کے مطابق بالکل غیر فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا۔ اس کے جواب میں فوراً ہی کلکتہ اور مغربی بنگال کے دوسرے شہری اور دیہاتی علاقوں میں ہندوستانی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور پھر جواب الجواب کے طور پر مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی وسیع پیمانے پر کشت و خون کی ابتدا ہوگئی۔ مغربی بنگال سے مسلمان مہاجرین کے لمبے لمبے قافلے مشرقی پاکستان میں آنے لگے اور مشرقی پاکستان

سے ہزاروں شرنارتھیوں نے مغربی بنگال میں پناہ لینی شروع کر دی۔

دسمبر 1949ء میں صورت حال بہت ہی خراب ہو گئی جبکہ ہندو مہا سبھا کے لیڈر ڈاکٹر کھارے نے کلکتہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کھلم کھلا یہ مطالبہ کیا کہ مشرقی پاکستان پر چڑھائی کر کے اسے دوبارہ ہندوستان میں شامل کر لیا جائے۔ اس نے کہا کہ ''ہم ذہنی طور پر برصغیر کی تقسیم کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ جو علاقے ہم سے الگ ہوئے ہیں انہیں پھر ہم سے متحد ہونا پڑے گا۔'' امریکی مؤرخ پروفیسر نارمن براؤن کے بیان کے بعد ڈاکٹر کھارے کے اس بیان کے مطابق کلکتہ میں ہندو مہا سبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی کونسل کی جانب سے مطالبہ کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کو بزور قوت ہندوستان میں شامل کر لیا جائے یا معاشی دباؤ کے ذریعے اس کو لگام ڈالی جائے۔ [2]

ان دنوں ہندوستان کا وزیراعظم جواہر لال نہرو کلکتہ گیا تو اس پر پبلک جلسوں میں دباؤ ڈالا گیا کہ پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے نہرو نے تو اس مطالبے کی فوراً تعمیل نہ کی البتہ نائب وزیراعظم سردار پٹیل نے 14 رجنوری 1950ء کو کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں اتنی اشتعال انگیز تقریر کی کہ وہ پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کے ہی مترادف تھی۔ اس نے بنگالی ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''1946ء میں مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے نتیجے میں کلکتہ میں جو کچھ ہوا تھا بنگال اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد نواکھلی کا المیہ ہوا۔ ہندوستان اور تم سب لوگ ان تاریک ایام کو کبھی نہیں بھول سکتے'' اس نے کہا کہ ''یہ کس قدر بدنصیبی کی بات ہے کہ جب چالیس سال قبل برطانیہ نے بنگال کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو ہم نے اس کی مزاحمت کی تھی۔ تم لوگوں نے تقسیم کی تباہی کے سدباب کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا تو اس وقت پورا ہندوستان تمہارے ساتھ تھا لیکن بعد ازاں ہمیں ایک اور طرح کی تقسیم کو منظور کرنا پڑا۔ ہمارے وہ احباب جو کل تک ہمارے ساتھ تھے آج ہمارے لیے غیر ملکی بن گئے ہیں۔ لیکن عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ آج بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ مصنوعی سرحدیں انہیں ہم سے الگ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے تعلقات اور معاشی روابط کو توڑا نہیں جا سکتا۔ ان کے رابطے میں مشکلات ہیں لیکن انہیں لازماً دور کرنا ہو گا۔ ہم ان کی امداد کیسے کر سکتے ہیں۔ اگر ہم جنوبی افریقہ کے عوام سے ہمدردی کا اظہار کر کے ان کی عملاً اعانت کر سکتے ہیں تو مشرقی پاکستان کے عوام کی اس سے زیادہ

آسانی کے ساتھ امداد کر سکتے ہیں۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ تمہاری بھارت ماتا کے اہم اعضا کاٹ لیے گئے ہیں۔ ذرا ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرو۔ اچھے دن ضرور آئیں گے۔ بنگال کو توسیع کے لیے مزید جگہ کی ضرورت ہے۔ میں آزمائش کی اس گھڑی میں اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ بنگال کی امداد کرنے کا انتہائی خواہش مند ہوں۔ [3]

سردار پٹیل کی اس تقریر کے بعد بنگال کے انتہا پسندوں کے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ مہاسبھا کے زیر اہتمام رضا کاروں کی ایک فوج کی تربیت کی گئی جس کے اخراجات پٹ سن کے کارخانوں کے مارواڑی مالکوں نے ادا کیے۔ مقصد یہ تھا کہ ان مسلح رضا کاروں کی مدد سے مشرقی پاکستان میں ایسی صورت حال پیدا کر دی جائے گی کہ حکومت ہندوستان کے لیے حیدر آباد کی قسم کا پولیس ایکشن کرنے میں آسانی ہوگی۔ ان رضا کاروں کی سرکردگی میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے دوسرے علاقوں میں مسلم اقلیت کے گھروں، دکانوں اور مسجدوں پر حملے کیے گئے اور چند ہی دنوں میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ مہاجرین مشرقی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق ہندوؤں نے کلکتہ کے مسلمانوں پر ایک منصوبہ کے تحت حملے کئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اتنی دہشت پھیلائی جائے کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور وزیر اعظم نہرو نے تسلیم کیا کہ ''مغربی بنگال کی مسلم اقلیت کے خلاف وحشت و بربریت کا جو مظاہرہ ہوا ہے وہ انتہائی شرمناک اور قابل افسوس ہے۔'' [4] تاہم مغربی بنگال میں مسلم اقلیت کا قتل عام مزید تقریباً دو مہینے تک جاری رہا اور اس کے ردعمل کے طور پر مشرقی پاکستان میں ہندوؤں پر مظالم ڈھائے گئے۔ تقریباً چار لاکھ خانماں برباد مسلمان ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آئے اور یہاں سے تقریباً اتنے ہی ہندوؤں نے مغربی بنگال میں پناہ لی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں، بالخصوص اتر پردیش میں بھی مسلم اقلیت کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ ان کی عورتیں اغوا کی گئیں، ان کا مال اسباب لوٹ لیا گیا اور ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

دریں اثنا پورے ہندوستان میں جنگ کا پراپیگنڈہ زور شور سے جاری رہا۔ بمبئی سے لے کر کلکتہ تک سارے اخبارات اور بہت سے سیاسی لیڈروں کا مطالبہ یہی تھا کہ پاکستان کے خلاف پولیس ایکشن کیا جائے۔ وزیر اعظم نہرو زیادہ دیر تک اس پر پیگنڈہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بالآخر فروری 1950ء کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کو جنگ کی ایک

اور دھمکی دے ہی دی۔ اس نے پہلے تو یہ تجویز پیش کی کہ بین الاقوامی ریڈ کراس کے نمائندے دونوں ملکوں کے وزراء کے ہمراہ فساد زدہ علاقوں کا دورہ کریں اور پھر کہا کہ اگر پاکستان نے یہ تجویز منظور نہ کی تو ہم اس مقصد کے لیے "دوسرے ذرائع" استعمال کریں گے۔ اس نے کہا کہ "کشمیر میں جو کچھ ہوا ہے اور مشرقی بنگال میں جو ہو رہا ہے ان دونوں کا آپس میں تعلق ہے۔ ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔[5] نہرو کی اس دھمکی نے بین المملکتی صورت حال میں مزید ابتری پیدا کر دی۔ پاکستان میں اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ حکومت ہندوستان مشرقی پاکستان میں ویسی ہی کاروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جیسی کہ اس نے 1947ء میں کشمیر میں کی تھی۔ بمبئی کے اخبار فری پریس جرنل نے بھی اس کا مطلب یہی سمجھا۔ اس اخبار نے 24ر فروری کو اپنے ایڈیٹوریل میں پیش گوئی کی کہ "ہندوستان امن وامان بحال کرنے کے لیے پاکستان میں فوجی مداخلت کرے گا۔" 24ر فرروی کو نیو یارک ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ "حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان کو یہ دھمکی ایک ایسے لیڈر کی طرف دی گئی ہے جو غیر جانبداری کی پالیسی کا علمبردار ہے اور جس نے امریکہ کے دورے کے دوران اپنے اس موٴقف پر اصرار کیا تھا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان اس کا حصول طاقت کا مظاہرہ، اسکی دھمکی کے بغیر ہونا چاہیے۔ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی جب وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس اصول کا اطلاق پاکستان پر نہیں ہوتا تو وہ اس کے سوویت یونین کے بارے میں اطلاق کی توقع کیسے کرتا ہے" نیو یارک ٹائمز کے اس تبصرے کی بنیاد پاکستان سے دوستی یا علمی عدل وانصاف پر نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد اس عنصر پر تھی کہ نہرو نے اینگلو امریکی سامراج کے منصوبے کے تحت سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کے عالمی محاذ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہندوستان کو دنیا کی تیسری بڑی طاقت بنانے کا عزم رکھتا تھا اور وہ اپنے آپ کو پورے ایشیاء کا لیڈر سمجھتا تھا۔

چند دن بعد لوک سبھا کے رکن آر۔ کے چوہدری نے مطالبہ کیا کہ "ہندوستان کو پاکستان کے خلاف بلا تاخیر جنگ کرنی چاہیے" اور سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نارائن نے 7ر مارچ کو کہا کہ "ہمارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مشرقی پاکستان میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے فوجیں بھیجی جائیں۔ یہ اعلان جنگ نہیں ہے لیکن اگر پاکستان اسے اعلان جنگ تصور کرتا ہے تو اس کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔" 24ر مارچ کو لندن ٹائمز نے اپنے نئی دہلی کے

نامہ نگار کی یہ خبر چھاپی کہ کلکتہ کے ایک مشہور ہفت روزہ نے جنگ کے بارے میں عوامی استفسار کیا ہے کہ جبکہ خود یہ جریدہ مشرقی پاکستان میں ہندو اقلیت کے تحفظ کے لیے فوجی کاروائی پر مسلسل زور دے رہا ہے اور کلکتہ کا ایک اور اخبار مشرقی پاکستان کی ایک ''آزاد'' حکومت کی تشکیل کا پرچار کر رہا ہے۔ تین دن کے بعد لندن ٹائمز نے ایک اور خبر چھاپی جس میں بتایا گیا کہ کلکتہ کے ہفت روزہ کے عوامی استفسار سے پتہ چلا ہے کہ ''82.7 فیصد لوگ مشرقی پاکستان کے خلاف پولیس ایکشن کے حق میں ہیں تاکہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے۔'' کلکتہ کے اخبارات میں پولیس ایکشن کی اصطلاح کے بار بار استعمال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ستمبر 1948ء میں جس ہندوستانی جرنیل کی سرکردگی میں ریاست حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن کیا گیا تھا۔ وہ ان دنوں مشرقی پاکستان کے اضلاع دیناج پور، راجشاہی اور جیسور کے نزدیک سرحدی علاقوں کا مفصل جائزہ لے رہا تھا۔ ہندوستانی فوج کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئیں تھیں اور پاکستان کے دونوں حصوں کی سرحدوں کے نزدیک ہندوستانی افواج کی نقل و حرکت شروع ہو گئی تھی۔ ڈیلی ٹیلیگراف کی 27/مارچ کی رپورٹ یہ تھی کہ پاکستانی سرحدوں کے نزدیک ہندوستانی فوجوں کی وسیع پیمانے پر نقل و حمل ہوئی ہے۔ ہندوستانی فوج کے آرمرڈ دستے ضلع فیروز پور بھیج دیئے گئے ہیں اور دو یا تین انفنٹری ڈویژن مشرقی پنجاب بھیجی گئی ہیں۔[6]

ائین سٹیفنز لکھتا ہے کہ ''ان دنوں بین المملکتی صورت حال اتنی خراب ہو گئی تھی کہ جنگ تقریباً یقینی نظر آتی تھی۔ دونوں ملک جنگ کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ فوجوں کی نقل و حرکت نہ صرف بنگال میں ہوئی تھی بلکہ اس سے زیادہ تشویشناک طور پر پنجاب میں ہوئی تھی۔ ہندوستان کی آرمرڈ ڈویژن پنجاب میں کچھ اس طرح حرکت میں آئی کہ لاہور کو خطرہ محسوس ہوتا تھا۔[7]

تاہم پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 29/مارچ کو ایک بیان جاری کیا جس کی بنا پر دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی میں خاصی کمی آ گئی۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں بلا روک ٹوک جنگ کا پراپیگنڈہ ہوتا رہے گا اس وقت تک پاکستان کی اقلیتوں کے دل و دماغ پر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوتے رہیں گے۔ گذشتہ چند ہفتوں سے اخبارات اور کئی لیڈر مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ ہندوستان کو پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دینا چاہیے۔ اگر اس ایجی ٹیشن کو ختم کرنے کے لیے کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا تو اس کے نہایت خطرناک نتائج

برآمد ہوں گے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے اسی دن وزیراعظم جواہر لال نہرو کے نام ایک پیغام میں تجویز پیش کی کہ دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات اور جنگ کے خطرات ختم کرنے کے لیے وزرائے اعظم کی ملاقات ہونی چاہیے۔ نہرو نے اس پیغام کا فوراً ہی اثبات میں جواب دیا تو دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات 2/اپریل کو نئی دہلی میں ہوئی۔ بات چیت 6 دن تک جاری رہی اور 8/اپریل 1950ء کو لیاقت علی خان اور جواہر لال نہرو کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے میں دونوں حکومتوں کی جانب سے یہ عہد کیا گیا کہ وہ اپنے ملکوں میں اس امر کو یقینی بنائیں گی کہ اقلیتوں کو بلا لحاظ دین و مذہب شہریت کے کلی طور پر مساوی حقوق حاصل ہوں اور وہ اپنی جان و مال، ثقافت اور عزت نفس کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔ اقلیتوں کو بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی جائے گی یعنی انہیں نقل وحرکت اور تحریر وتقریر کی آزادی ہوگی، ان کی عبادت گزاری پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اور انہیں حسب خواہش ہر پیشہ اختیار کرنے کا حق ہوگا۔ اقلیتوں کو اکثریتی فرقے کی طرح عوامی زندگی میں حصہ لینے کے مساوی مواقع حاصل ہوں گے ان کے لیے کسی سیاسی یا دوسرے عہدے کے دروازے بند نہیں ہوں گے۔ انہیں سول انتظامیہ اور مسلح افواج میں ملازمتوں کے بھی مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ معاہدے میں مزید کہا گیا تھا کہ دونوں ملکوں میں اقلیتی کمیشن مقرر کئے جائیں جو معاہدہ پر عملدرآمد کی نگرانی کریں گے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کے مہاجروں اور شرنارتھیوں کو واپس اپنے گھروں میں جانے کا حق حاصل ہوگا اور ان کی جائیدادیں انہیں واپس کی جائیں گی۔ پنجاب کے دونوں صوبوں میں مغویہ عورتوں کی برآمدگی کے لیے مناسب قانون سازی کر کے مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔ اقلیتوں کی وفاداری اپنے اپنے ملکوں کے ساتھ ہوگی اور وہ اپنی شکایات کے ازالے کے لیے صرف اپنی حکومتوں کی طرف رجوع کریں گی۔

اس معاہدے سے وقتی طور پر ہمہ گیر جنگ کا خطرہ ایک مرتبہ اور ٹل گیا۔ ساری دنیا میں اس کی بڑی تعریف کی گئی۔ مشہور امریکی اخبار نویس لپ مین نے لکھا کہ ''ایشیا کی نئی آزاد طاقتوں کی طرف سے اعلیٰ سیاسی تدبر کا یہ پہلا عظیم مظاہرہ ہوا ہے۔'' لیکن ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں، بالخصوص مغربی بنگال میں اس معاہدے پر سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا۔ کلکتہ کے اخبار ہندوستان سٹینڈرڈ نے لکھا کہ ''مصنوعی معاہدے سے تاریخ کو دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔''

امرت بازار پتریکا اور دوسرے بہت سے اخباروں نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس معاہدے کو بے سود اور بے معنی قرار دیا۔ 19 ر اپریل کو نہرو کی کابینہ کے دو بنگالی ارکان ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی اور کے۔سی نیوگی نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ مکر جی نے اپنے ایک طویل بیان میں رائے ظاہر کی کہ اس نام نہاد معاہدے سے کوئی بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوا اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی ریاست اسلامی ہے اور اس کی انتظامیہ انتہائی فرقہ پرست ہے۔ معاہدے میں پاکستان کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا اور نہ ہی ہندو شرنارتھیوں کو ان کے نقصانات کا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس طرح پاکستان سے ہندوؤں کی بیدخلی کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔ بعد میں مکر جی نے لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی اقلیتوں کے تحفظ میں ناکامی نے برصغیر کی تقسیم کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے۔ لہٰذا پولیس ایکشن جائز ہوگا۔

26 ر اپریل کو نہرو دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی دوسری ملاقات کے لیے کراچی پہنچا تو اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ دو دن کی اس ملاقات کے بعد 8 ر اپریل کے معاہدے پر عملدر آمد کی رفتار پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ لندن ٹائمز کے بیان کے مطابق اس اطمینان کی بنیاد یہ تھی کہ روزانہ تقریباً دس ہزار ہندو شرنارتھی مشرقی پاکستان میں واپس اپنے گھروں کو آرہے تھے جبکہ مغربی بنگال میں اپنے گھروں کو واپس جانے والے مسلمان مہاجرین کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ پورے پاکستان میں ہندوستان کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈہ ختم ہو گیا تھا اور مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت ہندو شرنارتھیوں کی از سر نو آباد کاری کے لیے مخلصانہ کوششیں کر رہی تھی۔ مئی میں دونوں ملکوں کے ایڈیٹروں کی نئی دہلی میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ اخبارات اپنے پراپیگنڈے میں نفرت کی بجائے خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دیں گے۔ اگست کے اوائل میں اقلیتی امور کے وزراء کی ایک میٹنگ نئی دہلی میں ہوئی۔ جس میں 8 ر اپریل کے معاہدے پر عمل درآمد کے کام کو مزید بہتر بنانے کے لیے متعدد فیصلے کیے گئے۔

جون میں ہندوستان کی خبر رساں ایجنسی یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے ایک نامہ نگار نے پاکستان کا سترہ دن کا دورہ کیا اور پھر اس نے مدراس کے اخبار ''ہندو'' کی 25 ر جون کی اشاعت میں اپنے دورہ پاکستان کے تاثرات پر مشتمل ایک رپورٹ میں لکھا کہ ''میں نے پاکستان کے تقریباً سارے حلقوں بشمول سرکاری حکام، سیاسی زعما، اخبار نویس، اقلیتی ارکان، طلبا اور

تاجروں سے ملاقاتیں کرکے یہ تاثر لیا ہے کہ وہ سب لیاقت، نہرو معاہدہ کی وجہ سے پیدا شدہ دوستانہ جذبات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس معاہدے کی بنا پر جو خیر سگالی پیدا ہوئی ہے اس کی ایک اور علامت یہ ہے کہ پاکستان کے اخبارات کا لہجہ بالکل بدل گیا ہے۔ اب ہندوستان کے خلاف پراپیگنڈہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی بجائے دوستی کی باتیں لکھی جاتی ہیں۔'' لیکن اس کے تقریباً دو ہفتے بعد 12؍جولائی کو لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ نے لیاقت اور نہرو کے درمیان 8؍اپریل کے معاہدے پر تین ماہ کے عملدرآمد پر جو تبصرہ کیا اس میں خدشہ ظاہر کیا گیا کہ مغربی بنگال کے ہندو اس معاہدے کو سبوتاژ کر دیں گے۔ اکونومسٹ کا مشاہدہ یہ تھا کہ ''اس معاہدے کے بعد مشرقی بنگال سے ہندوؤں کی نقل مکانی کا دور بالکل ختم ہو گیا ہے۔ لیکن مغربی بنگال سے مسلمانوں کی ہجرت بدستور جاری ہے۔ مغربی بنگال اس معاہدے کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ کلکتہ کے ''سٹیٹس مین'' کے سوا مغربی بنگال کے اخبارات کا لہجہ ابھی تک بہت تلخ ہے اور اس امر کا خدشہ ہے کہ مغربی بنگال کے شر پسند عناصر ایک مرتبہ اور سارے ہندوستان کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ مغربی بنگال کے بہت سے لوگ یہ نہیں چاہتے کہ اس معاہدے پر عمل درآمد ہو...... پاکستان کی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ٹرسٹ کمیٹیوں کی وساطت سے ہندوؤں کے درمیانہ طبقہ کی جائیدادیں انہیں واپس دلا دی ہیں اور اس نے اس کے بدلے میں مغربی بنگال کے مسلمانوں کی پوزیشن کے بارے میں کوئی سودے بازی نہیں کی ہے۔'' وزیراعظم لیاقت علی خان کی جانب سے اقلیتوں کے بارے میں معاہدے کے لیے پہل کرنے اور پھر اس معاہدے پر خلوص نیت سے عمل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت پاکستان نہ صرف فوجی لحاظ سے بہت کمزور تھا بلکہ پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی اور مشرقی بنگال میں لسانی تحریک کی وجہ سے پاکستان کی داخلی سیاسی حالت بھی بہت کمزور ہو گئی تھی۔

''اکونومسٹ'' کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ دونوں ملکوں کے درمیان خیر سگالی کی یہ فضا تین چار مہینے سے زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ کلکتہ کے اخبار نے ٹھیک ہی لکھا تھا کہ اس معاہدے سے تاریخ کو جھٹلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان تضاد کی بنیادیں بہت گہری تھیں۔ یہ تضاد محض پراپیگنڈے سے حل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی اس کا حل اقلیتوں کے بارے میں

منافقانہ اعلانات اور اقدامات سے ممکن تھا ستمبر میں کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مسلم اقلیت کے خلاف پھر فسادات ہوئے۔

8 اکتوبر کو پاکستان کا اچھوت مرکزی وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل فرار ہو کر کلکتہ چلا گیا۔ وہاں اس نے پاکستان کے خلاف بڑے اشتعال انگیز بیانات دیئے۔ اس نے الزام عائد کیا کہ پاکستان میں ہندوؤں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی پاکستان سے ہندوؤں کو کامیابی سے بیدخل کر دیا گیا ہے اور مشرقی پاکستان میں بھی یہ کام عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ چوہدری محمد علی کہتا ہے کہ جوگندر ناتھ منڈل کے فرار کا پاکستان میں ہندوؤں کے تحفظ یا عدم تحفظ کے سوال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے فرار کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ''اس نے کراچی میں ہندوستان کے ہائی کمیشن سے خفیہ روابط قائم کر لیے تھے۔ چونکہ لیاقت علی خان کو اس کا پتہ چل گیا تھا اس لیے میں نے ایسے احتیاطی اقدامات کئے تھے کہ خفیہ دستاویزات منڈل کے ہاتھ نہ لگنے پائیں اور منڈل کو جب پتہ چلا کہ اس کی نگرانی کی جارہی ہے تو وہ فرار ہو کر ہندوستان چلا گیا۔''[8] اسی مہینے میں راؤنڈ ٹیبل کے نامہ نگار نے پاکستان سے یہ رپورٹ بھیجی کہ ''معلوم نہیں وہ دن کب آئے گا جب کوئی اخبار یا جریدہ پاکستان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے کراچی اور نئی دہلی کے تعلقات کا محض سرسری حوالہ دے گا۔ جس دن سے پاکستان قائم ہوا ہے اسی دن سے اس پر بین المملکتی سیاسی اور معاشی کشیدگی کا غلبہ ہے۔ گذشتہ تین ماہ میں دونوں ملکوں کے درمیان بہتر تعلقات کی امیدیں پھر ختم ہوگئی ہیں۔''[9]

12 دسمبر کو آل انڈیا کانگرس کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن نے ایک تقریر میں کہا کہ برصغیر کی تقسیم ایک المیہ ثابت ہوئی ہے اس نے ہمارے لاکھوں بھائیوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے اور وہ سب بے شمار مشکلات ومصائب کا شکار ہیں۔ میں نے 1947ء میں تقسیم کی سخت مخالفت کی تھی۔ کانگریس کے سابق صدر اچاریہ کرپلانی نے کہا کہ حکومت ہندوستان کو مشرقی پاکستان کی اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے کے لیے آہنی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اس مسئلے سے ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ہمیں فوجی کاروائی کرنا پڑے۔ امریکہ میں ہندوستان کی سفیر وجے لکشمی پنڈت نے ایک تقریر میں پیش گوئی کی کہ ہندوستان اور پاکستان پھر ایک ہو جائیں گے۔ اس نے کہا کہ ہم نے برصغیر کی تقسیم محض اس لیے مانی تھی کہ اس کے بغیر غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا۔ انہی دنوں ہندوستان میں انگریزی کا ایک پمفلٹ بعنوان What shall we do بھی شائع

ہوا جس کا دیباچہ سرسی۔ پی۔ راما سوامی نے لکھا تھا۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا کہ بھارت ماتا کی بیٹیوں اور بیٹوں کو اشوک کی سرحدوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اس سلطنت میں مغربی پاکستان اور افغانستان کے علاقے بھی شامل تھے۔ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوھیا نے بھی ایک کتاب بعنوان ''اگلا قدم'' لکھی جس میں اعلان کیا گیا کہ ''ہم زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتے۔ غالباً دو یا تین سال میں امرتسر اور پاکستان کے درمیان کی سرحدی لکیر مٹ جائے گی۔ ہمیں اس زہر کو نکالنا ہے اور برصغیر کی تقسیم کو ختم کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم بہت جلد ختم ہو جائے گی اور ہندوستان اور پاکستان پھر ایک ہو جائیں گے۔''[10]

ہندوستان میں اس قسم کے معاندانہ پراپیگنڈہ کے جواب میں پاکستان میں بھی بعض عناصر نے اشتعال انگیز پراپیگنڈا کیا۔ خاکسار لیڈر عنایت اللہ مشرقی کا کہنا یہ تھا کہ وہ پورے ہندوستان پر اسلام کا غلبہ قائم کرے گا۔ چند افراد نے ''ہندوستان ہمارا'' پارٹی بھی بنائی۔ یہ لوگ دہلی کے لال قلعے پر ہلالی پرچم لہرانے کے عزم کا اظہار کرتے تھے۔ پنجاب کے بعض اخبارات میں کشمیر کی آزادی کے لیے جہاد شروع کرنے کی تبلیغ کی گئی اور وزیراعظم لیاقت علی خان کو اس بنا پر ہدف تنقید بنایا گیا کہ اگرچہ برطانیہ نے تنازعۂ کشمیر کے منصفانہ حل کے لیے پاکستان کی کوئی مؤثر امداد نہیں کی لیکن اس کے باوجود اس نے پاکستان کو برطانوی کامن ویلتھ سے نتھی کر رکھا ہے۔ لیاقت علی خان نے مسئلہ کشمیر کو جب ''بزدلانہ'' طریقے سے نمٹانے کی کوشش کی تھی اس کی وجہ سے پنجاب میں اس کے خلاف سخت غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان کے کسی ذمہ دار لیڈر یا تنظیم کی طرف سے سیاسی غیر ذمہ داری اور اشتعال انگیزی کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے کسی ذمہ دار عہدے دار نے کبھی ہندوستان پر قبضہ کرنے کا خواب نہیں دیکھا تھا اور وہ اس قسم کا خواب دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ جنرل محمد ایوب خان کے بیان کے مطابق ان دنوں ''ہندوستانی فوج کے مقابلے کے لیے ہمارے پاس لے دے کر کل تیرہ ٹینک تھے جن کے انجنوں کی عمر صرف چالیس پچاس گھنٹے رہ گئی تھی۔''[11]

فریقین کی طرف سے اس قسم کے معاندانہ پراپیگنڈا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی 1951ء میں بین المملکتی کشیدگی نے پھر خطرناک صورت اختیار کر لی اور پاکستان کے قیام کے چوتھے سال اسے ہمہ گیر جنگ کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حکومت ہندوستان ان دنوں

کشمیر میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے بعض اشتعال انگیز اقدامات کر رہی تھی اور فائر بندی لائن پر آئے دن خونریز جھڑپیں ہوتی تھیں اور حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان آزاد کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے بھرپور حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے حسب معمول اس مرتبہ بھی اشتعال انگیزی میں پہل کی۔ اس نے 8/جولائی کو اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ''پاکستان ایک فرقہ پرست ریاست ہے اور یہ اپنے فرقہ پرستانہ نظریات اور مقاصد کی بنا پر جارحیت پسند ہے۔ پاکستان کی اس خصوصیت کا دونوں ملکوں کے لاکھوں عوام پر جو اثر ہوتا ہے ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' اس کی دھمکی آمیز تقریر کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان نے جون میں ایک بریگیڈ راولاکوٹ بھیج دیا تھا کیونکہ کشمیر مسلم کانفرنس کے ابراہیم گروپ نے آزاد کشمیر میں ایک متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔[12] اس بریگیڈ نے جب ابراہیم گروپ کو مرعوب کرنے کے لیے راولاکوٹ میں پریڈ کی تو حکومت ہندوستان نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان مقبوضہ کشمیر پر کوئی بڑا حملہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ 11/جولائی کو ہندوستان کی فوجوں کا مغربی پنجاب کی سرحد پر پھر اجتماع ہونا شروع ہو گیا۔

15/جولائی کو پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے ایک اخباری بیان میں پاکستانی عوام کو خبردار کیا کہ مشرقی پنجاب اور جموں و کشمیر میں ہندوستانی فوجیں جارحیت کے لیے جمع ہو گئی ہیں۔ یہ فوجیں پاکستان کی سرحدوں کے نزدیک پڑاؤ کئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی آرمرڈ ڈویژن اتنی نزدیک ہے کہ وہ کسی وقت بھی پاکستان پر حملہ کر سکتی ہے۔ پاکستان کی سلامتی اور بین الاقوامی امن کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ گذشتہ سال بھی ایسا ہی ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں دونوں ملک جنگ کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ 8/اپریل 1950ء کے بین المملکتی معاہدے کے بعد ہندوستانی افواج پاکستانی سرحدوں سے ہٹا لی جائیں گی۔ لیکن یہ وہیں کی وہیں رہیں۔ بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی بہت سی فوجوں کو یہاں منتقل کر دیا گیا ہے اور ہندوستان کے اخبارات اور سیاسی زعما پاکستان کے خلاف مسلسل اعلان جنگ کر رہے ہیں۔ وزیراعظم لیاقت نے وزیراعظم نہرو سے اپیل کی کہ وہ اس خطرے کا فوراً سدباب کرے ورنہ اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ لیاقت علی نے سلامتی کونسل کی توجہ بھی برصغیر کی خطرناک صورت حال کی طرف مبذول کرائی اور دنیا کے سارے ممالک کے عوام سے کہا کہ وہ ہندوستان

کے جارحانہ عزائم کے بارے میں خود فیصلہ کریں۔ جب وزیر اعظم لیاقت علی خان یہ بیان دے رہے تھے اس وقت پاکستان کی فوجیں بھی سرحدوں کی طرف نقل وحرکت کر رہی تھیں اور 16 رجولائی کو دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل جنگ کے لیے تیار کھڑی تھیں اور پھر جب 17 رجولائی کو حکومت پاکستان نے سلامتی کونسل کے روبرو اپنی سرحدوں پر ہندوستانی افواج کے اجتماع کے خلاف احتجاج کیا تو اس وقت برصغیر کی فضا جنگ کے خطرے سے بھرپور تھی چونکہ ہندوستان کی دو لاکھ سے زائد فوجوں کے مقابلے میں پاکستان کی فوجوں کی تعداد ستر ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے ان کی امداد کے لیے پاکستان نیشنل گارڈز کی چار بٹالینوں کی تشکیل کی گئی۔ دو آرڈیننس نافذ کئے گئے جن کے تحت شہری دفاع اور ہوائی حملوں سے بچاؤ کے انتظامات کئے گئے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے لیاقت علی خان کے 15 رجولائی کے تار کے جواب میں اس الزام کی تردید کی کہ مشرقی پنجاب میں ہندوستانی فوجوں کا اجتماع جارحانہ مقاصد کے تحت ہوا ہے۔ اس نے کہا ''یہ کاروائی محض دفاعی مقصد کی بنا پر کی گئی ہے۔ پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جنگ اور جہاد کا اس قدر وسیع اور شدید پراپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' لیاقت علی خان نے اس کے جواب میں اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ ''جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تھی تو ہندوستان کی فوجوں کی تعداد پاکستان کی فوجوں کی تعداد کے مقابلے میں دوگنا تھی۔ اس وقت سے دونوں ملکوں کے درمیان فوجی طاقت کا توازن ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ حق میں کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف ہندوستان کے فوجی اخراجات میں بہت اضافہ کیا گیا ہے بلکہ پاکستان کے حصے کا فوجی ساز وسامان بھی روک لیا گیا ہے۔ پاکستان کو اس سامان کی کمی پوری کرنے کے لیے بہت اخراجات برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان کے دفاعی بجٹ میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ہندوستان کے فوجی اخراجات میں اضافے کے مقابلے میں بہت معمولی ہے، یعنی نصف سے بھی کم ہے۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود یہ کہا جارہا ہے کہ ہندوستان کو پاکستان کی جانب سے جارحیت کا خطرہ ہے۔'' جب دونوں وزرائے اعظم کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف تاروں کے ذریعے الزام تراشیوں کا یہ سلسلہ جاری تھا تو ہفت روزہ اکونومسٹ کا 21 رجولائی کا تبصرہ یہ تھا کہ'' ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک مرتبہ پھر جنگ کا سنگین خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔'' اگست میں

''راونڈٹیبل'' کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ پاکستان کی چارسالہ زندگی پے در پے بحرانوں میں گزری ہے لیکن اس کا موجودہ بحران سنگین ترین ہے۔[13]

حکومت ہندوستان کی طرف سے مشرقی پنجاب میں فوجوں کے اجتماع کی پانچ چھ وجوہ بتائی گئیں۔(1) کشمیر میں سرحدی جھڑپیں ہوئی تھیں۔(2) پاکستان نے مقبوضہ کشمیر میں تخریب کار بھیجے تھے۔(3) پاکستان نے فوجوں کی نقل وحرکت میں پہل کی تھی۔(4) وزیراعظم لیاقت علی خان نے جنگ نہ کرنے کے اعلان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔(5) پاکستان کے وزیر خارجہ نے اشتعال انگیز تقریر کی تھی اور(6) پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جہاد کا پراپیگنڈہ ہو رہا تھا۔حکومت پاکستان کی طرف سے ان الزامات کا یہ جواب دیا گیا کہ(1) اقوام متحدہ کے مبصروں نے سرحدی جھڑپوں کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر عائد کی ہے۔(2) ہندوستان نے پاکستان کے خلاف تخریب کاری کے الزام کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔(3) اس الزام کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا کہ پاکستان نے فوجوں کی نقل وحرکت میں پہل کی ہے۔اس کے برعکس غیر ملکی مبصرین پاکستان کے اس الزام کی تائید کرتے ہیں کہ ہندوستان کئی ماہ سے پاکستان کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔اس مقصد کے لیے مشرقی پنجاب میں کئی نئی سڑکوں اور فوجی اڈوں کی تعمیر بھی کی گئی ہے۔(4) جہاں تک جنگ نہ کرنے کے اعلان کی تجویز کا تعلق ہے اس کے بارے میں وزیراعظم پاکستان نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اس مجوزہ اعلان میں یہ عہد بھی کیا جائے کہ تنازعہ کشمیر اور دوسرے بین المملکتی تنازعات کا بذریعہ ثالثی تصفیہ کیا جائے گا لیکن یہ تجویز ہندوستان کے وزیراعظم کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔(5) وزیر خارجہ کی ساری تقریر پڑھی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں جنگ کی کوئی دھمکی نہیں ہے۔(6) پاکستان میں جن عناصر نے کشمیر کی آزادی کے لیے جہاد کا پراپیگنڈہ کیا ہے ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں اور وہ حکومت پاکستان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتے۔اس کے برعکس ہندوستان میں نہ صرف ہندومہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور سوشلسٹ پارٹی کے سرکردہ زعما پاکستان کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کرتے رہے ہیں بلکہ حکمران کانگرس پارٹی کے صدر اور دوسرے سرکردہ زعما بھی انتہائی اشتعال انگیز جنگی پراپیگنڈے میں مصروف رہے ہیں۔

ہندوستان کے وزیراعظم نہرو نے پاکستان میں مقیم برطانوی فوجی افسروں کی

سرگرمیوں پر بھی نکتہ چینی کی۔ اس پر برطانوی وزیراعظم ایٹلی نے افسوس کا اظہار کیا کہ نہرو نے برطانوی افسروں پر بے بنیاد الزام تراشی کی ہے۔ نہرو کو برطانیہ اور امریکہ کے اخبارات پر بھی بہت اعتراض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مغربی پریس برصغیر کے معاملات میں مداخلت کر کے صورت حال کو بگاڑ رہا ہے۔ اس پر مانچسٹر گارجین نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہٹلر نے بھی برطانیہ اور امریکہ سے کہا تھا کہ چیکوسلواکیہ کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔'' نہرو کو برصغیر کے معاملات میں حکومت امریکہ کی مداخلت پر بھی غصہ آیا تھا۔ اس نے امریکہ کے محکمہ خارجہ کے اس مضمون کے نوٹ کا کوئی تحریری جواب نہیں دیا تھا کہ پاکستان کی سرحدوں پر سے فوجیں ہٹالی جائیں بلکہ اس کا جواب نئی دہلی میں امریکی سفارت خانے کے حکام کو محض زبانی طور پر دیا گیا تھا۔ لندن ٹائمز نے تجویز پیش کی کہ دونوں ملکوں کے جن علاقوں میں فوجوں کا بھاری اجتماع ہوا ہے وہاں اقوام متحدہ کے مبصروں کا تقرر کیا جائے لیکن ہندوستان کے لیے ایسی کوئی تجویز قابل قبول نہیں تھی۔ آسٹریلیا کے وزیراعظم رابرٹ مینزیز (Robert Menzies) نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی دور کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں لیکن نہرو نے یہ پیش کش قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ ہندوستان کے عزائم جارحانہ نہیں ہیں۔ ہم نے محض چند احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔ نہرو نے پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان سے پانچ نکاتی امن منصوبے پر اتفاق کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لیاقت علی کا تجویز کردہ منصوبہ یہ تھا کہ (1) سرحدوں پر جن فوجوں کا اجتماع کیا گیا ہے انہیں فوراً وہاں سے ہٹا لیا جائے۔ (2) دونوں حکومتیں اعلان کریں کہ وہ تنازعہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق جمہوری طریقوں سے حل کریں گی اگر اس سلسلے میں کوئی اختلاف رائے ہوا تو سلامتی کونسل سے رجوع کیا جائے گا اور سلامتی کونسل جو فیصلہ صادر کرے گی دونوں حکومتیں اس کی پابندی کریں گی۔ (3) دونوں حکومتیں یہ بھی اعلان کریں کہ اگر دونوں ملکوں کے درمیان کوئی تنازعات ہوئے اور ان کا تصفیہ براہ راست گفت وشنید یا مصالحانہ مداخلت سے نہ ہو سکا تو یہ تنازعات کسی ثالث یا کسی عدالت کے روبرو پیش کئے جائیں گے۔ (4) دونوں حکومتیں عہد کریں کہ وہ 8 / اپریل کے معاہدے کے مطابق ایک دوسرے کے ملک کی علاقائی سالمیت کے خلاف اور جنگ پر اکسانے والے پراپیگنڈے کی اجازت نہیں دیں گی۔ اگر کسی فرد یا تنظیم نے اس قسم کا پراپیگنڈہ کیا تو اس کے خلاف بلا تاخیر موثر

کاروائی کی جائے گی اور(5) دونوں حکومتیں مزید اعلان کریں کہ وہ کسی بھی حالت میں دوسرے کے علاقے پر قبضہ نہیں کریں گی۔

لندن ٹائمز اور دوسرے برطانوی اخبارات نے لیاقت علی خان کے اس ''امن منصوبے'' کی تعریف کی اور رائے ظاہر کی کہ یہ ایسی قابل عمل اور تعمیری تجاویز پر مشتمل ہے جن سے دونوں ملکوں کے درمیان ہمہ گیر تصفیہ ہوسکتا ہے۔ امریکی اخبارات نے بھی اس پر اسی قسم کا تبصرہ کیا لیکن ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے یہ منصوبہ مسترد کر دیا۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے۔ پاکستان کو اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ ہندوستان کبھی حملے میں پہل نہیں کرے گا۔ ہندوستان جنگ کے خلاف ہے لیکن وہ اپنی حفاظت کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ پاکستان میں جنگ کی کھلم کھلا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لندن ٹائمز اور دوسرے برطانوی اخبارات نے پھر جواہر لال نہرو پر نکتہ چینی کی اور الزام عائد کیا کہ ''ہندوستان کا وزیراعظم دوغلی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ایک طرف تو وہ امن و آشتی کی باتیں کرتا ہے لیکن دوسری طرف جب پاکستان یا سلامتی کونسل کا نمائندہ امن پسندی کے دعاوی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کہتا ہے تو اس کی اپنی تعبیر و تشریح پرامن تصفیے کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ گذشتہ سال نہرو نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دونوں ملکوں کو جنگ نہ کرنے کا اعلان کرنا چاہیے لیکن جب لیاقت علی خان نے کہا کہ اس ''امن منصوبے'' میں بین المملکتی تنازعات کا براہ راست گفت وشنید یا عدالتی کاروائی یا ثالثی کے ذریعے تصفیہ کرانے کی بھی گنجائش ہونی چاہیے تو نہرو نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ نہرو نے پہلے خود ہی تنازعہ کشمیر استصواب کے ذریعے حل کرنے کی تجویز پیش کی تھی لیکن جب لیاقت علی خان نے اس سلسلے میں اقوام متحدہ کے مجوزہ انتظامات کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو نہرو نے یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ ہندوستانی فوجیں استصواب کے دوران بھی کشمیر کے تحفظ کے لیے وہیں رہیں گی اور یہ کہ شیخ عبداللہ کی حکومت کو استصواب کی نگرانی کرنے کا پورا اختیار ہوگا اور اب جبکہ لیاقت علی خان نے سرحدوں پر سے فوجیں ہٹانے کی تجویز پیش کی ہے تو نہرو کو یہ تجویز بھی منظور نہیں اور وہ نہ صرف اپنی فوجیں وہیں رکھنے پر مصر ہے بلکہ اس نے گفت وشنید کے لیے کراچی آنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔''

پاکستان کے اخبارات اور سیاسی مبصروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ''ہندوستان نے

سرحدوں پر اپنی فوجوں کا اجتماع محض اس لیے کیا ہے کہ پاکستان کو اس وقت تک مرعوب رکھا جائے جب تک کہ کشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ نہیں کر لیتی۔ جب نہرو یہ کہتا ہے کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر پاکستان نے کشمیر میں کوئی گڑبڑ کی تو ہندوستان مغربی پنجاب پر حملہ کر دے گا۔ نہرو کی محاذ آرائی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔'' تاہم یہ محاذ آرائی ستمبر میں بتدریج ختم ہوگئی کیونکہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر میں کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی۔ یہاں کے حکمران جاگیردار طبقے میں اس قسم کی کاروائی کرنے کی ہمت اور سکت نہیں تھی لہٰذا جنگ کا خطرہ ایک بار اور ٹل گیا لیکن اس محاذ آرائی کے دوران دونوں ملکوں کے درمیان قومی تضاد کی جڑیں مزید گہری ہوگئیں اور 1952ء کے اوائل میں پہلے پاکستان نے اور پھر ہندوستان نے بین المملکتی آمدورفت پر پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیاں عائد کر دیں۔

بعض بھارت نواز عناصر جب ہندوستان اور پاکستان کی کشیدگی کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو وہ ان سارے عوامل کو یا تو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے یا انہیں بالکل ہی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا بالعموم مؤقف یہ ہوتا ہے کہ یہ بین المملکتی کشیدگی اولاً سامراجیوں کی پیداوار ہے اور ثانیاً اس کے لیے پاکستان کا حکمران جاگیردار طبقہ ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے مؤقف کی تائید میں ساری دنیا میں سامراج کی فتنہ انگیز سازشوں اور اندرون ملک حکمران جاگیردار طبقے اور سامراج نواز افسر شاہی کی بدعنوانیوں کے حوالے دیتے ہیں اور پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی عالمی سامراج کے مفاد میں ہے اور اس سے پاکستان کے جاگیردار طبقے اور افسر شاہی کو اپنا عوام دشمن اقتدار قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ برصغیر کے حالات کے اس سہل ترین تجزیے کی بنیاد دراصل تجریدی نظریات پر ہے اور اس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تجزیہ بالکل ایسا ہی موضوعی ہے جیسا کہ کانگرسی قیادت برصغیر کی تقسیم سے پہلے ہندو مسلم تضاد کے بارے میں کیا کرتی تھی اور جس کو اس نے بالآخر خود ہی عملاً غلط ثابت کر دیا تھا۔ بے شمار دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر قائم شدہ تاریخی حقائق یہ ہیں کہ کانگرس کی بورژوا قیادت نے برصغیر کی تقسیم کو نیک نیتی اور خلوص دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ امید کرتے تھے کہ یہ تقسیم عارضی ہوگی اور جو لوگ ہم سے الگ ہوئے ہیں وہ بہت جلد واپس آ جائیں گے۔ چنانچہ

انہوں نے ان ''لوگوں'' کی واپسی کی راہ ہموار کرنے کے لیے کئی جتن کئے۔ انہوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے منظم قتل عام میں شرومنی اکالی دل کی امداد کی۔ انہوں نے فوجی سامان کی تقسیم میں کھلم کھلا دھاندلی کی۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے سپریم کمانڈر آکن لیک کا ہیڈکوارٹرز مقررہ تاریخ سے بہت پہلے ہی بند کروادیا۔ انہوں نے دسمبر 1947ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے واجبات کی ادائیگی سے انکار کردیا۔ اگر ان دنوں نظام حیدرآباد پاکستان کو 20 کروڑ روپے کا قرضہ نہ دیتا تو پاکستان بالکل دیوالیہ ہوجاتا۔ انہوں نے ثالثی ٹربیونل کی میعاد ختم ہونے کے دوسرے ہی دن مغربی پنجاب کی نہروں کا پانی یکایک بند کرکے لاکھوں پاکستانیوں کے لیے بھوک اور پیاس کا سنگین مسئلہ پیدا کردیا۔ انہوں نے ستمبر 1949ء میں پاکستان کی کرنسی کی نئی شرح مبادلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرکے معاشی جنگ کی ابتداء کی اور پھر جب اس معاشی جنگ کی بنا پر مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال میں اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوا تو انہوں نے پاکستان کو راہ راست پر لانے کے لیے ''دوسرے ذرائع'' استعمال کرنے کی دھمکی دی۔ انہوں نے جولائی 1951ء میں پہلے تو کشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی کا ڈھونگ رچایا اور پھر پاکستان کو مرعوب کرنے کے لیے کھلم کھلا فوجی محاذ آرائی کی۔ کیا انہوں نے یہ سب کچھ عالمی سامراج اور پاکستان کے جاگیردار طبقے کے مفاد میں کیا تھا؟ کیا اس میں ہندوستان کے بورژوا طبقے کے توسیع پسندانہ عزائم کا کوئی دخل نہیں تھا؟

مزید تاریخی حقائق یہ ہیں کہ 1947ء اور اس کے بعد عالمی سامراج کا مفاد برصغیر کی کشیدگی میں مضمر نہیں تھا بلکہ اس کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں معاشی امن وامان اور سیاسی استحکام رہے۔ اس کا کھلم کھلا منصوبہ یہ تھا کہ اس وسیع وعریض علاقے کی افرادی قوت اور دوسرے ذرائع کو ازسرنو منظم کرکے انہیں پورے ایشیا میں طبقاتی انقلاب کے سدباب کے لیے استعمال کیا جائے گا اور اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے تنازعات کا پرامن تصفیہ ضروری تھا۔ برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں اور ان کے اخبارات کو وقتاً فوقتاً نہرو پر غصہ آتا تھا کیونکہ وہ ہندوستان کے قومی بورژوا طبقے کے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت برصغیر میں خلفشار پیدا کررہا تھا۔ 51-1950ء میں اینگلو امریکی سامراج کی حکومتوں اور اخبارات کی جانب سے کشمیر اور پاکستان کے بارے میں جواہرلال نہرو کی پالیسی پر جونکتہ چینی کی گئی تھی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ

وہ برصغیر میں مسلسل کشیدگی اور تفرقہ کے خواہاں تھے بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ (1) انہیں کوریائی جنگ کے دوران نہرو کی ''غیر جانبدارانہ'' پالیسی پر غصہ تھا۔ اگرچہ یہ جنگ شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد، جب امریکی سامراج نے چین کے خلاف ایٹم بم استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی، تو برطانیہ کی لیبر حکومت نے پس پردہ نہرو کی اس پالیسی کی تائید شروع کر دی تھی لیکن وہ کھلم کھلا نہرو کی خارجہ پالیسی کی حمایت کرنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس طرح امریکہ اس سے خفا ہو جائے گا۔ (2) وہ تنازعہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کی اخباری حمایت کر کے نہرو پر اس مقصد کے لیے دباؤ ڈالنا چاہتے تھے کہ ہندوستان ''غیر جانبداری'' کی پالیسی ترک کر کے سوویت یونین اور چین کے خلاف ان کے مجوزہ عالمی فوجی گٹھ جوڑ میں شامل ہو جائے۔ کوریا کی جنگ شروع ہونے سے پہلے نیویارک ٹائمز نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے اتحاد و اتفاق کا پرزور حامی تھا بلکہ وہ پورے ایشیا کو نہرو کی زیر قیادت متحد و منظم کرنے کا پرچار کرتا تھا۔ (3) انہیں امید تھی کہ اگر اس طرح جواہر لال نہرو فوری طور پر رام نہ ہوا تو پاکستان کے رجعت پسند جاگیردار طبقے اور سامراج نواز افسر شاہی کو تھوڑی بہت فوجی اور مالی امداد دے کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے گا اور پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی و فوج اتحاد کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان مسلسل کشیدگی اور محاذ آرائی اینگلو۔امریکی سامراج کے عالمی مفاد کے منافی تھی۔ ان دونوں کے اتحاد و اتفاق کے بغیر ایشیا میں اس کے کسی انقلاب دشمن منصوبے کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ جواہر لال نہرو نے 1950ء کی بین المملکتی کشیدگی کے دوران پاکستان کے خلاف ''دوسرے ذرائع'' استعمال کرنے کی دھمکی دینے کے کچھ عرصہ بعد جنگ نہ کرنے کے اعلان کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اس تجویز کی حقیقت ایک پراپیگنڈہ اسٹنٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ کیونکہ اس قسم کے اعلان یا معاہدے سے فائدہ ہمیشہ اس فریق کو پہنچتا ہے جس کا پہلے سے غلبہ قائم ہو چکا ہو۔ اس تجویز کے بارے میں تقریباً دس ماہ تک دونوں ملکوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی رہی تھی اس کے سرسری مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہرو کی نیت نیک نہیں تھی۔ وہ تنازعہ کشمیر اور دوسرے بین المملکتی تنازعات کے پرامن تصفیے کے لیے کسی بھی انتظام پر راضی نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پاکستان جنگ نہ کرنے کے اعلان پر کوئی شرط عائد کئے بغیر دستخط کر دے

اوراس طرح وہ کشمیر پر ہندوستان کے قبضے کو تسلیم کرلے۔ پاکستان کا کوئی حکمران ان دنوں اس قسم کے غیر مشروط اعلان پر دستخط کر کے ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہندوستان میں گاندھی، نہرو، پٹیل، اچاریہ کرپلانی، پرشوتم داس ٹنڈن، شیاما پرشاد مکرجی، جے پرکاش نارائن اور رام منوہر لوہیا جیسے سرکردہ سیاسی زعما پاکستان کو بزورِ قوت ختم کرنے کا بار بار اعلان کرتے تھے اور آئے دن کھلم کھلا کہتے تھے کہ ہم اپنے ''ملک'' کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتے۔ گاندھی نے آزادی کے صرف تین ہفتے بعد یعنی 26ر ستمبر 1947ء کو کہا تھا کہ اگر پاکستان نے اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی تو ہندوستان کو اس کے خلاف جنگ کرنا پڑے گی۔ پٹیل نے 6ر جنوری 1948ء کو اپنی ایک تقریر میں متنبہ کیا تھا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بدستور غیر تسلی بخش رہے تو دونوں ملکوں کے درمیان بھرپور جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ نہرو نے 23ر فروری 1950ء کو لوک سبھا میں وارننگ دی تھی کہ اگر پاکستان نے اپنی اصلاح نہ کی تو ہندوستان ''دوسرے ذرائع'' استعمال کرے گا اور پھر نہرو نے 8ر جولائی 1951ء کو کہا کہ پاکستان ایک فرقہ پرست ریاست ہے اور ہم اس کی جارحیت پسندی کو نظرانداز نہیں کر سکتے اور اس کی اس تقریر کے تین دن بعد مغربی پنجاب کی سرحد پر ہندوستانی فوجوں کا اجتماع شروع ہو گیا۔ پاکستان کا جاگیردار طبقہ فی الحقیقت ان دھمکیوں سے خوفزدہ تھا۔ اسے ان دنوں ہندوستان کی جانب سے ہر قسم کے دباؤ کے باعث اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی۔ پنجاب کے عوام کے جذبات تنازعہ کشمیر، نہری پانی کے تنازعہ اور متعدد دوسرے بین المملکتی تنازعات کے باعث بہت مشتعل تھے اور وہ اس سلسلے میں لیاقت علی خان کی حکومت پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ لہٰذا جاگیردار طبقہ ان تنازعات کے پرامن تصفیہ کے لیے ہندوستان سے تعاون اور اشتراک کی توقع کرتا تھا۔ وہ فوجی اور سیاسی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ بین المملکتی کشیدگی اور محاذ آرائی اس کے مفاد میں نہیں تھی۔ اس پر اپنے دیرینہ آقا و مولا برطانوی سامراج کا ابتدا ہی سے دباؤ یہ تھا کہ ہندوستان سے کسی صورت بھی جنگ نہ کرنا۔ اگر اس کے اور اس کے حلیف عوام دشمن ملاؤں اور سامراج نواز افسر شاہی کے بس میں ہوتا، تو وہ ہندوستان کے توسیع پسندوں کے سامنے غیر مشروط طور پر گھٹنے ٹیک دیتے۔ وہ ایسا محض اس لیے نہ کر سکے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد غیر حقیقی نہیں تھا۔ یوں تو اس معاندانہ قومی تضاد کی تاریخ بڑی پرانی تھی لیکن

15 راگست 1947ء کے بعد ہندوستان کے حکمران بورژوا طبقے کی عاجلانہ توسیع پسندی نے اس کی شدت میں بے انتہا اضافہ کر دیا تھا۔ پاکستانی عوام نے بالعموم اور پنجابی عوام نے بالخصوص بڑی قربانیاں دے کر قومی آزادی حاصل کی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی ہندوستان کی غلامی یا بالا دستی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ مزید براں پاکستان کے درمیانہ طبقہ نے آزادی کے بعد جو بے پناہ معاشی فائدہ اٹھایا تھا وہ اسے ہندوستان کی غلامی یا بالا دستی قبول کر کے خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا اور دوسری طرف وہ لاکھوں ہندو اور سکھ جو اپنی بہت سی دیہاتی اور شہری جائیدادیں چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے وہ پاکستان کے وجود کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سینوں میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ بین المملکتی تضاد کے پرامن حل کے راستے میں آتش فشاں پہاڑ کی طرح حائل تھی۔

# جزو دوم

# مسئلہ کشمیر کا آغاز

باب: 5

# تنازعہ کشمیر کا تاریخی پس منظر

بایں ہمہ یہ سارے بین المملکتی قومی تضادات شاید وقت گزرنے کے ساتھ پرامن طور پر حل ہو جاتے اگر دونوں ملکوں کے درمیان ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں ایک مستقل اور لاینحل تضاد پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان نے برطانوی سامراج کے اشتراک عمل سے مسلم اکثریت کے اس وسیع وعریض اور خوبصورت علاقے پر کچھ اس قدر مکاری، عیاری، دغابازی اور غنڈہ گردی سے قبضہ کیا تھا کہ پاکستان کا ہر باغیرت شہری بلبلا اٹھا۔ بالخصوص پنجاب کے عوام نے یہ محسوس کیا کہ ان کے ازلی دشمن نے ان کی پیٹھ میں ایک ایسا زہر آلود چھرا گھونپ دیا ہے کہ جس کا زخم کبھی مندمل نہیں ہو گا۔ پنجابی عوام کشمیری عوام سے اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی تعلقات یکایک منقطع ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ برصغیر کی تقسیم جس اصول کی بنا پر ہوئی ہے وہی اصول کشمیر کے مستقبل کا تعین کرے گا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ چونکہ ریاست جموں وکشمیر کی تقریباً چالیس لاکھ کی آبادی کا تقریباً 77 فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور چونکہ یہ علاقہ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے مغربی پنجاب کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کے ہندو مہاراجہ کو اس کا الحاق لازمی طور پر پاکستان کے ساتھ کرنا پڑے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کشمیر کی سرزمین جنت نظیر پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں آ گرے گی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہندوستان کی بورژوا قیادت اور برطانوی سامراج کا مشترکہ منصوبہ ان کی ان توقعات کے ہوائی قلعے کو یکایک مسمار کر دے گا۔

پاکستان اور کشمیر کے خلاف یہ ناپاک منصوبہ دراصل مئی 1947ء میں تیار کیا گیا تھا جب کہ ماؤنٹ بیٹن نے شملہ میں نہرو کے ساتھ سودا بازی کر کے برصغیر کی تقسیم کا فیصلہ کیا تھا۔ دستاویزی اور واقعاتی شہادتوں کی بنیاد پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے درمیان

اس خفیہ سمجھوتے کی ایک شرط یہ تھی کہ صوبہ پنجاب کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ بٹالہ اور گورداسپور کی مسلم اکثریت کی تحصیلیں ہندوستان میں شامل ہوں گی اور اس طرح ریاست جموں وکشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا جغرافیائی جواز پیدا کیا جائے گا۔ بلاشبہ پاکستانی اور کشمیری عوام کے خلاف یہ سازش مسلمہ اخلاقی اقدار کے منافی تھی لیکن یہ بورژوا سیاست کے مروجہ اصولوں کے عین مطابق تھی۔ جواہر لال نہرو کو ہندوستان کے بورژوا طبقے کے نمائندہ کی حیثیت سے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی بورژوا حب الوطنی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس نے اپنے ملک کے حکمران طبقے کے نقطۂ نگاہ سے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اپنے ملک کی ایک ناقابل فراموش خدمت سرانجام دی تھی۔ دوسری طرف ماؤنٹ بیٹن نے بھی برطانوی سامراج کے ایک ملازم کی حیثیت سے کوئی برائی نہیں کی تھی۔ بلکہ اس نے برطانیہ کے حکمران طبقے کے نکتہ نگاہ سے ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار کی دوستی حاصل کر کے ''اعلیٰ کا کردگی'' کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی اس ''اعلیٰ کارکردگی'' کی وجہ سے نہ صرف کشمیر کی جنگی اہمیت کا علاقہ ایک ایسے بڑے ملک کے پاس چلا گیا تھا جس کا مستقبل غیر یقینی نہیں تھا بلکہ ہندوستانی ارباب اقتدار نے برضا ورغبت برطانوی کامن ویلتھ میں رہنا منظور کر لیا تھا اور اس طرح انہوں نے یہ امید دلائی تھی کہ وہ ایشیا میں برطانیہ کے مفادات کے تحفظ کے لیے تعاون واشتراک عمل کریں گے۔ اگر مسلم لیگ کی قیادت اس سازش کا کوئی مؤثر توڑ کرنے میں ناکام رہی تو اس میں کانگرس اور برطانوی سامراج کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بورژوا اور سامراجی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے ذرائع اختیار کر کے اپنے مقصد کی تکمیل کریں اور انہوں نے یہ کارنامہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

ہندوستانی مؤرخین انہیں دغابازی اور غنڈہ گردی کے الزامات سے بری کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کرتے ہیں۔ وی۔ پی۔ مینن کہتا ہے کہ ''جب میں نے حکومت ہندوستان سے یہ سفارش کی تھی کہ مہاراجہ کشمیر کے الحاق کی درخواست منظور کر لی جائے تو میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ قبائلی حملہ آوروں نے کشمیر پر جو دھاوا بولا ہے اس سے ہندوستان کی سالمیت کو سنگین خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے زمانے سے یعنی تقریباً آٹھ سو سال سے، شمال مغرب سے وقتاً فوقتاً حملے ہوتے رہے ہیں۔ صرف مغلیہ عہد کا مختصر سا عرصہ ایسا تھا جس میں یہ حملے نہیں ہوئے تھے۔ محمود غزنوی نے ذاتی طور پر سترہ حملے کیے تھے۔ اب پاکستان کی نئی مملکت

نے اپنے قیام کے بعد صرف دس ہفتے کے اندر شمال مغربی علاقے کے قبائلیوں سے حملہ کروا دیا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ آج سری نگر پر حملہ ہوا ہے تو کل دہلی پر ہوگا۔ جو قوم اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیے کو بھول جاتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ کشمیر میں ہمارے کوئی علاقائی عزائم نہیں تھے۔ اگر قبائلیوں کا حملہ نہ ہوتا تو میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکومت ہندوستان کشمیر کے معاملے میں مداخلت نہ کرتی۔''[1] سیسر گپتا (Sisir Gupta) لکھتا ہے کہ حکومت ہندوستان نے کئی وجوہ کی بنا پر کشمیر میں مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ (1) کشمیر میں بہت سے سیاسی لیڈر تھے جو سیکولرازم پر یقین رکھتے تھے۔ (2) اس وقت تک کشمیر کی رائے عامہ سے کوئی استفسار نہیں کیا گیا تھا۔ (3) خیال یہ تھا کہ اگر کشمیر گیا تو ہندوستان میں نظریۂ لادینی سیاست کے تحفظ کا امکان بھی ختم ہو جائے گا۔ (4) چونکہ برصغیر میں ہندوستان نے برطانیہ کے جانشین کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تھا اس لیے وہ ایسے علاقوں کے تحفظ کا ذمہ دار تھا جو برضا و رغبت پاکستان میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ (5) کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ ''سٹینڈسٹل'' معاہدہ کرنے کی پیش کش کر رکھی تھی اور (6) کشمیری عوام کو بیرونی دباؤ کے تحت اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ یہ بات اخلاقی طور پر غلط تھی۔[2]

ہندوستان میں ان دونوں مؤرخوں کا مقام بہت اونچا ہے۔ وی۔ پی۔ مینن درباری مؤرخ ہے۔ وہ 15/اگست 1947ء سے پہلے وائسرائے ہاؤس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور آزادی کے بعد وہ حکومت ہندوستان کے محکمہ ریاستی امور کا افسر اعلیٰ بنا تھا۔ وہ نائب وزیراعظم سردار پٹیل کا مشیر خاص تھا۔ لہٰذا ہندوستان میں اس کی ہر تحریر کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ گپتا سرکاری مؤرخ ہے۔ اس کی یہ کتاب تنازعہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے سرکاری مؤقف کی وضاحت کے لیے انڈین کونسل آف ورلڈ افیرز کے زیر اہتمام شائع کی گئی ہے۔ تاہم ان دونوں ہی نے کشمیر پر ہندوستان کے قبضے کا پس منظر بیان کرنے میں سراسر جھوٹ بولا ہے۔ انہوں نے اس قدر جھوٹ بولا ہے کہ جس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ قومی تضاد انسان کو کہاں تک پہنچا سکتا ہے۔ اگر ان کے مؤقف کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے جو کاروائی کی تھی اس کے پس پردہ اعلیٰ سیاسی و اخلاقی اقدار کارفرما تھیں۔ اگر قبائلیوں کا حملہ نہ ہوتا تو وہ کشمیر میں کوئی عملی دلچسپی کا مظاہرہ

نہ کرتے۔ وپی۔ پی۔ مینن کہتا ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیے کو بھول جاتی ہے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ پاکستانی قوم سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور جغرافیے کو بھول جائے اور کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے غاصبانہ مؤقف کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے۔ پاکستانی قوم کو کشمیر پر ہندوستان کے قبضے کے تاریخی پس منظر کا اچھی طرح پتہ ہے اور وہ اپنے ملک اور ریاست جموں و کشمیر کے جغرافیے سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ حکومت پاکستان نے اکتوبر 1947ء میں کشمیر پر قبائلیوں سے محض اس لیے حملہ کروایا تھا کہ ہندوستان ریاست کے سارے علاقے کو ہڑپ کرنے ہی والا تھا۔ اس مقصد کے لیے نئی دہلی اور سری نگر میں سیاسی، آئینی، انتظامی اور فوجی بندوبست کیا جا چکا تھا۔ اگر حکومت پاکستان مزید چند دن تک بے عملی کا مظاہرہ کرتی تو وہ چھوٹا سا علاقہ بھی ہندوستان کے تسلط میں ہوتا جو آج پاکستان کے پاس ہے۔ پاکستانی قوم کو ہندوستان کے بورژوا توسیع پسندوں اور برطانوی سامراجیوں سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے دشمنوں سے کوئی اور توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ البتہ اسے افسوس ہے کہ پاکستان کے نئے حکمرانوں نے کشمیر میں جو کارروائی کی وہ نیم دلانہ بلکہ بزدلانہ تھی۔ اگر بین المملکتی جنگ کے خوف سے بالاتر ہو کر اور غیر منظم قبائلیوں کے بجائے پاکستانی اور کشمیری عوام کے جذبۂ آزادی پر اعتماد کر کے ذرا جرأت ایمانی کا مظاہرہ کیا جاتا تو شاید کشمیر کے ہندوستان کی غلامی میں جانے کا عظیم المیہ رونما نہ ہوتا۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کشمیر کا پس منظر جاننے کے لیے کشمیر کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

کشمیر کے قدیم دور کی تاریخ کو بارھویں صدی عیسوی کے ایک برہمن شاعر کلہانہ نے راج ترنگنی کے نام سے سنسکرت زبان میں منظوم کیا۔ اس کے مطابق وادی کشمیر میں باقاعدہ حکومتی نظام 2450 قبل مسیح میں قائم ہوا جب ایک شخص گونند نے یہاں اپنا راج قائم کیا۔ اس کے بعد دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک یہاں مقامی خاندان حکومت کرتے رہے۔ اس دوران برصغیر کے مختلف علاقوں میں بھی چھوٹی بڑی بے شمار ریاستیں موجود تھیں اور کوئی بڑی سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس عرصے میں برصغیر میں ایران اور وسط ایشیا کی جانب سے آریاؤں کی آمد کا سلسلہ بھی کئی صدیوں تک جاری رہا۔ وہ زیادہ تر شمالی ہند میں چھا گئے۔ 326 ق م میں سکندر اعظم کے حملے

کے بعد 321ق م میں پہلی مرتبہ شمالی ہند میں چندر گپت موریہ نے برصغیر کی پہلی بڑی سلطنت قائم کی۔ اس سلطنت کے ایک شہنشاہ اشوک اعظم (274 تا 237ق م) نے برصغیر کے بعض دوسرے علاقوں کی طرح وادی کشمیر کو بھی فتح کیا اور اسے موریہ سلطنت میں شامل کرلیا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ کشمیر پر ایک بیرونی حکومت کا قبضہ ہوا تھا۔ مگر یہ بہت ہی مختصر عرصہ کے لیے رہ سکا۔ راج ترنگنی میں اشوک کے بعد جن حکمرانوں کے نام ہیں ان کا تعلق موریہ سلطنت سے نہیں تھا، گویا اشوک کے بعد کشمیر بیرونی غلبہ سے آزاد ہوگیا اور مقامی حکمرانوں کی حکومت بحال ہوگئی۔

اشوک بدھ مت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی بدولت کشمیر میں بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''ویدک برہمن ازم روبہ زوال ہوکر رجعت، ظلم اور جبر کی علامت بن چکا تھا۔ تنگ نظر برہمنوں کی سربراہی میں حکمران طبقے بددلی کا شکار ہوچکے تھے...... اس لیے جب بدھ مت یہاں محبت، نیکی، عالمی بھائی چارہ، روحانی نظم وضبط، اعلیٰ اخلاق، تمام طبقوں اور مرد عورتوں کے مابین مساوات اور آزادی کے نظریات لے کر آیا تو موریہ سامراج یہاں کے لیے زحمت کے بھیس میں رحمت ثابت ہوا۔''[3] یاد رہے کہ اشوک کا دارالحکومت ٹیکسلا جو اپنے عہد میں علوم وفنون کا بڑا مرکز تھا، کشمیر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس طرح گویا وادی کشمیر کا پہلا بیرونی سیاسی وثقافتی رشتہ وادی گندھارا کے ساتھ قائم ہوا۔

پہلی صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے ترک اور ساکا قبائل نے برصغیر کا رخ کیا اور شمالی ہند کے بیشتر علاقے پر قبضہ کرلیا اور کشان سلطنت وجود میں آئی۔ اس کی حدود وسط ایشیا میں کاشغر، یارقند اور ختن تک، مغرب میں ایران تک، مشرق میں بنارس تک اور جنوب میں بندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا دارالحکومت پشاور تھا۔ اس کے سب سے مضبوط فرمانروا کنشک (123-78ء) نے کشمیر پر قبضہ کیا۔ کنشک نے بدھ مت قبول کیا اور اس کے جانشین بھی بدھ مت کے پیروکار رہے۔ ان کے عہد میں وادی کشمیر میں بدھ مت کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی تاہم ساتھ ساتھ پرانے ویدک مذہب کے ماننے والے بھی موجود رہے۔ دوسری صدی عیسوی کے اواخر میں کشان سلطنت زوال کا شکار ہوئی اور 178ء میں کشمیر اس کے قبضے سے نکل گیا۔ یہاں کے قدیم حکمران گونند خاندان نے ایک بار پھر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ اس سے بدھ مت کو بڑا دھچکا لگا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''چار سو سال سے

زائد عرصے تک نئے عقیدے نے ملک کے عام لوگوں میں بیداری پیدا کی تھی اور ان میں ظلمت پسندی (Obscurantism) اور سماجی ناانصافی کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ آزاد افراد پر مشتمل ایک متحرک معاشرہ وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے فلسفہ، ادب، علم وفن اور تعمیرات میں طبع زاد تخلیقات پیش کی تھیں لیکن رجعت پسندوں کا مکمل طور پر خاتمہ نہ ہو سکا۔ گونند خاندان کے دوبارہ عروج اور کشان حکومت کے خاتمے کے بعد بدھ مت کے خلاف ردعمل کا آغاز ہوا اور برہمن ازم کے احیاء کی کوششیں شروع ہو گئیں۔"[4] برہمنوں کے زیر اثر گونند حکمرانوں نے بدھ مت کے پیروکاروں پر بہت ظلم ڈھائے۔ ہزاروں کی تعداد میں موجود بدھ مت کی درسگاہوں، خانقاہوں اور عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔"[5] پوری وادی میں انتشار، افتراق اور خانہ جنگی کی یہ کیفیت ایک عرصہ تک جاری رہی۔

ہندو۔ بدھ تضاد کے نتیجے میں افراتفری کی یہ صورت حال جاری تھی کہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں وسط ایشیا کے ہن قبائلیوں نے شمالی ہند پر یلغار کی اور یہاں واقع گپتا خاندان کی سلطنت کو تباہ و برباد کر کے وسیع و عریض علاقے پر قبضہ کر لیا۔ چھٹی صدی کے اوائل میں ان کے سردار تورمن کے انتقال پر اس کا بیٹا مہر گل تخت نشین ہوا۔ یہ بے حد سفاک انسان ثابت ہوا۔ اس نے پورے شمالی ہند میں بدھ مت کے ماننے والوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام کیا۔ یہاں تک کہ گپتا خاندان کی بچی کھچی سلطنت کے آخری راجہ بالاجیت نے جو کہ بدھ تھا۔ ایک اور بدھ راجہ کے ساتھ مل کر مہر گل کے خلاف چڑھائی کر دی۔ لڑائی میں ہن لشکر کو شکست ہوئی۔ مہر گل قیدی بنا لیا گیا۔ مگر بالاجیت نے اپنی بدھ فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا اور اجازت دی کہ وہ ہندوستان کی حدود سے کہیں دور نکل جائے۔ مہر گل نے وادی کشمیر کا رخ کیا، جہاں ہندو، بدھ تضاد پہلے ہی شدید تھا اور وہاں کے گونند حکمران بدھوں پر ظلم کر رہے تھے۔ مہر گل چونکہ بدھ راجاؤں سے شکست کھا کر گیا تھا۔ اس لیے کشمیر کے بدھ دشمن ہندو حکمرانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی قدر افزائی کی۔ لیکن مہر گل نے جلد ہی اپنے محسن راجہ کا بھی صفایا کر دیا اور کشمیر کا حاکم بن بیٹھا۔ وہ بدھ مت کے ماننے والوں پر قہر بن کر ٹوٹا جو پہلے ہی گونند حکمرانوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہو رہے تھے۔ اس نے ہندو برہمنوں کی بڑی عزت افزائی کی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مندر تعمیر کروائے۔ کلہانہ نے راج ترنگنی میں مہر گل کے مظالم کا بڑا بھیانک

نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''انسانیت کے اس خوفناک ترین دشمن کو نہ تو بچوں پر رحم آتا تھا، نہ عورتوں پر ترس اور نہ ہی وہ بزرگوں کا احترام کرتا تھا'' وہ مزید لکھتا ہے کہ ''مگر اس کے باوجود مذہبی فضیلت حاصل کرنے کی خاطر شیو مندر تعمیر کراتا تھا اور برہمنوں پر خاص عنایت کرتا اور انہیں خانقاہیں بنوا کر دیتا تھا اور یہ کمینے برہمن جو خود اتنے ہی ذلیل تھے جتنا کہ ان کا مربی خود تھا، اس کی عنایات کو قبول کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے تھے۔''[6]

مہر گل نے 530ء میں خودکشی کر لی۔ اس کے بعد گونند خاندان کا اقتدار ایک بار پھر لوٹ آیا۔ لیکن ستم رسیدہ عوام نے ان حکمرانوں کی بالادستی کو بھی زیادہ دیر تک قبول نہ کیا اور باہر سے پرتاپ اجیت کو بلا کر حکومت اس کے حوالے کر دی۔ اس طرح کشمیر ایک بار پھر بیرونی فرمانروا بکرما جیت کے زیر تسلط آ گیا جو اجین (مالوہ) کے علاقے کا راجہ تھا۔ اس کے خاندان کو 192 سال تک کشمیر پر غلبہ حاصل رہا۔ اس کے بعد گونند خاندان سے تعلق رکھنے والوں نے پھر سے یہاں اپنا اقتدار استوار کر لیا۔ جو ساتویں صدی میں ان کے آخری بے اولاد حکمران تک قائم رہا۔

ساتویں صدی میں وادی کشمیر پر ایک مقامی ناگا قبیلے کارکوٹہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ جو کم وبیش چھ سو سال تک قائم رہی۔ اس دوران اس قبیلے میں حکمرانی کئی خاندانوں کو منتقل ہوتی رہی۔ ایک موقع پر انہوں نے چین کے بادشاہ کی بالادستی بھی قبول کی۔ ان کے بہت سے حکمرانوں نے پنجاب کے شمالی اور وسطی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کے ابتدائی دور میں ہندو۔ بدھ تضاد کی شدت میں کمی آئی اور خوشحالی و ترقی کو فروغ حاصل ہوا، تاہم ان کے آخری فرمانرواؤں کا دور طوائف الملوکی اور انتشار کا دور تھا۔ آخری حکمران سہادیو (1320-1300) کے دور میں 1319ء میں شمال کی جانب سے تاتاریوں نے ذوالقدر خاں نامی سردار جو دولچہ کے نام سے مشہور ہوا، کی سرکردگی میں کشمیر پر دھاوا بول دیا، انہوں نے 8 ماہ تک وادی کو تاخت وتاراج کیا اور خوب لوٹ مار کی۔ سہادیو فرار ہو کر کشت واڑ کی جانب چلا گیا۔ جب تاتاری لشکر اپنے خوفناک عزائم کی تکمیل کے بعد واپس شمال کی طرف جا رہا تھا تو اسے برف باری کے شدید طوفان نے گھیر لیا اور دولچہ اپنے لشکر سمیت فنا ہو گیا۔

دولچہ کی آمد سے ذرا قبل لداخ کے راجہ کا بیٹا رنچن ایک بغاوت میں اپنے باپ کے قتل کرنے کے بعد فرار ہو کر کشمیر چلا آیا تھا۔ یہاں سہادیو نے اسے پناہ دی اور جاگیر سے نوازا۔ اسی

دوران وادی سوات کا رہنے والا ایک مسلمان جس کا نام شاہ میر تھا وادی کشمیر میں آیا اور سہا دیو کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ یاد رہے وادی میں مسلمانوں کی آمد اور تبلیغ کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ دولچہ کی یلغار کے دوران سہا دیو نے چونکہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشت واڑ کی جانب راہ فرار اختیار کی تھی۔ چنانچہ وہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ دولچہ کی واپسی کے بعد ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا خلا پیدا ہو گیا۔ عوام کا حکمران خاندان پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اس لیے اس خاندان کے کسی فرد کو تخت پر نہیں بٹھایا گیا۔ تاتاری یلغار کے دوران رنچن اور شاہ میر نے لوگوں کے حوصلے بلند رکھے تھے اور لوگوں کی خدمات انجام دی تھیں، اس لیے امراء اور سرداروں نے مل کر رنچن کو تخت نشین کر دیا اور شاہ میر کو اس کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ تخت سنبھالنے کے بعد رنچن کوئی باقاعدہ مذہب اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہندو برہمنوں کے سامنے درخواست رکھی لیکن وہ رد کر دی گئی۔ اس کے بعد وہ ایک صوفی بزرگ سید بلال شاہ المعروف حضرت بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور اس نے ''سلطان صدر الدین'' کا لقب اختیار کیا۔

1322ء میں صدر الدین (رنچن) کا انتقال ہو گیا تو ایک بار پھر پرانے ہندو حکمرانوں کے اقتدار کی بحالی کی کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ صدر الدین کے بیٹے حیدر کو تخت نشین کرنے کی بجائے سہا دیو کے بھائی ادیان دیو کو تخت نشین کر دیا گیا۔ تاہم شاہ میر بدستور، عہدۂ وزارت پر فائز رہا۔ ادیان دیو کا 1338ء میں انتقال ہوا تو اس کی بیوی رانی کوٹا نے باگ ڈور سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ چند ماہ بعد شاہ میر نے مکمل طور پر اقتدار پر قبضہ کر لیا اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے باقاعدہ مسلم عہد حکومت کا آغاز کیا۔

وادی کشمیر میں اسلام کے اثر و نفوذ کا پس منظر یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عربوں نے وسط ایشیاء پر گلگت تک قبضہ کر لیا تھا اور یہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہو گئی تھی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پنجاب پر غزنوی سلاطین کا قبضہ ہو چکا تھا اور یہاں اشاعت اسلام کا کام شروع ہو چکا تھا۔ وادی کشمیر کا جغرافیائی تعلق وسط ایشاء اور پنجاب سے بنتا تھا۔ اس لیے یہاں وقوع پذیر ہونے والی مذہبی تبدیلیوں کا اثر وادی پر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ راج ترنگنی میں بھی کشمیر میں مسلمانوں کے وجود کے اشارے ملتے ہیں۔ 1277ء میں اطالوی نژاد سیاح مارکو پولو کا یہاں سے گزر ہوا۔ وہ بھی کشمیر میں مسلمانوں کی

موجودگی کا ذکر کرتا ہے، بارہویں صدی میں دریائے سندھ کے کنارے آباد بدھ مت کے پیروکار دردقبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں یہاں مسلمانوں درویشوں اور صوفیوں کی آمدورفت میں اضافہ ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب ہندوحکمران طبقے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے روبہ زوال تھے۔ ماضی میں یہاں کے لوگ برہمن ازم کے خلاف بغاوت کر کے بدھ مت اختیار کرنے کا تجربہ کر چکے تھے۔ مگر اب جب کہ وسط ایشیاء میں بدھ مت کی جگہ اسلام نے لے لی تھی۔ وادی کشمیر کے عوام کے لیے بھی اسلام ایک بہتر متبادل کے طور پر سامنے آیا اور یہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ تبدیلی کا یہ عمل بالآخر سیاسی تبدیلی کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ چنانچہ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''...... مسلمان اس وادی میں فاتح یا لٹیرے کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے تھے۔ بلاشبہ یہاں پر چند ہزار مسلمان موجود تھے۔ جن کی اکثریت مقامی نومسلموں پر مشتمل تھی۔ تاہم یہاں مسلم حکومت کا قیام زیادہ تر یہاں کے مقامی ہندوؤں کی حمایت کی بدولت عمل میں آیا تھا...... کشمیر کے تخت پر شاہ میر کا قبضہ کسی اسلامی طاقت کی طرف سے ریاست میں بالادستی کے حصول کی جدوجہد کی فتح کے نتیجے کے طور پر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی یہ شاہ میر کی بطور مہم جو، سازشی یا سیاستدان کی حیثیت سے کامیابی کی بدولت ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی ذہنی صلاحتیوں اور پختہ کار تجربے نے اس تاریخی تبدیلی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ درحقیقت یہ عوام کی جدوجہد آزادی کی فتح تھی جو ہندوحکمرانوں کی بدنظمی کے دباؤ تلے سسک رہے تھے۔ ہندو سیاست اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں ترقی کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔ یہ بدبودار، خستہ حال اور مردہ ہو چکی تھی۔'' وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ ''مسلمانوں کا اقتدار نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ عملی اور روحانی طور پر بھی ایک رحمت ثابت ہوا۔ اس سے کشمیر میں اسلام کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس نے عوام کی سوچ میں انقلاب برپا کر دیا اور زندگی کے بارے میں مجموعی رویہ بدل کر رکھ دیا سیاست بازی نے کشمیریوں کو انسانیت سے بے بہرہ کر دیا تھا۔ اسلام نے انہیں دوبارہ انسان بنا دیا۔''[7] اپنے اسلاف کے بارے میں پریم ناتھ بزاز کے اس جرأت مندانہ بیان پر اسے جس قدر خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ اس جیسی جرأت آج کے نام نہاد مسلم مورخین میں ناپید ہے جنہیں اپنے اسلاف میں سوائے خوبیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

1339ء میں شاہ میری سلاطین کے اقتدار کے قیام سے لے کر 1819ء میں

رنجیت سنگھ کے قبضے تک مسلم عہد 480 سال پر محیط ہے۔ جس طرح ماقبل اسلام عہد میں ہندو۔ بدھ تضاد کے مختلف اتار چڑھاؤ آتے رہے اسی طرح مسلم عہد حکومت میں ہندو مسلم تضاد کے کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ کبھی تو اس تضاد کی شدت بہت کم ہو گئی اور کبھی یہ بے انتہا شدید ہو کر سامنے آیا۔ شروع شروع میں یہ تضاد نہ ہونے کے برابر تھا۔ برہمن بدستور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی۔ غلام محی الدین صوفی لکھتا ہے کہ ''اسلام نے نہ تو کشمیر کی آزادی پر کوئی اثر ڈالا اور نہ ہی شروع میں یہاں کی سیاسی اور ثقافتی صورت حال میں کوئی مادی تبدیلی پیدا کی۔ انتظامیہ بدستور سرکاری طبقے یعنی برہمنوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کے لیے مذہب کی تبدیلی خاص فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی پرانے مذہب پر قائم رہ کر ان کی موروثی حیثیت کو کسی نقصان کا احتمال تھا۔ کشمیر میں ہندو راج کے خاتمے کے بعد خاصے عرصے تک سرکاری رسل و رسائل اور ریکارڈ رکھنے کے لیے سنسکرت زبان استعمال ہوتی رہی۔''[8]

1342ء میں سلطان شمس الدین شاہ میر کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا سلطان علاؤ الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے 1354ء تک حکومت کی اور وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان شہاب الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں سلطنت کی وسعت وادیٔ کشمیر سے نکل کر بلتستان، لداخ اور کشت واڑ تک پہنچ گئی اور پھر اس نے ایک طرف پشاور، اوہنداور سندھ تک اور دوسری طرف کابل اور کاشغر اور بدخشاں تک کامیاب مہمات انجام دیں۔ اس زمانے میں اس قسم کی مہمات کی کامیابی کے نتیجے میں سلطنت میں استحکام اور خوشحالی کا دور دورہ ہو جاتا تھا کیونکہ لشکر بے شمار مال غنیمت کے ہمراہ واپس لوٹتے تھے۔ سلطان شہاب الدین کی کامیابیوں کا راز یہ تھا کہ ہندو مسلم تضاد نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے سپہ سالار اور وزیر اعظم ہندو تھے۔ خود اس کی بیوی ہندو تھی جس کا نام لکشمی تھا اور اس کے نام پر اس نے لکشمی نگر کے نام سے ایک شہر آباد کیا تھا۔ شہاب الدین نے 19 سال حکومت کی اور 1373ء میں انتقال کیا اس کے بعد اس کا بھائی ہندال تخت نشین ہوا۔ اس نے قطب الدین کا لقب اختیار کیا اور 1389ء میں وفات پائی۔

کشمیر میں مسلم عہد حکومت کا سیاہ ترین دور سکندر کا ہے جو اپنے باپ قطب الدین کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا تھا اس وقت اس کی عمر 8 برس کی تھی۔ اس کے سن بلوغت تک پہنچنے

تک اس کی ماں یعنی بیوہ ملکہ حورہ یا سوبھا وزیروں کی مدد سے کاروبار سلطنت انجام دیتی رہی۔ جب سکندر جوان ہوا تو وہ ایک کٹر تنگ نظر اور متعصب مسلمان تھا اس نے وادی میں ہندو۔ مسلم تضاد کو انتہاء درجہ تک شدید کر دیا۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ کا ٹیکس نافذ کیا اور ان کے مردے جلانے پر ٹیکس لگا دیا۔ وہ معمولی باتوں پر ہندوؤں کو قید میں ڈال دیتا جہاں ان پر ظلم کیا جاتا۔ مسلم مورخین نظام الدین احمد بخشی اور محمد قاسم فرشتہ کے مطابق سلطان سکندر نے ''کافروں کے مندروں کے مسمار کرنے اور بتوں کو توڑنے کا مکمل بندوبست کیا تھا'' انہوں نے دو بڑے مندروں کے انہدام کی تفصیل بھی بیان کی ہے اور اس کے لیے ''بت شکن'' کا لقب استعمال کیا ہے۔ [9] ہندو مؤرخ جون راج نے زیادہ مندروں کی تباہی و بربادی اور بت شکنی کے واقعات بیان کئے ہیں۔ سلطان سکندر کا انتقال 1413ء میں ہوا جس کے بعد اس کا بیٹا سلطان علی شاہ 1420ء تک تخت نشین رہا۔

سلطان سکندر کے عہد (1413۔1389) میں جس قدر ہندو مسلم تضاد شدید ہوا تھا اس کے دوسرے بیٹے شاہی خان الملقب بہ سلطان زین العابدین کے عہد (1470۔1420) میں اتنا ہی ہندو مسلم تضاد نرم ہوا اور فرقہ وارانہ بھائی چارہ کو فروغ ملا۔ سلطان زین العابدین کا پچاس سالہ عہد کشمیر کی تاریخ کا سنہرا ترین دور شمار کیا جاتا ہے۔ وہ کشمیری عوام میں بڈشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ہندوؤں کی دل جوئی کے لیے سلطان سکندر کے مسمار شدہ مندروں کو دوبارہ تعمیر کیا، جزیہ کا ٹیکس ختم کر دیا، مردے جلانے پر ٹیکس ختم کر دیا، ہندوؤں کو اپنے شاستروں کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی دی، ان کے لیے درسگاہیں کھولیں اور ان کے ساتھ جاگیریں وقف کیں، ہندو طلبہ کو وظائف دیئے اور سنسکرت کی سرپرستی کی۔ اس نے مہابھارت اور راج ترنگنی کے فارسی تراجم کرائے اس کے دربار میں دو نامور ہندو مؤرخ جون راج اور سری ور موجود تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے نامی گرامی عالم و فاضل ہندو اس کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زین العابدین کا عہد مسلمانوں کے لیے بھی ایک درخشاں عہد سمجھا جاتا ہے، دور دور سے علماء فضلاء اور شعراء اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں مولانا کبیر، سید حسین قمی رضوی، قاضی جمال الدین اور ملا احمد کشمیری قابل ذکر ہیں۔ اس نے فوج کشی کی طرف توجہ نہیں دی۔ داخلی استحکام، امن عامہ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، علوم وفنون کی سرپرستی اس کی توجہ کا مرکز رہے۔ اس لیے

اس کے دور میں پیداوار بھی زیادہ ہوئی چنانچہ عوام الناس کی ترقی اور خوشحالی میں بھی اضافہ ہوا۔ یقیناً عوام الناس کے لیے بھی یہ ایک سنہرا دور تھا۔ زین العابدین کو کشمیر کا اکبر اعظم بھی کہا جاتا ہے۔

زین العابدین کا جانشین حاجی خان عرف حیدر شاہ (72-1470) نا اہل ثابت ہوا۔ اس نے طوائف الملوکی کو جنم دیا۔ برہمنوں پر ظلم کئے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو چھپاتے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''میں بھٹ نہیں ہوں'' یعنی ''میں ہندو نہیں ہوں'' تاہم اس کے بیٹے حسن شاہ (84-1472) نے اپنے دور میں بڈشاہ کے عہد کی لبرل پالیسی کو فروغ دیا مگر وہ اس سنہرے دور کو لوٹانے میں ناکام رہا۔ شاہ میریوں کے زوال کا آغاز ہو چکا تھا۔ حسن شاہ کے بعد اس کے بیٹے محمد شاہ اور اس کے بھائی فتح شاہ کے مابین 32 سال تک اقتدار کی رسہ کشی جاری رہی۔ 1516ء تک یہ دونوں باری باری تخت نشین ہوتے رہے۔ اول الذکر پانچ مرتبہ اور مؤخر الذکر تین مرتبہ۔ آخری دفعہ محمد شاہ 1537ء تک برسر اقتدار رہا۔ حقیقی اقتدار امراء کے گروہوں کے پاس تھا۔ ان میں سے ایک چک کہلاتے تھے اور دوسرے ماگری۔ چک فتح شاہ کی پشت پناہی کرتے تھے جب کہ ماگری محمد شاہ کی۔ اسی زمانے میں 1487ء میں خراسان سے ایک شیعہ عالم شمس الدین عراقی نے کشمیر میں آ کر قیام کیا۔ اس وقت برسر اقتدار فتح شاہ اور چک امراء نے اس سے متاثر ہو کر شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ ماگری امراء نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس طرح چک ماگری تضاد نے شیعہ سنی تضاد کی صورت اختیار کر لی اور کشمیر کی سیاست میں ہندو مسلم تضاد کے ساتھ ساتھ شیعہ سنی تضاد نے بھی اہم حیثیت اختیار کر لی۔ چک اور ماگری شیعہ سنی کے نام پر بادشاہ گری کرتے رہے اور شاہ میری خاندان کے کسی نہ کسی فرد کو مسند اقتدار پر بٹھاتے رہے۔ اس دوران بابر نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ چک اور ماگری ایک دوسرے کے خلاف وقتاً فوقتاً مغلوں سے امداد طلب کرتے رہتے تھے۔ 1540ء میں ماگریوں نے ہمایوں سے مدد طلب کی۔ وہ خود اس وقت شیر شاہ سوری کے ہاتھوں پے در پے شکست کھا رہا تھا مگر اس نے کاشغر کے ایک مغل امیر مرزا حیدر دوغلات کی سرکردگی میں ایک لشکر ماگریوں کی مدد کے لیے کشمیر بھیج دیا۔ اس لشکر کو کامیابی ہوئی اور قاضی چک شکست کھا کر شیر شاہ سوری سے مدد مانگنے چلا گیا مرزا حیدر دوغلات نے سلطان ابراہیم شاہ کو معزول کر کے نازک شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ مرزا دوغلات نے سنیوں کی بالادستی قائم کی، شیعوں پر مظالم کئے اور انہیں ذلیل و خوار کیا۔

چک سرداروں نے سوری سلاطین سے امداد حاصل کر کے کئی مرتبہ یورش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ 1551ء میں کشمیری امراء اور مرزا دوغلات کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں چک اور ماگری امراء نے اپنے اختلافات بھلا کر مرزا کے خلاف بغاوت کر دی جس میں مرزا دوغلات مارا گیا۔ اس کے بعد غازی چک اور دولت چک کی قیادت میں چک امراء کو عروج حاصل ہو گیا۔ انہوں نے چار سال تک شاہ میریوں کو برائے نام تخت پر برقرار رکھا اور بالآخر 1555ء میں آخری شاہ میری سلطان حبیب کو معزول کر کے چک خاندان کی حکومت قائم کر دی۔

چک خاندان کا عرصۂ اقتدار کل 31 سال (1555-86) پر محیط ہے۔ یہ انتہائی متعصب اور کٹر شیعہ تھے۔ انہوں نے مذہبی جنون اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور سنیوں کا عرصہ حیات تنگ کر کے رکھ دیا۔ ان کے پہلے فرمانروا غازی شاہ چک (1555-63) نے چن چن کر سنیوں سے بدلے لئے۔ اس دوران ہندوستان میں مغلوں کا دوبارہ اقتدار قائم ہو چکا تھا اور ہمایوں ایران سے شیعہ امراء کی بھاری تعداد ساتھ لے کر آیا تھا۔ عہد اکبری میں ان کو جو عروج حاصل ہوا وہ پرانے ترک اور مغل امراء کو ناگوار تھا چنانچہ مغل سلطنت میں بھی شیعہ سنی تضاد جو دراصل ایرانی و تورانی تضاد تھا بری طرح سرایت کر گیا تھا۔ حسین چک (1536-70) کے دور میں دربار اکبری سے تعلق رکھنے والے بعض شیعہ امراء نے کشمیر میں جا کر شیعہ سنی تضاد کو مزید ہوا دی۔ کشمیر کے سنیوں نے اکبر سے فریاد کی تو وہ ان شیعہ امراء پر سخت ناراض ہوا۔ اس نے ان کو واپس طلب کر کے ان کے رہنما مرزا محمد مقیم کو موت کی سزا دی۔ اکبر نے حسین چک کے بھیجے ہوئے تحائف قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ جن میں حسین چک کی بیٹی بھی شامل تھی جو اس نے شہزادہ سلیم سے بیاہنے کے لیے بھیجی تھی۔ حسین چک یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور انتقال کر گیا۔ اس کے جانشینوں نے بھی کشمیر کے حالات میں کوئی بہتری پیدا نہ کی۔

اکبر کو وسط ایشیا کی جانب سے ازبکوں کی یلغار کا خطرہ لاحق تھا چنانچہ اس نے کشمیر پر قبضہ کا ارادہ کر لیا تھا۔ 1574ء میں اس نے حسین چک کے جانشین بھائی علی شاہ چک (1570-79) کے پاس اپنے سفیر بھیج کر تعلقات بحال کئے اور حسین چک کی متذکرہ بیٹی کو شہزادہ سلیم کے عقد میں قبول کر لیا۔ علی شاہ چک نے بھی اکبر کی بالادستی کو قبول کر لیا اور خطبے میں اس کا نام شامل کر لیا۔ اس کے بعد چک خاندان میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اکبر نے اس سے

فائدہ اٹھایا اور 1586ء میں کشمیر پر قبضہ کر کے اسے مغل سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ اس نے آخری چک فرمانروا یوسف چک کو اپنے امراء میں شامل کر کے اسے بہار میں جاگیر دے دی۔

کشمیر 1586ء سے 1752ء میں احمد شاہ درانی کے حملے تک 166 سال کے لیے مغل سلطنت کا صوبہ بنا رہا۔ مغل شہنشاہ کی طرف سے مقرر کردہ صوبے دار یعنی گورنر یہاں کا انتظامی سربراہ ہوتا تھا۔ کشمیر پر مغل عہد میں کم وبیش 63 صوبے دار مقرر ہوئے۔ ان میں سے بعض عوام کے خیر خواہ اور ترقی پسند تھے اور انہوں نے اس علاقے میں سیاسی ومعاشی فلاح کے لیے بہت کام کیا مگر ان میں سے اکثریت ان کی تھی جنھوں نے ظالمانہ روش اختیار کی، ہندو مسلم تضاد اور شیعہ سنی تضاد میں شدت پیدا کی اور عوام الناس پر غیر ضروری ٹیکس اور محصولات عائد کیے۔ بیشتر موقعوں پر یہاں کے لوگوں نے شہنشاہ سے ان کے خلاف شکایات کیں اور مداخلت کی درخواست کی۔ چنانچہ کئی مرتبہ شہنشاہ نے ذاتی طور پر مداخلت کی اور عوام کی شکایات کا ازالہ کیا۔

مغل شہنشاہ وقتاً فوقتاً وادی کشمیر کی سیر کے لیے بھی آتے رہتے تھے۔ اس سے یہاں کے عوام کو دربار تک اپنی آواز پہنچانے کا براہ راست موقع ملتا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں شہنشاہ ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہاں رفاہ عامہ کے بہت سے کام خود انجام دیتے تھے جس سے عوام الناس کی معاشی فلاح کے مواقع پیدا ہوتے تھے۔ 1589ء میں اکبر نے کشمیر کا دورہ کیا۔ یہاں کے لوگوں کو محصولات اور ٹیکسوں کے وضع کرنے کے طریقہ کار کے خلاف شکایات تھیں۔ اکبر نے تمام غیر ضروری محصولات معاف کر دیئے اور محصولات وضع کرنے کا جو طریقہ اس کے وزیر مال راجہ ٹوڈرمل نے سلطنت کے دوسرے علاقوں میں نافذ کیا ہوا تھا وہی یہاں بھی رائج کر دیا۔ کشمیر کے محکمہ مال گزاری میں پنڈت بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اکبر کشمیر کے قیام کے دوران یہاں کے ہندو تیرتھوں میں گیا اور اس نے برہمنوں کو سونے کے تحائف دیئے۔''[10] اکبر نے دوسری بار 1592ء میں اور تیسری بار 1597ء میں کشمیر کا دورہ کیا۔ اس نے پنجاب میں گجرات سے براستہ بھمبر راجوڑی اور شوپیاں سے سری نگر تک شاہراہ بھی تعمیر کرائی۔ آئین اکبری کے مطابق اکبر نے کابل اور قندھار کو صوبہ کشمیر میں شامل کر دیا تھا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے اس کی وجہ وادی کشمیر کا وادی گندھارا کے ساتھ قدیم تعلق تھا۔''[11]

جہانگیر اپنے عہد (28۔1605) میں چھ مرتبہ کشمیر آیا۔ اس نے 1621ء میں یہاں

کے لوگوں کی شکایت پر یہاں لا گوایک ناجائز ٹیکس ''رسم فوجداری'' کا خاتمہ کیا۔ یہاں بہت سے ہندوؤں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوا تھا کہ وہ مسلمان عورتوں کے ساتھ شادی کر لیتے اور جب مر جاتے ہندو رسم کے مطابق ان کی مسلمان بیوہ کو بھی ستی کر دیا جاتا تھا۔ جہانگیر نے 1619ء میں اس قسم کی شادیوں پر پابندی عائد کر دی۔ اس نے ایک کشمیری پنڈت سری کانت کو ہندو آبادی کے لیے منصف اعلیٰ کے عہدے پر فائز کیا تا کہ وہ ہندو شاستروں کے مطابق ان کے فیصلے انجام دے۔

شاہجہان نے اپنے عہد (59-1628) میں چار مرتبہ کشمیر کا دورہ کیا۔ جہانگیر کے اواخر عہد میں کشمیر کا گورنر اعتقاد خان تھا جس نے یہاں بعض ظالمانہ ٹیکس نافذ کر دیئے تھے۔ شاہجہاں نے لوگوں کی شکایت پر نہ صرف یہ ٹیکس معاف کر دیئے بلکہ اس گورنر کو بھی تبدیل کر دیا۔ 1634ء میں کشمیر کے شاہ جہاں کے پہلے دورہ کے موقع پر بھمبر کے ہندو راجہ نے اسلام قبول کیا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''شاہ جہاں اپنی سلطنت کے دوسرے عوام کے ساتھ برتاؤ کی طرح کشمیر کے عوام کے ساتھ بھی ویسا ہی اچھا برتاؤ کرتا تھا جو کہ شہنشاہ کے بجائے ایک باپ کا ہوتا ہے۔ جب وادی میں قحط پڑا تو اس نے لاہور، جالندھر اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے فوری طور پر یہاں غلہ پہنچایا اور غریبوں میں مفت تقسیم کیا۔''[12]

اپنے پیش رووں کے برعکس اورنگ زیب (1707-1659) فقط ایک مرتبہ کشمیر آیا۔ وہ بھی جب 1664ء میں وہ سخت بیمار پڑا تو تبدیلی آب و ہوا کے لیے اسے یہاں آنا پڑا۔ اس نے یہاں یکے بعد دیگرے 14 گورنر مقرر کئے۔ ان میں زیادہ تر اپنے شہنشاہ کی طرح متعصب اور تنگ نظر تھے۔ ان میں سے دو یعنی مظفر خان اور ابونصر خاں بہت سخت گیر واقع ہوئے، خاص طور پر ہندوؤں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا درشت تھا۔ محی الدین صوفی کے مطابق عہد عالمگیر میں ''کشمیر میں شیعہ سنی تضاد میں بھی اضافہ ہوا'' اس زمانے میں شیعوں اور سنیوں کے مابین جھگڑا اور فساد کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔''[13]

اورنگ زیب کے بعد متاخرین مغلوں کے عہد میں مغل سلطنت جس انتشار کا شکار ہوئی اس کا کشمیر میں بھی واضح اثر ہوا۔ اس عہد میں صوبوں کے گورنروں نے مرکز دہلی میں رہنا شروع کر دیا تھا ان کے نائب یا نمائندے برائے نام صوبوں میں موجود ہوا کرتے تھے۔ اس لیے صوبوں میں نظم و ضبط نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ انتشار اور لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے۔

ہندو مسلم تضاد اور شیعہ سنی تضاد دونوں میں شدت آ گئی۔ یہ شدت درحقیقت اقتدار کی کشمکش میں شدت کی آئینہ دار تھی۔ یہ دونوں تضادات محض عقیدے کے فرق کی وجہ سے رونما نہیں ہوئے تھے بلکہ سیاسی مفاد کے مختلف گروہوں کے مابین ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے جب مغل سلطنت زوال اور افراتفری کا شکار ہوئی اور یہاں اقتدار کی رسہ کشی میں اضافہ ہوا تو یہ دونوں تضادات بھی شدید ہو گئے۔ 1720ء میں کشمیر میں شیعوں اور ہندوؤں نے سنیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا کیونکہ ایک سنی مولوی محبوب خان نے جسے کشمیر میں شیخ الاسلام مقرر کر دیا گیا تھا، وہاں کی شیعہ اور ہندو آبادی کے خلاف مہم شروع کر دی تھی۔ بالآخر وہ ایک شیعہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بیٹے ملا شرف الدین نے سنی مسلمانوں میں انتقام کی آگ بھڑکائی اور وادی میں کثیر تعداد میں شیعوں اور پنڈتوں کا قتل عام ہوا۔ یکے بعد دیگرے کئی نائب صوبیدار بدلے گئے مگر حالات قابو میں نہ رہے۔ اس قدر فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھی کہ حکومت دہلی نے لاہور کے گورنر صمد خان کو کشمیر کے حالات سنبھالنے کے لیے وہاں بھیجا۔ صمد خان نے شیخ الاسلام کے نافذ کردہ تمام قوانین کو ختم کر دیا اور ملا شرف الدین اور اس کے پچاس ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تب جا کر وہاں امن و امان قائم ہوا۔[14] تضادات کی شدت عارضی طور پر کم ہو گئی لیکن چونکہ مغل شہنشاہ محمد شاہ رنگیلا (1719-14) اور صوبوں کے گورنر دہلی و آگرہ کے عشرت کدوں میں جاگیردارانہ شہنشاہیت کو اپنے انجام تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اس لیے صوبہ کشمیر کے حالات بدستور انتشار سے دوچار رہے۔

1739ء میں ایران کے فرمانروا نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ جب محمد شاہ رنگیلا نے اس کے سامنے اطاعت سے سر جھکا دیا تو یہ طے پایا کہ دریائے سندھ کے مغرب میں کشمیر سے لے کر سندھ تک واقع مغل سلطنت کے تمام علاقے نادر شاہ کی سلطنت میں شامل سمجھے جائیں گے۔ نادر شاہ بے بہا قیمتی مال و اسباب لے کر واپس ایران چلا گیا۔ قندھار، کابل، پشاور اور ڈیرہ جات ایرانی سلطنت کا حصہ بن گئے تاہم وادی کشمیر پر نادر شاہ کا مقرر کردہ صوبیدار فقط چالیس روز تک برقرار رہ سکا۔ اس کے بعد مغل سلطنت کے صوبیدار نے اس کی جگہ لے لی۔ جون 1747ء میں مشہد میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا تو اس کے امراء میں شامل ایک افغان سردار احمد شاہ ابدالی نے خزانے کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر کے

افغانوں کے ہمراہ وہاں سے راہ فرار اختیار کی اور قندھار میں آ کر افغانستان کی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اس کے پہلے فرمانروا کی حیثیت سے اپنے سر پر تاج رکھا۔ افغان سلطنت میں وہ تمام علاقے شامل کر لیے گئے، جو نادر شاہ نے مغل سلطنت سے حاصل کئے تھے۔ ان میں قندھار، کابل، غزنی، ہزارہ، پشاور، ڈیرہ جات، ملتان اور سندھ شامل تھے۔ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا رخ کیا اور 1751ء میں پنجاب کو مغل سلطنت سے نکال کر اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

اس دوران کشمیر میں انتشار اور افراتفری کی صورت حال بدستور جاری تھی۔ مغل نائب صوبیدار اور امراء کے دیگر گروہوں کی ریشہ دوانیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ 1752ء میں یہاں کے چند امراء نے احمد شاہ ابدالی کو، جو اس وقت لاہور میں تھا خط لکھ کر کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اس نے ایک بڑا لشکر کشمیر کی جانب روانہ کر دیا۔ کشمیر کے مغل ناظم، عبدالقاسم نے شوپیاں کے قریب اس لشکر کا راستہ روکا لیکن اسے بری طرح شکست ہوئی۔ اس طرح 1752ء میں کشمیر کی خوبصورت وادی پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا اور اسے افغانستان کی سلطنت کا صوبہ بنا دیا گیا۔

کشمیر 1752 سے 1819ء تک افغانوں کے زیر تسلط رہا۔ افغانوں کے ظلم و جبر، معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے اسے کشمیر کی تاریخ کے تاریک ادوار میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''ہزاروں سال تک کشمیر اور گندھارا کے لوگ سیاسی اور ثقافتی بندھن میں جڑے رہے تھے۔ اس لیے جب کشمیر انتشار اور افراتفری سے دوچار ہوا تو کشمیری امراء کا احمد شاہ درانی سے مدد طلب کرنا کوئی حیران کن امر نہیں تھا۔ انہیں امید تھی کہ اس مشکل کے وقت میں افغان کشمیریوں کے دوست ثابت ہوں گے لیکن جلد ہی...... کشمیریوں کو پتہ چلا کہ انہیں فرائی پان سے نکال کر آگ میں ڈال دیا گیا۔''[15] سب سے پہلے افغان گورنر عبداللہ خان عقسی نے انتہائی سخت گیر طریقوں سے لوگوں سے محصولات وضع کئے اور رقم جمع کی۔ صرف چھ مہینے بعد جب وہ کابل گیا تو اس نے بادشاہ کی خدمت میں ایک کروڑ روپے پیش کئے۔''[16] یہ رقم اس کے علاوہ تھی جو اس نے اور اس کے ساتھی سرداروں نے اپنے لیے جمع کی تھی۔ اس دوران کشمیر میں تجارت اور کاروبار بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ بڑے بڑے تاجر وادی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

افغان عہد میں کشمیر میں چودہ گورنر مقرر کئے گئے۔ ان میں سے بیشتر نے کابل سے رشتہ توڑ کر اپنی خود مختاری قائم کرنے کی کوشش کی کیونکہ افغان بادشاہ یا تو ایران اور ہندوستان کی مہمات میں مصروف رہتے تھے یا اقتدار کی باہمی کشمکش اور محلاتی سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔

بیشتر افغان گورنر انتہائی متعصب تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا جس سے ہندو مسلم تضاد کی شدت میں اضافہ ہوا۔ عبداللہ خان عقسی کابل گیا تو ایک ہندو سکھ جیون مل کو ناظم مقرر کر گیا تھا۔ سکھ جیون نے جلد ہی کابل کے خلاف بغاوت کر دی اور خود مختار حکومت قائم کر لی۔ شروع میں اس نے ایک کشمیری امیر ابوالحسن بانڈے کے ساتھ مل کر اقتدار مستحکم کیا مگر پھر اسے ہٹا دیا اور مسلمانوں پر سختیاں کرنے لگا۔ یہ سلسلہ چند برس تک جاری رہا کیونکہ احمد شاہ ابدالی ہندوستان کی مہم میں مصروف تھا۔ بالآخر افغانوں نے جموں کے راجہ رنجیت دیو کی مدد سے سکھ جیون مل کے خلاف حملہ کیا اور اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ سکھ جیون کو پابند سلاسل لاہور لایا گیا جہاں احمد شاہ نے اسے سزائے موت دے دی۔ اس کے بعد احمد شاہ کشمیر میں جلد جلد گورنر تبدیل کرتا رہا۔ 1772ء میں احمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ افغانستان کا بادشاہ ہوا۔ اس موقع پر کشمیر میں افغان فوج کے ایک شیعہ سپہ سالار جواں شیر قزلباش نے کشمیر کے صوبیدار خرم خان کو وہاں سے بھگا دیا اور خود یہاں کا حاکم بن گیا۔ اس کے عاقبت نااندیش رویے نے یہاں کے پرانے شیعہ سنی تضاد کو بھڑکا دیا۔ بقول صوفی ''وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ظالم تھا۔'' وہ 6 سال اقتدار پر قابض رہا۔

تیمور شاہ نے کریم داد کو گورنر نامزد کر کے ایک لشکر کے ہمراہ یہاں بھیجا۔ جس نے جوان شیر کو شکست دے کر یہاں کابل کی بالادستی کو دوبارہ مستحکم کر دیا۔ اس نے سکردو اور جموں کو بھی فتح کیا۔ اس کا رویہ بھی ظالمانہ رہا۔ بقول صوفی ''وہ معمولی بات پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔'' اس نے معمول کے ٹیکسوں کے علاوہ کئی ناجائز ٹیکس عائد کئے۔ ان میں ''زرنیاز'' منصب داروں اور جاگیرداروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ ''زراشخاص'' تاجروں اور ساہوکاروں سے اور ''زرحبب'' کاشتکاروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس نے پنڈتوں پر ''زردود'' اور شالیں بنانے والوں پر ''داغ شال'' نام کے ٹیکس عائد کر دیئے۔ اس نے جوان شیر کے آباد کردہ

شہرامیر آباد کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔'' سات سال حکومت کرنے کے بعد 1783ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آزاد خان یہاں کا حاکم ہوا۔ اس نے 3 ہزار سکھوں کو ملازمت میں لیا اور فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ اپنے سخت گیر رویے کی وجہ سے اسے کشمیر کا نادر شاہ کہا جاتا ہے۔ اس نے تیمور شاہ کے مطالبے پر یہاں سے تین لاکھ روپے جمع کر کے دیئے جو ظاہر ہے کہ عوام سے سختی کے ساتھ وصول کئے گئے تھے۔ آزاد خان نے بھی تخت کابل کے خلاف بغاوت کر دی مگر پائندہ خان بارک زئی نے اس کی سرکوبی کے لیے چڑھائی کی اور آزاد خان نے خودکشی کر لی۔ اس کے بعد یہاں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے لیے گورنر مقرر کئے گئے۔ 1792ء میں میر ہزار خان گورنر مقرر ہو کر آیا۔ 1793ء میں کابل میں تیمور شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا زمان شاہ تخت نشین ہوا لیکن وہ اپنے بھائی محمود شاہ کے خلاف جانشینی کی جنگ میں مصروف ہو گیا۔ ان حالات میں میر ہزار خان نے کشمیر میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ صوفی کے مطابق ''وہ شیعوں اور ہندوؤں کے لیے بہت سخت گیر ثابت ہوا۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ بھی نافذ کیا۔''[17]

1795ء میں عبداللہ خاں ہلاکو زئی یہاں کا گورنر مقرر ہو کر آیا اور اس نے یہاں 11 سال حکومت کی۔ اس دوران کابل میں تیمور شاہ کے بیٹوں کے درمیان اقتدار کی جنگ نے شدت اختیار کی۔ 1801ء میں محمود شاہ نے کابل پر قبضہ کر کے زمان شاہ کو گرفتار کیا اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔ تیسرے بھائی شجاع نے محمود کے خلاف لشکر کشی کی اور وہ 1802ء میں کابل کے اقتدار پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد محمود اور شجاع کے مابین اقتدار کی طویل جنگ جاری رہی۔ ان حالات میں عبداللہ خان ہلاکو زئی نے بھی کشمیر میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ 1807ء میں کابل کے لشکر نے اس کے خلاف کشمیر پر چڑھائی کی۔ عبداللہ مارا گیا اور عطا محمد خاں یہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ تھوڑے عرصے بعد کابل میں محمود شاہ نے شاہ شجاع کو اقتدار سے محروم کر دیا اور شجاع نے راہ فرار اختیار کی۔ اس صورت حال میں 1801ء میں کشمیر میں عطا محمد خاں بھی خود مختار ہو گیا۔ تمام افغان گورنروں میں اس کا مقامی لوگوں کے ساتھ رویہ اچھا رہا۔ وادی میں امن و امان اور خوشحالی دیکھنے میں آئی۔ اس دوران کابل کے معزول فرمانروا شاہ شجاع نے کشمیر میں آکر عطا محمد کے پاس پناہ لی۔ 1813ء میں کابل کے حکمران محمود شاہ نے پنجاب کے حاکم رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر کشمیر پر چڑھائی کی۔ یاد رہے کہ 1798ء میں

اس وقت کے کابل کے فرمانروا زمان شاہ نے رنجیت سنگھ کو لاہور کا حاکم مقرر کیا تھا جس نے جلد ہی پنجاب پر اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔لڑائی میں عطا محمد اور شاہ شجاع کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گئے۔محمود شاہ اور رنجیت سنگھ کے مابین ہونے والے معاہدے میں طے ہوا تھا کہ کامیابی کی صورت میں رنجیت سنگھ کو 8 لاکھ روپے دیئے جائیں گے۔مگر افغانوں نے اب یہ کہہ کر یہ رقم دینے سے انکار کر دیا کہ سکھوں نے صحیح طرح مدد نہیں کی۔رنجیت سنگھ نے بھی قیدی عطا محمد اور شاہ شجاع کو افغانوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں ہمراہ لے کر لاہور آ گیا۔

محمود شاہ نے عظیم خاں کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔1814ء میں رنجیت سنگھ نے 8 لاکھ روپے کی وصولی کا بہانہ کر کے ایک بار پھر کشمیر پر حملہ کر دیا۔لیکن رنجیت سنگھ کے لشکر کو افغانوں کے ہاتھوں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔رنجیت سنگھ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔کشمیر کے آخری افغان گورنروں عظیم خاں اور اس کے بھائی جبار خاں نے بدستور ظلم و جبر کا سلسلہ جاری رکھا۔ادھر افغانستان میں محمود شاہ کے بیٹے کامران اور زمان شاہ کے بیٹے قیصر کے مابین تخت نشینی کی جنگ عروج پر تھی۔1818ء میں شاہ کامران کی طلبی پر عظیم خان کو کابل جانا پڑا۔اس دوران کشمیر سے محکمہ مال کے اعلیٰ عہدیدار بیر بل ڈار نے پیر پنجال کے دو مسلمان سرداروں ملک کامدار اور ملک نامدار کے تعاون سے راہ فرار اختیار کی اور لاہور پہنچ کر رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب دی کہ عظیم خاں بیشتر افغان سپاہیوں کو لے کر افغانستان کی خانہ جنگی میں حصہ لینے کے لیے گیا ہوا تھا۔ چنانچہ 1989ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر بھرپور حملہ کیا۔عظیم خان کا بھائی جبار خاں اس کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہا اور یوں وادی کشمیر سکھوں کے قبضے میں چلی گئی۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے صوفی لکھتا ہے کہ ''افغانوں کی حماقت، ان کا لالچ اور سختی سے محصولات کی وصولی ان کے اس نقصان کی ذمہ دار ہے......ان کا غیر روادارانہ رویہ اور معاشی استحصال آج بھی ان لوگوں کے لبوں پر ہے جن کے آباؤاجداد پر یہ روا رکھا گیا تھا۔''[18]

وادی کشمیر پر سکھوں کے تسلط کے دور (46-1819ء) میں یہاں دس گورنر مقرر کئے گئے۔ان میں پانچ ہندو، تین سکھ اور دو مسلمان تھے۔جس طرح افغانوں کے استبدادی عہد میں یہاں کے ہندوؤں کو زیادہ ظلم وستم برداشت کرنا پڑا۔اسی طرح سکھوں کے استبدادی عہد میں یہاں کے مسلمانوں پر حد درجہ ظلم وستم کیا گیا۔بزاز لکھتا ہے کہ ''اگر افغانوں کی طرف سے مسلم اشرافیہ

پر نسبتاً کم مظالم ڈھائے گئے تو سکھ گورنروں نے بھی ہندو جاگیرداروں اور زمینداروں پر نسبتاً کم سختی کی......فطری طور پر جس طرح افغانوں کے عہد میں ملک کی جدوجہد آزادی کی قیادت یہاں کی پنڈت اشرافیہ کے حصے میں آئی تھی اسی طرح اب اس لڑائی کی قیادت مسلم اشرافیہ نے ہاتھ میں لے لی تھی۔'' وہ سکھ عہد کے ایک گورنر دیوان موتی رام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اس نے گائے ذبح کرنے پر پابندی عائد کر دی تھی اور اس کے مرتکب ہونے والے کے لیے سزائے موت کا اعلان کیا تھا۔ جن مسلمانوں پر یہ الزام عائد ہوا ان کو پھانسی دے دی گئی اور بازاروں میں گھسیٹا گیا۔ سپاہیوں نے ایک پورے خاندان کو اس جرم کے شک میں گھر میں بند کر کے زندہ جلا دیا تھا۔''[19]

1839ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں میں تخت نشینی کی شدید کشمکش شروع ہو گئی۔ اس دوران کشمیر میں شیخ غلام محی الدین اور اس کا بیٹا شیخ امام الدین دو مسلمان گورنر ہوئے لیکن وہ انتہائی کمزور ثابت ہوئے اور سکھ غلبے کے خلاف دم نہ مار سکے۔ مارچ 1846ء میں سکھوں نے انگریزوں کے ہاتھ شکست کھائی تو انہوں نے وادی کشمیر کی تقدیر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دی جنہوں نے اسے جموں کے ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

کشمیر کی گذشتہ تقریباً ساڑھے چار ہزار سال کی تاریخ کے اس مختصر ترین جائزے سے جو چند اہم حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(1) کشمیر کسی بیرونی حکومت کے زیر اثر بہت کم عرصے کے لیے رہا۔ طویل تاریخ میں ان مختصر وقفوں کی تفصیل یہ ہے:۔

اشوک......38 سال
کنشک اور بقیہ کشان......100 سال
مہر گل، ھن......20 سال (زیادہ سے زیادہ)
بکرماجیت، ریاست مالوہ......192 سال
مغل......166 سال
افغان......67 سال
سکھ......27 سال
کُل......609 سال

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال کی معلومہ تاریخ میں 609 سال کا عرصہ کل عرصہ کا فقط 13 فیصد بنتا ہے۔ بقیہ 87 فیصد عرصہ کشمیر سیاسی طور پر ایک علیحدہ اکائی رہا ہے۔

(2) وادی کشمیر کا اپنے سے باہر سیاسی اور ثقافتی تعلق زیادہ تر وادی گندھارا اور وادی سندھ کے ساتھ استوار رہا۔ اشوک کا دارالحکومت ٹیکسلا تھا، کنشک اور کشان سلطنت کا دارالحکومت پشاور تھا، ہنوں کا صدر مقام بھی پشاور تھا، بکرماجیت کی ریاست مالوہ کی راجدھانی اجین جنوب مغربی ہند میں واقع تھی، مغل عہد میں کشمیر کو کابل اور قندھار کے ساتھ مل کر انتظامی اکائی بنایا گیا تھا، افغانوں کا دارالحکومت کابل اور سکھوں کا دارالحکومت لاہور تھا۔ چنانچہ کشمیر کبھی بھی گنگا جمنا کی وادی کے زیر اثر نہیں رہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بعض کشمیری پنڈت خاندان جن میں نہرو خاندان بھی شامل ہے، اپنا وطن چھوڑ کر گنگا جمنا کی وادی میں جا آباد ہوئے اور پھر گنگا جمنی سامراج کے علمبردار بن گئے۔

(3) کشمیر کی وادی میں اسلام کے اثر و نفوذ سے پہلے کئی صدیوں تک ہندو۔ بدھ تضاد کار فرما رہا تھا۔ لوگوں نے برہمن ازم کے خلاف بغاوت کر کے بدھ مت اختیار کیا۔ بدھ مت کے زیر اثر یہاں کے لوگوں کا باہر کی دنیا کے ساتھ سیاسی و ثقافتی رشتہ استوار ہوا۔ بدھ کے ماننے والوں نے اپنے عہد عروج میں ہندوؤں کے ساتھ کوئی خاص زیادتی نہیں کی مگر ہندوؤں نے دوبارہ غلبہ حاصل کر کے بدھوں پر بڑے مظالم کئے۔

(4) کشمیر میں مسلمانوں کا اقتدار اس انداز سے قائم نہیں ہوا تھا جیسے برصغیر کے بیشتر دوسرے علاقوں میں قائم ہوا تھا۔ یہ کسی بیرونی حملے کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ اقتدار مقامی نومسلموں نے قائم کیا جو کسی جبر کے بجائے صوفیا کی تبلیغ کے زیر اثر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان صوفیا میں ایک بہت بڑا سلسلہ ایسا ہے جنہیں ریشی یعنی رشی کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کے زیر اثر یہاں کے لوگوں نے مسلم صوفیا کا بہت جلد اثر قبول کیا اور کثیر آبادی مسلمان ہو گئی۔ یاد رہے کہ وادی کی 95 فیصد سے زائد آبادی مسلمان ہے۔

(5) کشمیر میں تقریباً 500 سالہ مسلم دور حکومت میں ہندو۔ مسلم تضاد بدستور کارفرما رہا۔

کبھی نرم اور کبھی شدید تر۔ چنانچہ ہندوؤں پر مظالم بھی ہوئے اور انہیں محکوم و مغلوب قومیت کی حیثیت حاصل رہی۔ ایسے ادوار بھی آئے جب ان پر جزیہ اور مختلف مذہبی ٹیکس لاگو کئے گئے۔ ان کے مندر مسمار کئے گئے، بت توڑے گئے اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔ مگر سکھ عہد کے قیام کے ساتھ ہی پانسہ پلٹ گیا اور ہندو۔ مسلم تضاد نے دوسرا رُخ اختیار کر لیا۔ اب ہندو غالب اور مسلمان مغلوب و محکوم ہو گئے۔

(6) مسلم عہد میں شیعہ سنی تضاد بھی کارفرما رہا۔ تاہم یہ تضاد سکھ اور ڈوگرہ استبداد اور بھارتی سامراج کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی بدولت اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

برطانوی سامراج نے پنجاب میں سکھوں کی شکست کے بعد وادی کشمیر کا وسیع و عریض پہاڑی علاقہ شکست خوردہ سکھ سلطنت کے ایک ہندو ڈوگرہ صوبیدار گلاب سنگھ کے پاس 75 لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے امرتسر میں 9/مارچ 1846ء کو جس معاہدے پر دستخط ہوئے تھے اس میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ راجہ گلاب سنگھ ریاست جموں و کشمیر کا خودمختار حکمران ہوگا۔ ریاست میں سارا پہاڑی علاقہ اور اس کے وہ ملحقات بھی شامل ہوں گے جو مغرب کی جانب دریائے سندھ تک اور مشرق کی جانب دریائے راوی تک واقع ہیں۔ اس کے معاوضہ کی رقم میں سے پچاس لاکھ روپے معاہدے کی توثیق کے وقت اور باقی پچیس لاکھ روپے یکم اکتوبر 1846ء کو یا اس سے قبل ادا کئے جائیں گے۔ برطانوی حکومت بیرونی حملہ آوروں سے ریاست کو محفوظ رکھنے کے لیے راجہ گلاب سنگھ کی مدد کرے گی۔ گلاب سنگھ ریاست پر برطانوی حکومت کی بالادستی قبول کرے گا اور تحفے کے طور پر سالانہ ایک گھوڑا، بارہ بہترین نسل کی بھیڑیں جن کی اون شال بنانے کے کام آسکے اور جن میں سے چھ نر اور چھ مادہ ہوں گی اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے پیش کیا کرے گا۔ اس معاہدے کی رو سے ضلع ہزارہ بھی گلاب سنگھ کی ریاست میں شامل کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس علاقے کا تبادلہ پنجاب میں مینڈر وادی، کٹھوعہ اور سچیت گڑھ کے علاقوں سے کر لیا گیا تھا۔

پنجاب میں انگریزوں کی فتوحات سے پہلے گلاب سنگھ جموں میں لاہور کی سکھ سلطنت کا

صوبیدار تھا۔ اسے یہ جاگیر انعام کے طور پر اس لیے ملی تھی کہ اس نے انیسویں صدی کے اوائل میں سکھوں کے افغانستان پر حملے کے دوران ان کی امداد کی تھی۔ اس نے اپنی جاگیر میں توسیع کے لیے 1837ء میں تبت پر حملہ کر کے لداخ اور بلتستان کے شمالی علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ پانیکر کے بیان کے مطابق وہ پہلا ہندوستانی حکمران تھا جس نے اپنی سلطنت میں توسیع کی تھی۔ 1839ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ فوت ہوا تو گلاب سنگھ پنجاب کے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ چونکہ رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً ہی بعد اس کے وارثوں میں اقتدار کے لیے بڑی خوفناک رسہ کشی شروع ہو گئی تھی اس لیے گلاب سنگھ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب سکھ سلطنت کا ستارہ غروب ہونے ہی والا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی وفاداری کا محور بدلنے میں ذرا سی بھی دیر نہ کی۔ 1842ء میں جب انگریزوں نے افغانستان پر چڑھائی کی تو اس نے سکھوں کو ان پر عقب سے حملہ کرنے سے باز رکھا اور اس طرح اس نے پہلی مرتبہ انگریزوں کی گراں قدر خدمت سرانجام دے کر ان کی خوشنودی حاصل کی تھی اور پھر 1845ء کے اواخر میں جب پنجاب میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان آخری لڑائی ہوئی تو اس نے میر جعفر کا کردار ادا کیا تھا۔ اس نے عین وقت پر انگریزوں کے خلاف لڑائی میں سکھوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ قدرتی طور پر برطانوی سامراج گلاب سنگھ کی سکھوں سے اس غداری پر اور بھی خوش ہوا اور وہ اسے اس کی گراں قدر خدمات کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے تو گلاب سنگھ کو جموں، پونچھ، لداخ اور بلتستان کا خودمختار حکمران تسلیم کیا اور پھر وادی کشمیر کا علاقہ 75 لاکھ روپے کے عوض اس کے پاس فروخت کر دیا۔ نارمن براؤن (Norman Brown) کہتا ہے کہ معاوضہ کی رقم -/750,000 پونڈ تھی۔ لیکن پریم ناتھ بزاز کے بیان کے مطابق یہ رقم -/1500,00 پونڈ تھی۔ جب کشمیر میں سکھوں کے گورنر شیخ امام دین نے اس ناپاک سودابازی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو انگریزوں نے گلاب سنگھ کی جان نکلسن (John Nicholson) کی زیر کمان فوجی امداد کی اور اسے فروخت شدہ علاقے کا باقاعدہ قبضہ دلایا۔

برطانوی مورخ لارڈ برڈوڈ (Lord Birdwood) لکھتا ہے کہ 46-1845ء میں سکھوں کی شکست کے بعد ان کی سلطنت معدوم نہیں ہوئی تھی۔ پنجاب کا بیشتر علاقہ ابھی تک ان کے قبضے میں تھا اور وادی کشمیر بھی ان کے زیر تسلط تھی۔ چونکہ انگریزوں کو شکست خوردہ غنیم سے

تاوان جنگ وصول کرنا تھا اور سکھوں کے پاس اس کی ادائیگی کے لیے کوئی پیسہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کا صوبہ کشمیر ہتھیا کر راجہ گلاب سنگھ کے پاس فروخت کر دیا گیا۔ مزید براں 1846ء میں انگریزوں نے پنجاب کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ وادی کشمیر سے متصل نہیں تھے۔ انگریزوں کے مقبوضہ علاقے اور وادی کشمیر کے درمیان کا علاقہ بدستور سکھوں کے قبضے میں تھا۔ چونکہ سکھوں سے تاوان جنگ کے طور پر کشمیر کا علاقہ لیا گیا تھا اور اس پر انگریزوں کا براہ راست کنٹرول ممکن نہیں تھا۔ اس لیے تاوانی علاقہ کو فروخت کر دینا ہی مناسب سمجھا گیا۔ اگر انگریز 1846ء ہی میں دریائے جہلم تک قبضہ کر لیتے تو وادی کشمیر کا پورا علاقہ فروخت کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔[20] ایک اور برطانوی مؤرخ فریڈرک ڈریو(Frederic Drew) کہتا ہے کہ انگریزوں نے کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ کے پاس اس لیے فروخت کیا تھا کہ ان دنوں پنجاب کی حالت ابتر تھی اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور افغانستان کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ برطانوی گورنر جنرل کو امید تھی کہ گلاب سنگھ کو جموں و کشمیر کے علاقوں کا اقتدار سونپنے سے سکھوں کی طاقت کم ہو جائے گی اور سکھوں کے سر پر ایک ایسی طاقت مسلط ہو جائے گی جو ہمیشہ برطانیہ کی وفادار اور دست نگر رہے گی۔ بعد کے حالات نے اس کی اس امید کو صحیح ثابت کیا۔ تقریباً تین سال بعد جب انگریزوں اور سکھوں کے درمیان آخری معرکہ ہوا تو گلاب سنگھ نے سکھوں کی کوئی مدد نہ کی بلکہ اس نے انگزیروں سے وفاداری کا عملی ثبوت دیا۔[21] لیکن بعض دوسرے مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ انگریزوں کی جانب سے جموں و کشمیر کے علاقے میں اسے اپنی زیر سرپرستی ایک خودمختار ریاست قائم کرنے میں اس لیے بھی مدد دی تھی کہ وہ روس اور چین سے متصلہ علاقے کو ایک بفر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ امریکی مؤرخ پروفیسر نارمن براؤن لکھتا ہے کہ ''انگریزوں کو انیسویں صدی میں برصغیر میں روس کی دست درازیوں کا زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس خطرے کے سدباب کے لیے ہی سندھ پر 44-1842ء میں قبضہ کیا تھا اور پھر انہوں نے اسی مقصد کے تحت 49-1845ء میں سکھوں کی سلطنت کو تباہ کر کے پنجاب کا الحاق کیا تھا۔ انہوں نے پہلے 42-1838ء میں اور پھر 80-1878ء میں افغانستان سے جو دو جنگیں لڑی تھیں ان کے پس پردہ بھی یہی مقصد کارفرما تھا۔''[22] پانیکر کہتا ہے کہ ''اگرچہ معاہدہ امرتسر کے تحت راجہ گلاب سنگھ نے برطانیہ کی بالادستی قبول کر لی تھی اور برطانیہ کی حکومت نے ریاست کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ

رکھنے کے لیے گلاب سنگھ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کی یہ ریاست دراصل مکمل طور پر آزاد تھی اور اس نے بیرونی ممالک سے تھوڑے بہت سفارتی تعلقات بھی قائم کر لیے تھے۔ اس کے دربار میں کوئی برطانوی ریذیڈنٹ نہیں تھا۔ وہ ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمران تھا۔"[23] غالباً انگریزوں کو ان دنوں روس اور چین سے متصلہ علاقے میں ایک ایسی ہی بفر سٹیٹ کی ضرورت تھی اور اس لیے اسے اکیس توپوں کی سلامی دیتے تھے۔

راجہ گلاب سنگھ نے وادی کشمیر میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے فوراً ہی بعد گلگت کے علاقے اور اس کے گرد ونواح کی چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں پر دھاوا بول دیا۔ وہ اس دور دراز علاقے پر اپنا براہ راست تسلط زیادہ دیر تو قائم نہ رکھ سکا تاہم وہ ان ریاستوں سے سالانہ خراج وصول کیا کرتا تھا۔ قبل ازیں ان ریاستوں پر روس اور چین کی کسی نہ کسی طرح کی بالا دستی قائم رہی تھی۔ اندرون ریاست گلاب سنگھ کی پالیسی بڑی ظالمانہ تھی۔ گلاب سنگھ کا سوانح نگار پانیکر بھی اعتراف کرتا تھا کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایسی ناجائز اور قابل اعتراض کارروائیاں کرتا رہا جو ہمیشہ نکتہ چینی سے بالاتر نہیں ہوتی تھیں۔ اس نے اپنے اقتدار کو بہر صورت قائم رکھنے کے لیے نہ صرف چالاکی اور مکاری سے کام لیا بلکہ اس نے طاقت کے استعمال کے علاوہ ہر قسم کی بد دیانتی اور بے ایمانی کو بھی روا رکھا۔ اس نے ایک ایسے سخت سکول میں تربیت پائی تھی جس میں دروغ گوئی، سازش اور دغابازی کو سیاست کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔"[24]

جوزف کوربل کا بیان ہے کہ گلاب سنگھ بڑا ہی سنگدل اور متعصب ہندو تھا۔ وہ سونے، پولو، ٹینس اور شکار کا شوقین تھا اور شاہانہ شان وشوکت اور جاہ وجلال کا بہت دلدادہ تھا۔ وہ محض تفریح طبع کے لیے مسلمان رعایا کو قتل کروایا کرتا تھا۔ وہ کشمیری مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے لیے 1850ء میں بنارس کے پنڈتوں سے اجازت طلب کی تھی مگر اسے مطلوبہ آشیرباد نہیں ملی تھی۔ اس کے عہد میں مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے سارے دروازے بند تھے۔ مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ گئوکشی کی سزا ابتداً موت مقرر کی گئی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد اسے نرم کر کے دس سال قید میں بدل دیا گیا تھا۔ جوزف کوربل مزید لکھتا ہے کہ گلاب سنگھ کی سنگدلی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ایک مرتبہ یہ اپنی ریاست کے دورے کے دوران ایک دریا پر پل کی تعمیر کے کام کا معائنہ کر رہا تھا جس کی تکمیل قیدی کر رہے

تھے۔ایک قیدی بہت کاریگر تھا۔اس نے جب اس کی تعریف کی تو اس بدنصیب نے اپنی رہائی کی التجا کر دی۔اس نے پوچھا تمہیں کس جرم میں سزا ہوئی تھیں تو قیدی نے کہا کہ میں نے زیورات کی خاطر ایک لڑکی کو قتل کر دیا تھا۔گلاب سنگھ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور اس نے آرے سے اس کے جسم کے چار ٹکڑے کروا کر انہیں اپنی سلطنت کے چاروں سمت بھیج دیا تاکہ رعایا انہیں دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔''[25]

پریم ناتھ بزاز نے بھی اسی قسم کے ایک اور لرزہ خیز واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ گلاب سنگھ نے اپنے ایک جلاد کو بعض قیدیوں کی چمڑی ادھیڑنے کا حکم دیا۔جلاد نے اس قسم کی وحشیانہ کاروائی میں ذرا تامل کیا تو گلاب سنگھ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے ماں باپ تو نہیں ہیں۔اتنے بزدل کیوں بن رہے ہو۔چنانچہ ان کی چمڑی ادھیڑ دی گئی۔ تو اس نے دو ایک چمڑیوں میں بھوسہ بھر کر انہیں سڑک پر رکھوا دیا تاکہ ہر راہ گیر ان سے عبرت حاصل کرے۔ پھر اس نے اپنے بیٹے رنبیر سنگھ کو بلایا اور کہا کہ دیکھو! حکومت اس طرح کرتے ہیں![26] لیکن ان سارے لرزہ خیز تاریخی حقائق کے باوجود ہندوستان کا سرکاری مؤرخ سیسر گپتا نامعلوم برطانوی مؤرخین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ گلاب سنگھ ایک قابل، انصاف پسند اور مستعد حکمران تھا اور ایک خاصا دانشمند زمیندار تھا۔[27]

گلاب سنگھ کی موت کے بعد 1857ء میں اس کے بیٹے رنبیر سنگھ نے عنان اقتدار سنبھالی۔وہ اتنا سنگدل ثابت نہ ہوا جتنا کہ اسے اپنے باپ کی نصیحت کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔وہ قدرے نرم تھا اور اہل علم کی قدر کیا کرتا تھا۔سر فرانسس ینگ ہسبنڈ لکھتا ہے کہ ''رنبیر سنگھ اپنی امن پسندی اور علم دوستی کے باوجود اپنی رعایا کی حالت میں کوئی بہتری پیدا نہیں کر سکا تھا۔گلاب سنگھ کے عہد کی طرح رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں بھی ریاست کے کسانوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔زمین پر بھاری لگان عائد تھا جو جنس کی صورت میں ہر فصل کے موقع پر پیشگی ہی وصول کر لیا جاتا تھا۔لگان کی وصولی کا کام پولیس کے سپاہیوں کے سپرد تھا اور چونکہ ان سپاہیوں کو کئی کئی ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی تھی اس لیے وہ دیہات میں لگان کی وصولی کے بہانے لوٹ مار کرتے تھے۔ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔کوئی چھوٹے سے چھوٹا کاروبار بھی ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً گھوڑے کی فروخت پر 50 فیصد ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ بوچڑوں، نانبائیوں، بڑھئیوں،

لوہاروں، ملاحوں اور حتیٰ کہ طوائفوں کو بھی ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ ان ٹیکسوں سے سرکاری خزانہ میں جو بھاری رقوم جمع ہوتی تھیں ان کا بیشتر حصہ مہاراجہ کی عیاشی پر خرچ ہوتا تھا۔ عوام کی فلاح و بہبود پر کس قدر کم خرچ ہوتا تھا اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم پر سالانہ پچاس ہزار روپے اور سڑکوں کی مرمت پر پچاس ہزار روپے خرچ ہوتے تھے۔[28] حکومت کی جانب سے عوام پر سب سے زیادہ ظلم بیگار لینے کے دوران کیا جاتا تھا۔ غریب دیہاتی عوام کو ان کے گھروں سے زبردستی نکال لیا جاتا تھا اور غلاموں کی طرح ان سے بھاری وزن اٹھوا کر لداخ اور گلگت کی دور دراز کی مسافت طے کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ فوجی مہمات کے لیے اس بیگار کے دوران انہیں اجرت تو کجا خوراک بھی نہیں دی جاتی تھی۔ انہیں بے گار پر جاتے وقت خشک روٹی بھی گھر سے باندھ کر ساتھ لے جانا پڑتی تھی۔ ڈاکٹر آرتھر نیو (Arthur Neve) لکھتا ہے کہ "میں اسلام آباد میں ہیضہ کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا جو صفائی کے ناقص انتظام کی وجہ سے اس علاقے میں پھیل گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نواحی علاقوں سے بیگار لینے کے لیے قلی اکٹھے کیے جا رہے تھے جو پاؤں میں گھاس کی جوتیاں پہنے، کاندھوں پر کمبل، رسی اور ٹوکریاں اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ میں نے ایک ایسا مقام بھی دیکھا جہاں مسجد کے سامنے ایک سرسبز میدان میں بیگار کے لیے جانے والے مزدوروں کو رخصت کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے اکثر بلند آواز میں آہ و بکا کر رہے تھے۔ جبکہ ایک مولوی ان کے سامنے الوداعی انداز میں دعائیہ کلمہ پڑھ رہا تھا اور وہ خود بھی گویا ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے ہی دردناک لہجے میں ایک اس قسم کا الوداعی گیت اونچی سروں میں الاپ رہے تھے۔

ہمارے کھیت اب کون بوئے گا
اور ہماری اس طویل غیر حاضری میں
ہمارے بیوی بچوں پر کیا کچھ نہ گزرے گی
گلگت کے پہاڑی علاقے میں
برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی راستوں پر
ہم غریبوں کو کن کن آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"[29]

ایک اور انگریز مؤرخ نائٹ نے ڈوگرہ شاہی کے تحت بیگار لینے کے ظالمانہ نظام کا بڑے دردناک

الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شمالی سرحد پر متعین فوج کو اناج مہیا کرنے کے لیے نقل وحمل کے وسیع انتظامات کی ضرورت ہے لیکن ڈوگرہ حکام کو مال برداری کی خدمت انجام دینے والے ان بیگاری مزدوروں کے آرام اور ان کی خوراک کا قطعی طور پر کوئی احساس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ انہیں ان مزدوروں کی جان تک کی کوئی پرواہ نہیں ہے جنہیں ان کے گھروں سے زبردستی نکال کر جان لیوا اور دشوار گزار راستوں پر کبھی بھی نہ ختم ہونے والا فاصلہ طے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ بیگاری مزدور بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر سڑکوں پر گر جاتے ہیں اور ان میں سے سینکڑوں، جن کے تن بدن پر کپڑا ابھی نہیں ہوتا، برف پوش راستوں پر چلتے ہوئے سردی سے اکڑ اکڑ کر مر جاتے ہیں مگر وہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ جب کسی مزدور کو بیگار کے لیے لے جایا جاتا ہے تو اس کے بیوی بچے اس سے لپٹ لپٹ کر رونا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے اور جب کوئی سپاہی اناج کے بوجھ سے لدے ہوئے مزدوروں کو موسم سرما میں استور اور گلگت کے درمیان سفر کرنے پر مجبور کر رہا ہوتا ہے تو بالکل سائبیریا کے ریگستانوں کا دردناک منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ مگر کشمیر اور سائبیریا کے ان مناظر میں اتنا فرق پھر بھی ضرور باقی رہ جاتا ہے کہ سائبیریا میں صرف سزا یافتہ مجرموں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے، جبکہ کشمیر میں یہ وحشیانہ سلوک مہاراجہ کے وفادار اور بے گناہ مسلمان کسانوں سے روا رکھا جاتا ہے۔[30]

رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر کے عوام الناس اکثر قحط کا شکار ہوتے تھے لیکن 1877ء میں کشمیر میں ایسا خوفناک قحط پڑا کہ بے شمار لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔ بہت سے دیہات میں کوئی رونے والا بھی باقی نہ رہا تھا۔ اس عظیم المیہ کے آٹھ سال بعد 1885ء میں قیامت خیز زلزلہ آیا جس میں بے شمار لوگ موت کی ابدی نیند سو گئے۔ ہزاروں لوگوں نے منہدم شدہ عمارتوں کے ملبے تلے سسک سسک کر دم توڑا جبکہ مہاراجہ کی انتظامیہ مجرمانہ غفلت اور سنگدلانہ بے عملی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ غالباً یہ ان ہی مظلوموں کی آہوں اور بددعاؤں کا اثر تھا کہ رنبیر سنگھ اسی سال مر گیا۔ السٹیئر لیمب (Alstair Lamb) بتاتا ہے کہ رنبیر سنگھ نے اپنے عہد اقتدار میں اپنی سلطنت کی لداخ کے شمالی علاقے میں اور قراقرم سے آگے چینی ترکستان میں توسیع کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ ایک مقامی جاگیردار یعقوب بیگ نے چینی حکمرانوں کے

خلاف کامیاب بغاوت کر کے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ رنبیر سنگھ نے 1864ء میں دریائے کراکش کے نشیبی علاقوں میں شہید اللہ کے مقام پر ایک چھوٹی سی فوجی چوکی بھی قائم کر لی تھی اور وہ بعد میں اس دریا کے شمالی علاقے پر بالاصرار دعویٰ کرتا تھا۔ لیکن جب انیسویں صدی کے ساتویں عشرے کے اواخر میں چینی اس علاقے میں واپس آ گئے تو رنبیر سنگھ کے اس دعوے کی عملی طور پر کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ حکومت برطانیہ رنبیر سنگھ کی اس علاقے میں پیش قدمی کے خلاف تھی اگرچہ اس کا خیال تھا کہ حکومت کشمیر کے چینی ترکستان کے علاقے پر دعوے کو چینیوں اور روسیوں کے ساتھ گفت وشنید کے دوران سودابازی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ برطانیہ دریائے کراکش کے شمالی علاقے میں کشمیر کی پیش قدمی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس علاقے پر اس کے دعویٰ کو تسلیم کرنے سے واضح الفاظ میں انکار بھی نہیں کرتا تھا[31]۔ بعض دوسرے مؤرخین کا کہنا ہے کہ حکومت برطانیہ کی اس غیر مبہم پالیسی کی وجہ یہ تھی کہ چینی ترکستان میں یعقوب بیگ کی بغاوت کو اس کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ اس نے اس بغاوت کی اس لیے حوصلہ افزائی اور امداد کی تھی کہ اسے خدشہ تھا کہ روسی سامراج چینی سلطنت کی سرحدوں کے اور بھی زیادہ نزدیک پہنچ جائے گا۔ وہ چینی ترکستان کو بھی افغانستان، کشمیر اور تبت کی طرح ایک بفرسٹیٹ بنانے کے حق میں تھا۔ لیکن جب چند سال بعد چینیوں کا اقتدار بحال ہو گیا تو وہ حکومت کشمیر کے علاقائی دعوے کو روسیوں اور چینیوں کے ساتھ سرحد بندی کی گفت وشنید کے دوران بطور سیاسی ہتھیار استعمال کرنا چاہتا تھا۔

رنبیر سنگھ نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے اور چاروں ہی گدی کے امیدوار تھے۔ ان دنوں انگریزوں کو بھی متذکرہ وجوہ کی بنا پر اس علاقے میں خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پامیر میں روسیوں کی فوجی نقل وحرکت سے پریشان تھے۔ وہ زارشاہی کی توسیع پسندی کے سدباب کے لیے گلگت، بلتستان اور چترال کے سرحدی علاقوں کے دفاع کا معقول انتظام کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو بڑے بیٹے پرتاپ سنگھ کی گدی نشینی کی اس شرط پر حمایت کی کہ وہ ریاست میں برطانوی ریذیڈنٹ کا تقرر منظور کر لے گا۔ لیکن تین چار سال بعد یعنی 1890ء میں انہوں نے پرتاپ سنگھ کو گدی سے ہٹا کر ریاست کے نظم ونسق کے لیے ایک کونسل آف ایجنسی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پرتاپ سنگھ پر الزام یہ تھا کہ اس نے روسیوں کے ساتھ خفیہ رابطہ قائم کر کے غداری کا ارتکاب کیا تھا۔

پریم ناتھ بزاز کے بیان کے مطابق کشمیر میں انگریزوں کے اس فیصلے سے برصغیر کے ہندولیڈراور اخبارات بہت برہم ہوئے۔ ان سب نے کشمیر کی پوتر سرزمین کے ہندومہاراجہ کی معزولی کے خلاف سخت احتجاج کیا۔کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا نے حکومت ہندوستان کے محکمہ خارجہ کے سیکرٹری ایچ۔ایم۔ڈیورنڈ (H.M. Durand) کی ایک خفیہ دستاویز شائع کردی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انگریز محض سرحدی اضلاع کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کے لیے ریاست کے داخلی امور میں مداخلت کر رہے ہیں۔ وائسرائے اس خفیہ سرکاری دستاویز کی اخبار میں اشاعت سے بہت پریشان ہوا۔ چنانچہ اس نے قوم پرست ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کے سامنے جزوی طور پر ہتھیارڈال دیئے۔اس نے پرتاپ سنگھ کومعزول کرنے کا خیال توترک کردیا لیکن کونسل آف ایجنسی کے تقرر کا فیصلہ واپس نہ لیا۔ پرتاپ سنگھ کو یہ کونسل منظور کرنا پڑی اور یہ بھی ماننا پڑا کہ ریاست کا نظم ونسق کونسل چلائے گی اور وہ خود محض ایک نمائشی مہاراجہ ہوگا۔اقتدار اعلیٰ برطانوی ریذیڈنٹ کے پاس رہے گا۔ یہ انتظام کئی سال تک جاری رہا۔تا آنکہ 1905ء میں پرتاپ سنگھ کو ریاست کے ایک بااختیار حکمران کی پوزیشن پر بحال کردیا گیا۔ پریم ناتھ بزاز مزید لکھتا ہے کہ اگرچہ انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت بڑی بددیانتی اور مکاری سے کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی تھی تاہم ان کے اس اقدام سے کچھ امید پیدا ہوگئی تھی کہ مظلوم کشمیری عوام کی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوئی راستہ نکل آئے گا۔مگر جب انہوں نے برصغیر کے ہندولیڈروں اور اخبارات کے دباؤ کے تحت پرتاپ سنگھ کو پھر ایک بااختیار مہاراجہ بنادیا تو کشمیری عوام کی تقدیر کا ستارہ ڈوب گیا۔کشمیری عوام کے لیے حکومت برطانیہ کا فیصلہ بڑی بدنصیبی کا پیغام لایا تھا۔اگر حکومت برطانیہ جرأت کے ساتھ اپنے اس فیصلے پر قائم رہتی، مہاراجہ کومعزول کردیتی اور ریاست پر براہ راست اپنی انتظامیہ قائم کرتی تو وادی میں بڑی تیزی کے ساتھ جدیدیت رائج ہوجاتی۔[32] سروالٹر لارنس (Walter Lawrence) لکھتا ہے کہ ''حکومت برطانیہ کے اس افسوس ناک فیصلہ کے بعد پرتاپ سنگھ کے استبدادی عہد میں کشمیر کے غریب کسانوں کی زبوں حالی ناقابل بیان تھی۔ بے شمار کسان اپنی زمینوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ان کی سارے سال کی محنت کی فصل ڈوگرہ فوج کے سپاہی لوٹ لے جاتے تھے۔ پانی اور ہوا کے سوا ہر چیز پر ٹیکس عائد تھا۔انتظامیہ پر غیر کشمیری ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔کشمیر کے مسلم

عوام کو ریاست کے نظم ونسق میں کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ ان کا ابھرتا ہوا تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کے ہر شعبے میں غیر ملکی یعنی غیر ریاستی ہندو حکام کی بالادستی کی وجہ سے بے چینی و پریشانی کا شکار تھا۔" چنانچہ بیسوی صدی کے آغاز میں ان کے سینوں میں صدیوں کا دبا ہوا انتہائی تلخ جذبات واحساسات کا لاوا پھوٹ کر بہہ نکلا۔ انہوں نے حکومت ہندوستان کو اپنی اس حق تلفی اور غیر ریاستی حکام کی بالادستی کے خلاف احتجاجی یادداشتیں پیش کرنے کی ایک مہم شروع کر دی جو 1912ء تک جاری رہی جب کہ سرکاری ملازمتوں کے مسئلے کو پہلی بار باقاعدہ صراحت ووضاحت سے پیش کیا گیا۔ اسی سال حکومت ہندوستان کے محکمہ تعلیم کا ایک اعلیٰ انگریز افسر ریاست کے سرکاری دورے پر آیا تو اس نے ریاستی مسلمانوں کے مطالبات ومشکلات کی بھی چھان بین کی۔ جس کے بعد اس نے حکومت کشمیر کو ایک رپورٹ پیش کی مگر اس پر کوئی عمل درآمد نہ ہوا۔ 1924ء میں ہندوستان کے وائسرائے ریڈنگ نے ریاست کا دورہ کیا تو اس موقع پر کشمیری مسلمانوں نے اس کے سامنے بھی ایک عرض داشت پیش کی۔ جس میں ایک بار پھر مطالبہ کیا گیا کہ ریاست کی سرکاری ملازمتوں میں کشمیری مسلمانوں کو مساوی حقوق دیئے جائیں اور بیگار لینے کا نظام قانونی طور پر فوراً ختم کیا جائے۔ لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی اور ڈوگرہ حکومت نے اس یادداشت پر دستخط کرنے والے کئی افراد کو ریاست بدر کر دیا۔ تاہم سیٹلمنٹ کمشنر سر والٹر لارنس بعض زرعی اصلاحات نافذ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے غریب کسانوں سے بیگار لینے کا نظام منسوخ کرنے کے علاوہ ایسے کئی ٹیکس منسوخ کر دیئے جو جاگیردار بطور "رسوم" وصول کرتے تھے۔

ستمبر 1925ء میں پرتاپ سنگھ مر گیا۔ چونکہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے اس کا بھتیجا ہری سنگھ گدی نشین ہوا۔ یہ شخص بہت ہی عیاش و بدمعاش تھا۔ یہ سرکاری خزانے کی بیشتر دولت شراب نوشی وزنا کاری پر خرچ کرتا تھا۔ یہ نہ صرف کشمیر کے مسلمان عوام کا بدترین دشمن تھا بلکہ یہ وادی کشمیر کے ہندو برہمنوں سے بھی نفرت کرتا تھا۔ اسے صرف راجپوت ہندوؤں کی وفاداری پر اعتماد تھا۔ چنانچہ سارے سرکاری محکموں میں راجپوتوں کا غلبہ تھا۔ اس کی فوج میں بھی راجپوتوں کی اجارہ داری تھی۔ اس کے عہد میں مسلمانوں کے لیے سول یا فوجی ملازمتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا حالانکہ اس وقت تک کشمیری مسلمانوں میں ایک چھوٹا سا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ کیونکہ پنجاب میں آباد شدہ خوشحال کشمیری مسلمان اپنے آبائی وطن کے غریب مسلمان

طالب علموں کی مالی امداد کرتے تھے۔ جب اس طبقے کے احتجاج نے زور پکڑا تو 1927ء میں ایک سرکاری اعلان کے ذریعے یقین دلایا گیا کہ آئندہ مقامی لوگوں کو بھی سول اور فوجی محکموں میں بھرتی کیا جائے گا۔ مگر بعد میں اس اعلان پر صرف اس حد تک عمل ہوا کہ مقامی ہندوؤں اور سکھوں کو کچھ ملازمتیں دے دی گئیں۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بدستور بند رہے۔ 1929ء میں کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے چینی اس قدر زیادہ تھی اور ان پر مشکلات و مصائب کا اس قدر بوجھ تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے ایک وزیر سرایلبیئن بینرجی (Albion Bannerji) کا ضمیر بھی اسے برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کشمیری مسلمانوں سے اس کھلی بے انصافی کی سخت مذمت کی اور بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ اس نے 15 / مارچ کو لاہور میں ایسوسی ایٹڈ پریس سے ایک انٹرویو کے دوران کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی کا بڑے دردناک الفاظ میں ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ "ریاست جموں و کشمیر کے عوام بے شمار آلام و مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ وہ محنت و مشقت کی سخت اذیتیں برداشت کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کشمیری عوام کی کثیر تعداد جو مسلمانوں پر مشتمل ہے، تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہے اور وہ انتہائی ناسازگار معاشی حالات میں زندگی کے دن جوں توں کر کے گزار رہے ہیں۔ ڈوگرہ حکومت ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتی ہے۔ ریاستی حکام کا اپنے عوام سے کوئی رابطہ نہیں اور چونکہ عوام کو حکومت کے سامنے اپنے مطالبات و شکایات پیش کرنے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے اس لیے حکومت کی انتظامی کارکردگی کو دور حاضر کے تقاضوں اور معیار کے مطابق ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے۔ ریاست میں رائے عامہ نہ ہونے کے برابر ہے اور جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے پوری ریاست میں سرے سے کوئی اخبار ہی موجود نہیں ہے اور یہ اس بات کا ایک بین ثبوت ہے کہ ریاست کی حکومت اپنے خلاف عوام کی تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہے۔"[33]

مگر مہاراجہ ہری سنگھ پر بینرجی کے اس مشورے کا یہ اثر ہوا کہ اس نے کشمیری مسلمانوں پر اپنے ظلم و ستم میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اس نے وادی کشمیر میں سیاسی سرگرمیوں پر عائد کردہ پابندیاں اور بھی سخت کر دیں۔ تاہم ان پابندیوں کے باوجود علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں نے ایک ریڈنگ روم کھول کر خفیہ طور پر اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر

دیا۔ 11 ستمبر 1930ء کو اس ریڈنگ روم میں جمع ہونے والے ان مسلمان نوجوانوں کے ایک وفد نے ریاست کی وزارتی کونسل سے ملاقات کی جب کہ مہاراجہ ہری سنگھ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے لندن گیا ہوا تھا۔ اس وفد میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل تھا جو انہیں دنوں علی گڑھ سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری لے کر کشمیر واپس آیا تھا۔ ریاست کے انگریز وزیر اعظم ویک فیلڈ (Wake Field) نے وفد کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ آئندہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دی جائے گی مگر یہ کھوکھلی یقین دہانی وفد کو مطمئن نہ کر سکی۔ 1931ء کے اوائل میں ریاست میں کچھ ایسے واقعات ہوئے جن سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے۔ پہلا واقعہ جموں میں ہوا جہاں قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی۔ دوسرا واقعہ ایک اور جگہ ہوا جہاں عید کے موقع پر مولوی کے خطبے میں مداخلت کی گئی اور تیسرا واقعہ ایک گاؤں موضع ڈیگوں میں ہوا جہاں مسلمانوں کو ایک جگہ نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ واقعات اس لیے بھی بہت تکلیف دہ تھے کہ انہیں کشمیری معاشرے میں محض اس لیے معاشرتی طور پر حقیر سمجھا جاتا تھا کہ وہ مسلمان تھے اور ہندوؤں کو محض اس بنا پر معزز و برتر سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہندو تھے۔ چنانچہ باشعور تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مطالبات منوانے کی تحریک تیز کر دی۔ ان کے ایک نمائندہ وفد نے اس سلسلے میں 25 جون 1931ء کو مہاراجہ ہری سنگھ سے ملاقات کی۔ جب یہ وفد محل سے باہر نکلا تو اس وقت ایک پٹھان نوجوان عبدالقادر نے مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ریاست کے مراعات یافتہ ہندوؤں اور مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف سخت تقریر کی۔ اسے اسی وقت گرفتار کر کے اس پر مہاراجہ اور اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

جب 13 جولائی 1931 کو سنٹرل جیل سری نگر میں عبدالقادر کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو مسلمان کثیر تعداد میں جیل کے باہر جمع ہو گئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں عبدالقادر کے خلاف مقدمے کی کاروائی سننے کے لیے جیل کے اندر جانے دیا جائے۔ مگر ڈوگرہ حکام نے ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس پر وہ زبردستی جیل کی عمارت کے اندر گھس گئے۔ پولیس نے ان پر گولی چلا دی جس سے 21 مسلمان جان بحق ہوئے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا یہ پہلا خونی واقعہ تھا۔ مگر مظاہرین منتشر نہ ہوئے۔ انہوں نے کشمیری عوام کی اپنی بزدلی

اور پست ہمتی کی ساری روایتوں کو غلط ثابت کر دیا۔ انہوں نے شہیدان آزادی کی لاشوں کو چار پائیوں پر ڈال کر سری نگر شہر میں زبردست جلوس نکالا۔ جب یہ جلوس ہندوؤں کے محلہ مہاراجہ گنج میں پہنچا تو مظاہرین بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے ہندوؤں کی دکانوں اور گھروں کو لوٹا اور خونریزی بھی کی۔ جس سے تین ہندو مارے گئے اور 163 زخمی ہوئے۔ پریم ناتھ بزاز کہتا ہے کہ ہندوؤں کے خلاف اس فساد کی وجہ یہ تھی کہ ریاست کی انتظامیہ پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور ہندو فرقہ کے لوگ مہاراجہ کی ہر ظالمانہ کاروائی کی بالعموم تائید وحمایت کرتے تھے۔ تجارت پر بھی ہندوؤں کا غلبہ تھا اور بیشتر اراضی بھی انہی کی ملکیت تھی۔ لہٰذا سری نگر جیل میں گولی چلنے کے واقعہ کے بعد غریب ومظلوم مسلمانوں نے مراعات یافتہ ہندوؤں کے خلاف نفرت کا پہلی مرتبہ احتجاجی طور پر اظہار کیا تھا۔ مظاہرین نے تقریباً تین گھنٹہ تک شہر کے شمالی حصے پر اپنا کنٹرول قائم رکھا۔ جب حالات سول انتظامیہ کے کنٹرول سے باہر ہو گئے تو فوج نے بڑی مشکل سے امن وامان بحال کیا۔ تقریباً 300 مظاہرین کو گرفتار کیا گیا جن میں سے 217 کو اس بنا پر رہا کر دیا گیا کہ ان کے خلاف شہادتیں نہیں تھیں۔ [34] اس تاریخی واقعہ کے بعد پورے کشمیر میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے، جلوس اور مظاہرے ہونے لگے چنانچہ ڈوگرہ حکومت نے متعدد کشمیری لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس بھی شامل تھے۔ جب مسلمان لیڈروں کی گرفتاری کے نتیجے میں ریاست کی صورت حال مزید خراب ہوگئی تو مہاراجہ ہری سنگھ نے انگریز وزیراعظم ویک فیلڈ کو برطرف کر کے اس کی جگہ ایک ہندو جاگیردار ہری کشن کول کو انتظامیہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ نئے وزیراعظم نے جولائی کے اواخر میں کشمیری لیڈروں کو اس یقین دہانی پر رہا کر دیا کہ وہ ایجی ٹیشن بند کر دیں گے اور اشتعال انگیز تقریریں نہیں کریں گے۔

14 راگست 1931ء کو پنجاب میں قادیانیوں کی قائم کردہ کشمیر کمیٹی کی ہدایت کے مطابق پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے یوم کشمیر منایا جس کے بعد شیخ عبداللہ اور دوسرے کشمیری لیڈروں کی مہاراجہ کے ساتھ ''صلح'' ہوگئی۔ شرائط یہ تھیں کہ کشمیری زعماء ایجی ٹیشن بند کر دیں گے۔ اشتعال انگیز تقریریں نہیں کریں گے اور مہاراجہ کے وفادار رہیں گے اور دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت ایجی ٹیشن کو کچلنے کے لیے اختیار کردہ سارے تعزیری اقدامات معطل کر دے گی۔ 28 راگست کو سری نگر کی جامع مسجد میں ان شرائط کا اعلان کیا گیا تو مسلمان

عوام نے ان پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کیونکہ ان میں ان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ شیخ عبداللہ وغیرہ نے اس نام نہاد صلح نامے کے بارے میں مسلمان عوام کا غیر موافق ردعمل دیکھا تو انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ نتیجتاً انہیں 24 رستمبر کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ جب یہ خبر شہر میں پہنچی تو آن کی آن میں پورے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہزاروں لوگ احتجاج کرنے کے لیے جامع مسجد میں جمع ہوئے تو پولیس نے گولی چلا دی جس سے تین مسلمان جاں بحق اور متعدد زخمی ہوئے۔ مگر مظاہرین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ سارے مسلمان لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر بازاروں میں نکل آئے۔ پولیس بھاگ گئی تو شہر میں کئی گھنٹے لاقانونیت کا غلبہ رہا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ مسلمان غریب عوام کا یہ تاریخی مظاہرہ خود رو تھا۔ اس کے دوران انہوں نے نہایت پاکیزہ کردار کا ثبوت دیا۔ سارے دن میں کسی ایک ہندو بچے یا عورت کو کوئی گزند نہ پہنچی۔ کئی مظاہرین نے ہندو عورتوں کو بحفاظت ان کے گھروں تک پہنچایا اور اس طرح انہوں نے ثابت کر دیا کہ ریاستی انتظامیہ کے خلاف ان کی جدوجہد کی نوعیت سیاسی اور غیر فرقہ وارانہ تھی اور اس کا رخ غیر مسلموں کے خلاف نہیں تھا۔ انہوں نے محض ڈوگرہ شاہی کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے پرتشدد مظاہرہ کیا تھا۔ اسی دن شام کو پوری ریاست میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ مگر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ سری نگر اور دوسرے شہروں میں پرتشدد ایجی ٹیشن جاری رہا۔ کئی جگہ گولیاں چلیں، متعدد لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ بالآخر مہاراجہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ 15 راکتوبر 1931ء کو مارشل لا ختم کر کے سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔

دریں اثنا مجلس احرار نے بھی قادیانیوں کے مذہبی و سیاسی حریف کی حیثیت سے کشمیری مسلمانوں کی تائید و حمایت کا جھنڈا اٹھا لیا تھا۔ اس جماعت نے کشمیری مسلمانوں کی حمایت کے لیے پنجاب سے جموں کی طرف اپنے رضا کاروں کے جتھے روانہ کئے لیکن انہیں پنجاب کی سرحد پر ہی گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اکتوبر کے مہینے میں کل 14500 احرار رضا کاروں کو گرفتار کیا گیا جبکہ جموں کے مسلمان روزانہ پرتشدد مظاہرے کرتے رہے۔ نومبر کے اوائل میں جموں کی صورت حال اس قدر خراب ہو گئی کہ مہاراجہ کو ہندوستان کے وائسرائے سے فوجی امداد کی اپیل کرنا پڑی۔ برطانوی فوج 4 رنومبر 1931ء کو جموں پہنچی تو چند دن میں امن وامان بحال ہو

گیا۔لیکن اس کے فوراً ہی بعد ضلع میر پور میں بدامنی شروع ہوگئی۔مسلمان کسانوں نے میر پور، کوٹلی اور راجوڑی کی تحصیلوں میں بہت سے ہندو ساہوکاروں پر حملے کئے۔کئی ہندو مارے گئے۔ ہندوؤں کی متعدد عمارتیں نذر آتش کر دی گئیں اور ان کا مال واسباب لوٹ لیا گیا۔احراریوں کے لیے یہ بات قابل برداشت نہیں تھی کہ مرزا غلام احمد کے مقلدین کی تنظیم اپنے لیے کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کے نجات دہندہ کا مقام حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

12 رنومبر 1931ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے حکومت ہندوستان کی تجویز کے مطابق ریاست کے مسلمانوں کی شکایات کا جائزہ لینے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس کا صدر حکومت ہندوستان کے سیاسی و خارجی امور کے محکمہ کا ایک انگریز افسر بی۔جے۔گلینسی (B.J.Glancy) تھا۔اس کمیشن نے اپریل 1932ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں متعدد سیاسی، آئینی، تعلیمی، انتظامی اور معاشی اصلاحات کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔چونکہ کمیشن کی ایک تجویز قانون ساز اسمبلی کی تشکیل کے بارے میں بھی تھی اس لیے کشمیر کے مسلمانوں کے ان سیاسی عناصر نے جو قبل ازیں فتح کدل ریڈنگ روم اور ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام صلاح و مشورے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس کی۔چنانچہ کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی جس کا پہلا سہ روزہ اجلاس 15-17 راکتوبر 1932ء کو سری نگر میں منعقد ہوا۔شیخ عبداللہ کشمیری مسلمانوں کی اس پہلی سیاسی جماعت کا روح رواں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ گلینسی کمیشن کی سفارشات پر دیانتداری سے عمل کرے گا تو کشمیر کے مسلمانوں کو ریاست کے سیاسی اقتدار میں کچھ نہ کچھ حصہ مل جائے گا۔مگر اس کے اس خواب کی تعبیر نہ ہوئی اور ریاستی حکومت نے مختلف حیلوں بہانوں سے کمیشن کی تجاویز پر پوری طرح عمل کرنے سے گریز کیا۔لہٰذا جون 1933ء میں پھر ایک عوامی بغاوت ہوئی۔پھر مارشل لاء نافذ ہوا، گولیاں چلیں، متعدد لوگ جاں بحق ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ہزاروں گرفتاریاں عمل میں آئیں اور مظاہرین کی بہت سی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔1934ء کے اوائل میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ریاست میں مجوزہ آئینی اصلاحات کے فوری نفاذ کے لیے ایک مرتبہ اور ایجی ٹیشن کی۔چوہدری غلام عباس اس ایجی ٹیشن کا ''ڈکٹیٹر'' تھا۔چنانچہ اسے اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔تاہم یہ ایجی ٹیشن جزوی طور پر کامیاب ہوئی۔مہاراجہ ہری سنگھ نے

کشمیر کی رائے عامہ اور حکومت ہندوستان کے مشوروں سے مجبور ہوکر اپریل 1934ء میں ایک قانون نافذ کیا جس میں قانون ساز اسمبلی کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ چند ماہ بعد اس اسمبلی کے پہلے انتخابات ہوئے تو جموں وکشمیر مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی مخصوص کردہ 21 نشستوں میں سے چودہ نشستیں جیت لیں۔ یہ اسمبلی 75 ارکان پر مشتمل تھی جن میں سے صرف 40 ارکان کا انتخاب ہوا تھا۔ باقی 35 ارکان مہاراجہ نے نامزد کئے تھے۔ انتخابات ہر بالغ کے حق رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر نہیں ہوئے تھے بلکہ آبادی کے صرف 8 فیصد مراعات یافتہ افراد کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا تھا۔ اسمبلی کی حیثیت محض ایک مشاورتی ادارے کی تھی۔ اسے کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔

چونکہ سارے اختیارات مہاراجہ کی ذات میں مرتکز تھے اس لیے یہ ڈھونگ زیادہ دیر نہ چل سکا اور 1936ء میں اسمبلی کے سارے منتخب مسلم اور غیر مسلم ارکان مستعفی ہو گئے۔ اسمبلی کے منتخب غیر مسلم ارکان کے مہاراجہ کی استبدادی حکومت کے خلاف اس اشتراک وتعاون کا مسلمان ارکان اسمبلی پر بہت اثر ہوا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز اور بعض دوسرے ترقی پسند کشمیری برہمن اس سے پہلے ہی شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس وغیرہ کو قائل کر چکے تھے کہ اگر ریاست میں فرقہ پرستی سے بالاتر ہوکر سیکولر خطوط پر سیاسی تحریک چلائی جائے تو اس کے بہت جلد مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ 28/جون 1938ء کو شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس نے کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کا نام تبدیل کر کے اسے کل ہند نیشنل کانگرس کے سیاسی ڈھانچے کے مطابق نیشنل کانفرنس کی صورت میں ڈھالنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ملک کی تمام ترقی پسند سیاسی طاقتیں ایک ہی جھنڈے تلے جمع ہوکر ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے متحدہ طور پر جدوجہد کریں۔ 29/جون کو بارہ سرکردہ ہندو، سکھ اور مسلمان لیڈروں کے دستخطوں سے مجوزہ نیشنل کانفرنس کا قومی منشور شائع کیا گیا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر کا ہر باشندہ رنگ ونسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر نیشنل کانفرنس کا ایک رکن بن کر ریاست کی سیاسی جدوجہد میں اپنا سیاسی کردار ادا کر سکے گا۔ 10/جون 1939ء کو نیشنل کانفرنس کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں مجلس عاملہ کی 28/جون 1938ء کی قرارداد کی توثیق کی گئی۔ اس موقع پر چوہدری غلام عباس اور بعض دوسرے مسلمان لیڈروں کی طرف سے یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اس قسم کی سیکولر

سیاسی تنظیم کامیاب نہیں ہو سکے گی کیونکہ مراعات یافتہ ہندوؤں کی بھاری اکثریت کھلم کھلا ڈوگرہ شاہی کے حق میں ہے۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس آل انڈیا نیشنل کانگرس کی ایک ذیلی تنظیم بن کر رہ جائے گی۔ مگر شیخ عبداللہ اور پریم ناتھ بزاز کے یقین دلانے پر وہ بالآخر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے پر رضامند ہو گئے تاہم ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا کہ جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کا انڈین نیشنل کانگرس یا آل انڈیا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔

مسلم کانفرنس کے اس تاریخی فیصلے پر زیادہ دیر تک عمل نہ ہو سکا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ چوہدری غلام عباس وغیرہ نے ریاست کے مراعات یافتہ ہندوؤں کے بارے میں جس خدشے کا اظہار کیا تھا وہ بے بنیاد نہیں تھا۔ ان انتہا پسند ہندوؤں نے جب پہلے سے بھی زیادہ ڈوگرہ شاہی کی تائید و حمایت شروع کر دی تو ناگزیر طور پر فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہو گیا۔ نوزائیدہ نیشنل کانفرنس کا غیر مستحکم ڈھانچہ اس کشیدگی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 39-1938ء میں برصغیر کے متعدد صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی کوتاہ اندیشیوں کے باعث ہندو مسلم تضاد کے پرامن حل کی ساری امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ سر چمن لال سیتلواد اور پینڈرل مون کے بقول ان کانگرسی وزارتوں نے مسلم اقلیت کے بارے میں ایسا تنگدلانہ رویہ اختیار کیا کہ برصغیر کے مسلم عوام کانگرس سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک مسلم لیگ نے رسمی طور پر پاکستان کا مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں یہ مطالبہ روز بروز مقبول ہوتا جا رہا تھا۔ مسلم لیگ کانگرسی وزارتوں کی مخالفت کی بنا پر اس قدر مقبول اور طاقت ور ہو گئی تھی کہ پنجاب کے سر سکندر حیات خان اور بنگال کے مولوی فضل الحق کو قائداعظم محمد علی جناح کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے۔ دوسری طرف کانگرس کی قیادت اپنی اکثریتی طاقت سے مخمور تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی ''منفی اور رجعت پسندانہ'' سیاست کانگرس کی ''مثبت اور ترقی پسندانہ سیاست'' کی زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے گی۔ جواہر لال نہرو نے مسلمان عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے عوامی رابطے کی ایک وسیع مہم شروع کر رکھی تھی۔ چونکہ ریاست جموں و کشمیر کی سیاست برصغیر کی فرقہ وارانہ سیاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اس لیے نیشنل کانفرنس کے قیام کے چند ہی ماہ بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ ریاست میں اس قسم کی غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت کے لیے زیادہ عرصہ تک گنجائش نہیں ہو گی۔ پریم ناتھ بزاز کے بیان کے مطابق

نیشنل کانفرنس کے ہندوارکان کی ہمہ وقت یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس جماعت کوفوراً ہی آل انڈیا کانگرس کی ذیلی تنظیم کا درجہ دے دیا جائے۔ وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں ہونے دیتے تھے جو کانگرس کے نظریے اور طریقہ کار کے مطابق نہ ہو۔ وہ پارٹی کے آئین، جھنڈے، قومی زبان اور نعروں کے سلسلے میں پوری طرح کانگرس کی تقلید کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ دوسری طرف نیشنل کانفرنس کے مسلمان لیڈروں اور کارکنوں میں بھی ایسے عناصر موجود تھے جو آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر تھے۔

ان میں سے چند ایک ایسے بھی تھے جنہوں نے 1930ء میں مسلم لیگ کے الہٰ آباد سیشن میں شرکت کی تھی جس میں علامہ اقبال نے شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک خودمختار ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا تھا۔ یہ عناصر ریاستی مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے حق میں تھے۔

23 ر مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے برصغیر کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل آزاد خودمختار ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا تو ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں میں اس کا فوراً ردعمل ہوا اور مسلم کانفرنس کی ازسرنو تنظیم کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ یہ کام بظاہر تو سردار گل رحمان وغیرہ کے سپرد تھا لیکن پس پردہ چوہدری غلام عباس اور بعض دوسرے مسلمان قائدین سرگرم عمل تھے۔

آل انڈیا کانگرس کی قیادت کو بھی مسلم لیگ کی 23 ر مارچ کی قرارداد کے بعد کشمیر کے معاملات میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی جبکہ مسلم لیگ ریاستی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی پر بدستور عمل پیرا رہی تھی۔ کانگرسی لیڈروں کی خواہش وکوشش یہ تھی کہ مسلم اکثریت کا یہ علاقہ پاکستان کی تحریک سے متاثر نہ ہونے پائے۔ انہیں نوزائیدہ نیشنل کانفرنس میں پھوٹ پڑنے اور مسلم کانفرنس کی بحالی کے امکانات سے پریشانی لاحق تھی۔ لہٰذا جب جواہر لال نہرو نے ریاستی حالات کا موقع پر جائزہ لینے کا پروگرام بنایا تو اس امر کا انتظام کیا گیا کہ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس اس کی میزبانی کریں۔ پنجاب اور کشمیر کے بڑے بڑے ہندو تاجروں نے نہرو کے استقبال کے لیے شیخ عبداللہ کو ہزاروں روپے کا چندہ دیا۔ پریم ناتھ بزاز کی اطلاع کے مطابق یہ چندہ اتنا زیادہ تھا کہ شیخ عبداللہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نہرو نے دس دن تک کشمیر کا دورہ

کیا۔ جس کے دوران شیخ عبداللہ کو نہ صرف پورے ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی بڑی شہرت ملی۔ وہ گذشتہ دس سال سے سیاسی میدان میں سرگرم عمل تھا لیکن اسے نہ تو کبھی اتنا پیسہ ملا تھا اور نہ ہی اتنی شہرت، کانگرسی اخبارات نے شیخ عبداللہ کے ''سیکولر'' اور ''جمہوری نظریات'' کی اتنی تعریف کی کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ وہ جواہر لال نہرو کا ''ذاتی دوست'' بن گیا۔ وہ سمجھا کہ آئندہ ریاست جموں وکشمیر میں اس کی قیادت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور پورے ہندوستان کی سیاست میں بھی اسے بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔ لیکن دراصل یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی۔ پریم ناتھ بزاز کہتا ہے کہ شیخ عبداللہ کو کتابوں سے نفرت تھی۔ اس نے کبھی کوئی اچھی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ اسے تاریخ کا کوئی شعور نہیں تھا۔ وہ صرف لچھے دار تقریریں کرنی جانتا تھا۔ وہ شہرت اور اقتدار کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ ہندوؤں کے بورژوا طبقے نے اس کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ بالخصوص ریاست کے کانگرس نواز وزیراعظم گوپالاسوامی آئنگر نے ایک منصوبے کے تحت شیخ عبداللہ سے دوستی کر کے اس کی بہت قدر افزائی کی۔ آئنگر کا واحد مقصد یہ تھا کہ شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کی پالیسیوں کی آل انڈیا کانگرس کی پالیسیوں کے ساتھ پوری طرح مطابقت پیدا کی جائے تا کہ مسلم اکثریت کا یہ علاقہ مسلم لیگ کے پاکستان سے الگ تھلگ رہے۔ شیخ عبداللہ اس دور اندیشانہ سیاست کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ شہرت، دولت اور اقتدار کی ہوس نے درمیانہ طبقہ کے اس شخص کو اندھا کر دیا تھا۔ اس نے آئنگر کے ہر مشورے پر عمل کیا اور اس طرح وہ اپنے ''ذاتی دوست'' جواہر لال نہرو کی کانگرس کے جال میں پوری طرح پھنس گیا۔ اب ریاست کے مراعات یافتہ ہندوؤں کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ روز بروز اس سے برگشتہ ہوتا چلا گیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کو ہندو کانگرس کے پاس فروخت کر دیا ہے اور اب یہ تنظیم کشمیری مسلمانوں کے حقوق ومفادات کا تحفظ نہیں کر سکے گی۔

چنانچہ جب ستمبر 1940ء میں بارامولا میں نیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں بہت ہی کم مسلمانوں نے شرکت کی۔ جموں کے مسلمانوں کی تو کسی ایک مندوب نے بھی نمائندگی نہیں کی تھی اور پھر جب اس اجلاس میں قومی زبان کے بارے میں گاندھی کی پالیسی کو اپنایا گیا تو ریاست کے مسلمانوں کی شیخ عبداللہ سے بیزاری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ صورت حال مسلم

کانفرنس کی بحالی کے لیے بہت موافق تھی۔ چنانچہ اکتوبر میں سردار گل رحمان اور اس کے ساتھیوں نے نئی مسلم کانفرنس کا ایک منشور شائع کیا اور پھر 1941ء میں چوہدری غلام عباس نے نیشنل کانفرنس سے الگ ہو کر مسلم کانفرنس کی بحالی کا اعلان کر دیا۔ میر واعظ یوسف شاہ اور اس کے بہت سے مقلدین بھی مسلمانوں کی اس نئی جماعت میں شامل ہو گئے۔ نیشنل کانفرنس میں فرقہ وارانہ خطوط پر پھوٹ پڑنے کا یہ واقعہ نہرو کے دورہ کشمیر کے منطقی نتیجے کے طور پر رونما ہوا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر کی سیاست نہ تو آل انڈیا کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی رسہ کشی سے بالاتر رہ سکتی تھی اور نہ ہی اس پر کانگرس کی اجارہ داری قائم ہو سکتی تھی۔ جن عوامل نے برصغیر کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو اپنے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کرنے پر مجبور کیا تھا، ان کی ریاست جموں کشمیر میں کارفرمائی بہت ہی نمایاں تھی۔ کشمیری مسلمانوں کا نوزائیدہ درمیانہ طبقہ ہندوؤں کے تجربہ کار بورژوا طبقہ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی غلبے سے بہت ہی زیادہ خائف تھا۔ انہوں نے تقریباً ایک سو سال تک ڈوگرہ شاہی کے ماتحت بے پناہ مظالم برداشت کئے تھے۔ انہیں یہ تصور کر کے پسینہ آتا تھا کہ ہندوؤں کا مراعات یافتہ طبقہ آزادی کے بعد بھی ان پر بدستور حکومت کرتا رہے گا۔ وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں سے بھی زیادہ پاکستان کے قیام کے حق میں تھے۔

باب: 6

# کشمیر کے الحاق کے لیے کانگرس اور برطانوی سامراج کا اشتراک عمل

شیخ عبداللہ نے کشمیری مسلمانوں میں علیحدگی کے اس روز افزوں رجحان کا سد باب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اندرون ریاست تو مسلمانوں کے حقوق و مفادات کی علمبرداری کا دعوٰی کرتا تھا لیکن جب وہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں جاتا تھا تو اپنے آپ کو کانگرس کی قوم پرستانہ سیکولر سیاست کا گرویدہ ظاہر کرتا تھا۔ اس کی یہ دوغلی اور منافقانہ سیاست نہ کامیاب ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ کشمیری مسلمانوں کے درمیانہ طبقے کی کانگرس نواز نیشنل کانفرنس سے بیزاری میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس طبقے کے پنجاب کے مسلم درمیانہ طبقے سے گہرے معاشرتی اور معاشی روابط تھے اور اس وجہ سے ان کا پنجابی مسلمانوں کے سیاسی رجحانات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ جب مارچ 1942ء میں برطانیہ کا وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس انتقال اقتدار کا ایک منصوبہ لے کر ہندوستان آیا تو برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کشمیری مسلمانوں میں بھی پاکستان کے لیے بہت جوش و خروش پیدا ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرپس پلان میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر صوبے الگ ہونا چاہیں گے تو انہیں ہندوستان کے وفاق میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انہیں صاف نظر آنے لگا تھا کہ برطانوی سامراج اب زیادہ عرصے تک برصغیر میں نہیں رہ سکے گا اور اگر اس موقع پر انھوں نے اپنے آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست سے پوری طرح وابستہ نہ کیا تو وہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے بورژوا طبقے کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ چنانچہ شیخ عبداللہ کی سیاست کی کشتی اور بھی ڈانواں ڈول ہوگئی۔ جب اگست میں آل انڈیا

کانگرس نے کرپس پلان کو مسترد کر کے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے بھی کئی اشتعال انگیز تقریریں کر کے کشمیری عوام کو کانگرس کی تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب دی مگر وہ بری طرح ناکام ہوا۔ نہ تو ہندوؤں کے مراعات یافتہ طبقہ کی اکثریت ڈوگرہ شاہی کے لیے کوئی مشکلات پیدا کرنے کے حق میں تھی اور نہ ہی مسلم عوام کو کانگرس کی فسطائیت نواز تحریک سے کوئی دلچسپی تھی۔ مارچ 1943ء میں وزیر اعظم آئنگر کو برطرف کر دیا گیا کیونکہ حکومت ہندوستان کانگرس کی پر تشدد ایجی ٹیشن کے دوران ریاست جموں وکشمیر میں کانگرس نواز وزیر اعظم کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی اس شخص کی کانگرس نوازی کے خلاف بہت شکایت تھی۔

آئنگر کی جگہ ایک مقامی عیسائی سیاست دان راجہ مہاراج سنگھ کا تقرر ہوا مگر تقریبا تین ماہ بعد اسے بھی برطرف کر دیا گیا کیونکہ مہاراجہ ہری سنگھ کو اس شخص کی وسیع المشربی اور غریب نوازی پسند نہیں آئی تھی۔ اس کی جگہ ایک مقامی رجعت پسند جاگیر دار سر کیلاش ناتھ ہکسر نیا وزیر اعظم بنا۔ یہ شخص بہت متعصب تھا۔ اس نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالتے ہی یہ واضح کر دیا کہ وہ ریاست میں مسلم لیگ نواز سیاسی سرگرمیوں کو برداشت نہیں کرے گا البتہ اسے نیشنل کانفرنس کی کانگرس نواز سیاست پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ 15 راگست کو جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس سری نگر میں منعقد ہوا تو اس نے یہ پابندی عائد کر دی کہ کوئی غیر کشمیری سیاسی لیڈر اس میں شرکت نہیں کر سکے گا اور نہ ہی اس میں کشمیر سے باہر کی سیاست کا کوئی ذکر ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں پراپیگنڈے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جب آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کا صدر نواب بہادر یار جنگ اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے آیا تو اسے سرحد پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ کشمیری مسلمانوں نے اس واقعہ پر بہت غم وغصہ کا اظہار کیا۔ ستمبر میں جموں کے عوام نے غذائی قلت کے خلاف مظاہرہ کیا تو مسلمان اس میں پیش پیش تھے۔ ڈوگرہ پولیس نے بھوکے مظاہرین پر گولی چلا دی۔ جس سے نو افراد ہلاک اور 40 زخمی ہوئے۔ وزیر اعظم ہکسر اس سنگدلانہ خونریزی کی بنا پر ہر فرقے اور طبقے کے لوگوں میں بہت بدنام ہوا۔ چنانچہ جنوری 1944ء میں اسے بھی برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک جج سر بینیگل راؤ کو وزیر اعظم بنایا گیا۔

ان دنوں ریاست میں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کی سیاست کا ستارہ روبہ زوال تھا بلکہ غروب ہونے والا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جنگ عظیم میں سوویت یونین کے عوام کی کامیاب مزاحمت کے باعث اتحادیوں کی فتح تقریباً یقینی ہوگئی تھی۔ برصغیر میں کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک ناکام ہوچکی تھی اور یہ بات سب پر واضح ہوگئی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر حل نہیں ہوسکے گا۔ مسلم لیگ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کی دعوے دار تھی اور بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اصولی طور پر پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کرچکی تھی۔ کشمیر کی سوشلسٹ پارٹی بھی مسلمانوں کو حق خودارادیت دینے کے حق میں تھی۔ لہٰذا شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس نے اپنے سیاسی وجود کو قائم رکھنے کے لیے مسلم لیگ کے ساتھ صلح کرنے کا فیصلہ کیا۔ مارچ اور اپریل 1944ء میں نیشنل کانفرنس کے کئی لیڈروں نے نئی دہلی میں جناح سے ملاقاتیں کرکے نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے درمیان اختلافات کے تصفیہ کے لیے امداد کی درخواست کی۔ اپریل کے اواخر میں نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ اور جنرل سیکرٹری مولوی محمد سعید نے بھی لاہور میں قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کرکے اس درخواست کا اعادہ کیا اور چند دن بعد مسلم کانفرنس کی طرف سے بھی اسی قسم کی استدعا کی گئی۔ چنانچہ جناح جب 9رمئی کو جموں پہنچے تو مسلم کانفرنس کی طرف سے قائداعظم کا فقیدالمثال خیرمقدم کیا گیا۔ وہاں سے وہ اگلے دن 10رمئی کو سری نگر پہنچے تو مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس دونوں ہی نے قائداعظم کا استقبال کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی بے انتہا کوشش کی۔

جناح نے کشمیر میں تقریباً دو ماہ تک قیام کیا جس کے دوران انہوں نے متعدد پبلک جلسوں کو خطاب کرنے کے علاوہ نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے لیڈروں سے کئی ملاقاتیں کیں۔ بالآخر انہوں نے 17رجون کو سری نگر کے مسلم پارک میں ایک پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مسلم کانفرنس کے حق میں فیصلہ صادر کیا کیونکہ ان کو کشمیر میں اپنے قیام کے دوران جو مسلمان ملے تھے ان میں سے 90 فیصد کے رائے یہ تھی کہ مسلم کانفرنس ریاستی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے مسلمان لیڈروں اور کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے الگ سیاسی وجود کو ختم کرکے مسلم کانفرنس میں شامل ہوجائیں۔ اس لیے کہ جب تک

سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر ایک تنظیم کے تحت اور ایک پرچم تلے متحد نہیں ہوں گے اس وقت تک وہ اپنا نصب العین حاصل نہیں کر سکیں گے۔ لیکن شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے جناح کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے مختلف جلسوں میں جناح کو گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ اگر جناح نے ریاست کی اندرونی سیاست میں اپنی مداخلت ترک نہ کی تو ان کے بے عزتی کی جائے گی۔ جناح نے 24 ر جولائی کو کشمیر سے روانگی سے پہلے ایک بیان میں افسوس ظاہر کیا کہ شیخ عبداللہ نے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے میرے مشورے پر عمل کرنے کی بجائے میرے خلاف غلیظ ترین بدزبانی اور غنڈہ گردی کا ارتکاب کیا ہے۔

مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت شیخ عبداللہ کی جناح سے اس بغاوت سے بہت خوش ہوئی۔ چنانچہ اسے اس کا معاوضہ یہ دیا گیا کہ جب مہاراجہ کے آئینی مشیر سر تیج بہادر سپرو کی سفارش کے مطابق 2 ر اکتوبر کو بعض آئینی اصلاحات نافذ کی گئیں تو نیشنل کانفرنس کے ایک سرکردہ لیڈر مرزا افضل بیگ کو ریاستی کابینہ میں وزیر مال مقرر کیا گیا۔ کشمیری مسلمانوں نے شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کے ڈوگرہ شاہی کے ساتھ اس تعاون واشتراک عمل پر بہت غم وغصہ کا اظہار کیا۔ مارچ 1945ء میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر جلوس نکالا گیا اس میں ڈوگرہ شاہی کی بدعنوانیوں اور نیشنل کانفرنس کی غداری کے خلاف پر جوش نعرے لگائے گئے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اس صورت حال کے پیش نظر اپنی حکومت میں پھر تبدیلی کرنے کا فیصلہ کیا۔ جون 1945ء میں وزیر اعظم سر بی۔ این۔ راؤ کو فارغ کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک کشمیری برہمن رائے بہادر رام چندر کاک کا تقرر کیا گیا۔ اس حکومتی تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پنڈت رام چندر کاک ''مہاراجہ بہادر'' کی طرح ریاست جموں وکشمیر کی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کے حق میں تھا۔ جولائی میں وائسرائے لارڈ ویول نے عبوری حکومت کے قیام کے لیے کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی شملہ میں ایک کانفرنس بلائی مگر وہ اس بنا پر ناکام ہوگئی کہ کانگرس اور وائسرائے نے مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ تضاد شدید سے شدید تر ہو گیا۔

چند ماہ بعد جب کہ برطانیہ کی نئی لیبر حکومت ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کے پروگرام

کا اعلان کر چکی تھی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور عبدالغفار خان جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے سری نگر پہنچے۔ وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی طرح کشمیر کے مسلم عوام کو بھی مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن جب یکم اگست کو نیشنل کانفرنس نے کانگرسی لیڈروں کا خیر مقدم کرنے کے لیے سری نگر میں جلوس نکالا تو شہر کے مسلمانوں نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ جلوس پر جوتوں اور پتھروں کی بارش کی گئی۔ خوش قسمتی سے کوئی کانگرسی لیڈر زخمی نہ ہوا لیکن ان کی خواہش کے برعکس یہ ثابت ہو گیا کہ کانگرس نواز نیشنل کانفرنس کو کشمیری مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔

1945ء کے اواخر میں لیبر حکومت کے منصوبے کے تحت عام انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کے مسلمان حلقوں میں سو فیصد کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الحقیقت برصغیر کے مسلمانوں کے واحد نمائندہ جماعت ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں پر مسلم لیگ کی اس کامیابی کا بہت اثر ہوا اور وہ موج در موج مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کا سیاسی دیوالہ نکل گیا۔ ان کے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے ساتھ سمجھوتے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انہوں نے جولائی 1944ء میں قائداعظم کو غلیظ ترین گالیاں دی تھیں اور پھر انہوں نے اگست 1945ء میں کانگرسی لیڈروں کی عزت افزائی کر کے برصغیر میں مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کیا تھا۔

جب 19 رفروری 1946ء کو ہندوستانی بحریہ کی بغاوت کے دوران برطانوی سامراج نے برصغیر کی آزادی کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے ایک وزارتی مشن بھیجنے کا اعلان کیا تو ہر باشعور شخص کو اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ مطالبۂ پاکستان کی کسی نہ کسی صورت میں منظوری کے بغیر کوئی حل دستیاب نہیں ہو سکے گا۔ کشمیری مسلمانوں کے درمیانہ طبقے کو بھی اس حقیقت کا اچھی طرح شعور تھا۔ وہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ قدرتی طور پر اپنے مستقبل کو پنجاب کے مسلمانوں کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کے پنجاب کے مسلمانوں کے ساتھ بڑے دیرینہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی روابط تھے۔ انہوں نے جب 38-1930ء کے دوران ڈوگرہ شاہی کے مظالم کے خلاف پہلی مرتبہ ایجی ٹیشن کی تھی تو اس وقت بھی پنجاب کے مسلمانوں نے ان کی پرزور حمایت

کی تھی۔ لیکن شیخ عبداللہ شہرت، دولت اور اقتدار کا پجاری تھا اور اس بنا پر وہ برصغیر کے سیاسی حقائق کا احساس کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ چنانچہ اس نے اور اس کی نیشنل کانفرنس نے کشمیری مسلمانوں کے حق خودارادیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے اپنے آپ کو کانگرس کے اکھنڈ بھارت کے تصور کے ساتھ اور بھی زیادہ وابستہ کرلیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اسے ریاست کے اقتدار میں مزید حصہ دیا جائے تو وہ کشمیری مسلمانوں کے فرقہ وارانہ رجحان کا موثر طریقے سے سدباب کر سکے گا۔ مگر مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک کے لیے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی۔ وہ دونوں اس وقت تک اپنی ریاست کی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ نہ تو پاکستان میں شامل ہونا چاہتے تھے اور نہ ہی ہندوستان سے الحاق کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا نیشنل کانفرنس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ اسے اقتدار میں جو تھوڑا سا حصہ ملا ہوا تھا اس سے بھی دستبردار ہو جائے۔

18 رمارچ 1946ء کو مرزا افضل بیگ وزیر مال کے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ اب شیخ عبداللہ اپنے اور اپنی نیشنل کانفرنس کے سیاسی وجود کو قائم رکھنے کے لیے ڈوگرہ شاہی کے خلاف محاذ آرائی پر مجبور تھا۔ اس نے پہلے تو 15 رمئی 1946ء کو ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کردی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ تخت سے دستبردار ہو جائے اور ریاست کا اقتدار نیشنل کانفرنس کے سپرد کردے۔ اس تحریک کے دوران نیشنل کانفرنس کے کارکنوں نے بعض سرکاری عمارتوں اور تنصیبات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی مگر 21 رمئی کو شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد یہ تحریک چند ہی دن میں ختم ہوگئی۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کو عوام الناس کی تائید وحمایت حاصل نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈوگرہ نے اسے فوراً کچلنے کے لیے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ آل انڈیا کانگرس بھی اس کے خلاف تھی۔ پٹیل اور دوسرے سرکردہ کانگرسی لیڈروں کی رائے یہ تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر کا ہی رہنے والا ہے۔ اس کی حکومت کے خلاف ایسی تحریک چلانا مناسب نہیں جیسی کہ کانگرس نے جنگ کے دوران حکومت برطانیہ کے خلاف چلائی تھی۔ پٹیل گروپ فروری 1946ء میں ہندوستانی بحریہ کی بغاوت کے بھی خلاف تھا۔ ان حالات میں وہ برصغیر میں کسی قسم کی باغیانہ سرگرمیوں کے خلاف تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ برطانیہ جلد ہی برصغیر سے دستبردار ہو جائے گا۔ پٹیل ویسے بھی ابوالکلام آزاد، عبدالغفار خان اور شیخ عبداللہ جیسے

''قوم پرست'' لیڈروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ انہیں پیسے دینے میں پس وپیش کرتا تھا اور ان کی وفاداری پر بھی شبہ کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انتقال اقتدار کے موقعہ پر ریاست جموں وکشمیر میں ہندو مہاراجہ ہری سنگھ کی بجائے مسلمان شیخ عبداللہ برسر اقتدار ہو۔ چنانچہ شیخ عبداللہ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

جواہر لال نہرو کشمیر میں اپنے ''ذاتی دوست'' کی اس احمقانہ جیل یاترا پر بہت پریشان ہوا۔ ان دنوں برطانیہ کے وزارتی مشن کے ساتھ برصغیر کی آزادی کے بارے میں فیصلہ کن بات چیت ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس موقعہ پر ایک قومی نظریے کے علمبردار شیخ عبداللہ کا سیاسی وجود ختم ہو گیا تو کانگرس کو ریاست جموں وکشمیر میں ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اس نے نیم مردہ نیشنل کانفرنس میں جان ڈالنے کے لیے کشمیر کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ڈوگرہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے ریاست میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ نہرو اپنے پروگرام کے مطابق آصف علی کے ہمراہ 18 رجون 1946ء کو کشمیر پہنچا تو اسے سرحد کے نزدیک ہی گرفتار کر کے ایک ڈاک بنگلہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہرو کی گرفتاری کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ صوبہ مدراس کے شہر مدورا میں مظاہرین پر گولی چلی جس میں ایک شخص ہلاک ہوا اور کئی زخمی ہوئے۔ مگر ریاست جموں وکشمیر میں بالکل امن وامان رہا۔ سری نگر میں کوئی ہڑتال یا مظاہرہ نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ریاست میں ہندوؤں کا مراعات یافتہ طبقہ ڈوگرہ حکومت کے ساتھ تھا اور مسلمان عوام اب تقریباً سو فیصد مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ چار دن بعد یعنی 22 رجون کو جواہر لال نہرو از خود کشمیر سے واپس جانے پر رضامند ہو گیا کیونکہ کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے وائسرائے ویول سے بات کرنے کے بعد اُسے ٹیلی فون پر یقین دلایا تھا کہ وہ کانگرس کے صدر کی حیثیت سے اس معاملہ کو خود نبٹائے گا اور شیخ عبداللہ کی رہائی کے لیے بھی کوشش کرے گا۔ چنانچہ نہرو اسی رات ایک سرکاری ہوائی جہاز کے ذریعے واپس دہلی پہنچ گیا۔[1]

15 رجولائی کو ڈوگرہ حکومت نے نہرو کے کشمیر میں داخلہ کے خلاف جاری کردہ حکم منسوخ کر دیا۔ 24 رجولائی کو نہرو پھر کشمیر آیا اور اس نے بادامی باغ چھاؤنی میں اپنے ''ذاتی دوست'' شیخ عبداللہ سے ملاقات کی۔ بعد میں اس نے واپس دہلی پہنچ کر اعتراف کیا کہ نیشنل

کانفرنس نے ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کر کے ''غلطی'' کی تھی لیکن اس موقعہ پر انہیں بے سہارا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا[2]۔

تاہم جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے ناتجربہ کار لیڈروں نے نیشنل کانفرنس کی اس غلطی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر وہ اس موقعہ پر ویسا ہی رویہ اختیار کرتے جیسا کہ آل انڈیا کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت نے اختیار کیا تھا تو شاید مسلم کانفرنس کو بھی سیاسی طور پر اتنا ہی فائدہ ہوتا جتنا کہ مسلم لیگ کو ہوا تھا۔ مسلم کانفرنس کے لیڈر کوتاہ اندیش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس موقع پر انہوں نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف کوئی محاذ آرائی نہ کی تو عوام الناس ان کی حب الوطنی پر شبہ کریں گے اور وہ ایجی ٹیشن کے لیے کسی نہ کسی بہانے کی تلاش میں تھے حالانکہ مسلم لیگ کے صدر قائداعظم جناح نے انہیں ہر قسم کی ایجی ٹیشن کی ممانعت کر رکھی تھی۔ اکتوبر میں انہیں یہ بہانہ مل گیا جبکہ رام چند کاک کی حکومت نے انہیں سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے 24 ر اکتوبر کو اس حکم امتناعی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جامع مسجد میں اجلاس منعقد کیا جس میں چوہدری غلام عباس نے بڑی سخت تقریر کی۔ اگلے دن غلام عباس اور اس کے تین سرکردہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈوگرہ حکومت اپنی اس کاروائی پر خوش تھی کیونکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کے مقامی حامیوں کی سیاسی سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں اور بظاہر مہاراجہ ہری سنگھ کی ایک مطلق العنان سلطنت کے قیام کے لیے راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ شیخ عبداللہ کی نظر بندی کے بعد نیشنل کانفرنس عوام الناس کی حمایت کی عدم موجودگی میں عملی طور پر ختم ہو گئی تھی اور چوہدری غلام عباس کی گرفتاری کے بعد مسلم کانفرنس اندرونی دھڑے بندی کے باعث اپنا اثر و رسوخ بہت حد تک کھو بیٹھی تھی۔ ڈوگرہ حکومت نے اس سیاسی خلا کو پر کرنے کے لیے ایک پٹھو جماعت آل جموں اینڈ کشمیر سٹیٹ پیپلز کانفرنس کی تشکیل کی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جب برصغیر میں اقتدار کی منتقلی ہو گی تو یہ پٹھو جماعت ریاستی عوام کی نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے ''مہاراجہ بہادر'' کے ہر فیصلے کی تائید و حمایت کرے گی۔

جنوری 1947ء کے اوائل میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پٹھو جماعت کے ''منتخب نمائندوں'' کی ایک پٹھو اسمبلی وجود میں آجائے اور بعد میں ''مہاراجہ بہادر'' اپنی سلطنت کے مستقبل کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرے یہ اسمبلی اس پر قانونی

تائید کا ٹھپہ لگا دے۔ نیشنل کانفرنس نے ان انتخابات کا آخری وقت پر بائیکاٹ کر دیا کیونکہ حکومت نے اپنے ناپاک مقصد کی تکمیل کے لیے کھلم کھلا دھاندلیاں کی تھیں۔ اس نے نہ صرف بہت سے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے تھے بلکہ سرکاری نمائندوں کے حق میں جعلی ووٹوں کا بھی وسیع پیمانے پر بندوبست کیا تھا۔ مسلم کانفرنس نے انتخابات میں حصہ لیا حالانکہ مسلم نشستوں میں سے چھ نشستوں کے لیے اس کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے تھے۔ جن 15 مسلم نشستوں کے لیے مسلم کانفرنس نے انتخابات میں حصہ لیا ان میں اس کو سو فیصد کامیابی حاصل ہوئی اور یہ ثابت ہوا کہ ریاست کی مسلمان رائے عامہ مسلم کانفرنس کے لیڈروں کی کوتاہ اندیشی کے باوجود نیشنل کانفرنس کے خلاف تھی۔

کشمیری مسلمانوں کا یہ فرقہ وارانہ رجحان 20 رفروری 1947ء کو اور بھی پختہ ہو گیا جبکہ برطانوی سامراج نے یہ اعلان کیا کہ وہ برصغیر سے جون 1948ء تک بہر صورت دستبردار ہو جائے گا اور یہ کہ اگر مقررہ معیاد کے اندر ہندوستان کی یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لیے ساری پارٹیوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو اقتدار کی منتقلی ایک یا ایک سے زیادہ حکومتوں کو کر دی جائے گی۔ برطانوی سامراج کے اس اعلان سے برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کشمیر کے مسلمانوں میں بھی بہت ہیجان پیدا ہوا۔ وہ قدرتی طور پر اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ بالخصوص ایسی صورت حال میں کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے اس اعلان کے فوراً ہی بعد ریاست پر اپنی گرفت کو مضبوط تر کرنے کے لیے متعدد فوجی اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ اس نے صوبہ جموں کے مغربی اضلاع میں متعینہ ڈوگرہ فوج کی تعداد میں یکا یک اضافہ کر دیا تھا اور میر پور، پونچھ کے علاقوں میں دو نئے بریگیڈوں کی تشکیل کی تھی۔ ان علاقوں میں جو ڈوگرہ فوج پہلے سے موجود تھی اسے سارے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں اہم پلوں، بڑی بڑی سرکاری عمارتوں اور ذرائع مواصلات کی حفاظت کرنے پر مامور کر دیا گیا تھا۔ مہاراجہ کی اس نئی اور پرانی فوج کی تعداد 9000 تھی جن میں مسلمانوں کی تعداد 200 سے زیادہ نہیں تھی۔ باقی فوج ڈوگرہ ہندوؤں، سکھوں اور گورکھوں پر مشتمل تھی۔ جنگ کے دوران جو تقریباً 60 ہزار ریاستی مسلمان عالمی جنگ کے لیے فوج میں بھرتی ہوئے تھے انہیں 46-1945ء میں اس وجہ سے فارغ کر دیا گیا تھا کہ ان کی وفاداری مشکوک تھی۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے ممالک میں کئی سال تک قیام کے باعث ان کا

سیاسی شعور بہت بلند ہو گیا تھا۔ وہ جب فوج سے فارغ ہو کر اپنے گھروں میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں پونچھ کے ذیلی جاگیرداروں اور مہاراجہ کشمیر کے درمیان اس علاقے کی ملکیت کے بارے میں جو مقدمہ چلا تھا اس کا فیصلہ مہاراجہ ہری سنگھ کے حق میں ہو گیا تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت نے مارچ 1947ء میں اپنے ان نئے علاقوں سے ٹیکسوں کی زبردستی وصولی شروع کی تو اس کی مزاحمت ہوئی۔ اس پر ڈوگرہ فوج نے نہتے دیہاتیوں پر ظلم وستم شروع کر دیا۔ فوج نے کئی دیہات پر چھاپے مارے اور ان لوگوں کو گرفتار کر کے زدوکوب کیا جو ٹیکس ادا نہ کرنے کی انفرادی طور پر مہم چلا رہے تھے۔ بعض دیہات میں عورتوں کی آبروریزی بھی کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سدھنوتی اور باغ کی تحصیلوں کے لوگ ڈوگرہ راج کے ظلم وتشدد کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لیے فوجی تنظیموں کی صورت میں متحد ومنظم ہونے لگے۔ اپریل کے اواخر میں مہاراجہ ہری سنگھ نے بھمبر، کوٹلی، منادار، میرپور، پونچھ، راولاکوٹ اور نوشہرہ کے علاوہ کئی دوسرے سرحدی علاقوں کا دورہ کیا اور اسے یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی کہ ان علاقوں میں اس کی مسلم رعایا ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حامی تھی۔ جبکہ ہندوستان کا آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن دہلی میں کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے اقتدار کی منتقلی کے بارے قطعی بات چیت کر رہا تھا۔ راولاکوٹ میں تقریباً 40000 ہزار مسلمانوں نے مہاراجہ کا ''استقبال'' کرتے ہوئے پاکستان کے حق میں پرجوش نعرے لگائے۔ ان مظاہرین میں پونچھ کی باغ اور سدھنوتی تحصیلوں کے سابق فوجی بھی کثیر تعداد میں شامل تھے۔

تاہم جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری حمید اللہ نے 10 رمئی 1947ء کو ایک بیان میں ''مہاراجہ بہادر'' سے درخواست کی کہ وہ بلاتاخیر ریاست کی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کا اعلان کر دے اور ایک دستور ساز اسمبلی بنائے تاکہ ریاست کے عوام اپنی خواہش کے مطابق دستور مرتب کر سکیں۔ اس بیان میں مزید کہا گیا تھا کہ اگر مہاراجہ اس پالیسی پر عمل کرے تو وہ ریاست کے مسلمانوں کی حمایت اور ان کے تعاون پر انحصار کر سکتا ہے۔ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی 80 فیصد ہے اور مسلم کانفرنس ان کی ایک بااختیار نمائندہ تنظیم ہے۔ مسلمان عوام مہاراجہ کا جمہوری اور آزاد کشمیر کے پہلے آئینی بادشاہ کی حیثیت سے پرجوش خیر مقدم کریں گے۔[3]
چوہدری حمید اللہ کا یہ بیان مسلم لیگ کی ریاستوں کے بارے میں اس پالیسی کے عین مطابق تھا کہ

وزارتی مشن کے منصوبے کے مطابق ''ریاستی حکمران'' قانونی طور پر اپنی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کا اعلان کرسکتے ہیں۔ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان بھی قبل ازیں 21/اپریل 1947ءکوایک اخباری بیان میں اپنی جماعت کی اس پالیسی کی وضاحت کرچکا تھا۔ یہ بیان جواہر لال نہرو کے اس بیان کے جواب میں جاری کیا گیا تھا کہ ''اگر ریاستی حکمرانوں نے آزادی کا اعلان کیا تو ہندوستان اسے تشویش کی نگاہ سے دیکھے گا۔''[4]

چوہدری حمیداللہ نے جس دن یہ بیان جاری کیا تھا اسی دن شملہ میں نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان برصغیر کی تقسیم کے بارے میں خفیہ سمجھوتہ ہوا تھا جس کی ایک شرط یہ تھی کہ برطانوی سامراج ریاست جموں وکشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے تعاون کرے گا۔ جب 11/مئی کو یہ بیان ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوا تو کانگرس کی قیادت کو تشویش لاحق ہوئی۔ اس سے قبل اس مضمون کی خبریں بھی چھپ چکی تھیں کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے میرپور اور پونچھ کے دورے کے دوران ہزاروں مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں نعرے لگائے تھے۔ چنانچہ تقریباً ایک ہفتہ بعد کانگرس کا صدر اچاریہ کرپلانی سری نگر گیا۔ اس نے کشمیر میں تقریباً ایک ہفتہ قیام کیا جس کے دوران اس نے مہاراجہ ہری سنگھ، وزیراعظم رام چندر کاک اور نیشنل کانفرنس کے بعض سرکردہ لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے مہاراجہ ہری سنگھ کی بہت خوشامد کی۔ اس نے ایک بیان میں نیشنل کانفرنس کی ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک کی مذمت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس تحریک کا کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کانگرس کی تحریک غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور انگریزوں کے درمیان وادی کشمیر کے بارے میں جو سودا ہوا تھا اس میں بھی کوئی برائی نہیں تھی۔ ان دنوں ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔''[5] تاہم اچاریہ کرپلانی کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔[6] مہاراجہ ہری سنگھ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجنے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ بدستور اپنی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کا سہانا خواب دیکھ رہا تھا۔

29/مئی کو لاہور کے ایک کانگرسی اخبار ٹربیون نے کرپلانی کے دورۂ کشمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے ریاست کے بارے میں کانگرس کے منصوبے کا انکشاف کیا۔ اخبار کے بیان کے مطابق منصوبہ یہ تھا کہ اگر مہاراجہ نیا جمہوری آئین نافذ کرکے نئے انتخابات کرائے اور شیخ عبداللہ

کی پارٹی کو انتظامیہ میں حصہ دار بنائے تو کشمیر کے دستور ساز اسمبلی کے ساتھ تعاون اور پھر انڈین یونین کے ساتھ اس کے بیاہ میں آسانی ہوگی۔ [7] کرپلانی کے بعد جون اور جولائی میں پٹیالہ، کپورتھلہ، فرید کوٹ اور مشرقی پنجاب کی بعض دوسری پہاڑی ریاستوں کے حکمران یکے بعد دیگرے سری نگر پہنچے اور انہوں نے بھی مہاراجہ ہری سنگھ کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کی ترغیب دی۔

3 رجون 1947ء کو حکومت برطانیہ نے نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے 10 رمئی کے خفیہ سمجھوتے کے مطابق برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا تو اس سے اگلے دن یعنی 4رجون کو ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اشارۃً یہ بتا دیا کہ برطانوی سامراج ریاست کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے کانگرسی لیڈروں سے اشتراک عمل کرے گا۔ اس نے کہا کہ گورداسپور ایک ایسا علاقہ ہے جہاں سرحدوں کا حتمی تعین ان سرحدوں کی طرح نہیں کیا جائے گا جو عارضی طور پر پہلے اختیار کی گئی ہیں۔ میرے ''خیال'' میں اس ضلع کی آبادی کا تناسب یہ ہے کہ 50.4 فیصد مسلمان ہیں اور 49.6 فیصد غیر مسلم۔ آپ اندازہ لگائیں کہ صرف 0.8 کے فرق کی وجہ سے باؤنڈری کمیشن کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ پورے ضلع کو مسلم اکثریت والے علاقے میں شامل کر دے۔ اس کا یہ ''خیال'' سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔

اصل پوزیشن یہ تھی کہ مذکورہ ضلع میں مسلم اکثریت کا تناسب 51.11 فیصد تھا۔ ضلع کی چار تحصیلیں تھیں جن میں سے صرف ایک تحصیل یعنی پٹھانکوٹ میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی دیگر تینوں تحصیلوں، گورداسپور، بٹالہ اور شکر گڑھ میں مسلمانوں کی اکثریت خود ضلع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ اگر ہندو اکثریت والی تحصیل پٹھانکوٹ کو ہندوستان کے حوالے کیا جاتا تو اس صورت میں بھی ہندوستان کو جموں و کشمیر تک رسائی حاصل نہ ہو سکتی۔ کیونکہ درمیان میں مسلم اکثریت والی بٹالہ اور گورداسپور کی تحصیلیں ہندوستان کے سلسلۂ مواصلات کی راہ میں حائل ہوتیں۔

7رجون کو ''ہندوستان ٹائمز'' میں یہ خبر شائع ہوئی کہ شیخ عبداللہ نے جیل سے اپنے ایک ''دوست'' کے نام خط میں کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کی ہے۔ پریم ناتھ بزاز کہتا ہے کہ شیخ عبداللہ نے اپنے اس خط میں لکھا تھا کہ مہاراجہ کو ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دینا چاہیے اور اسے مسلم کانفرنس کے لیڈروں کے ان بیانات سے گمراہ نہیں ہونا چاہیے جو وہ ریاست کی ''آزادی و خود مختاری'' کے بارے میں دے رہے تھے۔ [8] ''ہندوستان

ٹائمز'' کی اس رپورٹ کی 15 رجون کو تصدیق ہوگئی جبکہ بیگم شیخ عبداللہ نے ایک بیان میں کہا کہ برصغیر کی تقسیم کی تجویز سے کشمیر کے عوام کو بے انتہا صدمہ پہنچا ہے۔

بیگم شیخ عبداللہ نے یہ بیان آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی 14 رجون کی اس قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دیا تھا جس میں اگرچہ برصغیر کی تقسیم کو بادل نخواستہ منظور کیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یقین ظاہر کیا گیا تھا کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کرلیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود ہو جائے گا۔ اس قرارداد میں مزید کہا گیا تھا کہ برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے سے ریاستیں آزاد و خود مختار نہیں ہو جائیں گی کیونکہ وہ باقی ہندوستان سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں اور سلطانئ جمہور کی بنا پر ریاستی عوام ہی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔[9] گاندھی نے اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ریاستی حکمرانوں کی طرف سے آزادی کے اعلانات ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جواہر لال نہرو کا اعلان یہ تھا کہ ہندوستان کے اندر آزاد ریاستوں کا وجود ملک کی سلامتی کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔ اگر کسی غیر ملکی طاقت نے ایسی آزادی کو تسلیم کیا تو اسے ایک غیر دوستانہ اقدام تصور کیا جائے گا۔[10] 14 رجون کو نہرو کے دست راست کرشنا مینن نے ماؤنٹ بیٹن کے نام اپنے خط میں صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ''اگر کشمیر اور صوبہ سرحد پاکستان کے پاس چلے گئے تو یہ توقع کہ 3رجون پلان سے تصفیہ ہو گیا ہے، خیال خام ثابت ہوگی۔''[11]

کانگرس کی اس قرارداد سے ریاستوں کے بارے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف منظر عام پر آ گیا تھا۔ یہ اختلاف ایک دن قبل 13 رجون کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی سیاسی لیڈروں سے ملاقات کے دوران پیدا ہوا تھا۔ نہرو کا مؤقف یہ تھا کہ ریاستوں کے پاس چونکہ نہ بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے اور نہ جنگ کرنے کے وسائل ہیں اس لیے وہ حاکمیت سے بہرہ ور آزاد و خود مختار ریاستیں نہیں بن سکتیں اور انہیں لازماً کسی ایک ڈومینین حکومت کے سیاسی ڈھانچہ میں شامل ہونا پڑے گا۔ اس پر جناح نے کہا کہ ''اس معاملہ میں ریاستوں پر کوئی جبر نہیں کرنا چاہیے۔ ریاستیں اپنے لیے آپ فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن یہ بات ریاستوں اور ڈومینین حکومتوں کے باہمی مفاد میں ہے کہ وہ حسب ضرورت ایک

دوسرے کے ساتھ سمجھوتے کریں۔'' جناح کا مؤقف تھا کہ ریاستوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو کسی بھی ڈومینین میں شامل نہ ہوں اور آزاد و خودمختار رہیں۔ لیکن نہرو ریاستوں کو یہ اختیار دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ دستاویزات سے نہرو کے مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔[12]

17 رجون کو قائداعظم جناح نے ایک بیان میں کانگرس کی 14 رجون کی قرارداد کا ذکر کئے بغیر ریاستوں کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کی وضاحت کی۔ اس بیان میں کہا گیا ''کہ برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے خاتمے کے ساتھ ریاستیں آئینی اور قانونی طور پر آزاد و خودمختار مملکتیں بن جائیں گی اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو راستہ چاہیں اسے اختیار کرنے میں آزاد ہوں گی۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کی ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کی پابند نہیں ہوں گی۔ اگر وہ اپنی آزادی کا اعلان کریں گی تو وہ اپنی مرضی کے مطابق ہندوستان یا پاکستان سے تعلقات قائم کر سکیں گی۔ مسلم لیگ کی پالیسی ابتدا ہی سے یہ ہے کہ ہم کسی ریاست کے اندرونی امور میں مداخلت نہیں کرتے کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ جسے اولاً حکمرانوں اور ریاستی عوام کو ہی حل کرنا چاہیے۔ جو ریاستیں اپنی مرضی سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں ہم سے تبادلۂ خیالات یا گفت وشنید کی خواہاں ہیں وہ ہمیں اس پر آمادہ پائیں گی۔ اگر وہ آزاد رہنا چاہتی ہیں اور پاکستان کے ساتھ سیاسی یا کسی دوسری قسم کے تعلقات کے لیے گفت وشنید کرنا چاہتی ہیں یا ان میں کوئی ردوبدل کرنا چاہتی ہیں تو ہم بخوشی ان کے ساتھ بات چیت کر کے ایسا تصفیہ کریں گے جو دونوں کے مفاد میں ہوگا۔ میری غیر مبہم رائے یہ ہے کہ وزارتی مشن نے اپنے 12 رمئی کے اعلان میں حکومت برطانیہ کی ریاستوں کے بارے میں پالیسی کی جو وضاحت کی تھی اس کے مطابق یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ریاستوں کے پاس دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ میری رائے میں وہ اگر چاہیں تو آزاد رہ سکتی ہیں۔ حکومت برطانیہ یا برطانوی پارلیمنٹ یا کسی اور طاقت یا ادارے کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ انہیں اپنی مرضی کے خلاف کوئی اقدام کرنے پر مجبور کرے۔ حکومت برطانیہ یہ واضح کر چکی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کسی ایک حکومت یا حکومتوں یا کسی اتھارٹی کو منتقل نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کو منتقل نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ ختم ہو جائے گا اور اس کے خاتمے پر ریاستیں مکمل طور

پر خودمختار ہو جائیں گی۔"[13] 8 رجولائی کو آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں قائداعظم جناح کی اس ریاستی پالیسی کی تائید کی اور کہا کہ ریاستی حکمرانوں کو آزادی کا اعلان کرنے کا حق حاصل ہے۔

19 رجون کو ماؤنٹ بیٹن سری نگر گیا اور اس نے وہاں اپنے پانچ روزہ قیام کے دوران مہاراجہ ہری سنگھ سے کئی "غیر رسمی" ملاقاتیں کیں جن کے دوران اس نے مسلم لیگ کے مؤقف کے بالکل برعکس اور کانگرس کے مؤقف کے عین مطابق مہاراجہ پر زور ڈالا کہ وہ اپنی ریاست کی "آزادی" کا اعلان نہ کرے بلکہ 15 راگست سے پہلے پہلے اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ملک کے ساتھ کردے۔ اس نے مہاراجہ کو یہ یقین بھی دلایا کہ "وہ جس ڈومینین کے ساتھ بھی الحاق کرے گا وہ ریاست کو اپنے علاقے کے ایک حصے کے طور پر پوری طرح اپنی حفاظت میں لے لیگی۔"[14] ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو یہ یقین اس حقیقت کے باوجود دلایا تھا کہ اس وقت تک ضلع گورداسپور کے مستقبل کے بارے میں بظاہر کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں ضلع گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کا پہلے سے منصوبہ نہ ہوتا تو وہ کشمیر کے دفاع کے معاملے میں پاکستان اور ہندوستان کو مساوی پوزیشن نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ کشمیر کا تمام تر جغرافیائی رابطہ پاکستان کے ساتھ تھا اور اس کا ہندوستان کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا۔ مزید براں اگر اس نے کشمیر کے مستقبل کے بارے میں برطانوی سامراج کی پالیسی کے مطابق نہرو کے ساتھ پہلے سے سازش نہ کی ہوتی تو وہ مہاراجہ ہری سنگھ کو بھی ویسا ہی غیر مبہم مشورہ دیتا جیسا کہ اس نے نواب حیدرآباد کو دیا تھا۔ نواب حیدرآباد کو اس کا مشورہ یہ تھا کہ "آزادی کا اعلان مت کرو اور بلا تامل ہندوستان سے الحاق کرلو کیونکہ تمہاری ریاست کے جغرافیائی محل وقوع کا تقاضا یہی ہے۔" نواب کو دیئے گئے مشورہ میں پاکستان کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن مہاراجہ کو جو مشورہ دیا گیا تھا اس میں ہندوستان اور پاکستان کو مساوی پوزیشن دی گئی تھی اور اس میں ریاست کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع کے تقاضے کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کے اس دوغلے اور منافقانہ رویے کا مطلب دراصل یہ تھا کہ اگر مہاراجہ ہری سنگھ ہندوستان سے الحاق کرلے گا تو اسے پاکستان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں ہندوستان ریاست کے دفاع کا ذمہ دار ہوگا۔

مہاراجہ ہری سنگھ پر ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورے کا بظاہر کوئی اثر نہ ہوا۔ روزنامہ ڈان کی 4/جولائی کی رپورٹ کے مطابق وہ بدستور اپنی ریاست کی ''آزادی وخودمختاری'' کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری حمید اللہ نے جب ڈان میں یہ خبر پڑھی تو اس نے ''مہاراجہ بہادر'' کے نام ایک تار میں اسے مبارک باد دی اور یقین دلایا کہ مسلم کانفرنس اس کے ساتھ وفادارانہ تعاون کرتی رہے گی۔ [15] چوہدری حمید اللہ نے ''مہاراجہ بہادر'' کو یہ یقین دہانی اس حقیقت کے باوجود کرائی کہ مارچ میں میرپور، پونچھ کے علاقے میں ٹیکس ادا نہ کرنے کی جو انفرادی مہم چلائی گئی تھی اس نے جون کے اواخر میں بہت حد تک اجتماعی بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی اور ڈوگرہ فوج کو جگہ جگہ پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔ کانگرس کی قیادت مہاراجہ کی ان پسپائیوں سے بہت پریشان تھی اور سردار پٹیل نے 3/جولائی کو مہاراجہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ''مجھے اس مشکل اور نازک صورت حال کا احساس ہے جس سے آپ کی ریاست دوچار ہے لیکن ایک مخلص دوست اور ریاست کے بہی خواہ کی حیثیت سے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کشمیر کا مفاد اس میں ہے کہ وہ بلا تاخیر انڈین یونین اور اس کی دستور ساز اسمبلی میں شریک ہو جائے۔ اس کی ماضی کی تاریخ اور روایت کا تقاضا بھی یہی ہے پورے ہندوستان کا 80 فیصد حصہ اس فیصلے کا متمنی ہے...... مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی ہے کہ ہز ایکسی لینسی وائسرائے آپ کے ساتھ مکمل اور کھل کر بات چیت کئے بغیر واپس آ گئے...... کیا میں یہ تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ اگر اب بھی آپ دہلی تشریف لائیں تو یہ بہتر ہو گا اور آپ یقیناً ان (وائسرائے) کے مہمان ہوں گے؟ ہم آپ کے ساتھ آزادانہ فضا میں کھل کر بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے وہ تمام شکوک وشبہات جو میں نے گوپال داس سے سنے ہیں یقیناً دور ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ آزاد ہندوستان کے رہنماؤں کے ساتھ دوستی بڑھائیں جو آپ کے دوست بننا چاہتے ہیں۔'' [16]

10/جولائی کو جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ اور اسحاق قریشی پر مشتمل ایک وفد نے نئی دہلی میں قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کر کے انہیں کشمیر کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ جناح نے اس ملاقات کے بعد ایک بیان میں کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ فوج کے مظالم کی مذمت کی اور کشمیر کے مستقبل کے بارے میں مسلم لیگ

کی پالیسی کا اعادہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''میں قبل ازیں ایک سے زیادہ مرتبہ واضح کر چکا ہوں کہ ہندوستانی ریاستوں کو اس امر کی آزادی ہے کہ وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں جائیں یا آزاد رہیں۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ مہاراجہ اور حکومت کشمیر اس مسئلہ پر پوری طرح توجہ دیں گے اور نہ صرف حکمران بلکہ عوام کے مفادات کا بھی احساس کریں گے۔ ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ہم کسی ریاست کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے سلسلے میں مجبور یا مرعوب نہیں کریں گے اور نہ ہی اس پر کوئی دباؤ ڈالیں گے۔ لیکن جو ریاستیں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتی ہیں ان سے ہم بخوشی گفت وشنید کر کے ایسا معاہدہ کریں گے جو دونوں کے مفاد میں ہوگا اور جو ریاستیں اپنی مکمل آزادی کا اعلان کرنے کی خواہاں ہیں وہ بھی ہم سے ایسا دوطرفہ معاہدہ کرسکیں گی جس میں دونوں کا فائدہ ہوگا۔''[17]

قائداعظم نے جس دن یہ بیان دیا اُس دن یعنی 10 رجولائی کو ہی برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے پارلیمنٹ میں قانون آزادیٔ ہند پر بحث کے دوران امید ظاہر کی کہ ہندوستان کی ریاستیں مناسب وقت پر دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہوجائیں گی۔ اس نے کہا کہ اگر کسی ریاستی حکمران نے آزادی کا فیصلہ کیا تو میں اسے کہوں گا کہ ''ذرا ٹھہرو پھر سوچ لو! میں امید کرتا ہوں کہ تم قبل از وقت کوئی ناقابل تنسیخ فیصلہ نہیں کروگے۔''[18]

لیکن آل انڈیا مسلم لیگ اور کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی قیادت پر ایٹلی کے اس بیان کا بظاہر کوئی اثر نہ ہوا اور مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری حمید اللہ نے 15 رجولائی کو سری نگر میں ایک بیان جاری کیا جس میں کانگرس کو متنبہ کیا کہ وہ کشمیر کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ حمید اللہ کا دعویٰ یہ تھا کہ ''ریاست کے مسلمان، جو کشمیر کی آبادی کا 80 فیصد ہیں مہاراجہ کی زیر سرپرستی آزادی کے حق میں ووٹ دے چکے ہیں۔''[19] چنانچہ اگلے دن 16 رجولائی کو وزیر ہند لارڈ لسٹوویل نے وزیراعظم ایٹلی کے 10 رجولائی کے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے خیال میں اس بات میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ساری ہندوستانی ریاستوں اور سارے ہندوستان کے عوام کے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بروقت دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہوجائیں۔ اگر ریاستوں نے ہندوستان کو مستفید نہ کیا تو یہ بات ہندوستان کے لیے ایک المیہ ہوگی...... بلاشبہ ہم کسی ریاست کی الگ بین الاقوامی حیثیت کو تسلیم نہیں کریں گے۔''[20]

17 رجولائی کو ہاؤس آف لارڈز نے متفقہ طور پر قانون آزادی ہند منظور کر دیا۔ دونوں پارٹیوں نے اس بل کی پرجوش تائید کی اور کسی نے بھی ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں ایٹلی کی لیبر حکومت کی کانگرس نواز پالیسی پر اعتراض نہ کیا۔

لارڈلسٹوویل کے اس غیر مبہم بیان کا کشمیر مسلم کانفرنس پر جزوی طور پر اثر ہوا۔ چنانچہ 19 رجولائی کو آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کے اجلاس میں ''کثرت رائے'' سے یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ''جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور مذہبی اعتبار سے ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہایت ضروری ہے کیونکہ ریاست کی آبادی کا 80 فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور پاکستان کے تمام بڑے دریا جن کی گزرگاہ پنجاب ہے، کے منبعے وادی کشمیر میں ہیں۔ ریاست کی سرحدیں تو پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ پہلے ہی ملحق ہیں اور ریاست کے عوام بھی پاکستان کے عوام کے ساتھ مذہبی وثقافتی اور اقتصادی رشتوں میں مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کیا جائے۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کے محکمے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیئے جائیں۔ اگر حکومت کشمیر نے یہ مطالبات تسلیم نہ کئے اور مسلم کانفرنس کے اس مشورے پر کسی داخلی یا خارجی دباؤ کے تحت عمل نہ کیا اور ریاست کا الحاق ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے ساتھ کر دیا تو کشمیری عوام اس فیصلے کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنی تحریک آزادی پورے جوش وخروش سے جاری رکھیں گے۔'' سردار ابراہیم کا کہنا ہے کہ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی تھی حالانکہ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ خان اور اس کے رفقائے کار نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ریاست میں پاکستان اور بھارت دونوں کی بالادستی سے الگ ''آزاد خودمختار حکومت قائم کی جائے۔ آزاد ریاست کا مطالبہ کرنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے یہ مؤقف کل ہند مسلم لیگ سے مشورہ کے بعد اختیار کیا ہے۔[21]

لیکن ایک اور کشمیری لیڈر امان اللہ خان کا بیان ہے کہ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور نہیں ہوئی تھی بلکہ کانفرنس کے بعض ارکان نے رائے شماری کے دوران اس کے خلاف ووٹ دیئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چوہدری غلام عباس نے غالباً قائداعظم کی ہدایت پر آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے کنونشن کے نام ایک خط میں اسے ریاست کی آزادی کی حمایت میں قرارداد منظور

کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ کنونشن کے صدر چوہدری حمید اللہ، جس نے تقریباً ایک ہفتہ قبل قائداعظم سے تبادلہ خیالات کیا تھا، نے ریاست کی آزادی کی پرزور وکالت کی تھی اور کانفرنس کے بعض سینئر ارکان نے اس کے اس مؤقف کی تائید وحمایت کی تھی۔ [22] خلیفہ عبدالمنان کے بیان سے امان اللہ خان کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ خلیفہ لکھتا ہے کہ جب مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن شروع ہوا تھا تو چوہدری عبداللہ خان بھلی نے چوہدری غلام عباس کا ایک خط پڑھ کر سنایا تھا جو اس نے جیل سے لکھا تھا۔ اس خط میں کنونشن کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ریاست جموں وکشمیر کی آزادی کے حق میں قرارداد منظور کرے۔ چوہدری حمید اللہ، سید نذیر حسین شاہ اور بہت سے دوسرے لوگوں نے چوہدری غلام عباس کی اس تجویز کی تائید کی تھی۔ لیکن سردار ابراہیم اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اس کی مخالفت کی تھی اور پھر عبدالرحیم درانی کی یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور ہوئی تھی کہ ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کیا جائے۔ خلیفہ عبدالمنان مزید لکھتا ہے کہ بعد میں چوہدری غلام عباس نے ایک اور خط میں کنونشن کی منظور کردہ قرارداد کی توثیق کر دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس نے ریاست کی آزادی کے بارے میں قرارداد کا جو مسودہ بھیجا تھا وہ قائداعظم کی ہدایت پر مبنی تھا۔ [23] خلیفہ عبدالمنان کے اس بیان کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ جس دن مسلم کانفرنس نے یہ قرارداد منظور کی تھی اس دن کشمیر کے وزیراعظم رائے بہادر رام چندر کاک نے نئی دہلی میں قائداعظم سے ملاقات کر کے ریاست کی ''آزادی'' کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا تھا۔

25 رجولائی کو ماؤنٹ بیٹن نے ریاستی حکمرانوں کے ایک رسمی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انہیں متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے اپنی ریاستوں کے برصغیر ہند کے ساتھ روابط منقطع کر لیے تو اس کا نتیجہ بدامنی کی صورت میں برآمد ہوگا اور وہ خود سب سے پہلے بدامنی کا شکار ہوں گے۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ آزادی کا اعلان ہرگز نہ کریں بلا چون و چرا دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہو جائیں۔ ماؤنٹ بیٹن کے اس انتباہ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہند کی ریاست ٹراونکور کے ہندو مہاراجہ نے 30 رجولائی کو اپنی ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ قبل ازیں 11 رجون کو قائداعظم محمد علی جناح سے اس کے دیوان کی ملاقات کے بعد اس نے آزادی کا فیصلہ کیا تھا اور روزنامہ ڈان نے اپنی 23 رجون کی اشاعت میں اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ ''پاکستان اور ٹراونکور کے درمیان گہرے سفارتی اور تجارتی روابط

قائم ہوں گے۔'' مہاراجہ ٹراونکور کی اس ہزیمت سے ان ریاستی حکمرانوں کے حوصلے پست ہو گئے جو مسلم لیگ کی اعلانیہ ترغیب پر اپنی '' آزادی وخودمختاری'' کا خواب دیکھ رہے تھے۔

کانگرس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور اس نے مہاراجہ کشمیر پر فیصلہ کن طریقے سے اثر انداز ہونے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی اس فیصلے کو جامہ عمل پہنانے کے لیے یکم اگست کو سری نگر پہنچا اپنی زندگی میں وہ اس سے پہلے کبھی کشمیر نہیں گیا تھا۔ اس نے دہلی سے روانگی سے قبل اپنے اس پہلے دورہ کشمیر کے مقصد کے بارے میں عجیب وغریب بیان دیا۔ اس نے 30 رجولائی کو پرارتھنا کے دوران اعلان کیا کہ میں اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے کشمیر جارہا ہوں جو میں نے 1919ء میں کنبھ میلے کے دوران مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے کیا تھا۔ اسکا یہ بیان ہندوستان کے سارے اخبارات میں شائع ہوا اور پھر جب وہ سری نگر پہنچا تو اس نے پھر اسی قسم کا بیان دیا۔ بلاشبہ اس کے یہ بیانات حسب معمول سراسر منافقت پر مبنی تھے۔ اس نے اپنی ''مہاتمیت'' کے باوجود بالکل جھوٹ بولا تھا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ '' گاندھی کے دورے کا اصل مقصد رائے بہادر رام چندر کاک کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کروانا تھا کیونکہ یہ کشمیری برہمن ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے راستے میں حائل تھا۔ وہ بدستور کشمیر کی آزادی وخودمختاری کے حق میں تھا[24] اس نے اس سلسلے میں 19 رجولائی کو جناح سے ملاقات بھی کی تھی۔

سیسر گپتا اعتراف کرتا ہے کہ '' گاندھی نے دراصل سیاسی مقصد کے تحت کشمیر کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ مسلم لیگ ریاستی حکمرانوں کے بارے میں دوستانہ پالیسی پر عمل پیرا تھی لیکن کشمیر کے بعض مقامی عناصر ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے ہر ممکن طریقے سے جدوجہد کررہے تھے۔ نہرو اس صورت حال سے پریشان تھا۔ وہ خود کشمیر جانا چاہتا تھا لیکن گاندھی نے اسے روک دیا اور کہا کہ اگر وائسرائے کو کوئی اعتراض نہ ہو تو تمہاری بجائے میں خود کشمیر جاؤں گا۔ وہ ریاست کے الحاق کے فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتا تھا وہ کشمیری عوام کو محض یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ انہیں فراموش نہیں کیا گیا ہے۔''[25]

چوہدری محمد علی لکھتا ہے کہ اگرچہ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو کشمیر جانے سے منع کردیا تھا اور اس نے کسی اور مسلم لیگی لیڈر کو بھی کشمیر بھیجنے کی اجازت نہیں دی تھی تاہم اس نے گاندھی کے دورہ کشمیر پر کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ اس نے گاندھی کے دورے کا انتظام کیا۔[26] گاندھی نے

سری نگر میں اپنے دوروزہ قیام کے دوران مہاراجہ ہری سنگھ، وزیراعظم کاک، نیشنل کانفرنس کے لیڈر بخشی غلام محمد، مہارانی کشمیر اور بیگم شیخ عبداللہ کے علاوہ مہاراجہ کے گوروسوامی سنت دیو سے بھی ملاقات کی۔ یہ سوامی دراصل کشمیر کے دربار کا راسپوتین تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا اور مہارانی اس کی ہر بات کو بھگوان کا حکم تصور کرتی تھی۔ حسب توقع مہاتما اور سوامی کی ملاقات نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ چنانچہ گاندھی نے اپنے اس دورے کے بارے میں سردار پٹیل کو لاہور سے 6راگست کو جو رپورٹ بھیجی اس میں لکھا کہ ''کاک نے مہاراجہ کو لکھ دیا ہے۔ وہ تمہیں اس کی ایک نقل بھیج دے گا۔ اس نے مجھے یہ نقل دکھادی ہے۔ میں نے مہاراجہ اور مہارانی سے تقریباً ایک گھنٹہ تک ملاقات کی۔ وہ بڑا چرب زبان ہے۔ اس نے اس رائے سے تو اتفاق کیا کہ اسے ''عوام کی خواہش، کے مطابق عمل کرنا چاہیے لیکن اس نے اصلی بات کرنے سے گریز کیا اور بعد میں اس نے اپنے ایک سپیشل سیکرٹری کو بھیج کر معذرت کردی۔ وہ کاک کو الگ کرنا چاہتا ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ کیسے کرے۔ اس کی جگہ سرجے۔ لال کے تقرر کا تقریباً فیصلہ ہو گیا ہے۔ بظاہر تمہیں اس سلسلے میں کچھ کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں کشمیر کی صورت حال میں بہتری ہو سکتی ہے۔''[27] گاندھی نے اپنے دورے کے بارے میں پٹیل اور نہرو کو ایک مشترکہ رپورٹ بھی بھیجی جس میں اس نے انہیں مطلع کیا کہ ''میں نے مہاراجہ اور مہارانی سے ملاقات کی ہے۔ دونوں ہی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے خاتمہ کے بعد عوام کا حقیقی اقتدار شروع ہوگا وہ خواہ یونین (انڈین) میں شامل ہونے کے کتنے ہی خواہاں کیوں نہ ہوں انہیں اس سلسلے میں کوئی انتخاب عوام کی خواہشات کے مطابق کرنا ہوگا۔ یہ بات انٹرویو میں زیر بحث نہیں آئی تھی کہ عوام کی خواہش کا تعین کیسے ہوگا۔''[28] آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ ''بخشی غلام محمد تو عوام کے آزادانہ ووٹ کے بارے میں ازحد پرامید ہے۔ ووٹ خواہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ڈالے جائیں یا موجودہ انتخابی فہرستوں کے مطابق عوام کا فیصلہ کشمیر کے ہندوستان میں شامل ہونے کے حق میں ہوگا بشرطیکہ شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھی قیدیوں کو رہا کردیا جائے اور ساری پابندیاں ختم کردی جائیں اور موجودہ وزیراعظم برسراقتدار نہ رہے۔''[29] دیکھا آپ نے! ''مہاتما جی'' سے یہ ساری کارروائی تو محض اتفاقاً ہوگئی تھی۔ دراصل اس کی کشمیر یاترا کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس نے تقریباً 28 سال قبل 1919ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کے پیشرو مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا

جائے۔ بورژوا سیاست کی تاریخ میں منافقت اور دروغ گوئی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں ملے گی۔ یہ ''کارنامہ'' صرف ''مہاتما جی'' سرانجام دے سکتا تھا۔

باب: 7

# حکومتِ ہندوستان کی مستعدی اور پاکستانی اربابِ اختیار کی غفلت

گاندھی کی کشمیر کی ''پوتّر'' سرزمین سے واپسی کے تقریباً ہفتہ بعد اور اقتدار کی منتقلی سے چار دن قبل یعنی 11 راگست کو ریاست کے وزیراعظم رائے بہادر رام چندر کاک کو برطرف کر دیا گیا۔ چوہدری محمد علی کی اطلاع کے مطابق وزیراعظم کاک ہندو ہونے کے باوجود ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے خلاف تھا۔ مہر چند مہاجن کہتا ہے کہ پنڈت کاک نے اپنے پاکستان کی طرف رجحان کو کبھی پردہ راز میں نہیں رکھا تھا اور وہ پاکستانی لیڈروں سے بات چیت کے دوران انہیں کشمیر کی پیشکش کر رہا تھا۔ لارڈ برڈوڈ (Birdwood) لکھتا ہے کہ اس کشمیری پنڈت کے خاندان کی نہرو خاندان سے دیرینہ عداوت تھی اور مہاراجہ کی حکومت اور ہندوستان کے درمیان سیاسی کشیدگی پیدا ہونے کی زیادہ تر وجہ اس حقیقت میں پنہاں تھی۔ نہرو کاک سے اعلانیہ نفرت کرتا تھا اور اسے ''کرنل بلمپ'' کہتا تھا۔ کاک غالباً اسی وجہ سے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں نہیں تھا۔ پریم ناتھ بزاز کا بیان ہے کہ پنڈت کاک آخر وقت تک ریاست کی ''آزادی وخودمختاری'' کا علمبردار تھا۔ اس کی برطرفی کے بعد اس کی جگہ ایک بوڑھے ڈوگرہ جنرل جناک سنگھ کا تقرر ہوا تو سب کو معلوم ہو گیا کہ مہاراجہ اور اس کی حکومت نے آل انڈیا کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ چنانچہ نیشنل کانفرنس کے حلقوں میں بڑی خوشی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس کے سینکڑوں کارکنوں نے سیکرٹریٹ کے سامنے جمع ہو کر ''جناک سنگھ زندہ باد'' اور ''مہاراجہ بہادر کی جے'' کے نعرے لگائے لیکن مسلم کانفرنس کے حلقوں میں صف ماتم

بجھ گئی کیونکہ وہ تو پہلے ''مہاراجہ بہادر'' کی زیر سرپرستی کشمیر کی مکمل آزادی وخودمختاری کا مطالبہ کرتی رہی تھی اور پھر اس نے کثرت رائے سے ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مطالبہ کیا تھا۔ ریاست کے مسلم عوام الناس کو بہت دُکھ ہوا اور غصہ آیا جس کی بنا پر ریاست کی صورت حال بڑی کشیدہ ہوگئی۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے حامیوں میں تصادم شروع ہو گئے۔ پونچھ کے مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں بہت سے جلسے اور مظاہرے کئے۔

جنرل جناک سنگھ نے 12 ر اگست کو ریاست کی وزارت عظمٰی کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں کے ساتھ ایک نئے عارضی معاہدے کی پیش کش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ فی الحال نہ کیا جائے بلکہ موجودہ صورت میں الحاق کے معاملے کو جوں کا توں قائم رکھا جائے۔ ہندوستان کی حکومت نے مہاراجہ ہری سنگھ کی اس تجویز کا کوئی جواب نہ دیا لیکن حکومت پاکستان نے مجوزہ عارضی معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے پاکستان ریاست کے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے انتظام کا ذمہ دار قرار پایا۔ جب اس معاہدے کا اعلان ہوا تو ریاست کے بعض مسلمانوں میں یہ خوش فہمی پیدا ہوگئی کہ یہ معاہدہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ باقاعدہ الحاق کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ مگر چند ہی دن بعد ان کی یہ خوش فہمی دور ہوگئی جبکہ 15 ر اگست کو حکومت کشمیر نے پاکستان کے قیام کی تقریبات منعقد کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ 17 ر اگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا جس کے مطابق ضلع گورداسپور کی تین تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر کے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے راستہ ہموار کیا گیا۔ لارڈ برڈ وڈ اس غیر منصفانہ ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اگر یہ پورا ضلع پاکستان میں شامل کر دیا جاتا تو کشمیر میں جو ہندوستانی فوجیں خاص مقصد کے تحت بھیجی گئی تھیں ان کی پوزیشن وہاں بالکل غیر محفوظ ہو جاتی ۔ ریڈ کلف ایوارڈ کے تحت مسلم اکثریت کے باوجود گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلیں ہندوستان کو مل جانے کے نتیجے میں جموں میں ہندوستان کی فوجوں کو برقرار رکھنا ممکن ہو گیا جس میں پٹھانکوٹ ریل ہیڈ کا کام دیتا تھا اور اس وجہ سے ہندوستان جنوب کی جانب اوڑی سے لے کر پاکستان کی سرحد تک اپنے دفاع کو مستحکم کرنے کے قابل ہو گیا۔[1]

مہر چند مہاجن بھی مانتا ہے کہ اگر ضلع گورداسپور ہندوستان کو نہ دیا جاتا تو ریاست کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ممکن نہ ہوتا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اگر یہ ضلع پاکستان کو دے دیا جاتا تو ہندوستان اور کشمیر

کے درمیان کوئی رابطہ سڑک نہ ہوتی اور ریاست چاروں طرف سے پاکستان کے گھیرے میں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جناح 17 راگست سے پہلے کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں بہت پر امید تھا۔ اگرچہ وہ بظاہر تو یہ کہتا تھا کہ مہاراجہ کو دونوں ڈومینینوں میں سے کسی بھی ڈومینین میں شامل ہونے کا اختیار حاصل ہے لیکن دراصل اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ضلع گورداسپور پاکستان کے حوالے کیا گیا تو مہاراجہ کشمیر کو طوعاً و کرہاً پاکستان میں شامل ہونا پڑیگا۔''[2]
تاہم قائداعظم نے پاکستانی عوام کو تلقین کی کہ وہ ''ریڈ کلف ایوارڈ کو صبر وتحمل سے قبول کر لیں حالانکہ یہ سراسر غیر منصفانہ، نا قابل فہم اور خلاف عقل ایوارڈ ہے۔''

ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد یعنی 26 راگست کو ڈوگرہ فوج نے ضلع پونچھ کے قصبے باغ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع پر گولی چلا دی جو 15 راگست کے امتناعی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منعقد کیا گیا تھا۔ فائرنگ سے بہت سے مسلمان جاں بحق ہوئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد پونچھ کے پورے علاقے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور ڈوگرہ فوج نے مسلمانوں کے کئی دیہات میں لوٹ مار، آتشزنی اور عورتوں کی آبروریزی کی وارداتیں کیں۔ 27 راگست کو موضع نیلا بٹ میں اسی قسم کی وارداتیں ہوئیں تو ایک مقامی نوجوان زمیندار سردار عبدالقیوم نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر ڈوگرہ فوج کی وحشت و بربریت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ مسلمانوں کے بہت سے دیہات یکے بعد دیگرے راکھ کا ڈھیر بنا دیئے گئے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان سابق فوجی عبدالقیوم کے ساتھ مل گئے اور اگلے دو تین ہفتوں کے دوران ریاستی فوج کے تقریباً 2000 مسلمان فوجیوں میں سے بیشتر فوجی بھی باغیوں میں شامل ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ڈیڑھ ماہ میں پونچھ شہر کے سوا اس ضلع کا سارا علاقہ باغیوں کے کنٹرول میں چلا گیا۔[3] لیکن ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار کے توسیع پسندانہ عزائم اس صورت حال سے بالکل متاثر نہ ہوئے۔ انہوں نے یکم ستمبر کو اپنے مرکزی محکمہ ڈاک وتار کی جانب سے ایک میمورنڈم شائع کیا جس میں ریاست جموں وکشمیر کے سارے شہروں اور قصبوں کو ہندوستان کے علاقے کا حصہ ظاہر کیا گیا تھا اس وقت تک کشمیر پر پٹھان قبائلیوں کا کوئی حملہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی کوئی کاروائی ہوئی تھی۔ حکومت کشمیر اور پاکستان کے درمیان 12 راگست کے عارضی

معاہدے کے مطابق ریاست کے مواصلات کے انتظام کی ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی تھی۔

ستمبر کے اوائل میں ریاست کے نظم ونسق میں بہت ہی ابتری پیدا ہوگئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ پونچھ کے علاقے میں مسلمان کسانوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف جو بغاوت کر رکھی تھی اسے مقامی ارباب اقتدار نے ریاست گیر فرقہ وارانہ فسادات کی شکل دے دی تھی اودھم پور، کٹھور اور جموں میں ڈوگرہ فوج، راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کے مسلح جتھوں نے بالکل ویسے ہی مسلمان دیہات پر حملے شروع کر دیئے تھے جیسے کہ ان دنوں مشرقی پنجاب میں ہو رہے تھے۔سرکاری طور پر ان حملوں کی تیاری جولائی کے اوائل سے ہو رہی تھی جبکہ ڈوگرہ حکومت نے وادئ کانگڑہ کے راجوں سے مل کر اس مقصد کے لیے ریاستی مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا۔اس ناپاک منصوبے کے تحت نہ صرف بیرون ریاست راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کے مسلح جتھوں کو دعوت دی گئی تھی بلکہ لارڈ برڈووڈ کے بیان کے مطابق اگست کے اوائل میں جموں میں 7000 بارودی بندوقوں کا ذخیرہ بھی کیا گیا تھا۔یہ بندوقیں بعد میں صوبہ جموں کی ہندو آبادی کو مہیا کی گئیں۔[4] صوبہ سرحد سے جو سکھ شرنارتھی ریاست میں آئے تھے ان کے پاس بھی بہت سا اسلحہ موجود تھا۔

ہندوستان کا وزیر اعظم جواہر لال نہرو ریاست کشمیر کی اس تیزی سے بگڑتی ہوئی صورت حال سے بہت پریشان ہوا۔کیونکہ اس وجہ سے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ پرامن الحاق کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔اس نے 11 ستمبر کو مشرقی پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج مہر چند مہاجن کو مہاراجہ ہری سنگھ کے نام یہ پیغام دیکر سری نگر بھیجا کہ شیخ عبداللہ کو فوراً رہا کر دیا جائے۔[5] مہر چند مہاجن کانگڑہ کا رہنے والا بہت ہی متعصب ہندو تھا۔وہ دو تین ماہ سے مہارانی کشمیر کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا جس نے اسے ریاست کے وزارت عظمیٰ کے عہدے کی پیش کش کر رکھی تھی۔13 ستمبر کو ہندوستان کے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل نے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کے نام ایک خط میں لکھا کہ ''مجھے کشمیر دربار کی جانب سے درخواست موصول ہوئی ہے کہ کشمیر فورسز کے ریٹائر ہونے والے میجر جنرل سکاٹ کی جگہ بطور کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ کرنل کشمیر سنگھ کٹوچ کی خدمات مستعار دینے کا انتظام کیا جائے......آپ کو ریاست کی مشکلات کا علم ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اس نازک موقع پر ہمارے لیے یہ بات انتہائی مفید ہوگی کہ کشمیر فورسز کا کمانڈر انچیف ہماری فوج کا کوئی افسر ہو۔''[6]

18 ستمبر کو جنرل جناک سنگھ کی جگہ مہر چند مہاجن کو ریاست جموں وکشمیر کا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ مہاجن اپنا تقرر نامہ وصول کرنے کے بعد 11 ستمبر کو دہلی پہنچا۔ وہاں اس نے سب سے پہلے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کے ہمراہ نائب وزیراعظم سردار پٹیل سے ملاقات کی جس نے اسے یہ پیش کش قبول کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ تم یہ عہدہ قبول کر لو۔ مہاجن نے اس کے بعد وزیراعظم نہرو سے ملاقات کر کے اسے بتایا کہ ''مہاراجہ ریاست پر ہندوستان کے ساتھ الحاق اور بعض انتظامی اصلاحات پر آمادہ ہے۔'' اس پر نہرو نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''شیخ عبداللہ کو فوراً رہا کیا جائے، انتظامیہ میں مناسب ردوبدل کیا جائے۔'' بعد میں مہاجن نے جب گاندھی سے ملاقات کی تو اس نے بھی اسے یہی مشورہ دیا۔ وہاں سے امرتسر واپس پہنچنے کے بعد مہاجن نے صوبائی گورنر کو آٹھ ماہ کی چھٹی کی درخواست دی مگر اس نے چند دن تک اس کی منظوری نہ دی۔ 10 اکتوبر کو جب سردار پٹیل کو اس تاخیر کا پتہ چلا تو اس نے نصف شب کے بعد گورنر کو ڈانٹ پلائی جس کے نتیجہ میں مہاجن کو اسی رات چھٹی دے دی گئی۔ وہ اگلے دن صبح لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ہوائی جہاز میں دہلی پہنچا۔ وہاں اس نے سردار پٹیل، جواہر لال نہرو، گاندھی، ماؤنٹ بیٹن اور وی۔ پی۔ مینن سے ملاقاتیں کیں جنہوں نے اسے ہدایت کی کہ ''ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا بندوبست کیا جائے۔''[7]

دریں اثنا سردار پٹیل مہاجن کے وزیراعظم مقرر ہونے پر مہاراجہ ہری سنگھ کو مبارک باد پیش کر چکا تھا۔ اس نے 21 ستمبر کو مہاراجہ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ ''جسٹس مہر چند مہاجن نے ...... میرے ساتھ ریاست کی فوری ضروریات پر تبادلۂ خیالات کیا ہے اور میں نے اس کے ساتھ اپنی طرف سے مکمل امداد وتعاون کا وعدہ کیا ہے۔ ہمیں پوری طرح احساس ہے کہ وہاں کیسی مشکل صورت حال پائی جاتی ہے اور میں عالی جناب کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہم اس نازک دور میں آپ کی ریاست کی پوری مدد کریں گے۔ جسٹس مہر چند آپ کو ذاتی طور پر اس بات چیت کا خلاصہ بتائیں گے جو ہمارے درمیان کشمیر کے مفادات سے متعلق تمام معاملوں پر ہوئی ہے...... میں نے رام لال بترہ (کشمیر کے نائب وزیراعظم) کے نام آج ہی ان معاملوں کے بارے میں خط لکھا ہے جن کے لیے اس نے ہماری امداد طلب کی ہے۔''[8] یہ بڑی اہم کارروائی تھی کیونکہ مہاجن کو خود بقول اس کے ''حکمت عملی اور بعض جنگی اسباب کی بنا پر'' عدلیہ سے آزاد کیا گیا تھا اور اسے یقین

دلایا گیا تھا کہ ''جب کبھی بھی مجھے ضرورت پڑی فوجی امداد دی جائے گی۔''

جب ستمبر کے اواخر میں ریاست کے مسلمانوں کے طرف سے مہاراجہ کے خلاف مسلح بغاوت زور پکڑ گئی تو ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے 27 ستمبر کو سردار پٹیل کو خط لکھا جس میں ہندوستان کے نقطۂ نگاہ سے ریاست کی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اسے خطرناک اور بگڑتی ہوئی صورت حال قرار دیا گیا تھا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ ''موسم سرما قریب آرہا ہے جو کشمیر کو بقیہ ہندوستان سے کاٹ دے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ موسم سرما سے پہلے پہلے کچھ کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عملی طور پر اکتوبر کے آخر تک یا زیادہ سے زیادہ نومبر کے اوائل تک ...... مجھے یقین نہیں ہے کہ مہاراجہ اور اس کی ریاست کی فوجیں اپنے طور پر کسی عمومی امداد کے بغیر حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ وہ بقیہ ہندوستان سے کٹ جائیں گی اور اگر ان کے اپنے عوام ان کے خلاف برسر پیکار ہو گئے تو پھر صورت حال کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ بظاہر صرف ایک ہی بڑا گروپ ہے جو ان کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ ہے شیخ عبداللہ کی زیر قیادت نیشنل کانفرنس۔ اگر یہ کسی طرح مخالف ہو گیا یا الگ تھلگ رہا تو پھر مہاراجہ اور اس کی حکومت تنہا رہ جائیں گے اور میدان پاکستان کے حامیوں کے لیے صاف ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ مہاراجہ کو چاہیے کہ وہ نیشنل کانفرنس کے ساتھ دوستی کرے کیونکہ اس طرح شاید پاکستان کے خلاف عوامی حمایت حاصل ہو جائے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مہاراجہ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ وہ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کو رہا کرے اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے، ان کا تعاون حاصل کرے۔ انہیں یقین دلائے کہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے اور پھر ہندوستان یونین کے ساتھ الحاق کا اعلان کرے۔ ایک بار جب ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو گیا تو پھر پاکستان کے لیے یہ مشکل ہو جائے گا کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ تصادم کا خطرہ مول لیے بغیر اس پر سرکاری یا غیر سرکاری طور پر حملہ کر سکے۔ تاہم الحاق کے معاملے میں اگر کوئی تاخیر برتی گئی تو پاکستان بغیر کسی خوف و خطرے کے آگے بڑھے گا۔ خصوصاً جبکہ سردی کی وجہ سے کشمیر کٹ جائے گا...... مجھے امید ہے کہ آپ اس معاملے میں کوئی کاروائی کریں گے اور حالات کا رخ صحیح سمت میں موڑنے کے لیے جلد ہی کوئی قدم اٹھائیں گے...... میں پھر یہ کہوں گا کہ کوئی کام کرنے کے لیے وقت کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کام اس طرح کیا جائے کہ

شیخ عبداللہ کے تعاون سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ ہو جائے 9۔''

دراصل نہرو کی یہ بے تابی قدرے غیر ضروری تھی۔ اس نے جو کچھ اپنے اس خط میں لکھا تھا وہ پہلے ہی کیا جا رہا تھا۔ جس دن اس نے یہ خط لکھا تھا اسی دن لاہور کے ایک اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ ''حکومت کشمیر نے پٹھانکوٹ کے نزدیک دریائے راوی پر کشتیوں کا ایک پل بنانے کا حکم دے دیا ہے تاکہ جموں اور انڈین یونین کے درمیان گاڑیوں کی ٹریفک کو برقرار رکھا جا سکے۔ جموں سے کٹھوعہ تک پختہ سڑک بھی بڑی تیزی سے تعمیر ہو رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ریاست اور ہندوستان کے درمیان رابطہ قائم رہے تاکہ ہندوستان سے سپلائیز اور فوجیں براہ راست کشمیر بھیجی جا سکیں اور اس مقصد کے لیے پاکستان کے علاقے کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ پڑے''[10] اور دو دن بعد 29 ستمبر کو شیخ عبداللہ کی رہائی بھی عمل میں آ گئی جبکہ مسلم کانفرنس کا صدر چوہدری غلام عباس بدستور جیل میں مقید رہا۔

30 ستمبر کو حکومت ہندوستان نے ایک اعلیٰ سطح کی ''دفاعی کمیٹی'' کی تشکیل کی جو وزیر اعظم، نائب وزیر اعظم، وزیر دفاع، اور وزیر خزانہ کے علاوہ ایک وزیر بے محکمہ گوپالا سوامی آئنگر پر مشتمل تھی۔ آئنگر کو اس کمیٹی میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا تھا کہ وہ کوئی دفاعی امور کا ماہر تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ریاست جموں و کشمیر میں کانگرس نواز وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور اس بنا پر اسے ریاستی امور کا خاصہ تجربہ تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس ''دفاعی کمیٹی'' کا چیئرمین بنایا گیا کیونکہ ''اسے فوجی امور کا بہت علم اور تجربہ تھا'' یہ کارروائی کشمیر پر قبائلیوں کے حملے سے تقریباً تین ہفتے پہلے ہوئی تھی اور اس وقت تک ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وی۔ پی۔ مینن اور دوسرے ہندوستانی مؤرخین بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ اگر قبائلیوں کا حملہ نہ ہوتا تو ہندوستان کشمیر سے بے تعلق رہتا۔ پٹیل اور نہرو کی خط و کتابت کے اس سرکاری ریکارڈ سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کشمیر سے کبھی بھی لاتعلق نہیں تھا اور مہاراجہ کشمیر نے ستمبر کے اوائل میں مہر چند مہاجن کی وساطت سے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا یقین دلایا تھا البتہ اسے شیخ عبداللہ کو اقتدار منتقل کرنے میں تامل تھا۔

یکم اکتوبر کو مہاراجہ کی حکومت نے پٹیل کے نام ایک مراسلے میں اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اس نے ''ریاست کے لیے وائرلیس کا مطلوبہ سامان بھیجا ہے جس کی مدد سے سری نگر اور

جموں میں ہر موسم میں جہازوں کے اترنے کا کام بخوبی کیا جاسکتا ہے۔'' خط میں سردار پٹیل کے ایک ایلچی آہوجہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔ ''مسٹر آہوجہ نے بڑی مہربانی کے ساتھ یہ تجویز کیا ہے کہ بعض اہم انتظامی پیغامات، جو آپ کے لیے یا نئی دہلی میں دوسرے لوگوں کو بھیجے جائیں گے، کی بہم رسانی میں راز داری قائم رکھنے کے لیے ایک خصوصی کوڈ استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ یہ ایک شاندار تجویز ہے اور مجھے یقین ہے کہ متعلقہ حکام اس سے اتفاق کریں گے۔ اسلحہ گولہ بارود کی سپلائی کے بارے میں ایک علیحدہ خط وزیر دفاع کے نام ارسال کیا جا رہا ہے۔'' پٹیل نے 2/اکتوبر کو اس کے خط کا جواب دیا۔ اس نے مہاراجہ کو یقین دلاتے ہوئے لکھا: ''میں تار، ٹیلیفون، وائرلیس اور سڑکوں کے ذریعے ریاست کو ہندوستانی ڈومینین کے ساتھ جلد سے جلد ملانے کے سلسلے میں کاروائی تیز تر کر رہا ہوں، ہمیں فوری ڈسپیچ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس سلسلے میں انتہائی کوشش کریں گے۔'' 3/اکتوبر کو کشمیر کے نائب وزیر اعظم آر۔ ایل۔ بترہ نے سردار پٹیل کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ ''یکم اکتوبر کو آپ کے نام ایک خط میں مطلوبہ فوجی ساز وسامان کی فہرست بھیجی گئی تھی اور آج ایک اور خط کے ساتھ دوسری فہرست بھیجی جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس پر آپ پہلی فرصت میں توجہ دیں گے...... یہ خط میں یاددہانی کرانے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ مسٹر جسٹس مہاجن نے دہلی میں آپ سے ملاقات کے بعد اس امید کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستانی ڈومینین کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ کچھ فوجوں کو مادھو پور میں یا اس کے نزدیک کسی اور مقام پر اکٹھا کرے گی جہاں سے یہ فوجیں ضرورت پڑنے پر ریاست کی مدد کر سکیں گی'' اور پھر 7/اکتوبر کو سردار پٹیل نے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کو لکھا کہ ''مجھے یقین ہے کہ ریاست کشمیر کو اسلحہ اور گولہ بارود بذریعہ ٹرین بھیجنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو ہمیں یہ سامان بذریعہ ہوائی جہاز بھیجنے کے انتظامات لازمی طور پر کرنے چاہئیں۔''[11]

شیخ عبداللہ نے اپنی رہائی کے بعد سب سے پہلے ''مہاراجہ بہادر'' کے دربار میں حاضری دے کر اظہار وفاداری کے لیے نذرانہ پیش کیا اور پھر 5/اکتوبر کو اس نے ہزاری باغ میں ایک پبلک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کانگرسی رہنماؤں کی تعریف کی، مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی مذمت کی اور جناح کو اس بنا پر گالیاں دیں کہ انہوں نے ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا کہ ہم ایسے لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے جو یہ کہتے ہیں کہ عوام کو

اپنی رائے دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ہم کٹ مریں گے لیکن اپنی ریاست کو ایسے لوگوں کے ساتھ الحاق کی اجازت نہیں دیں گے...... ہم کشمیر میں عوام کی حکومت چاہتے ہیں۔ہم ایسی حکومت چاہتے ہیں جو سارے لوگوں کو بلا لحاظ مذہب اور ذات پات مساوی حقوق و مواقع مہیا کرے۔کشمیر کی حکومت کسی ایک فرقہ کی حکومت نہیں ہوگی۔یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت ہوگی۔''[12] جوزف کوربل کی رائے میں بظاہر شیخ عبداللہ کے یہ جذبات بڑے نیک تھے لیکن ان کا ان دنوں کے سیاسی حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ان دنوں برصغیر کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہوئی تھی اور ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ بھی بنیادی طور پر فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہی ہورہا تھا۔شیخ عبداللہ کی اس تقریر سے صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف تھا۔

7/اکتوبر کو بمبئی کے ایک ماہنامے''کمیونسٹ'' نے شیخ عبداللہ کی اس مہم کی تائید و حمایت کی کہ ریاست کشمیر کے الحاق سے پہلے وہاں کے عوام کو جمہوری حقوق ملنے چاہئیں۔''کمیونسٹ'' کی رائے یہ تھی کہ''سامراج کشمیر نیشنل کانفرنس کی جمہوری تحریک میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔تاہم یہ تحریک لازمی طور پر فتح یاب ہوگی۔مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہوگا اور نیشنل کانفرنس کے پروگرام کے مطابق جمہوری حکومت قائم ہوگی۔''

ڈیلی ٹیلی گراف اور ڈیلی میل کی اسی دن کی رپورٹوں کے مطابق مہاراجہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے خفیہ معاہدہ کا انکشاف قبائلیوں کے حملے سے بہت پہلے ہوگیا تھا جب کہ اس کے بھائی ٹھاکر ہری مان سنگھ کا ہوائی جہاز انجن کی خرابی کے باعث لاہور کے ہوائی اڈے پر اترنے پر مجبور ہوگیا تھا۔لاہور کے شہریوں کے ایک ہجوم نے اس ہوائی جہاز پر ہلہ بول دیا تھا جس کے دوران ہری مان سنگھ کے سارے سوٹ کیس کہیں گم ہوگئے تھے ان میں الحاق کے خفیہ معاہدے کا مسودہ بھی تھا۔جس کے مطابق ہندوستان نے یہ وعدہ کیا تھا کہ پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان مواصلاتی نظام تعمیر کیا جائیگا۔ہندوستانی فوجیں گلگت میں متعین کی جائیں گی اور ہندوستان کی ہوائی فوج کے لیے جنگی اہمیت کے علاقوں میں نئے ہوائی اڈے بنائے جائیں گے۔

مہر چند مہاجن لکھتا ہے کہ''شیخ عبداللہ نے اپنی اس تقریر کے بعد اور 13 اور 14/اکتوبر کو دہلی روانہ ہونے سے پہلے''مہاراجہ بہادر'' سے ایک اور ملاقات کی جس کے دوران

اس نے کہا کہ ''کسی غیر ریاستی کو وزیراعظم یا نائب وزیراعظم مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر کے ریاست کی انتظامیہ میرے سپرد کر دیں۔ میں ایک فرض شناس بیٹے اور وفادار رعایا کی حیثیت سے کام کروں گا[13]۔'' شیخ عبداللہ دہلی پہنچا تو اس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ خود وزیراعظم جواہر لال نہرو ہوائی اڈے پر اس کے استقبال کو موجود تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا اور اپنے پاس مہمان رکھا۔

15 راکتوبر کو ریاست کے نئے وزیراعظم مہر چند مہاجن نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے سے پہلے مسلم کانفرنس کے لیڈروں اور بعض مذہبی رہنماؤں سے ملاقات کی جن کا مطالبہ یہ تھا کہ ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہونا چاہیے۔ لیکن ان کے فوراً بعد جب نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے اس سے ملاقات کی تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا جائے۔ مہر چند مہاجن نے حلف اٹھانے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ حکومت برطانیہ کے نام ایک تار میں ریاست کے خلاف پاکستان کے ''معاندانہ'' رویے کی شکایت کی۔ اس کا الزام یہ تھا کہ حکومت پاکستان نے ریاست کو پاکستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کرنے کے لیے نہ صرف ریاست کی معاشی ''ناکہ بندی'' کر دی ہے بلکہ اس نے ریاست کے خلاف اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے ''معاندانہ'' پراپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ اس نے اسی دن پاکستان کو بھی ایک تار بھیجا جس میں دھمکی دی گئی کہ اگر سرحدوں پر حملے بند نہ کئے گئے تو حکومت کشمیر مجبوراً ''دوسروں'' سے امداد طلب کرے گی۔ اس نے اسی دن ایک پریس کانفرنس میں مسلم کانفرنس کے لیڈروں کو بھی متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے مہاراجہ کی ڈومینین میں فرقہ وارانہ ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تو ان سے کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔ ان سے ایسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسا کہ ''باغیوں'' سے کیا جاتا ہے۔ اس نے شیخ عبداللہ کی ''غیر فرقہ وارانہ سیاست'' کی تعریف کی اور کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو ہندوستان سے دوستانہ امداد طلب کی جائے گی۔

مہر چند پیشہ کے لحاظ سے فوجداری وکیل تھا جو برصغیر کی تقسیم سے کچھ عرصہ قبل پنجاب ہائی کورٹ کا جج بن گیا اور پھر کشمیر میں بھارت ماتا کی گراں قدر خدمات سرانجام دینے کے بعد ترقی کر کے ہندوستان کے چیف جسٹس کے عہدے تک پہنچا تھا۔ اس نے یہ دونوں تاریں ایک جھوٹے مقدمے میں محض دستاویزی شہادتیں پیدا کرنے کے لیے دی تھیں۔ دراصل ریاست کے

ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا اور حکومت ہندوستان اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے ہر قسم کے انتظامات کر رہی تھی۔ 17 راکتوبر کو لاہور کے ایک اخبار میں شائع شدہ خبر کے مطابق پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان پختہ سڑک اور پل کی تعمیر کا کام بڑی تیزی سے شروع ہو چکا تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ راوی پر کشتیوں کا ایک عارضی پل بھی بن رہا ہے تا کہ پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان گاڑیوں کی آمد و رفت فوری طور پر شروع ہو سکے۔ ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے کہ ریاست کشمیر کو ان موجودہ دو راستوں سے بے نیاز کر دیا جائے جو اسے براستہ پاکستان بیرونی دنیا سے ملاتے ہیں۔ سری نگر کے اعلیٰ حلقوں میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ جب ریاست اور ہندوستان کے درمیان مواصلاتی روابط قائم ہو جائیں گے تو مہاراجہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دے گا۔ سری نگر کے مسلمان حلقوں کا یہ کہنا ہے کہ مہاراجہ کا یہ اعلان ریاست کی 80 فیصد مسلمان آبادی کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہوگا۔"[14] جس دن یہ خبر چھپی اسی دن کشمیر کے نائب وزیراعظم بترہ نے پٹیل کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ "پونچھ میں جو کاروائی جاری ہے اس کے لیے ہماری فوجوں کو مکمل اسلحہ اور گولہ بارود کی فوری ضرورت ہے۔ لہٰذا میں نے وزیر دفاع سے درخواست کی ہے کہ وہ دہلی سے فوجی سامان بھیجنے کے فوری انتظامات کریں اور اگر کوئی سامان دوسری جگہ سے لانا پڑے تو وہ بھی بذریعہ ہوائی جہاز فوری طور پر دہلی لانے کی بجائے براہ راست سری نگر بھیج دیا جائے۔"[15] پریم ناتھ بزاز کہتا ہے کہ "پونچھ میں اس کاروائی کی نوعیت یہ تھی کہ مہاراجہ کی فوج نے دوسری جنگ عظیم کے ہزاروں سابق فوجیوں کے ساتھ اس علاقے میں وسیع پیمانے پر لوٹ مار اور آتشزنی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پونچھ کے لیڈروں نے مہاراجہ کے نام تاروں میں اپنے تحفظ کی استدعا کی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ایک ڈوگرہ کرنل بلدیو سنگھ پٹھانیہ کا جواب یہ تھا کہ ہم اس علاقے کو بالکل اسی طرح دوبارہ فتح کریں گے جیسے کہ گلاب سنگھ نے کیا تھا۔ چنانچہ اس کے اس کام میں امداد کے لیے سری نگر سے ڈوگرہ فوج کی کئی رجمنٹیں بھیجی گئیں۔ حکومت اس علاقے میں عوام کا کچھ اس طرح قتل عام کرنا چاہتی تھی کہ دنیا میں کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔"[16]

لیکن یہ خبر چھپائی نہیں جا سکتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی اس قدر تشہیر ہوئی کہ 21 راکتوبر کو شیخ عبداللہ نے بھی پونچھ کے علاقے میں ڈوگرہ فوج کے مظالم کی مذمت کرتے ہوئے

وہاں کے لوگوں کی بغاوت کو جائز قرار دیا۔ اس نے دہلی میں ایک استقبالیہ تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پونچھ ریاست کشمیر کے اندر ایک ذیلی ریاست ہے۔ وہاں کے لوگ دوہری غلامی اور دوہرے استبداد کا شکار رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ جو فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ کشمیر دربار نے کچھ عرصہ قبل وہاں اپنی فوج بھیجی تو مقامی لوگوں میں ہراس پھیل گیا۔ پونچھ کے اکثر بالغ مرد ہندوستان کی فوج کے پرانے سپاہی ہیں ان کے تعلقات جہلم اور راولپنڈی کے دیہات میں بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو پاکستانی دیہات میں بھیج دیا اور خود کشمیر کے فوجیوں کے مقابلے پر اتر آئے۔ انہوں نے پاکستانی دیہات سے کچھ اسلحہ بھی ضرور حاصل کیا ہوگا۔ اب پوزیشن یہ ہے کہ وہاں مہاراجہ کی فوج کو کئی جگہ پسپا ہونا پڑا ہے۔'' شیخ عبداللہ نے ان واقعات پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ عوام پر اعتماد کیا جائے اور ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے۔''[17]

شیخ عبداللہ کی اس تقریر کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ وادی کشمیر اور پونچھ کے مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے اور ریاست کا ہندوستان سے الحاق ہو تو وہ ہندوؤں کی غلامی میں نہیں چلے جائیں گے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ حکومت ہندوستان کو قائل کرنا چاہتا تھا کہ اگر ریاست کا اقتدار بدستور ہندو مہاراجہ اور اس کے غیر ریاستی ہندو وزیر اعظم کے پاس رہا تو کشمیر کی مسلم رائے عامہ کو ہندوستان کے حق میں کرنا بہت مشکل ہوگا۔ لہٰذا اقتدار بلا تاخیر میرے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن ہندوستانی ارباب اقتدار سیاسی لحاظ سے شیخ عبداللہ سے زیادہ تجربہ کار اور دور اندیش تھے۔ سردار پٹیل، جو نائب وزیر اعظم ہونے کے علاوہ ریاستی امور کے محکمہ کا وزیر بھی تھا، ابوالکلام آزاد اور شیخ عبداللہ جیسے مسلمان ''قوم پرستوں'' کی وفاداری پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ وہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق اور وہاں ہندوستانی فوجیں بھیجنے سے پہلے شیخ عبداللہ کو اقتدار نہیں دینا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے ہندوستان کے نقطہ نگاہ سے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو شیخ عبداللہ کی سیاسی سودا بازی کی قوت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔ پٹیل کو معلوم تھا کہ ان دنوں شیخ کا ایلچی لاہور میں پاکستانی ارباب اختیار سے بھی کوئی سیاسی سودا بازی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جس دوران نئی دہلی کے ارباب اقتدار ریاست جموں وکشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے متذکرہ سیاسی، انتظامی اور فوجی اقدامات کر رہے تھے پاکستان کی حکومت ناقابل یقین حد تک غفلت اور بے عملی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ بظاہر اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ان دنوں حکومت مشرقی پنجاب میں لاکھوں مسلمانوں کے منظم قتل عام اور حکومت ہندوستان کی یکے بعد دیگرے کئی معاندانہ کارروائیوں کے باعث بے شمار مسائل ومشکلات میں مبتلا تھی۔ دوسری وجہ مسلم لیگ کی قیادت کی ریاستوں سے متعلقہ پالیسی کے دیوالیہ پن میں مضمر تھی۔ کانگرس کی قیادت نے ان کی اس غیر جمہوری اور غیر حقیقت پسندانہ پالیسی سے خوب فائدہ اٹھایا اور بالآخر کامیابی حاصل کی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان کو ماؤنٹ بیٹن سے لے کر نچلی سطح تک کے سارے برطانوی افسروں کی ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا جن کا مقصد جموں وکشمیر سے متعلق پاکستان کی جوابی کارروائی کو ناکام بنانا تھا۔ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ دراصل اگست کے اوائل میں ہی ہو گیا تھا جب کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے گاندھی کی خواہش کے مطابق اپنے وزیراعظم پنڈت رام چندر کاک کو برطرف کر کے اس کی جگہ کسی ہندوستان نواز شخصیت کے تقرر کا فیصلہ کیا تھا۔ جب مہاراجہ نے 12 راگست کو پاکستان کے ساتھ عارضی معاہدہ کیا تھا تو پاکستان میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ معاہدہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس نے یہ معاہدہ درحقیقت پاکستان کے ارباب اقتدار اور ریاستی مسلمانوں کو کچھ عرصے کے لیے خوش فہمی میں مبتلا کر کے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے انتظامات مکمل کرنے کے لیے کیا تھا۔ حکومت پاکستان نے 15 راگست کو ''تفصیلات کے طے ہونے اور نئے معاہدوں پر باقاعدہ عمل درآمد ہونے تک'' اس عارضی معاہدہ کو قبول کر لیا لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی مؤثر کارروائی نہ کی گئی۔

28 راگست کو مسلم کانفرنس کا ایک لیڈر سردار ابراہیم لاہور آیا۔ وہ اپنے ساتھ کشمیری نژاد میاں امیر الدین کے نام ایک پیغام لایا تھا جو ان دنوں لاہور کارپوریشن کا میئر تھا۔ اس نے میاں امیر الدین سے ملاقات کی اور اس کے ذریعے قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی کوشش کی تاکہ انہیں کشمیر کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا جا سکے۔ وہ بالخصوص پونچھ اور میر پور کے حالات بتانا چاہتا تھا جہاں مارشل لاء نافذ کیا جا چکا تھا اور ڈوگرہ فوج مسلمانوں کے دیہات کو

نذر آتش کر رہی تھی۔ ڈوگرہ حکومت کا اپنی فوج کے نام حکم یہ تھا کہ عوام کے تمام ناجائز ہتھیار بحق حکومت ضبط کر لیے جائیں۔ جس شخص پر تخریبی کارروائی کا شبہ ہو اسے فوراً گولی سے اڑا دیا جائے اور پاکستان کی سرحد سے ملحقہ تمام ریاستی علاقے خالی کروا لیے جائیں۔ سردار ابراہیم لکھتا ہے کہ ''لیکن قائداعظم نے مجھے ملاقات کا موقع نہ دیا۔ کیونکہ وہ ریاست جموں و کشمیر کی موجودہ صورت حال میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک دوست بی۔ اے۔ ہاشمی، جن سے میری سری نگر میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں، کے ہمراہ پنجاب کے ایک مشہور مسلم لیگی راہنما راجہ غضنفر علی خان سے ملاقات کی جو ان دنوں محکمہ مہاجرین و آبادکاری کے مرکزی وزیر تھے اور ان سے درخواست کی کہ مجھے قائداعظم سے ملانے کا بندوبست کیا جائے۔ راجہ غضنفر علی خان نے بھی اس سلسلے میں اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن انہیں قائداعظم سے کوئی رابطہ پیدا کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان دنوں پاکستان کے حالات کچھ ایسے نامساعد تھے کہ کوئی شخص بھی اس بات کی جسارت نہ کر سکتا تھا کہ قائداعظم سے ملاقات کرے اور انہیں کشمیر کی نازک صورت حال سے آگاہ کر کے وہاں کے لاکھوں بے یارومددگار اور مظلوم مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج کے وحشیانہ ظلم وستم سے نجات دلا سکے...... میں پورے ایک ہفتے تک مختلف سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں سے ملاقاتوں میں مصروف رہا تاکہ کسی طرح کشمیری حریت پسندوں کی عملی امداد کرنے کے لیے کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ مگر مجھے ہر جگہ ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑا اور امید کی کوئی کرن دور دور تک نظر نہ آتی تھی...... میں کشمیری مسلمانوں کی عملی امداد کے لیے ہر بڑے پاکستانی رہنما کے دروازے پر دستک دے چکا تھا مگر میں ہر جگہ سے بالکل مایوس و ناامید ہو کر لوٹا تھا۔ لاہور کا شور وشغب اور گہما گہمی اب میرے لیے تکلیف دہ حد تک ناقابل برداشت ہو گئی تھی اور مجھے یہاں ہر شخص خودغرض نظر آتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شہر کے لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ تجارت، گہما گہمی اور حصول دولت و جائیداد کی لگن اپنے دامن میں کس قدر ناپائیداری لیے ہوئے ہے۔ آخر یہ لوگ اس بات کا احساس کیونکر نہیں کرتے کہ ریاست جموں وکشمیر میں ان کے مسلمان بھائیوں کی ایک پوری قوم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کی فیصلہ کن کوشش جاری ہے۔ ڈوگرہ فوج ان کے ہم مذہب ونسل کشمیری بھائیوں کو چن چن کر گولیوں کا نشانہ بنا رہی ہے۔ مگر یہ لوگ مال ودولت پیدا کرنے اور غیر مسلم تارکین وطن کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے میں

لگے ہوئے ہیں[18]۔'' مسئلہ کشمیر کی طرف توجہ کرنے کی کسی کو فرصت نہیں تھی۔

بلاشبہ قائداعظم محمد علی جناح نے ستمبر کے وسط میں کشمیر کا دورہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور انہوں نے اس مقصد کے لیے دو مرتبہ اپنے ملٹری سیکرٹری کو سری نگر بھیجا تھا۔ لیکن اس وقت تک کشمیر کی بس نکل چکی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ 11 راگست کو کشمیر کے نئے وزیراعظم مہر چند مہاجن کو یقین دلا چکا تھا کہ ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہوگا اور اس مقصد کے لیے پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان رابطہ سڑک کی تعمیر بھی شروع ہو چکی تھی۔ لہٰذا مہاراجہ مختلف حیلوں بہانوں سے جناح کو دورۂ کشمیر کی اجازت دینے سے گریز کرتا رہا۔ مہر چند مہاجن کے بیان کے مطابق ''مہاراجہ کو شبہ تھا کہ اگر جناح کو سری نگر آنے کی اجازت دی گئی تو وہ اسے ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کرے گا۔ وہ ایسے حالات پیدا کر دے گا کہ ریاست کو بہ امر مجبوری پاکستان میں شامل ہونا پڑے گا۔ اس کا پرائیویٹ سیکرٹری گذشتہ تین ماہ سے کشمیر میں تھا اور وہ ریاست کی پاکستان میں شمولیت کے لیے ایک پرزور فرقہ وارانہ تحریک کو جنم دے رہا تھا حالانکہ جناح کھلم کھلا یہ اعلان کر چکا تھا کہ قانونی طور پر مہاراجہ کو اپنی مرضی کے مطابق الحاق کا فیصلہ کرنے کا کلی اختیار ہے اور ریاستی عوام کو اس کے کسی فیصلے پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔''[19]

عارضی معاہدے کے تقریباً سات ہفتے بعد حکومت پاکستان کے ایک جائنٹ سیکرٹری کرنل اے۔ ایس۔ بی۔ شاہ کو سری نگر بھیجا گیا۔ اس نے 15 راکتوبر کو ریاست کے نئے وزیراعظم مہر چند مہاجن سے ملاقات کر کے اسے جناح کی جانب سے لاہور آنے کی دعوت دی مگر اس نے یہ دعوت مسترد کر دی کیونکہ ''میں اپنے آپ کو جناح کے دربار میں پیش کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔'' جب کرنل شاہ نے اسے اس انکار کے سنگین نتائج دھمکی دی تو مہاجن کا جواب یہ تھا کہ ''ایسی صورت میں ریاست فی الفور ہندوستان کی گود میں چلی جائیگی۔'' مہر چند مہاجن لکھتا ہے کہ ''میں نے اسی شام مہاراجہ کو کرنل شاہ سے اپنی بات چیت کی تفصیل بتائی تو وہ بہت برہم ہوا۔ وہ اس وقت تک ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ہو چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے ریاست کا ہندوستان کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے لیے چمبہ، بھدروا اور کشتواڑ کی جانب سے ڈلہوزی تک سڑک بنانی پڑے تو میں بناؤں گا۔ لیکن ریاست کو کسی صورت پاکستان کے پاس نہیں جانے دوں گا۔'' اس پر میں نے پوچھا کہ ''اگر آپ کا یہی خیال ہے تو آپ نے 15 راگست

سے پہلے کوئی فیصلہ کیوں نہ کیا؟'' مہاراجہ نے جواب دیا کہ ''مجھے سابق وزیراعظم نے اس کے برخلاف مشورہ دیا تھا اور میں مسلسل یہ امید کرتا تھا کہ ریاست کی آزاد حیثیت کو برقرار رکھا جا سکے گا۔''[20] جب مہاجن اور مہاراجہ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی تھی اس وقت تک کشمیر پر قبائلیوں کی کوئی یلغار نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مینن اور گپتا کہتے ہیں کہ اگر قبائلی لشکر حملہ نہ کرتا تو ہندوستان کشمیر سے بے تعلق رہتا۔ تاریخ نویسی میں دروغ گوئی اور بددیانتی کی اس سے بدتر مثال ملنا مشکل ہے۔

جب کرنل شاہ اپنے مشن کی ناکامی کے بعد کراچی پہنچا تو 18 اکتوبر کو حکومت کشمیر کی طرف سے ایک اور تار موصول ہوا جس میں اس دھمکی کا اعادہ کیا گیا کہ اگر پاکستان کی جانب سے ریاست کی ناکہ بندی ختم نہ کی گئی اور سرحدوں پر حملے جاری رہے تو حکومت کشمیر ''بیرونی دوستانہ امداد'' طلب کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس تار کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی ریاست میں فوری فوجی مداخلت کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔ گورنر جنرل پاکستان نے 20 اکتوبر کو اپنے جوابی تار میں مہاراجہ سے درخواست کی کہ اپنے وزیراعظم کو کراچی بھیجو تاکہ بات چیت کے ذریعے سارے مسائل کو دوستانہ طریقے سے حل کیا جائے۔ تار میں مزید کہا گیا کہ ''بیرونی امداد کی دھمکی سے صاف ظاہر ہے کہ تمہاری حکومت ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے موقع کی متلاشی ہے اور وہ اپنے اس مقصد کی تکمیل ہندوستان کی مداخلت و اعانت کے ذریعے کرنا چاہتی ہے۔ مگر حکومت کشمیر کی طرف سے اس تار کا کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

ادھر ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی کاروائی آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی یعنی صوبہ جموں میں مسلمانوں کے قتل عام اور انہیں وہاں سے جبراً بے دخل کرنے کے منصوبے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس ابلیسی منصوبے کے تحت پہلے تو جموں شہر کی مسلمان بستیوں کے لیے پانی، بجلی اور اناج کی سپلائی بند کی گئی اور پھر مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں گے تو انہیں فوج کی حفاظت میں پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ ہزاروں مسلمانوں نے مہاراجہ کے اس اعلان کی صداقت پر یقین کرتے ہوئے ہتھیار ڈال کر خود کو ڈوگرہ فوج کے سپرد کر دیا۔ جب یہ مسلمان حسب ہدایت ایک کھلے میدان میں جمع ہو گئے تو انہیں ساٹھ لاریوں میں سوار کیا گیا جو کٹھوعہ کے جنگل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جہاں اس قسم کے مسلمان مہاجروں کی بہت سی لاریاں پہلے سے موجود تھیں۔ 20 اکتوبر کو ڈوگرہ فوجوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھوں

نے ان مہاجرین کا گھیراؤ کر کے یکا یک ان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ کئی گھنٹے تک جاری رہا۔ جس کے دوران تقریباً 8000 نہتے مسلمان جاں بحق ہوئے۔ دو دن بعد موضع سنبھا کے نزدیک مسلمان مہاجرین پر اسی قسم کا حملہ ہوا جس میں تقریباً 14000 مسلمان تہ تیغ ہوئے اور ان کی سینکڑوں عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ یہ حملے بالکل اسی طرح کی فوجی طرز کے تھے جس طرح کہ ان دنوں مشرقی پنجاب میں ہو رہے تھے۔ مہاجرین کے اس کیمپ میں سے صرف 15 مسلمان کسی نہ کسی طرح اپنی جانیں بچا کر سیالکوٹ پہنچے۔ جموں، کٹھوعہ اور اودھم پور کے اضلاع کے مسلمانوں کے منظم قتل عام کا یہ سلسلہ اگلے تقریباً دو ماہ تک جاری رہا جس کے دوران ایک اندازے کے مطابق تقریباً دو لاکھ مسلمان جاں بحق ہوئے اور تقریباً تین لاکھ مہاجرین پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مرنے والوں میں پروفیسر شیخ عبدالرشید، پروفیسر ملک فضل حق اور پروفیسر راجہ مقبول کے علاوہ بہت سے دوسرے سرکردہ مسلمان شامل تھے۔ ہزاروں عورتیں اغوا ہوئیں جن میں مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری غلام عباس کی بیٹی بھی شامل تھی۔ دوسری طرف اس دوران میرپور، پونچھ کے علاقوں میں ہزاروں بے گناہ ہندو اور سکھ بھی تہ تیغ ہوئے۔ ان کے بہت سے بچے بھی جاں بحق ہوئے اور سینکڑوں عورتیں اغوا ہوئیں جنہیں بعد میں مغربی پنجاب کے بعض شہروں میں فروخت کیا گیا۔

21 ر اکتوبر کو تقریباً پانچ ہزار قبائلیوں نے پونچھ کے حریت پسندوں کی امداد کے لیے یکا یک کشمیر پر یلغار کر دی اور اس طرح مہاراجہ ہری سنگھ اور نئی دہلی کے ارباب اقتدار کو ریاست کے ہندوستان کے الحاق کی رسمی کاروائی کے لیے وہ موقع مل گیا جس کے وہ کئی ہفتے سے منتظر تھے۔ چوہدری محمد علی کا یہ بیان صحیح نہیں کہ ''حکومت پاکستان کو قبائلیوں کے اس حملے کا پہلے سے علم نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے پونچھ کے حریت پسندوں کی امداد کے لیے ستمبر میں ہی کاروائی شروع کر دی تھی۔ یہ کاروائی بڑی نیم دلانہ بلکہ بزدلانہ تھی اور اسے خواہ مخواہ پردۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ سابق میجر جنرل اکبر خان کا بیان ہے کہ اس نے ستمبر کے وسط میں مسلم لیگی لیڈر میاں افتخار الدین کے کہنے پر کشمیری حریت پسندوں کی امداد کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ لیکن وزیر اعظم لیاقت علی خان کی زیر صدارت منعقدہ اعلیٰ سطح کی ایک کانفرنس میں اس کے اس منصوبے پر تو غور نہ ہوا البتہ سردار شوکت حیات خان کا تیار کردہ ایک منصوبہ منظور کر لیا گیا جس کے مطابق

کشمیری عوام کی جنگ آزادی میں پاکستانی امداد کا کام آزاد ہند فوج کے ایک سابق افسر زمان کیانی اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے سالار اعلیٰ خورشید انور کے سپرد کیا گیا تھا۔ اگرچہ پاکستانی فوج کے برطانوی کمانڈر انچیف اور دوسرے برطانوی فوجی افسروں کو اس منصوبہ کے بارے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا تاہم اکبر خان نے اس مقصد کے لیے فوج کے ذخیرے میں سے چار ہزار رائفلیں دی تھیں جو پنجاب پولیس کے حکام نے کشمیری حریت پسندوں کو نہ دیں بلکہ ان کی جگہ انہیں سرحد کی دیسی ساخت کی بندوقیں دی گئیں جو بہت جلدی ناکارہ ہوگئیں۔ اکبر خان لکھتا ہے کہ ''اکتوبر میں کشمیر پر قبائلیوں کی یلغار ہوئی تھی تو اس وقت تک اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا البتہ اس نے قبل ازیں سنا تھا کہ خورشید انور قبائلیوں کا لشکر جمع کرنے میں مصروف تھا۔''[21] یہ خبر صرف اکبر خان نے ہی نہیں سنی تھی بلکہ پاکستان کے ہر باخبر شہری کو اکتوبر کے اوائل میں معلوم تھا کہ صوبہ سرحد میں خورشید انور کی نگرانی اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان کے تعاون سے قبائلیوں کے حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ جب 18 ر کتوبر کو روز نامہ ''ڈان'' میں یہ خبر چھپی کہ سرحد کے قبائلی سرداروں نے روالپنڈی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے اسے یقین دلایا ہے کہ قبائلی عوام پاکستان کی خاطر ہر محاذ پر لڑنے پر آمادہ ہیں تو ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ کشمیر پر قبائلیوں کا حملہ ہونے ہی والا ہے کیونکہ حکومت ہندوستان نے ستمبر میں پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان سڑک اور پل تعمیر کرنے کا جو کام شروع کیا تھا اکتوبر کے اوائل میں اس کی رفتار بہت تیز کر دی گئی تھی اور کشمیر کے نئے وزیر اعظم مہر چند مہاجن نے 15 ر اکتوبر کو اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے فوراً ہی بعد اعلانیہ یہ دھمکی دی دی تھی کہ ہندوستان سے فوجی امداد طلب کی جائے گی۔

وزیر اعظم لیاقت علی، چوہدری محمد علی اور بعض دوسرے پاکستانی ارباب اقتدار کشمیری حریت پسندوں کے امداد کے سلسلے میں جس نیم دلی اور راز داری کا مظاہرہ کر رہے تھے وہ دراصل ان میں جرأت ایمانی کے فقدان کی آئینہ دار تھی۔ وہ برطانوی سامراج سے بہت خائف تھے اور وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے اس کی ناراضگی کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ انہیں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کے تصور سے پسینہ آتا تھا۔ حالانکہ ان دنوں برصغیر کی صورت حال ایسی تھی کہ اگر کشمیر میں مہاراجہ کی فوجوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ وا کالی دل جیسے بیرونی عناصر کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کو بند کرنے کے لیے پاکستان کی طرف سے مداخلت کی

جاتی تو بین الاقوامی قانون کی نظر میں یہ کارروائی بلا جواز نہ ہوتی۔ جموں وکشمیر کے عوام نے ڈوگرہ حکومت کے استبداد کے خلاف جو جدوجہد شروع کر رکھی تھی وہ بیرونی حمایت کی مستحق تھی۔ اقوام متحدہ کے منشور اور اس کی کئی قراردادوں میں اس قسم کی کارروائی کو قانونی واخلاقی طور پر صحیح تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اگر حکومت پاکستان انڈین یونین کی جانب سے برصغیر کی تقسیم کے متفقہ اصولوں کی خلاف ورزی اور اس کی توسیع پسندی کے سدباب کے لیے کوئی کارروائی کرتی تو وہ تین جون کے منصوبے کے عین مطابق ہوتی۔ ایسی کوئی بھی کارروائی امن کے لیے کارروائی ہوتی اور کسی بھی قانونی موشگافی کے ذریعے اسے جارحیت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان اور بعض دوسرے پاکستانی ارباب اقتدار کی جانب سے کشمیر کی جنگ آزادی کی امداد کے سلسلے میں نیم دلی اور راز داری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت پاکستان کے متعدد سامراج نواز اعلیٰ سول حکام جن میں محکمہ دفاع کا سیکرٹری بھی شامل تھا، اس کارروائی کے خلاف تھے۔ ان افسروں نے نہ صرف پنجابی رضا کاروں کو مناسب اسلحہ اور دوسری اشیاء مہیا کرنے کے راستے میں رکاوٹیں حائل کیں بلکہ یہ ہدایات بھی جاری کیں کہ قبائلیوں کو کشمیر میں داخل نہ ہونے دیا جائے، چونکہ حکومت پاکستان پر ابتداء ہی سے برطانوی سامراج کی پٹھو بیوروکریسی کا غلبہ ہو گیا تھا اس لیے اعلیٰ سول حکام کشمیر کے حریت پسندوں اور ان کے حامیوں کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوئے۔ سرکاری طور پر پنجابی رضا کاروں کو کوئی امداد نہ دی گئی اور پاکستان کے محب وطن غیر سرکاری عناصر نے انہیں جو امداد دی وہ بھی سرکاری نگرانی کی عدم موجودگی میں بدعنوانیوں کی نذر ہو گئی یا ان لوگوں کی باہمی چپقلش کے باعث ضائع ہو گئی جنہوں نے اس تحریک کی قیادت سنبھال رکھی تھی۔ اس سلسلے میں رقوم خورد برد کر دی گئیں۔ رائفلیں منافع پر فروخت کر دی گئیں اور اس بنا پر کٹھوعہ، جموں روڈ پر کوئی مؤثر کارروائی نہ ہو سکی۔ برطانوی سامراج کا فیصلہ یہی تھا۔ 20/ اکتوبر کو جب صوبہ سرحد کے برطانوی گورنر کو قبائلیوں کی کشمیر کی طرف روانگی کا پتہ چلا تو اس نے نہ صرف ان کی پیش قدمی روکنے کے لیے ناکہ بندی کا حکم دیا بلکہ اس نے انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف کو اطلاعات بھی فراہم کیں۔ 24/ اکتوبر کو پاکستان آرمی کے جنرل ہیڈ کوارٹرز سے بھی ہندوستان کے کمانڈر انچیف کو بذریعہ تار قبائلیوں کے کشمیر پر حملہ کی اطلاع دی گئی اور اس دن پاکستان آرمی کے برطانوی کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے محکمہ دفاع

کے سیکرٹری کے نام ایک تار بھیجا جس میں اس نے متنبہ کیا کہ ''کشمیر میں گڑبڑ پاکستان کے ملحقہ اضلاع اور بین الاقوامی سرحد پر خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔'' تار میں مزید کہا گیا تھا کہ ''آپ سوچیں کہ مزید قبائلی یلغار کو روکنے اور کشمیر میں پہلے سے موجود لشکروں کو واپسی پر آمادہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ قبائلی لیڈروں کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ مکمل غیر جانبداری حکومت پاکستان کی پالیسی تھی اور اب بھی ہے۔''[22]

قبائلی لشکر نے 22 / اکتوبر کو مظفر آباد پر قبضہ کیا تو اس شہر میں تین دن تک ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ قبائلیوں نے بلا امتیاز غیر مسلموں کو قتل کرنے کے علاوہ ان کی بہت سی عورتوں کو اغوا کیا اور ان کے گھروں کو لوٹا۔ سردار ابراہیم کہتا ہے کہ ''ان تین دنوں کے دوران مظفر آباد میں جو کچھ ہوا اس کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قبائلی مجاہدوں پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری تو ان پر عائد ہوتی ہے جو اس تحریک آزادی کو چلا رہے تھے۔''[23] سردار ابراہیم کا مطلب یہ ہے کہ اس قتل عام اور لوٹ مار کی ذمہ داری خورشید انور پر ہی عائد ہوتی تھی جو قبائلیوں کے حملے کا انچارج تھا۔ لارڈ برڈ وڈ کا بیان ہے کہ 26 / اکتوبر کو بارامولا میں قبائلیوں نے جو قتل عام کیا اور جو لوٹ مار مچائی اس کی ذمہ داری بھی خورشید انور پر عائد ہوتی تھی''[24] لیکن کسی فرد واحد کو اس ساری گھناؤنی کاروائی کا ذمہ دار ٹھہرانا صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آفریدی اور محسود قبائلیوں نے محض اسلامی جذبے کے تحت کشمیر پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کا بڑا مقصد لوٹ مار بھی تھا۔ انہوں نے مظفر آباد اور بارامولا کے علاوہ میر پور، پونچھ، کوٹلی، جھنگر، نوشہرہ، اوڑی اور بھمبر کے قصبوں اور دیہات میں بھی بے محابا قتل و غارت، لوٹ مار، آتشزنی اور اغوا کی وارداتیں کی تھیں۔ ان قبائلیوں میں نظم وضبط کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہ بالکل بے مہار اور غیر منظم تھے۔ ان سے حملہ کروانے سے پہلے ان کی تنظیم و تربیت کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہیں ہندوستان کی منظم اور تربیت یافتہ فوج کا سامنا کرنا پڑا تو یہ کسی جگہ بھی کامیابی سے مزاحمت نہ کر سکے۔ پاکستان کے ارباب اقتدار نے اس قسم کے قبائلیوں کے کشمیر پر حملے کا غیر سرکاری طور پر انتظام کر کے بڑی کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا اور بعد میں اس کی سزا پوری پاکستانی قوم کو بھگتنا پڑی۔ چوہدری محمد علی لکھتا ہے کہ ''اگر قبائلی لشکر میں قدرے نظم وضبط ہوتا اور وہ لوٹ مار نہ کرتا تو 26 / اکتوبر کو وادئ کشمیر پر اس کا قبضہ ہوتا۔'' اس وقت تک سردار محمد ابراہیم خان

کی زیر قیادت آزاد کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آچکا تھا اور شیخ عبداللہ کا ایلچی جی۔ایم۔صادق لاہور سے سری نگر واپس جا چکا تھا۔ وہ اکتوبر کے اوائل میں پاکستان کے ارباب اقتدار سے ریاست کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے لاہور آیا تھا۔لیکن سردار ابراہیم کی طرح اس کی بھی قائداعظم جناح سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اس بناء پر اس کا مشن ناکام ہو گیا تھا اور وہ کشمیر پر قبائلیوں کے حملے کے دو دن بعد یعنی 22/اکتوبر کو واپس سری نگر چلا گیا تھا۔''

باب: 8

# دوطرفہ بات چیت کی ناکامی اور اقوام متحدہ سے رجوع

جب قبائلی لشکر کے کشمیر پر حملے کی اطلاع نئی دہلی پہنچی تو 25/اکتوبر کو ماؤنٹ بیٹن کی صدارت میں ہندوستان کی دفاعی کمیٹی کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر میں مہاراجہ کی حکومت کی امداد کے لیے بلا تاخیر ہندوستانی فوج بھیجی جائے گی۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کے مطابق اس فیصلہ پر یہ شرط عائد کی گئی کہ مہاراجہ پہلے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کرے۔ جوزف کوربل کی رائے یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کا رویہ کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کی جانبداری پر مبنی تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ مشورہ کیوں دیا تھا کہ ہندوستان کی فوجی امداد پر الحاق کی شرط عائد کی جائے؟ وہ کیسے یہ دلیل پیش کرسکتا تھا کہ کشمیر جو اس وقت تک تکنیکی طور پر آزاد ملک تھا، الحاق کی درخواست کیے بغیر قانوناً فوجی امداد طلب نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے لازمی طور پر یہ فرض کرلیا ہوگا کہ حکومت پاکستان ایسے الحاق کی قانونی حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی جو کشمیری عوام کی رائے معلوم کئے بغیر بروئے کار لایا جائے گا اور اسے یہ بھی ضرور پتہ ہوگا کہ اگر اس مسئلہ پر دونوں ڈومنینیوں کے درمیان جنگ ہوئی تو اس کی بنیاد الحاق کی قانونی حیثیت پر نہیں ہوگی بلکہ الحاق کی حقیقت پر ہوگی۔ جوزف کوربل کو اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا کہ اس موقع پر اقوام متحدہ یا حکومت پاکستان سے کیوں رابطہ قائم نہیں کیا گیا تھا۔''[1] لارڈ برڈووڈ بھی حیران ہے کہ ''24 یا 25/اکتوبر کو نئی دہلی میں کسی نے وزیراعظم پاکستان سے ٹیلی فون پر رابطہ کرکے اس بحران کو مشترکہ سیاست کاری کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟

اگر نہرو کے لیے از خود ایسا کرنا ممکن نہیں تھا تو کیا اس کے قریب کوئی بھی ایسا دور اندیش شخص نہیں تھا جو اسے ایسا کرنے کی ترغیب دیتا؟"[2] برڈوڈ کے سوالوں کا جواب یہ ہے کہ برطانوی سامراج نے پہلے سے ہی ریاست جموں وکشمیر کو ہندوستان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں مقیم اعلیٰ برطانوی سول وفوجی حکام نے کشمیر میں پاکستان کی فوجی مداخلت کی مخالفت کی تھی جبکہ ہندوستان میں ماؤنٹ بیٹن کے علاوہ سارے اعلیٰ برطانوی سول وفوجی حکام نے ریاست میں ہندوستان کی فوجی مداخلت کی بھرپور تائیدوحمایت کی تھی۔ سامراجی سیاست میں عملاً قانون اور اخلاق کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

حکومت ہندوستان کی دفاعی کونسل کے فیصلے کے مطابق محکمہ ریاستی امور کا سیکرٹری وی۔ پی۔ مینن اسی دن یعنی 25 /اکتوبر کو ہی خاص فوجی ہوائی جہاز کے ذریعے سری نگر پہنچ گیا۔ ہندوستان کی ہوائی اور بری فوج کے دو تین اعلیٰ حکام بھی اس کے ہمراہ تھے۔ مینن نے فوراً ہی مہاراجہ سے ملاقات کر کے اس سے الحاق کی درخواست پر دستخط کروا لیے اور پھر اسے مشورہ دیا کہ یہاں سے جموں چلے جاؤ کیونکہ قبائلی لشکر نے اسی دن سری نگر سے صرف 35 میل دور بارامولا پر قبضہ کر کے مہوڑہ کے اس پاور ہاؤس کو نذر آتش کر دیا تھا جہاں سے ساری وادی کشمیر کو بجلی مہیا ہوتی تھی۔ اس کو خطرہ تھا کہ یہ لشکر کسی وقت بھی سری نگر پہنچ جائے گا۔

مینن نے الحاق کی جس درخواست پر دستخط کروائے تھے اس میں اس حقیقت کا خاص طور پر ذکر تھا کہ "ریاست کشمیر کی سرحد سوویت یونین اور چین سے مشترکہ ہے اگر میری حکومت کی فوری طور پر فوجی امداد نہ کی گئی تو یہ علاقہ آفریدی قبائلیوں کی وحشیانہ کارروائیوں کے باعث تباہ وبرباد ہو جائے گا۔" مینن یہ درخواست لے کر 26 /اکتوبر کو دہلی واپس ہوا تو مہاراجہ اسی رات نہایت سراسیمگی کے حالت میں جموں روانہ ہو گیا۔ ڈوگرہ فوج نے مہاراجہ کے فرار میں مدد کرنے کے لیے پٹرول کے سارے ذخائر پر قبضہ کر لیا تھا اور صرف ان لوگوں کو پٹرول مہیا کیا جاتا تھا جو مہاراجہ کے ہمراہ سری نگر سے بھاگ رہے تھے۔ مہاراجہ نے اپنے تمام مال واسباب اور زروجواہر لاریوں میں لدوائے اور جو سامان لاریوں کی قلت کے باعث ان میں نہ سما سکا اسے تانگوں پر لدوالیا۔ اس نے پونچھ پہنچنے تک راستے میں کئی جگہ رک کر اپنی پولیس اور فوج کو یہ ہدایات جاری کیں کہ ریاست کے ڈوگرہ راج کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے جو مسلمان باشندہ

جہاں کہیں بھی نظر آئے اسے بلا دریغ قتل کر دیا جائے۔ اس نے 26 / اکتوبر کو جموں پہنچ کر اپنی خاص نگرانی میں برہمنوں اور راجپوت ہندوؤں کو ہتھیار تقسیم کروائے۔ [3]

اسی دن نئی دہلی میں ماؤنٹ بیٹن کی زیر صدارت حکومت ہندوستان کی دفاعی کمیٹی کا دوسرا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں مہاراجہ کی جانب سے ارسال کردہ الحاق کی درخواست کو قبول کرنے اور اس کی حکومت کی فوراً فوجی امداد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ماؤنٹ بیٹن نے اس ساری کاروائی کی بذات خود نگرانی کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس دن ماؤنٹ بیٹن کے جانبدارانہ رویے پر کوئی پردہ نہیں پڑا ہوا تھا۔ وہ کھلم کھلا پاکستان کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ائین سٹیفنز لکھتا ہے کہ ''مجھے لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے 26 / اکتوبر کی رات کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں کا رویہ ہند۔ پاک امور کے بارے میں بالکل ہی یک طرفہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بالکل ہندونواز ہو گئے ہیں۔ اس رات گورنمنٹ ہاؤس کی فضا تقریباً جنگ کی سی تھی۔ پاکستان، مسلم لیگ اور جناح دشمن تھے...... پٹھانوں کے حملے کی وجہ سے مہاراجہ کے ہندوستان کے ساتھ رسمی الحاق کی کاروائی مکمل کی جا رہی تھی۔ یہ بہت بڑی ریاست اور اس کی مسلم اکثریت اب قانونی طور پر جناح کے پاس نہیں رہے گی۔ شرط صرف استصواب کی تھی۔ پاکستانیوں نے جونا گڑھ کے الحاق کو منظور کر کے پاگل پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہندوستانی افواج کو فوراً کشمیر بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں ضروری انتظامات کئے جا رہے تھے۔ [4]

27 / اکتوبر کی صبح کو وی۔ پی۔ مینن رسمی الحاق نامے پر دستخط کروانے کے لیے جموں روانہ ہوا تو اس کے پاس مہاراجہ کے نام ماؤنٹ بیٹن کا ایک ذاتی خط بھی تھا۔ اس تاریخی خط میں لکھا تھا کہ ''الحاق کی درخواست اس شرط پر منظور کی جاتی ہے کہ جب کشمیر میں امن وامان بحال ہو جائے گا اور حملہ آوروں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا تو اس کے بعد ریاست کے مستقبل کے بارے میں عوام سے استفسار کیا جائے گا۔ دریں اثنا آپ کی امداد کے لیے آج ہی ہندوستانی فوجیں بھیجی جا رہی ہیں۔ میری حکومت کو یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا ہے کہ آپ نے شیخ عبداللہ کو عارضی حکومت بنانے کی دعوت دینے کا فیصلہ کیا ہے [5]'' اور جب وی۔ پی۔ مینن الحاق نامے پر دستخط کروانے کے لیے جموں پہنچا تو ہندوستانی فوج کی ایک سکھ بٹالین سری نگر کے ہوائی اڈے پر پہنچ چکی تھی۔ پاکستان کشمیر کی بازی ہار چکا تھا۔

قبائلیوں کی اکثریت ابھی تک بارا مولا میں لوٹ مار میں مصروف تھی اور ان کا جو ہراول دستہ سری نگر کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اسے سکھ بٹالین کی دو کمپنیوں نے شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر روک کر پسپا کر دیا۔ غیر تربیت یافتہ پنجابی رضا کاروں کا ایک جتھہ سری نگر ہوائی اڈے کے نزدیک پہنچا تو اسے سخت ہزیمت اٹھانا پڑی کیونکہ ہندوستانی فوج نے اس وقت تک ہوائی اڈے کی حفاظت کے لیے دفاعی مورچے بنا لیے تھے۔ جو ایک ہزار رضا کار کٹھوعہ روڈ پر ناکہ بندی کے لیے بھیجے گئے تھے وہ وہاں پہنچے ہی نہیں تھے۔ ان کی دیسی ساخت کی بندوقیں راستے میں ہی خراب ہو گئی تھیں۔ مینن اسی دن الحاق نامے پر مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے اس کے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے علاوہ شیخ عبداللہ کے دستخط کروا کر واپس دہلی پہنچ گیا۔ اس کی جموں سے روانگی کے فوراً بعد شیخ عبداللہ کو ریاست کا چیف ایمرجنسی ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا اور شیخ نے 30 راکتوبر کو ''مہاراجہ بہادر'' اور اس کی نسلوں کا وفادار رہنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اس کا یہ عہدہ محض نمائشی تھا۔ حقیقی اقتدار بدستور ''مہاراجہ بہادر'' اور اس کے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے پاس تھا۔ شیخ کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فوراً فائز نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ہندوستان کو یقین نہیں تھا کہ اس کی فوج وادیٔ کشمیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ وادی پر ہندوستانی فوج کے مکمل قبضہ سے پہلے شیخ کو ریاست کا اقتدار دینا مناسب نہیں تھا۔ شیخ عبداللہ اپنی ''قوم پرستی'' اور نہرو سے ''ذاتی دوستی'' کے باوجود مسلمان تھا اور سردار پٹیل کسی ''قوم پرست'' مسلمان کی وفاداری پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔

ہندوستان کی اس فوجی کاروائی کی تیاریوں کی اطلاع 26 راکتوبر کی شام کو ہی پاکستان آرمی کے لاہور ایریا ہیڈ کواٹر میں پہنچ گئی تھی۔ انڈین چھاتہ بردار بریگیڈ کو اس کاروائی کے لیے جو حکم دیا گیا تھا وہ پورے کا پورا لاہور میں سن لیا گیا تھا۔ یہ پیغام ڈیسائفر (Decipher) کر کے راولپنڈی میں پاکستان آرمی ہیڈ کوارٹرز کو روانہ کیا گیا۔ لیکن قائم مقام برطانوی کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے اس پر خاموشی اختیار کئے رکھی یہاں تک کہ قائد اعظم جناح کو بھی اطلاع نہ دی گئی حالانکہ وہ اس دن لاہور میں تھے۔[6] اس کے برعکس نئی دہلی میں اعلیٰ برطانوی فوجی افسر ساری رات سرگرم عمل رہے۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے ہندوستانی فوجوں کی نقل و حرکت کی نگرانی خود برطانوی کمانڈر جنرل ڈڈلے رسل (Dudley Russell) نے کی اور اس سلسلے میں اس قسم کا

کوئی خطرہ محسوس نہ کیا گیا کہ ہندوستانی فوج کے برطانوی افسر پاکستانی فوج کے برطانوی افسروں کے خلاف صف آراہوں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل سرفرینک میسروی، جوان دنوں لندن گیا ہوا تھا، کے بیان کے مطابق ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا منصوبہ بڑے غوروخوض کے بعد کئی ہفتے پہلے تیار کیا گیا تھا۔[7]

چونکہ پاکستانی فوج کے اعلیٰ برطانوی افسروں کو اس منصوبے کا یقیناً علم تھا اس لیے انہوں نے مجرمانہ غفلت اور غداری کا مظاہرہ کیا۔ 27/اکتوبر کی شام کو جب کشمیر میں ہندوستان کے فوجی حملے کی اطلاع قائداعظم جناح کو دی گئی تو انہوں نے فوراً پنجاب کے گورنر سرفرانسس موڈی کی وساطت سے پاکستانی فوج کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل سرڈگلس گریسی کو کشمیر میں فوج بھیجنے کا حکم دیا۔ اس حکم کا خلاصہ یہ تھا کہ ''پہلے راولپنڈی، سری نگر روڈ کے درے پر قبضہ کرو اور پھر سری نگر، جموں روڈ پر درہ بانہال پر قبضہ کر کے ہندوستانی فوجوں کا سلسلہ مواصلات منقطع کر دو۔'' لیکن گریسی نے اس حکم پر عمل کرنے کی بجائے نئی دہلی میں سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک سے ہدایات لینے کے لیے بذریعہ ٹیلی فون رابطہ قائم کیا حالانکہ سپریم کمانڈر کا پاکستانی آرمی پر کوئی اپریشنل کنٹرول نہیں تھا اور ہندوستان کے برطانوی کمانڈر انچیف نے کشمیر میں ہندوستانی فوجی مداخلت کے بارے میں اس سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ یہ جنرل گریسی وہی سامراجی درندہ تھا جس نے ستمبر 1947ء میں ہندچینی پر فرانسیسی سامراج کو دوبارہ مسلط کرنے کے لیے گورکھا اور جاپانی فوجیوں کے ذریعے ویتنامی عوام کا بے محابا خون بہایا تھا اور یہ وہی سامراجی سازشی تھا جس نے دسمبر 1949ء میں پاکستانی فوج کے ایک جونیئر جنرل محمد ایوب خان کو پہلے ایڈ جوٹنٹ جنرل بنایا اور پھر ستمبر 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان سے سفارش کر کے اسے کمانڈر انچیف مقرر کروایا تھا اور یہ وہی بدطینت شخص تھا جس کے بارے میں اس کا پروردہ ایوب خان لکھتا ہے کہ ''گریسی بڑے نیک آدمی تھے وہ دوسروں کے جذبات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے بہت آزادی دے رکھی تھی۔''[8] بظاہر سامراجی پٹھو ایوب خان کے نزدیک پاکستانی عوام کے جذبات کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی کیونکہ جب گریسی نے پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی تو اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ پاکستانی عوام میں اس کی اس حکم عدولی کا کیا ردعمل ہوگا۔

فیلڈ مارشل آکن لیک اگلے دن یعنی 28/اکتوبر کو علی الصبح لاہور پہنچا اور اس نے قائداعظم جناح سے ملاقات کر کے انہیں جنرل گریسی کو دیئے گئے حکم کو واپس لینے پر آمادہ کر لیا۔ آکن لیک کی دلیل یہ تھی کہ مہاراجہ کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی جو کارروائی کی ہے اس کی قانونی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نواب جونا گڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ صحیح تھا تو مہاراجہ کشمیر کے اسی قسم کے فیصلے کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ الحاق کی کارروائی کے بعد ہندوستان کو کشمیر میں اپنی فوجیں بھیجنے کا حق حاصل ہے۔ اگر پاکستان نے اب ہندوستان کے اس ملحقہ علاقے میں کوئی فوجی کارروائی کی تو اس کے نتائج بے انتہا خطرناک ہوں گے۔ چونکہ برطانوی فوجی حکام اس جنگ میں حصہ نہیں لیں گے اس لیے پاکستانی فوج کی حالت بہت پتلی ہو گی۔ آکن لیک نے تجویز پیش کی کہ اس تنازعہ کے پرامن تصفیہ کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے گورنر جنرلوں، وزرائے اعظم، مہاراجہ کشمیر اور اس کے وزیر اعظم کی ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہونی چاہیے۔ جناح نے یہ تجویز منظور کر لی تو دونوں ڈومینینوں کے درمیان ہمہ گیر جنگ کا خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا۔

ہندوستانی مؤرخین کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی جانب سے کشمیر میں اس فوجی کارروائی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اگر پاکستان کشمیر پر قبضہ کر لیتا تو کشمیری قوم پرستوں کی سیاسی موت واقع ہو جاتی۔ مسلم لیگ پاکستان میں کسی حزب اختلاف کے وجود کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ قبل ازیں ہندوستان کی قوم پرست قیادت نے صوبہ سرحد میں استصواب کی تجویز کو منظور کر لیا تھا حالانکہ 1946ء کے اوائل کے عام انتخابات میں اس صوبے کے عوام نے کانگرس کے حق میں ووٹ دیئے تھے اور 1947ء میں وہاں کانگرس کی حکومت قائم تھی۔ لیکن برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ سرحد میں خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب جیسے قائدین تحریک آزادی سے توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ ان حالات میں حکومت ہندوستان کشمیر کے ''قوم پرستوں'' کی جبری بیدخلی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی...... دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کی رائے عامہ کی خواہش کے مطابق کرنا چاہتا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں چار کروڑ مسلمان مقیم تھے اور اس بنا پر ہندوستان اس خطرناک اصول کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سارے مسلمان محض مذہب کی وجہ سے اپنا مستقبل پاکستان سے وابستہ کریں گے۔ صوبہ سرحد کے برخلاف ریاست جموں و کشمیر کا علاقہ جغرافیائی طور پر ہندوستان سے متصل تھا

اور اس کے ہندوستان کے ساتھ بہت سے معاشی اور ثقافتی روابط تھے۔ لہٰذا تشدد کے ذریعے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ برصغیر میں کشمیر ایک ایسا علاقہ تھا جہاں ہندو، مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے ساتھ پر امن طریقے سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر قبائلیوں کو اس فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کو تباہ کرنے کی اجازت دی جاتی تو اس کا ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر بہت برا اثر پڑتا۔ ہندو عصبیت بہت زور پکڑ جاتی اور اس بنا پر حکومت ہندوستان کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حکومت ہندوستان قانونی طور پر حکومت برطانیہ کی وارث تھی اس طرح وہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق نہ ہونے تک اس کے دفاع کی ذمہ دار تھی۔ کشمیر کا دفاع دراصل ہندوستان کا اپنا دفاع تھا۔ تقریباً 800 سال تک ہندوستان پر شمال کی جانب سے حملے ہوتے رہے تھے اور اس مرتبہ بھی قبائلی لیڈر کشمیر میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کو تباہ کرنے کے بعد مشرقی پنجاب میں ریاست پٹیالہ کو برباد کرنا چاہتے تھے اور اس کے بعد وہ امرتسر پر قبضہ کر کے نئی دہلی پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔[9]

اگر ہندوستانی مؤرخین کے اس مؤقف کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار نے برصغیر کی تقسیم کے متفقہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریاست کشمیر پر قبضہ کرنے کا پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا تھا۔ اگر قبائلی حملہ نہ کرتے اور تشدد کے ذریعے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو ہندوستان کشمیر سے بے تعلق رہتا اور یہ بھی ماننا پڑیگا کہ برطانوی سامراج نے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے کانگرسی لیڈروں سے کوئی ساز باز نہیں کر رکھی تھی۔ ہوڈسن کے اس بیان کو بھی صحیح تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے ممدوح ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے کشمیر میں ہندوستانی فوجیں بھیجنے کے کام میں سرگرمی سے حصہ لینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ''سری نگر میں تقریباً 200 برطانوی باشندے رہتے تھے۔ اگر ہندوستان کی جانب سے فوراً فوجی مداخلت نہ کی جاتی تو ان سب کی جانیں خطرے میں پڑ جاتیں۔ قبل ازیں، قبائلی حملہ آور بارامولا میں بعض برطانوی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے[10] اور پھر اس سامراجی دلیل کی اس منطق کو بھی صحیح تصور کرنا پڑے گا کہ پاکستان کو تو کشمیر میں کسی بھی حالت میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا حالانکہ وہاں ہزاروں مسلمان مارے جا چکے تھے، ہزاروں مسلمانوں کو جبراً بیدخل کیا جا چکا تھا اور لاکھوں

باشندوں کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی سیاسی دھاندلی اور فوجی غنڈہ گردی جائز اور ضروری تھی۔

تاہم نامور برطانوی مورخ پروفیسر السٹیئر لیمب ان ساری وجوہ کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جواہر لال نہرو ریاست کشمیر کے مستقبل کو اپنی سیکولر عینک سے دیکھتا تھا اور وہ نظریۂ پاکستان کو اپنے لادینی نظریۂ سیاست کے لیے ایک چیلنج تصور کرتا تھا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی قسم کے بہت سے ہندو لیڈر موجود تھے جو برصغیر کی تقسیم کو مذہبی جنگ کے نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ اسلامی قوتوں کے خلاف ہندو مہاراجہ کی امداد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں ایسے لیڈروں کی بھی کمی نہیں تھی جو کشمیر کی جغرافیائی اہمیت کے بارے میں انڈین سول سروس کے دیرینہ نقطہ نگاہ سے متفق تھے۔ ہندوستان کا محکمہ خارجہ برصغیر میں برطانوی راج کے آخری سالوں کے دوران بھی روس، جس نے اب کمیونزم کا لبادہ پہن لیا تھا، کی جانب سے بدستور خطرہ محسوس کرتا تھا۔ سر اولف کیرو جیسے لوگوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں بدامنی ہوئی تو روس کو مداخلت کا موقع مل جائے گا۔ وہ تاجکستان اور پامیر کی طرف سے یا سنکیانگ کی طرف سے دخل اندازی کرے گا۔ سنکیانگ میں اس صدی کے تیسرے عشرے کے دوران مقامی وارلارڈ شینگ زائی کی سرگرمیوں کی وجہ سے روسیوں کا اثر ورسوخ خاص طور پر بہت بڑھ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ نے 1935ء میں گلگت کا علاقہ پٹہ پر حاصل کر لیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان کے محکمہ خارجہ کو روسیوں کی جانب سے بدستور تشویش لاحق تھی۔ اس محکمہ نے اسی تشویش کی بنیاد پر اقتدار کی منتقلی کے تقریباً دو ماہ بعد اور مہاراجہ کشمیر کے الحاق سے ایک دن پہلے یعنی 25 اکتوبر کو برطانوی حکومت کو جو تار بھیجا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ پٹھان قبائلیوں کے خلاف مہاراجہ کشمیر کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہیے کہ ''کشمیر کی شمالی سرحدیں افغانستان، سوویت یونین اور چین سے ملتی ہیں۔ کشمیر کا تحفظ، جو لازمی طور پر ریاست کے اندرونی امن و امان اور مستحکم حکومت کے وجود پر منحصر ہے، ہندوستان کے تحفظ کے لیے بہت ضروری ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ کشمیر کی جنوبی سرحد کا ایک حصہ ہندوستان سے ملتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ کشمیر کی امداد کی جائے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں تھی کہ چند ہفتے بعد جواہر لال نہرو نے خود بھی ان وجوہ کا اعادہ کیا تھا۔''[11]

لیمب لکھتا ہے کہ ''کشمیر کے علاقے کی فوجی اہمیت کی بنیاد پر ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں جو دلائل پیش کئے جارہے تھے وہ اس بنا پر اور بھی زیادہ معقول نظر آتے تھے کہ برصغیر کی تقسیم کے موقع پر بہت سے مبصرین پاکستان کے تصور کو قابل عمل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نوزائیدہ اسلامی ریاست لازمی طور پر منہدم ہوجائے گی اور اس کے نتیجہ میں جو انتشار پیدا ہوگا اگر اسے کشمیر اور فوجی اہمیت کے پہاڑی سرحدی علاقوں تک پھیلنے دیا گیا تو سوویت یونین کو دخل اندازی کی ایسی ترغیب ملے گی کہ وہ اپنے آپ کو اس پر عمل درآمد سے باز نہیں رکھ سکے گا۔ پاکستان کے انہدام کا امکان اس لیے بھی زیادہ ہوگیا تھا کہ بہت سے ہندوستانی سیاست دان نہ صرف اس کی امید کرتے تھے بلکہ وہ اس مقصد کے لیے عملی اقدامات پر بھی آمادہ تھے۔'' فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک کا مشاہدہ یہی تھا۔ لہٰذا اس نے 28 ستمبر کو حکومت برطانیہ کو جو خفیہ رپورٹ بھیجی تھی اس میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ ہندوستانی کابینہ پاکستان کی ڈومینین کے مستحکم بنیادوں پر قیام کے سد باب کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ لیمب کی رائے یہ ہے کہ ''ہندوستانی زعما انہی وجوہ کی بنا پر شروع ہی سے ریاست کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے کوشاں تھے۔ برصغیر کی تقسیم سے کچھ دیر پہلے کانگرس کا صدر اچاریہ کرپلانی کشمیر گیا تھا۔ پھر مشرقی پنجاب میں پٹیالہ اور کپورتھلہ کی ریاستوں کے حکمران سری نگر گئے تھے اور ان کی واپسی کے بعد ریاست میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا تھا۔ آخر میں مہاتما گاندھی سری نگر پہنچا تھا اور اس کے دو روزہ دورہ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کشمیر کے وزیراعظم پنڈت کاک کو برطرف کر دیا گیا تھا کیونکہ اس کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کے سمجھوتے کے حق میں ہے۔ تقسیم کے چند ہفتے بعد ستمبر میں شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا تھا کیونکہ ریاست میں وہی ایک سیاسی لیڈر تھا جس کی سرکردگی میں ہندوستان نواز حکومت بن سکتی تھی اور اس موقعہ پر پاکستان میں اس حقیقت کا نوٹس لیا گیا تھا کہ شیخ عبداللہ کے ساتھ کشمیر مسلم کانفرنس کے لیڈر چوہدری غلام عباس کو رہا نہیں کیا گیا اور یہ کہ شیخ عبداللہ نے اپنی رہائی کے فوراً بعد نئی دہلی کا دورہ کیا تھا...... بہت سے پاکستانیوں کو یقین تھا کہ برطانیہ نے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے کانگرسی لیڈروں سے ساز باز کر رکھی ہے اور اسی سازش کے تحت ضلع گورداسپور کا علاقہ ہندوستان کے حوالے کیا گیا تھا۔ یہ علاقہ کوئی اتنا بڑا نہیں تھا لیکن اس سے ہندوستان کو ارضی راستے کے ذریعے کشمیر تک رسائی حاصل ہوگئی۔ اگر پورا ضلع گورداسپور پاکستان کو مل جاتا تو ہندوستان کو پٹھانکوٹ نہ ملتا اور وہ مشرقی

پنجاب اور جموں کی واحد رابطہ سڑک سے بھی محروم رہتا۔"[12]

تاہم پروفیسر لیمب نے برصغیر کے بارے میں برطانوی سامراج کے عزائم پر سے پوری طرح پردہ نہیں اٹھایا۔ اس نے یہ تو لکھا ہے کہ ہندوستان کا محکمہ خارجہ روس کے خطرے کے بارے میں انڈین سول سروس کے برطانوی سامراج کی رائے سے متاثر تھا لیکن یہ نہیں لکھا کہ برطانوی افسروں کی اس رائے کی بنیاد برطانوی سامراج کی خارجہ پالیسی پر تھی۔ ان دنوں اینگلو امریکی سامراج کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف عالمی سرد جنگ کا اعلان ہو چکا تھا اور سوویت یونین میں امریکی سفیر جارج کینن (George Cannon) نے سوویت یونین کا گھیراؤ کرنے کی جو اعلانیہ تجویز پیش کی تھی۔[13] اس پر بھی عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا کشمیر جیسے انتہائی فوجی اہمیت کے علاقے کو ایک ایسی نوزائیدہ پاکستانی ریاست کے سپرد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جس کا مستقبل بالکل غیر یقینی تھا اور جسے ہندوستانی ارباب اقتدار نے ابتدا ہی میں تباہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ پروفیسر لیمب نے اس سلسلے میں برطانوی سامراج کی سازش پر پردہ ڈالنے کے لیے مزید لکھا ہے کہ ریڈ کلف ایوارڈ کا کشمیر کے سوال سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد بعض نہروں کے پانی کی تقسیم پر تھی۔[14] پروفیسر نے یہ بات لکھ کر نہ صرف ماؤنٹ بیٹن اور برطانوی حکومت کو کشمیر کے معاملے میں کانگرس کے ساتھ سازش کرنے کے الزام سے بری کرنے کی ناکام کوشش کی ہے بلکہ اس نے اپنے قارئین کے علم و دانش اور فہم و فراست کی بھی توہین کی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے 3/جون 1947ء کو ضلع گورداسپور کو ہندوستان کے حوالے کر دینے کا جو اشارۃً ذکر کیا تھا اس میں نہروں کے پانی کی تقسیم کا کوئی حوالہ نہیں تھا اور اس کے بعد چار ماہ تک اچاریہ کرپلانی، ماؤنٹ بیٹن، گاندھی، پٹیل اور نہرو نے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے جو مؤثر اقدامات کئے تھے ان کا نہروں کے پانی کی تقسیم سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ مزید براں ہوڈسن، جوزف کوربل، لارڈ برڈووڈ اور حتیٰ کہ مہر چند مہاجن جیسے متعصب مؤرخین بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت والا ضلع گورداسپور ہندوستان کو نہ ملتا تو کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیو یارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق "ان دنوں ریاست کشمیر کے صوبہ لداخ میں "روس نواز" سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور اس بنا پر بعد میں سنکیانگ کے "چند ایجنٹوں" کو گرفتار کیا گیا تھا۔" نئی دہلی میں مقیم اس اخبار کے

نامہ نگار رابرٹ ٹرمبل کی ارسال کردہ یہ رپورٹ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے صرف دو دن بعد یعنی 29؍اکتوبر کو شائع ہوئی تھی۔

حسب توقع حکومت پاکستان نے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں 30؍اکتوبر کو جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا اس میں الزام عائد کیا گیا کہ انڈین یونین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی بنیاد فریب اور تشدد پر ہے حکومت ہندوستان نے استصواب کا جو وعدہ کیا ہے وہ گمراہ کن ہے۔ یہ وعدہ بظاہر بہت دلکش ہے لیکن دراصل اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر کشمیر پر قبضہ کے بعد حکومت ہندوستان کو وہاں حسب مرضی کاروائی کرنے کی اجازت دی گئی تو استصواب کا وعدہ ایک سراب ثابت ہوگا۔ اگلے دن 31؍اکتوبر کو وزیراعظم جواہر لال نہرو نے حکومت پاکستان کے نام ایک تار میں استصواب کے وعدے کا اعادہ کیا اور کہا کہ ''یہ وعدہ حکومت پاکستان اور کشمیر کے عوام کے علاوہ ساری دنیا سے کیا جا رہا ہے۔ اس کی ضرور تکمیل ہوگی۔'' لیکن جب یکم نومبر کو ہندوستان کا گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن سر کلاڈ آکن لیک کی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے لاہور آیا تو وزیراعظم جواہر لال نہرو اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ اس کی سرکاری طور پر یہ وجہ بتائی گئی کہ اسے یکا یک بخار ہو گیا ہے۔ اخبارات کو غیر سرکاری طو پر یہ بتایا گیا کہ حکومت پاکستان نے اپنے 30؍اکتوبر کے سرکاری اعلان میں حکومت ہندوستان پر فریب وتشدد کا جو الزام لگایا ہے نہرو کو اس پر بہت غصہ ہے اور اس کا خیال ہے کہ ایسی صورت حال میں حکومت پاکستان سے کوئی بات چیت سودمند نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے لاہور نہ آنے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ وہ کشمیر میں ہندوستان کی فوجی پوزیشن کافی مضبوط کئے بغیر پاکستان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کی جانب سے کشمیر میں فوجی کمک دھڑا دھڑ بھیجی جا رہی تھی اور امید کی جاتی تھی کہ آئندہ چند دنوں میں وادی کشمیر کے بیشتر علاقوں پر ہندوستانی فوجوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ قبائلی لشکر ہندوستان کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اگرچہ وزیراعظم نہرو کی عدم موجودگی میں کشمیر کے مسئلہ پر اس پہلی بین المملکتی کانفرس کے نتیجہ خیز ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا تاہم پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے یہ تجاویز پیش کیں کہ (1) دونوں گورنر جنرلوں کی طرف سے ایک اعلان کیا جائے جس میں

متحارب فوجوں کو جنگ بندی کے لیے 48 گھنٹے کا نوٹس دیا جائے اور قبائلیوں کو انتباہ کیا جائے کہ اگر انہوں نے اس پر عمل درآمد نہ کیا تو پھر دونوں ملکوں کی فوجیں ان کے خلاف جنگ کریں گی۔ (2) کشمیر سے ہندوستانی فوجوں اور قبائلیوں کی بیک وقت واپسی کا انتظام کیا جائے۔ (3) دونوں گورنر جنرلوں کو امن بحال کرنے، ریاست کا انتظام سنبھالنے اور اپنے مشترکہ اہتمام اور نگرانی میں استصواب کا بندوبست کرنے کے لیے جملہ اختیارات تفویض کیے جائیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ تجاویز ہندوستانی کابینہ کے سامنے پیش کرنے کی حامی بھری لیکن محض آئینی گورنر جنرل ہوتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے یا قائداعظم کے ساتھ مل کر استصواب کا اہتمام کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ جب اس نے واپس دہلی پہنچ کر یہ تجویز ہندوستان کی کابینہ کے روبرو پیش کی تو کابینہ نے حسب توقع اسے مسترد کر دیا۔

وزیراعظم نہرو نے 2 رنومبر کو اپنی ایک نشری تقریر میں اعلان کیا کہ کشمیر میں امن و امان بحال کرنے کے بعد اقوام متحدہ جیسے کسی بین الاقوامی ادارے کی نگرانی میں استصواب کرایا جائے گا۔ مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی فوجیں کشمیر سے کبھی نہیں نکلیں گی اور حکومت ہندوستان جب کبھی مناسب سمجھے گی وہاں استصواب کا ڈھونگ رچائے گی۔ پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 4 رنومبر کو نہرو کی اس تقریر کا جواب دیا جس میں استصواب کے وعدے کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے یہ الزام عائد کیا گیا کہ کشمیر میں ایک منصوبہ کے تحت مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہندوستان کشمیر میں مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کے بعد وہاں استصواب کرانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

5 رنومبر کو پاکستان آرمی کا کمانڈر انچیف جنرل میسروی لندن سے براستہ دہلی پاکستان پہنچا تو اس نے صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کننگھم کو بتایا کہ ''مجھے دہلی میں دو دن قیام کے دوران یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کی کارروائی ماؤنٹ بیٹن کے تحت ہو رہی ہے اور ماؤنٹ بیٹن اب ہر چیز کو ہندوؤں کی نظروں سے دیکھتا ہے۔''

4 رنومبر کو دہلی میں مشترکہ دفاعی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں پاکستانی وفد کی قیادت وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے کی۔ چوہدری محمد علی کہتا ہے کہ میں نے اس کانفرنس کے بعد ہندوستانی لیڈروں سے مسئلہ کشمیر پر بات چیت کے دوران جب یہ مؤقف پیش کیا کہ کشمیر میں

آزادانہ استصواب کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہاں سے ہندوستانی فوج اور قبائلی لشکر دونوں ہی کو نکال لیا جائے تو ماؤنٹ بیٹن اور سردار پٹیل نے اس سے اتفاق کیا لیکن نہرو نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے نہرو سے علیحدگی میں طویل بات چیت کی تو اس پختہ یقین کے ساتھ واپس آیا کہ نہرو نے کشمیر پر جبر وقوت سے تسلط جمائے رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور وہ کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بہترین ضمانت تنازعہ کشمیر کا منصفانہ حل ہے اور یہ بات دونوں ملکوں کے بہترین مفاد میں ہے لیکن اس دلیل کا نہرو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ فقط سیاسی غلبہ اور قوت کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے بار بار کہا کہ امور مملکت میں کسی بھی آزاد خودمختار طاقت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان پر صرف اسی صورت میں بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ اسے کبھی اتنی قوت حاصل نہ ہو جو ہندوستان کے لیے خطرہ کا باعث بن سکے۔ میں نے اسے بتایا کہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے ہندوستان کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ کشمیر اور ہندوستان کے درمیان پہاڑوں کا سلسلہ سد راہ ہے۔ اس کے برعکس کشمیر پر قبضہ کر کے ہندوستان نہ صرف پاکستان کی بلندیوں پر چڑھ بیٹھے گا بلکہ کشمیر سے بہنے والے دریا، جو پاکستان کے لیے آب حیات ہیں ان پر قابو پالے گا۔ نہرو کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا خاندان چونکہ کشمیر سے آیا تھا اس لیے اسے کشمیر سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس بات چیت کے دوران مجھے نہرو کے اس لگاؤ کی کوئی رمق تک نظر نہ آئی۔ اسے مطلق یہ پرواہ نہیں تھی کہ کشمیر کے لیے طویل کشمکش سے کشمیر کے عوام ہی سب سے زیادہ مصیبت اٹھائیں گے۔ اس کے نزدیک اہمیت رکھتی تھی تو فقط یہ بات کہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق سے پاکستان مستحکم ہو جائے گا۔[15] لیکن چوہدری محمد علی نے یہ نہیں بتایا کہ جواہر لال نہرو کے اس سخت مؤقف کی فوری وجہ یہ تھی کہ اسی دن ہندوستانی فوج نے قبائلیوں کو پسپا کر کے نہ صرف بارامولا پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ مزید وسیع علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

12 نومبر کو سردار پٹیل نے اپنی ایک تقریر میں حکومت پاکستان پر الزام عائد کیا کہ وہ بعض ریاستوں کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے راستے میں رکاوٹیں حائل کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے حالانکہ ہم نے اس سلسلے میں پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے 16 نومبر کو سردار پٹیل کے اس بیان کو بے بنیاد قرار دیا اور اس

حقیقت کی نشاندہی کی کہ حکومت ہندوستان نے ایک منصوبے کے تحت ریاست کشمیر پر بزورقوت سامراجی قبضہ کیا ہے۔اس نے کہا کہ ہندوستان کی اس توسیع پسندی کا نتیجہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ جیسا قومی غدار کھلم کھلا دندنا رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی فائدے اور اقتدار کے لیے کشمیری مسلمانوں کی زندگیوں،عزت وآبرو اور آزادی کا سودا کر رہا ہے جبکہ ان کا حقیقی رہنما چوہدری غلام عباس جیل میں سڑ رہا ہے۔لیاقت علی خان نے اپنے اس بیان میں تجویز پیش کی کہ مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کے روبرو پیش کر کے یہ درخواست کی جائے کہ وہ ریاست جموں وکشمیر میں لڑائی بند کرانے اور مسلمانوں پر ظلم وستم ختم کروانے کے لیے اپنے نمائندے مقرر کرے۔ ریاست میں استصواب ہونے تک ایک غیر جانبدارا انتظامیہ قائم کرے اور ریاست کے الحاق کے سوال پر عوام کی آزادانہ رائے معلوم کرنے کے لیے اپنے کنٹرول کے تحت استصواب کرائے۔ لیاقت علی خان نے اسی دن برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی کو بھی ایک تار دیا جس میں برطانوی سامراج سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ پاکستان کی اس تجویز پر عمل درآمد کرانے میں امداد کرے۔تاہم وزیراعظم نہرو نے 21 ؍نومبر کو یہ تجویز مسترد کر دی۔اس نے لیاقت علی کے نام ایک تار میں کہا کہ (1) چونکہ اقوام متحدہ کے پاس کوئی فوج نہیں ہے اس لیے وہ ہندوستانی فوجوں کی متبادل قوت کے طور پر حملہ آوروں کو نکالنے کا کام سرانجام نہیں دے سکتی۔(2) کشمیر کی موجودہ حکومت جانبدار نہیں ہے اور اقوام متحدہ اس کی جگہ کوئی اور انتظامیہ قائم کرنے کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔(3) اور جب تک ریاست کی حدود میں قبائلی حملہ آور موجود ہیں اس وقت تک عوام کی رائے معلوم نہیں کی جاسکتی۔ ہندوستان نے استصواب کرانے کا جو وعدہ کیا ہے وہ حملہ آوروں کے نکل جانے کے بعد پورا کیا جائے گا۔ 22 ؍نومبر کو برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے لیاقت علی خان کے تار کے جواب میں تنازعہ کشمیر کو اقوام متحدہ کے روبرو پیش کرنے کی تجویز کی تائید کی اور مزید لکھا کہ اس سلسلے میں بین الاقوامی عدالت انصاف سے بھی امداد کی استدعا کی جاسکتی ہے۔وزیراعظم لیاقت علی خان نے 24 ؍نومبر کو بذریعہ تار برطانوی وزیراعظم کو مطلع کیا کہ پاکستان تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لیے برطانیہ کی طرف سے پیش کردہ منصوبے کو منظور کرتا ہے۔ اگر اقوام متحدہ کا کمیشن ریاست میں استصواب کرائے تو اس کے ماتحت ایک بین الاقوامی فوج ہونی چاہیے۔ پاکستان کے لیے برطانوی کامن ویلتھ کی مشترکہ فوج بھی قابل قبول ہوگی۔لیکن اگلے ہی دن یعنی 25 ؍نومبر کو وزیراعظم نہرو نے

پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے بین الاقوامی فوج کی نگرانی میں استصواب کرانے کی تجویز کو پھر مسترد کر دیا اور کہا کہ کشمیر اور ہندوستان کے روابط بہت پرانے ہیں۔ گذشتہ چند ہفتوں میں ان روابط میں مزید اضافہ ہوا ہے اور اب انہیں کوئی طاقت منقطع نہیں کر سکتی۔

تاہم وزیر اعظم لیاقت علی خان اپنی علالت کے باوجود 26 رنومبر کو مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے خود دہلی گیا۔ وہاں کئی دن تک دونوں وزرائے اعظم کے درمیان تنازعہ کشمیر پر بات چیت ہوتی رہی جس کے دوران نہرو کا ایک مؤقف یہ تھا کہ اگر اس کی حکومت کشمیر میں مداخلت نہ کرتی تو اس کا تختہ الٹ دیا جاتا اور کوئی غیر ذمہ دار اور انتہا پسند حکومت قائم ہو جاتی جو غالباً پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیتی۔ بالآخر اس بات چیت کے نتیجہ میں...... ماؤنٹ بیٹن کی حکومت برطانیہ کو ارسال کردہ رپورٹ کے مطابق...... ایک بین المملکتی معاہدہ کا مسودہ تیار کیا گیا تھا۔ اس مجوزہ معاہدہ میں کہا گیا تھا کہ (1) پاکستان اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کر کے آزاد کشمیر فوج کو فائر بندی کرنے اور قبائلیوں کو ریاست کی حدود سے نکل جانے کی ترغیب دے گا۔ (2) ہندوستان اپنی بیشتر فوجوں کو واپس بلا لے گا اور وہاں صرف اتنی ہی فوجیں رکھے گا جو بدامنی پر قابو پانے کے لیے ضروری ہوں گی۔ (3) اقوام متحدہ سے درخواست کی جائے گی کہ وہ استصواب کرانے کے لیے اپنا کمیشن بھیجے۔ (4) ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کی حکومتیں ایسے اقدامات کریں گی کہ استصواب بالکل آزادانہ ماحول میں ہو۔ ان اقدامات میں سیاسی قیدیوں کی رہائی اور مہاجرین کی واپسی بھی شامل ہوگی۔ [16]

چونکہ یہ تجاویز پاکستان کے ابتدائی موقف سے مختلف تھیں اس لیے یہ طے ہوا کہ دونوں حکومتیں اس مسودے کو کشمیر میں ان لوگوں کے روبرو پیش کریں گی جن سے ان کے روابط تھے۔ لیکن دہلی سے پاکستانی وفد کی روانگی کے فوراً ہی بعد ہندوستانی کابینہ کی دفاعی کمیٹی کے اجلاس میں وزیر اعظم نہرو نے اعلان کیا کہ اب میں لیاقت علی خان سے استصواب کے بارے میں کبھی بات چیت نہیں کروں گا اور دوسرے وزراء نے بھی اصرار کیا کہ کشمیر میں انتہائی شدید جارحانہ فوجی کاروائی کی جائے۔ ان سب نے مسئلہ کشمیر پر اپنے اس مؤقف کے اس قدر سخت ہو جانے کی وجہ یہ بتائی کہ ان کی اطلاعات کے مطابق ''مغربی پنجاب میں جموں کی سرحد کے نزدیک قبائلیوں اور دوسرے لوگوں کو حملے کے لیے جمع کیا گیا ہے۔ لیاقت علی خان نے دہلی سے

واپسی پر کشمیر میں مزید حملہ آوروں کے داخلے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ پاکستان کشمیر کو کبھی نہیں چھوڑے گا اور قبائلی لٹیرے کشمیر میں غیر مسلموں کا قتل عام کرنے کے علاوہ کشمیری لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں فروخت کر رہے ہیں۔''[17] اس واقعہ کے دو تین دن بعد حکومت پاکستان کی جانب سے بھی ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا گیا کہ اس کے لیے مجوزہ معاہدے کی تجاویز قابل قبول نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں چوہدری محمد علی نے ماؤنٹ بیٹن کے کانفرنس سیکرٹری کو جو خط لکھا اس میں بتایا گیا کہ لیاقت علی خان نے جموں کے علاقے میں لاکھوں مسلمانوں کے قتل عام کی لرزہ خیز خبریں سنی ہیں۔ اس نے یہ بھی سنا ہے کہ سکھوں نے سینکڑوں مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے اپنے کیمپوں میں رکھا ہوا ہے۔ وہ وہاں ننگی پڑی ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ان کی آبرو ریزی کی جا رہی ہے۔''چوہدری محمد علی نے مزید لکھا کہ'' آزاد کشمیر کے لیڈروں نے مجوزہ معاہدہ کو قطعی طور پر مسترد کر دیا ہے۔ وہ کسی ایسے معاہدہ پر غور کرنے کو تیار نہیں جس میں استصواب سے پہلے ہندوستانی فوجوں کی مکمل دستبرداری اور ریاست میں غیر جانبدار انتظامیہ کے قیام کی تجاویز شامل نہ ہوں۔ وہ اپنی ان شرائط کی منظوری کی عدم موجودگی میں لڑائی جاری رکھیں گے۔''[18]

جب 9؍دسمبر کو لاہور میں مشترکہ دفاعی کونسل کا اجلاس ہوا تو فضا بہت کشیدہ تھی۔ دونوں وزرائے اعظم کے درمیان خاصی تلخ کلامی ہوئی جس کے دوران ماؤنٹ بیٹن کو یہ محسوس ہوا کہ برصغیر میں بہت جلد ایک ہمہ گیر جنگ شروع ہو جائے گی۔ وہ برطانوی سامراج کے نقطۂ نگاہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہمہ گیر جنگ کے خلاف تھا۔ اسے خطرہ لاحق تھا کہ اگر ایسی جنگ ہوئی تو کشمیر سمیت سارے برصغیر میں خونریزی، تباہی اور بربادی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا اور سوویت یونین کو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب ملے گی۔ چنانچہ اس نے تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتوں کو اس تنازعہ کے پرامن تصفیے کے لیے مشترکہ طور پر اقوام متحدہ سے درخواست کرنی چاہیے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے یہ تجویز منظور کر لی کیونکہ وہ قبل ازیں برطانوی وزیراعظم کے روبرو اس قسم کی تجویز پیش کر چکا تھا۔ لیکن نہرو نے اس موقعہ پر حسب معمول گول مول سا جواب دیا اور پھر واپس دہلی جا کر اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے 12؍دسمبر کو وزیراعظم لیاقت علی خان کے نام تار میں کہا کہ ہم اس بات پر آمادہ ہیں کہ اقوام متحدہ کے مبصرین کشمیر میں آئیں اور ہمیں مجوزہ استصواب کے بارے میں مشورہ دیں۔

ہماری رائے میں اقوام متحدہ اس کے سوا کوئی اور کردار ادا نہیں کر سکتی۔ ہم کشمیر کے علاقے کو کسی بھی بیرونی ایجنسی کے حوالے نہیں کرینگے۔ ماؤنٹ بیٹن کو نہرو کے اس غیر مصالحانہ رویے پر بہت تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ اس نے کئی دن تک نہرو کو سمجھایا بجھایا تو 20 / دسمبر کو ہندوستان کی کابینہ نے اقوام متحدہ کے روبرو یہ شکایت کرنے کا فیصلہ کیا کہ پاکستان کشمیر میں حملہ آوروں کی امداد کر رہا ہے اسے اس حرکت سے باز رکھا جائے۔ جواہر لال نہرو اقوام متحدہ سے مشترکہ درخواست کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھا۔ 22 / دسمبر کو وزیر اعظم لیاقت علی خان دہلی گیا تو اسے اس شکایت نامے کی ایک نقل مہیا کی گئی اور پھر 26 / دسمبر کو حکومت ہندوستان نے ایک یادداشت میں حکومت پاکستان سے جواب طلب کیا۔

ہوڈسن لکھتا ہے کہ ''دریں اثناء کشمیر میں ہندوستان کی فوجی پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔ جھنگڑ میں ہندوستان کی فوجی چوکی پر ایک حملے میں بہت نقصان ہوا تھا اور اوڑی کی فوجی چوکی کو بھی زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہندوستان کو اوڑی سے دستبردار ہونا پڑا تو حکومت ہندوستان مغربی پنجاب پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرے گی اور اس بناء پر دونوں ملکوں میں بھرپور جنگ شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے 25 / دسمبر کو جواہر لال نہرو کے نام ایک خط میں اپنی تجویز کا اعادہ کیا کہ اقوام متحدہ سے رجوع کر کے جتنی جلدی ممکن ہو سکے فائر بندی کرائی جائے۔ نہرو نے اگلے دن اس خط کا طویل جواب دیا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ''کشمیر پر حملہ محض قبائلیوں کی مذہبی عصبیت کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ پہلے کشمیر پر قبضہ ہوگا۔ پھر پٹیالہ اور مشرقی پنجاب پر اور پھر دہلی پر۔ پورے مغربی پنجاب میں دہلی چلو کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ہم نے اب تک مغربی پنجاب کے فوجی اڈوں پر حملہ کرنے سے گریز کیا ہے کیونکہ ہم ہمہ گیر جنگ نہیں چاہتے۔ ہم کشمیر کو بے انتہا اہمیت دیتے ہیں۔ ہم اس علاقے میں مسلح حملے کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ ہم نتائج کی پرواہ نہیں کریں گے۔ اگر دشمن نے سارے کشمیر پر قبضہ کر لیا تو ہم پھر بھی لڑائی جاری رکھیں گے اور کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ ہم اقوام متحدہ سے رجوع کریں گے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح فوجی تیاریاں کریں گے۔ اگر ہمیں کشمیر میں یا مغربی پنجاب کی سرحد پر کسی اور جگہ بہت خطرہ لاحق ہوا تو ہم پاکستانی علاقے پر حملہ کرنے میں تامل نہیں کریں گے۔'' جب

ماؤنٹ بیٹن کو یہ خط موصول ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ اب کسی بھی لمحے ہمہ گیر جنگ شروع ہو جائے گی اور برصغیر کے بارے میں برطانوی سامراج کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ اس نے فوراً برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی سے رابطہ پیدا کر کے درخواست کی آپ خود فوراً آجائیں اور دونوں وزرائے اعظم سے ملاقات کر کے جنگ کے خطرے کا سدباب کریں۔ مگر ایٹلی نے اس تجویز پر عمل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں عمومی صلح کروانے کے علاوہ کوئی خصوصی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ جواہر لال نہرو نے بھی ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر وزیراعظم ایٹلی کو تار دیا تو اسے فوراً یہ جواب موصول ہوا کہ ذرا احتیاط سے کام لو اور اقوام متحدہ سے رجوع کرو۔[19]

وزیراعظم لیاقت علی خان نے 30ر دسمبر کو حکومت ہندوستان کی 26ر دسمبر کی یادداشت کا جواب دیا جس میں بڑی تفصیل کے ساتھ الزام عائد کیا گیا کہ ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار نوزائیدہ پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی تقسیم کو خلوص دل سے تسلیم نہیں کیا اور وہ اب بھی پاکستان کو ہندوستان کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس منصوبے کی تکمیل کے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ انہوں نے املاک کی تقسیم میں دھاندلی کی ہے۔ پاکستان کے حصہ کا فوجی سامان نہیں دیا ہے۔ نقدی کے واجبات کی ادائیگی سے انکار کیا ہے۔ کوئلہ اور دوسری ضروریات زندگی کی سپلائی بند کر دی ہے۔ جونا گڑھ پر حملہ کیا ہے۔ مشرقی پنجاب میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے۔ اب فریب وتشدد کے ذریعے ریاست جموں و کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے مزید لکھا کہ ''ہندوستان اور پاکستان کے درمیان محض کشمیر پر قبائلیوں کے حملے کی بنا پر تنازعہ پیدا نہیں ہوا بلکہ اس تنازعے کی اصلی بنیاد یہ ہے کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اس نوزائیدہ ریاست کو بلاتاخیر تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے خلاف ان کی ساری معاندانہ کاروائی کا واحد مقصد یہی ہے۔''[20] حکومت ہندوستان نے لیاقت علی خان کے اس مراسلے کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ یکم جنوری 1948ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو ایک عرضی دیدی جس میں یہ درخواست کی گئی کہ حکومت پاکستان کو ہدایت کی جائے کہ (1) وہ اپنے فوجی اور سول عملے کو ریاست جموں و کشمیر پر حملے میں حصہ لینے یا مدد کرنے سے باز رکھے۔ (2) اپنے شہریوں کو ریاست کی لڑائی میں حصہ لینے سے روکے۔ (3) اور حملہ آوروں کی کسی قسم کی امداد واعانت نہ کرے۔

باب: 9

# تنازعہ کشمیراوراینگلوامریکی سامراج

سلامتی کونسل نے ہندوستان کی اس درخواست پر 15/جنوری 1948ء سے غور شروع کیا۔ دو تین ہفتے تک فریقین کی جانب سے بڑی لمبی لمبی تقریریں ہوئیں۔ ہندوستانی نمائندے گوپالاسوامی آئنگر کا موٴقف یہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر نے اپنی ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق برضاورغبت کیا ہے۔ اس کے خلاف پاکستان کی انگیخت پر اور اس کی امداد سے قبائلیوں نے ریاست پر دھاوا کر کے بہت فساد اور خون خرابہ کیا ہے اور ان قبائلیوں کی روک تھام کے لیے ہندوستان کو اپنی فوج بھیجنی پڑی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کشمیر میں جنگ ہو رہی ہے۔ پاکستان قبائلیوں کی ہر طرح سے مدد کر رہا ہے۔ بہت سے پاکستانی فوجی بھی قبائلیوں کے ساتھ ہیں۔ پاکستان کا یہ رویہ بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے۔ اسے ایسی کارروائیوں سے باز رہنے کی ہدایت کی جائے۔ پاکستان قبائلیوں کی مدد بند کرے اور انہیں واپس جانے پر آمادہ کرے۔ آئنگر نے ریاست کے الحاق کے بارے میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جہاں فرمانروائے ریاست ایک مذہب کا ہو اور رعایا کی اکثریت دوسرے مذہب کی ہو وہاں فرمانروا کا فرض ہے کہ وہ الحاق کا فیصلہ رعایا کی کثرت رائے کے مطابق کرے۔ ہندوستان اس اصول پر پختگی سے کاربند ہے۔ جب ریاست میں امن وامان بحال ہو جائے گا تو ہم کشمیر کی رعایا کی منشاء کے مطابق معاملے میں آخری فیصلہ کریں گے۔

پاکستان کے نمائندہ ظفراللہ خان نے اپنی سہ روزہ تقریر میں ان سارے الزامات کا اعادہ کیا جو وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنے 30/ستمبر کے مراسلے میں عائد کیے تھے۔ اس نے کہا کہ ہندوستان نے ریاست جموں وکشمیر پر بزورقوت قبضہ کرنے کی جو کارروائی کی ہے وہ

دراصل پاکستان کی نوزائیدہ ریاست کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبہ کا ایک حصہ ہے اور اس نے ریاست میں استصواب کرانے کا جو وعدہ کیا ہے وہ محض ایک فریب ہے۔ اگر خدانخواستہ ریاست پر ہندوستان کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو یہ اپنے استصواب کے وعدے سے منحرف ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں کرے گا۔ ظفر اللہ خان نے قائداعظم جناح کی جانب سے یکم نومبر 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے دوران پیش کردہ تجویز کے مطابق مطالبہ کیا کہ (1) سلامتی کونسل کو ایک کمیشن مقرر کرنا چاہیے۔ جو کشمیر میں جنگ بندی کا انتظام کرے۔ (2) کشمیر سے ساری فوجیں خواہ ہندوستان سے آئی ہوں یا پاکستان سے، نکال لی جائیں۔ (3) کشمیر میں غیر جانبدار انتظامیہ قائم کی جائے اور پھر (4) کشمیری عوام کی منشا معلوم کرنے کے لیے آزادانہ منصفانہ استصواب کرایا جائے۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی فوجوں اور قبائلیوں کے علاوہ مسلح مجوزہ سکھ جتھوں راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضا کاروں اور دوسرے سارے بیرونی عناصر کو کشمیر سے نکل جانا چاہیے جو وہاں مسلمانوں کی نسل کشی کر رہے ہیں اور پھر وہاں یا تو دونوں گورنر جنرلوں کی مشترکہ نگرانی میں مخلوط انتظامیہ قائم کرنی چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہاں سے سارے بیرونی عناصر کو نکال کر کامن ویلتھ یا اقوام متحدہ کی افواج کی نگرانی میں غیر جانبدار انتظامیہ کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ اس نے مزید مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو ہدایت کی جائے کہ وہ پاکستان کے خلاف جارحانہ اقدامات کرنے سے باز رہے اور ان معاہدوں کی پابندی کرے جو اس نے پاکستان سے کر رکھے ہیں۔ مزید براں پاکستان نے ہندوستان کے خلاف مسلمانوں کی نسل کشی کرنے اور نوزائیدہ پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کی کوششیں کرنے کے جو الزامات عائد کیے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ 1934ء تک ریاست کشمیر میں کسی شخص کا اپنی گائے ذبح کرنا نہ صرف جرم تھا بلکہ اس قدر سنگین جرم تھا کہ اس کی سزا عمر قید تھی۔ 1934ء میں اس سزا میں تخفیف ہوئی لیکن اب بھی اس جرم کی سزا غالباً سات سال قید بامشقت ہے۔

سلامتی کونسل نے فریقین کے مؤقف کی سماعت کرنے کے بعد 20/جنوری 1948ء کو بذریعہ قرارداد تین ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جو دونوں حکومتوں کی شکایات کی تحقیقات کرنے کے لیے جلد از جلد موقع پر جائے گا اور مصالحانہ اثر و رسوخ سے مشکلات دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ نو ممالک نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیے لیکن سوویت یونین

اور یوکرین نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔اس بے ضرر سی قرارداد کی منظوری کے بعد اس پر فوری طور پر کوئی عمل نہ ہوا البتہ سلامتی کونسل میں بحث جاری رہی۔ ہندوستان کی تجویز یہ تھی کہ "(1) کشمیر میں فوراً جنگ بندی کی جائے اور قبائلیوں اور پاکستانی شہریوں کو ریاست کی حدود سے باہر نکالا جائے۔(2) امن وامان بحال ہونے کے بعد مہاجرین اپنے گھروں کو واپس آئیں۔نظم ونسق بہر صورت برقرار رکھا جائے اور ریاست کی سلامتی کا تعین کیا جائے۔ ہندوستان وہاں اپنی فوجوں میں کمی کر دے گا اور وہ صرف اتنی فوجیں رکھے گا جو بیرونی سلامتی اور اندرونی امن وامان قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوں گی۔(3) شیخ عبداللہ ریاست کا وزیر اعظم رہے گا۔(4) اقوام متحدہ کے کمیشن کو فوراً موقع پر جا کر جنگ بندی کا انتظام کرنا چاہیے۔(5) جنگ بندی کے بعد وہاں قومی اسمبلی کا انتخاب ہوگا۔(6) پھر ایک قومی حکومت قائم کی جائے گی جو اقوام متحدہ کے کمیشن کے مطابق استصواب کرائے گی۔" پاکستان کی تجویز یہ تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی حیثیت محض ایک مشاورتی وفد کی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کمیشن کو اختیار دینا چاہیے کہ وہ (1) ریاست میں ایک غیر جانبدار عبوری انتظامیہ حکومت قائم کرے۔ (2) کشمیر سے سارے فوجیوں کی واپسی کا انتظام کرے۔(3) مہاجرین کی واپسی کا انتظام کرے۔(4) اور پھر وہاں آزاد اور منصفانہ استصواب کرائے۔

تقریباً دو ہفتے کی بحث کے بعد سلامتی کونسل کے صدر نے ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس میں پاکستان کے مؤقف کو تسلیم کیا گیا تھا۔قرارداد میں تجویز کیا گیا تھا کہ (1) کشمیر سے ساری بیرونی فوجیں واپس بلالی جائیں (2) ایک غیر جانبدار انتظامیہ قائم کی جائے (3) اور پھر اقوام متحدہ کی زیر نگرانی استصواب کرایا جائے۔امریکہ اور برطانیہ کے مندوبین نے اس قرارداد کی پر زور حمایت کی اور اس بنا پر سب کو یقین ہو گیا کہ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہو جائے گی۔ سوویت یونین کے متعلق خیال تھا کہ وہ یا تو اس قرارداد کے حق میں ووٹ ڈالے گا یا حسب سابق غیر جانبدار رہے گا لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی کیونکہ اس قرارداد پر رائے شماری سے پہلے 8رفروری کو ہندوستانی مندوب سرگوپالا سوامی آئنگر کی درخواست پر سلامتی کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ حکومت ہندوستان نے التوا کا مطالبہ محض اس لیے کیا تھا کہ مجوزہ قرارداد اس کے خلاف تھی اور وہ ماؤنٹ بیٹن کی وساطت سے برطانوی سامراج کے پاکستان نواز رویے میں تبدیلی لانے کی

کوشش کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اسے اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور برطانوی سامراج حکومت پاکستان کے شدید احتجاج کے باوجود اپنے 8رفروری کے ''پاکستان نواز'' مؤقف سے منحرف ہو گیا۔ 8رمارچ 1948ءکو سلامتی کونسل کا اجلاس پھر شروع ہوا تو سماں بدلا ہوا تھا۔ کئی ہفتے تک مندوبین کے درمیان مشورے ہوتے رہے اور بالآخر 21راپریل کو ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ ''پانچ ارکان کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو برصغیر جا کر فریقین کے مشورے اور ان کی رضامندی کے ساتھ کشمیر کے عوام کی آزادانہ رائے شماری کا اہتمام کرے۔ حکومت پاکستان کو کشمیر سے قبائلیوں اور پاکستانی شہریوں کی واپسی کا بندوبست کرنا چاہیے اور حکومت ہندوستان کو وہاں صرف اتنی ہی فوجیں رکھنی چاہیں جو نظم ونسق برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوں۔ ریاست میں سارے سیاسی گروپوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مخلوط حکومت قائم ہونی چاہیے اور استصواب منعقد کرانے کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے۔ مہاجرین کی واپسی، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور سیاسی سرگرمیوں کی آزادی کے لیے بھی مناسب اقدام کیے جائیں۔''

چونکہ یہ قرارداد برطانوی سامراج اور ہندوستان کے توسیع پسندوں کی ملی بھگت کی بنا پر منظور ہوئی تھی اس لیے پاکستان میں اس پر سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا۔ عوام الناس اور اخبارات کا پرزور مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کو برطانوی کامن ویلتھ سے الگ ہونا چاہیے۔ حکومت پاکستان نے اس عوامی مطالبے پر عمل نہ کرنا تھا اور نہ کیا۔ البتہ وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے نیو یارک میں سوویت یونین کے مندوب سے رابطہ پیدا کر کے اسے مطلع کیا کہ پاکستان اس کے ملک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے پر آمادہ ہے اور چند دنوں کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کرنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا گیا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے اس سفارتی کاروائی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ فی الحقیقت سوویت یونین سے دوستی کی خواہاں تھی بلکہ اس طریقے سے وہ محض برطانوی سامراج پر سفارتی دباؤ ڈالنا چاہتی تھی۔ قبل ازیں ظفر اللہ خان نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے نام ایک خفیہ تار بھی بھیجا تھا جس میں نیو یارک کے باخبر حلقوں کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کشمیر میں بہت بڑے فوجی حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کے وہاں پہنچنے سے پہلے ریاست کے بیشتر علاقے پر اس کا قبضہ ہو جائے۔ تار میں مزید کہا گیا تھا کہ ''کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا نیو یارک میں نہیں ہو

گا۔لہٰذا ہندوستان کے متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کی باقاعدہ فوج کو کشمیر کے محاذ پر بھیج دیا جائے۔''[1]

وزیراعظم لیاقت علی خان نے یہ تار ملنے پر جنرل سر ڈگلس گریسی جو سر فرینک میسروی کی جگہ 11رفروری1948ءکو پاکستان کا کمانڈر انچیف مقرر ہو چکا تھا، کو ہدایت کی کہ وہ کشمیر کے محاذ کے متعلق موجودہ حالت کی رپورٹ پیش کرے۔ گریسی نے 20راپریل کو مطلوبہ رپورٹ پیش کی جس میں بتایا گیا تھا کہ ''ہندوستان عنقریب ایک بڑا حملہ کرنے والا ہے۔ اگر ہندوستانی فوج کو اوڑی، پونچھ اور نوشہرہ لائن پر نہ روکا گیا تو مزید لاکھوں مہاجرین پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے، ہندوستان کی فوجیں پاکستان کی دہلیز تک آ پہنچیں گی، پاکستان کے شہریوں اور فوجیوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور اندرون ملک تخریب کاروں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔''[2] یہ وہی گریسی تھا جس نے 27راکتوبر کو قائداعظم کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی تھی کہ کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے پاکستان کی باقاعدہ فوج کو بھیجا جائے۔ اب اس کے رویے میں تبدیلی کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک برطانیہ کی لیبر حکومت میں وزیر خارجہ بیون کی زیر سرکردگی ایک بااثر لابی وجود میں آ گئی تھی جس کا خیال تھا کہ نوزائیدہ پاکستان کو تباہ و برباد ہونے سے بچانا چاہیے کیونکہ جاگیرداروں کی یہ اسلامی ریاست مشرق وسطیٰ میں سامراجی فوجی گٹھ جوڑ کی تشکیل میں مدومعاون ثابت ہو سکے گی۔ سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک، کامن ویلتھ وزیر فلپ نوئیل بیکر، سر اولف کیرو اور جنرل سر فرانسس ٹکر جیسے عناصر بھی اس رائے کے حامل تھے۔ مزید براں قیام پاکستان کے بعد آٹھ ماہ کے اندر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ چونکہ اس ملک میں اناج اور دوسری اجناس کی فراوانی ہے اس لیے اس کا معاشی انہدام نہیں ہوگا۔ حسب توقع حکومت پاکستان نے اس رپورٹ پر بلا تاخیر عمل کیا اور پاکستان کی باقاعدہ فوج کے بعض یونٹ اپریل کے اواخر میں کشمیر کے محاذ پر پہنچ گئے۔ تاہم انہیں چوہدری محمد علی کے بیان کے مطابق دفاعی لڑائی کا حکم دیا گیا تھا اور انہیں ہوائی فوج کی امداد بھی مہیا نہیں کی گئی تھی۔ اسے ہدایت محض یہ تھی کہ ''ہندوستان کو بزور قوت اپنے مقاصد میں فیصلہ کروانے سے روکا جائے۔'' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان نے جب موسم گرما میں بڑا حملہ کیا تو اس نے مینڈھر اور کارگل کے وسیع و عریض علاقے پر بآسانی قبضہ کر لیا۔ ہندوستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق ''اس موقع پر حکومت

پاکستان نے اپنی ہوائی فوج محض اس لیے استعمال نہیں کی تھی کہ وزیراعظم ایٹلی کی حکومت نے یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ اپنے برطانوی فوجی افسروں کو واپس بلالے گی۔

اقوام متحدہ کے کمیشن نے جنیوا میں اپنا ابتدائی اجلاس منعقد کرنے کے لیے تقریباً دو مہینے گزار دیئے اور پھر وہ 6/ جولائی 1948ء کو برصغیر پہنچا۔ یہاں اس نے تقریباً ایک ماہ تک دونوں ملکوں کے اعلیٰ ارباب اقتدار سے گفت وشنید کی۔ کمیشن کے ایک رکن جوزف کوربل کے بیان کے مطابق ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اس سے ایک ملاقات کے دوران پاکستان کے وجود کے جواز کو ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نہرو نے کہا کہ ''ہم ہمیشہ متحدہ ہندوستان کے حق میں رہے ہیں۔ ہم نے تقسیم محض اس لیے قبول کی تھی کہ اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ قدرتی طور پر ہمارا پاکستان کے ساتھ بہت گہرا تعاون ہونا چاہیے۔ ہم پاکستان سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اور اس تعاون کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن ان دونوں ملکوں کا ناگزیر طور پر ادغام ہو جائے گا۔ مجھے معلوم نہیں ایسا کب ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہونے میں چار، پانچ، دس سال لگ جائیں۔'' نہرو نے مزید کہا کہ ''برصغیر کی تقسیم کا پس منظر معاشی ہے۔ ہم ہندوستانیوں نے ہمیشہ سیاسی آزادی اور معاشرتی ترقی کا پرچار کیا ہے۔ پہلے ہمیں برطانیہ کے غلبے سے نجات حاصل کرنا پڑی اور اب ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم معاشی خوشحالی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشش کریں۔ کچھ لوگ اس پالیسی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چونکہ کوئی شخص کسی قوم کی آزادی اور عوام الناس کی خوشحالی کے راستے میں اعلانیہ طور پر حائل نہیں ہوسکتا اس لیے ان لوگوں کو اپنی مراعات کے تحفظ کے لیے دوسرے دلائل ڈھونڈنے پڑے۔ لہٰذا انہوں نے مذہب کو استعمال کیا۔ درحقیقت یہ تنازعہ مذاہب کے درمیان نہیں ہے۔ ہم نے سب لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ علاوہ بریں ملک کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ اب بھی ہندوستان میں تقریباً 42 ملین مسلمان رہائش پذیر ہیں۔ یہ کشمکش امراء کے گروہ اور آزادی و ترقی کے درمیان ہے۔ جناح نے 30 سال قبل ہم سے الگ ہو کر جب لیگ قائم کی تھی تو اس نے ایسا اسلام کے تحفظ کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اس نے یہ اقدام مادی مراعات وحقوق کے تحفظ کے لیے کیا تھا۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ خود بھی مذہبی آدمی نہیں ہے۔ ہم پاکستان کے قیام پر محض اس لیے رضامند ہوئے تھے کیونکہ ان دنوں ہماری آزادی کی جدوجہد میں اس مسئلہ کا اس کے سوا

اور کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ آج کل پاکستان ایک اسلامی جاگیردارانہ ریاست بن رہا ہے۔ پسماندہ، رجعتی، معاشی لحاظ سے کمزور اور انتظامی طور پر غیر مستحکم ہے۔ اس کی فوج کی قیادت برطانوی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ برطانوی افسر چلے جائیں تو پاکستانی فوج کا کوئی وجود نہیں رہے گا۔ ہمارے پاس بھی چند برطانوی افسر ہیں لیکن ہمارے لوگ رفتہ رفتہ سارے کام خود سنبھال رہے ہیں۔ یہ ہے پس منظر پاکستان کے ساتھ ہمارے اختلافات کا اور کشمیر پر اسی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر کشمیر پر پاکستان کی حمایت سے قبائلی حملہ آور نہ ہوتے اور وہ وہاں لوٹ مار اور قتل وغارت نہ کرتے تو ہمیں وہاں اپنی فوج بھیجنے کا کبھی خیال نہ آتا۔ قبائلیوں کے حملہ سے ملک کے دوسرے حصوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ وہ جب پیش قدمی کرتے تھے تو یہ نعرے لگاتے تھے کہ ہم دہلی کی طرف جا رہے ہیں۔'' جوزف کوربل کہتا ہے کہ جب میں نے نہرو سے کہا کہ آپ کی قیادت ولولہ انگیز ہے آپ کو پاکستان سے کچھ رعایت کرنی چاہیے تو وہ بہت برہم ہوا اور اس نے تلخ لہجے میں کہا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی پوزیشن اور اپنے حقوق کو نہیں سمجھتے۔ ہماری ریاست سیکولر ہے اور اس کی بنیاد مذہب پر نہیں ہے۔ ہم ہر ایک کو ضمیر کی آزادی دیتے ہیں۔ پاکستان ایک قرون وسطیٰ کی ریاست ہے اور اس کا ملائیت کا نظریہ ناقابل عمل ہے۔ یہ ریاست کبھی قائم نہیں ہونی چاہیے تھی اور اگر برطانیہ جناح کے اس احمقانہ نظریے کی پشت پناہی نہ کرتا تو یہ کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔'' جوزف کوربل مزید لکھتا ہے کہ ''نہرو نے اس ملاقات کے دوران پہلی مرتبہ استصواب کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کر کے کشمیر کی تقسیم کا تصور پیش کیا تھا اور اس نے بعد میں کمیشن کے ایک رکن کو ایک نقشہ دکھایا تھا جس میں ہندوستان کی سرحد مغرب میں دور تک پاکستان کی جانب تھی۔ اس میں پوری وادی کشمیر اور صوبہ جموں کا مغربی علاقہ بھی شامل تھا۔''[3]

کمیشن نے چند دن بعد کراچی پہنچ کر جب پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کو بتایا کہ ہندوستان کشمیر کی تقسیم پر آمادگی ظاہر کر رہا ہے تو اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ پاکستان کشمیر کی تقسیم کو کسی صورت میں قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس طرح ہندوستان کی سرحدوں میں مزید توسیع ہوگی اور پاکستان کے وجود کو مزید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ جب جوزف کوربل نے پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد سے کشمیر کی تقسیم کی بات کی تو اس نے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات پر طویل تبصرہ کیا۔ اس نے کہا کہ ''میں 30 سال تک نہرو کا دوست رہا ہوں اور میں نے

اس کے ساتھ مل کر برطانیہ کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ اب ہم آزاد ہیں اور ہمارے اپنے آزاد ممالک ہیں۔ لیکن نہرو پاکستان کے وجود سے نفرت کرتا ہے اور وہ ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا کرسکتا ہے۔ اس کے پاس فوج ہے اور اسلحہ بھی ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ کراچی پر دھاوا بول سکتا ہے۔ وہ میرے گھر میں آ کر میرے سینے پر چھرا گھونپ سکتا ہے۔ لیکن میں مر جاؤں گا۔ کبھی گھٹنے نہیں ٹیکوں گا اور جس عظیم نظریے کے لیے میں زندہ رہا ہوں وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ ہم اپنے کشمیر کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔'' غلام محمد نے ایک اور موقعہ پر کہا کہ ''ریاست جموں وکشمیر کی ایسی کوئی تجویز قابل قبول نہیں ہوگی جس میں ہندوستان کو مشرقی جموں سے زیادہ علاقہ دیا جائے گا۔ چونکہ ریاست کے دوسرے سارے علاقوں میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے اس لیے انہیں پاکستان میں شامل کرنا ہی پڑے گا۔''[4]

کمیشن تقریباً چار ہفتے تک دونوں حکومتوں کے متضاد نظریات اور خیالات کی سماعت کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے درمیان براہ راست گفت وشنید کے ذریعے تصفیے کی گنجائش نہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی نیتوں کے بارے میں شدید شبہات ہیں۔ دہلی میں پاکستان کے لیے کھلم کھلا نفرت وحقارت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ نہرو اس ریاست کے وجود کو قبول کرنے میں بڑی مشکل محسوس کر رہا ہے اور کراچی میں ہندوستان کی کسی بھی حرکت پر بھروسہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لیے خیرسگالی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ کمیشن نے ان حقائق کو پیش نظر رکھ کر 13 راگست 1948ء کو اس مضمون کی ایک قرارداد منظور کی کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اس قرارداد کی منظوری کے بعد چار دن کے اندر جنگ بندی کا حکم جاری کریں گی اور کمیشن اس جنگ بندی کی نگرانی کے لیے فوجی مبصرین مقرر کرے گا۔ دونوں میں عارضی معاہدۂ امن کے لیے پاکستان ریاست کی حدود میں سے اپنی ساری فوجیں واپس بلا لے گا۔ سارے قبائلی اور پاکستانی رضا کار ریاست سے نکل جائیں گے۔ جن علاقوں کو پاکستانی فوجیں خالی کریں گی ان کا نظم ونسق مقامی ارباب اختیار کمیشن کی نگرانی میں چلائیں گے۔ جب کمیشن حکومت ہندوستان کو مطلع کرے گا کہ پاکستانی فوجیں، قبائلی اور پاکستانی رضا کار ریاست کی حدود سے نکل گئے ہیں تو وہ کشمیر سے اپنی فوجوں کا کثیر حصہ نکالنا شروع کر دے گی اور ریاست میں صرف اتنی ہی فوج رکھے گی جو امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوں گی۔ دونوں حکومتیں

ایک مرتبہ پھر اقرار کریں گی کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے ہوگا اور یہ استصواب منصفانہ طریقے سے کرنے کے لیے دونوں حکومتیں اور کمیشن بات چیت کریں گے۔ ''چونکہ یہ قرارداد اس بین المملکتی معاہدے کے مسودے کے مطابق تھی جو وزیراعظم جواہر لال نہرو نے دسمبر کے اوائل میں وزیراعظم لیاقت علی خان کو پیش کیا تھا اس لیے حکومت ہندوستان نے 20ر اگست کو بلا تامل اس کی منظوری دے دی۔ لیکن حکومت پاکستان نے حسب توقع 6ر ستمبر کو اسے مسترد کر دیا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ اگر جنگ بند ہوگئی تو ہندوستان کشمیر کی تقسیم پر اس لیے مطمئن ہو جائے گا کہ اس کا زیادہ تر علاقہ اس کے قبضہ میں ہوگا اور پھر جب صورت حال اس کے حق میں مستحکم ہو جائے گی تو وہ آزاد استصواب کے راستے میں رکاوٹ حائل کرے گا۔

تاہم کمیشن اپنے مشن کی ناکامی کے فوراً بعد برصغیر سے روانہ نہ ہوا بلکہ اس کے ارکان چند دن کے لیے سری نگر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ شہر اجڑا سا ہے۔ دکانیں خالی ہیں اور کوئی کاروبار نہیں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر اداسی طاری ہے۔ متعدد لوگوں نے پوشیدہ طور پر کمیشن کے ارکان سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کرکے رو رو کر التجائیں کیں کہ انہیں سیاسی دہشت گردی، رشوت ستانی اور دوسری بہت سی بدعنوانیوں سے نجات دلائی جائے۔ بہت سی عورتوں، نوجوان تنظیموں اور گمنام افراد کے خطوط بھی آئے۔ ان سب کی استدعا تھی کہ انہیں آزادانہ طور پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔ جوزف کوربل لکھتا ہے کہ ''ایک دن حکومت نے ہمارے لیے بارامولا کے دورے کا انتظام کیا۔ جہاں قبائلیوں نے بہت تباہی مچائی تھی۔ راستے میں ایک جگہ ہمارے لیے ایک جلسے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ وہاں ایک شخص نے تقریر کی اور بعض لوگوں نے بڑی نیم دلی سے شیخ عبداللہ اور ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں نعرے لگائے۔ اس کارروائی کے دوران ایک نوجوان یکا یک پولیس کے گھیرے کو توڑ کر ہمارے سامنے آ گیا اور اس نے انگریزی میں چلا کر کہا ''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ ہم پر ظلم وستم کرتے ہیں۔ پولیس نے اسے فوراً پکڑ لیا اور پھر اسے گھسیٹ کر دور لے گئی لیکن وہ اس دوران ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتا رہا۔'' جوزف کوربل مزید لکھتا ہے کہ ''ایک دن جب میں نے شیخ عبداللہ سے ملاقات کی تو وہ استصواب کرانے کے بارے میں پرامید نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تنازعہ کشمیر کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ ریاست کو تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ

کیا گیا تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائی جاری رہے گی۔ یہ تنازعہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور ہمارے عوام مصائب میں مبتلا رہیں گے۔"[5]

کمیشن کے ارکان 21ر ستمبر 1948ء کو جنیوا روانہ ہو گئے۔ وہاں انہوں نے اپنی ناکامی کی رپورٹ لکھی اور پھر وہ اکتوبر میں پیرس آ گئے جہاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا تھا۔ پیرس میں کمیشن نے ہندوستان اور پاکستان کے مندوبین سے بات چیت کا پھر سلسلہ شروع کر دیا جو تقریباً دو ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر کمیشن نے دسمبر 1948ء کے اواخر میں ایک قرارداد مرتب کی۔ (اگرچہ دونوں حکومتوں نے یہ قرارداد دسمبر 1948ء کے اواخر میں منظور کر لی تھی لیکن اس پر تاریخ 5ر جنوری 1949ء کی ڈالی گئی تھی کیونکہ سلامتی کونسل نے اس تاریخ کو اس کی رسمی منظوری دی تھی)۔ جس میں یقین دلایا گیا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ آزادانہ غیر جانبدارانہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے ہی ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ایک اعلیٰ پایہ کی شخصیت کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے۔ اگرچہ اس ایڈمنسٹریٹر کا تقرر رسمی طور پر حکومت کشمیر کرے گی لیکن اُسے آزادانہ استصواب کرنے کے لیے ضروری اختیارات حاصل ہوں گے۔ جنگ اور عارضی معاہدۂ امن کے بعد کمیشن اور ایڈمنسٹریٹر حکومت ہندوستان اور آزاد اتھارٹیز (حکومت آزاد کشمیر) سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کریں گے کہ ریاست میں ہندوستانی فوجوں اور آزاد فوجوں کی تعداد کتنی رہے گی۔ یہ قرارداد جو دراصل 13ر اگست کی قرارداد کا نتیجہ تھی قدرے پس و پیش کے بعد دونوں حکومتوں نے منظور کر لی اور پھر اس کے مطابق یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی ہو گئی۔

جب دونوں حکومتوں کی جانب سے اس فیصلے کا اعلان کیا گیا تو پورے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پنجاب میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف نفرت کی جو آگ سلگ رہی تھی وہ یکا یک بھڑکنے لگی۔ جگہ جگہ جلسے اور مظاہرے ہوئے جن میں لیاقت علی خان اور اس کی حکومت کی پرزور مذمت کی گئی۔ پنجاب کے عوام کا تاثر تھا کہ لیاقت علی خان برطانوی سامراج کے دباؤ کے تحت پاکستان اور کشمیر کے عوام سے "غداری" کا مرتکب ہوا ہے۔ اس تاثر کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ ہندوستان اس وقت تک کشمیر کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس نے پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی

امداد سے پونچھ شہر کا محاصرہ اٹھوالیا تھا اور نوشہرہ کا اس سے رابطہ قائم کرلیا تھا اس نے نومبر 1948ء میں ایک بڑا حملہ کر کے مینڈھر اور کارگل کے وسیع علاقے پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ اب پاکستان کے پاس چند بنجر اور پتھریلی پہاڑیوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہا تھا اور تحصیل مینڈھر سے مزید ہزاروں مہاجرین پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پنجاب کے عوام کو یہ بھی معلوم تھا کہ پاکستان کی فوج نے دسمبر میں پہلی مرتبہ جوابی کاروائی کر کے ہندوستان کے سلسلۂ مواصلات کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ بیری پتن کے پل پر پہلی مرتبہ بمباری کی گئی تھی اور اس کے نزدیک ہندوستان کا گولہ بارود کا ذخیرہ تباہ کر دیا گیا۔ چنانچہ نہرو کی منظوری کے ساتھ کمانڈر انچیف جنرل بچر نے 30 دسمبر کو پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو جنگ بندی کے لیے کہا تھا۔ جنرل گریسی نے اس تجویز کی حمایت کی تھی اور حکومت پاکستان نے اسے منظور کرلیا تھا۔ پنجاب کے عوام اور فوج کو صحیح یا غلط طور پر یقین تھا کہ اگر ہندوستان کے خلاف اس قسم کی مؤثر جوابی کاروائی جاری رہتی تو کشمیر کی جنگ کا پانسہ پاکستان کے حق میں پلٹ جاتا۔ قبل ازیں ہندوستان کو محض اس لیے فتوحات حاصل ہوئی تھیں کہ پاکستانی فوج کو محض مدافعتی کاروائی کرنے کا حکم تھا۔ اسے جوابی حملہ کرنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی اسے ہوائی فوج کی امداد حاصل تھی کیونکہ بری فوج اور پاکستانی اعلیٰ سول اور فوجی افسروں کے مشورے کی بنیاد پر حکومت پاکستان کی رائے یہ تھی کہ اس طرح دونوں ملک کلی طور پر جنگ میں الجھ جائیں گے۔

میجر جنرل فضل مقیم لکھتا ہے کہ 14 دسمبر 1949ء کی سہ پہر کو بیری پتن کے پل پر پاکستانی فوج کی گولہ باری سے دشمن کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اس پل کے چاروں طرف تقریباً دو میل تک ہندوستانی فوج کے راشن، پٹرول، کپڑے اور گولہ بارود کے ذخیرے تھے۔ ہماری گولہ باری سے ان میں آگ لگ گئی جس کا دھواں 20 میل سے نظر آتا تھا۔ خود پل کو بھی بہت نقصان پہنچا۔ نوشہرہ پر ہندوستانی ڈویژن کے ہیڈکوارٹرز میں اینٹی ائر کرافٹ توپوں کے گولوں سے دہشت اور ابتری پھیل گئی۔ پل کے شمال میں جو ہندوستانی سپاہ تھی اور جس کا دارومدار اس سڑک پر تھا وہ اپنی عام رسد اور گاڑیوں وغیرہ سے محروم ہو گئی۔ ہندوستان سے نئی نئی آئی ہوئی ایک بٹالین کو کالی دھر سے پتن کی طرف بڑھنے کے دوران پاکستان فرنٹیئر فورس رائفلز والوں نے بری طرح نقصان پہنچایا...... اس گولہ باری سے ہندوستانی بری طرح کلبلائے۔ انہیں یہ بالکل توقع نہ تھی کہ اس

علاقے میں توپیں پہنچا کر فائر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے لیے صورت حال بہت خطرناک ہوگئی۔ اس طرح جب پہلی دفعہ باقاعدہ منصوبہ بنا کر جوابی حملہ کیا گیا تو ہندوستان نے گھٹنے ٹیک دیئے اور بہت جلد جنگ بندی کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن پاکستانی فوج ششدر رہ گئی کہ عین اس وقت جب پاکستان کو کشمیر میں سب سے نمایاں کامیابی ہو رہی تھی وہ جنگ بندی منظور کرنے پر فوراً آمادہ ہو گیا۔ اس طرح یکم جنوری 1949ء کی رات کے بارہ بجے کشمیر کی جنگ بند ہوگئی اور اقوام متحدہ نے کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا...... یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ پاکستان نے اس سنہری موقع کو اتنی آسانی سے کیوں ہاتھ سے جانے دیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ پاکستان کمزور ہے یا پھر کسی دباؤ کی وجہ سے ایسا کیا گیا یا یہ کہ ایک مصیبت زدہ مخالف ہمسائے کی ہمدردی کی خاطر بے محل بہادری کا جذبہ کارفرما تھا۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو کشمیر میں جنگ جاری نہ رکھنے کی خواہش کا یہ نتیجہ ہوا کہ پاکستان کے ہاتھ سے کشمیر جاتا رہا۔ پاکستان کے لیے اس وقت ہر حال میں یہ خطرہ مول لینا ہی مناسب تھا۔ اس وقت شمال میں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے لیکر جنوب کی پہاڑیوں اور وادیوں تک ہندوستان کی بہترین فوج بہت ابتری کی حالت میں بکھری ہوئی تھی اور پورے کشمیر میں بیکار ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی فوج وہاں بری طرح پھنسی ہوئی تھی اور اس سے مفر آسان نہ تھا۔" فضل مقیم کا مزید بیان یہ ہے کہ "ہندوستانی فوج کے مقابلے میں پاکستانی فوج کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اس نے جو کارنامے سرانجام دیئے ان کی نہ تو کوئی شہرت ہوئی اور نہ ہی کسی نے انہیں سراہا۔ ابتدائی مرحلوں میں اسے توپ خانے کی امداد اور فوجی بندوبست سے محروم رکھا گیا۔ اس کی پشت پر ہوائی جہاز نہیں تھے۔ ان سب اہم باتوں کے باوجود پاکستانی جوان مطلق پریشان نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کرنے گیا تھا جو اس نے ان تکلیف دہ حالات میں انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہا۔ اسے وہاں ایک محدود اور محض دفاعی مقصد سے بھیجا گیا تھا لیکن اس نے کبھی کوئی شکایت کی بھی تو وہ اپنی بے عملی اور جمود کی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک ڈویژنل کمانڈر نے بتایا کہ کشمیر میں چھ ماہ کے قیام میں انہیں اپنے افسروں اور جوانوں سے صرف ایک ہی شکایت موصول ہوئی اور وہ یہ کہ "ہم آگے کب بڑھیں گے" ......وزیراعظم لیاقت علی خان کو بھی اس بات کا علم تھا۔ جنگ بندی کے بعد جب وہ پہلی بار کشمیر گئے تو انہوں نے جوانوں سے بات

چیت کے دوران متعدد بار اس سلسلے میں حکومت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ 27/جنوری 1949ء کو چناری کے مقام پر جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ''اگر آپ کو جارحانہ اقدام سے نہ روکا جاتا تو ممکن ہے کہ آپ زیادہ علاقے پر قابض ہو جاتے لیکن پاکستان محض دفاعی پالیسی پر عمل کرتا رہا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ توپوں کے ذریعے کیا جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ کشمیری عوام اپنی قسمت کا فیصلہ ایک پر امن اور آزاد استصواب رائے سے کر سکیں۔'' وہیں ایک اور تقریر کے دوران اس نے ایسے ہی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ ''غالباً آپ میں سے کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کی سرگرمیوں کو نہ روکا جاتا تو شاید آج نقشہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن ہمارا یہ طرز عمل اس لیے رہا ہے کہ ہم یہ منوانے کے لیے کوشاں ہیں کہ کشمیری اپنی قسمت اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کرینگے۔''[6]

لارڈ برڈووڈ بیری پتن کے پل پر پاکستانی فوج کی کامیاب گولہ باری اور پھر اس کے دو ہفتے بعد جنگ بندی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 15/نومبر کو پونچھ شہر کا محاصرہ ٹوٹنے کے بعد پاکستانی فوجی حکام نے اس شہر پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس مقصد کے لیے لاہور کے محاذ سے فوجیں ہٹا کر انہیں جہلم اور گجرات کے علاقے میں مجتمع کر دیا گیا تھا۔ یہ حملہ 8/دسمبر 1948ء کو ہونا تھا لیکن پیرس میں سیاسی گفت وشنید کے پیش نظر اس میں تاخیر ہوگئی۔ دریں اثنا آزاد کشمیر ریڈیو نے اپنے ایک غیر ذمہ دارانہ نشریہ میں اشارۃً نہ صرف اس متوقع حملے کا انکشاف کر دیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس کے ساتھ ہی کوٹلی سے راجوری کی جانب پیش قدمی بھی ہوگی۔ چنانچہ جب ہندوستانی فوجی حکام کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے 13/دسمبر کو ہوائی جہازوں کے ذریعے کوٹلی کے نزدیک پاکستانی فوج کے گولہ بارود کے ایک ذخیرے پر کامیابی سے بمباری کی جس کا جواب اگلے دن 14/دسمبر کو بیری پتن کے پل پر کامیاب گولہ باری کے ذریعے دیا گیا...... جنگ بندی کا سہرا اقوام متحدہ کے کمیشن کے سر باندھا جاتا ہے حالانکہ یہ کام دراصل برطانوی سامراج کی تحریک پر انجام پایا تھا۔ ہندوستان کے کمانڈر انچیف بچر کو احساس تھا کہ پاکستان کا کمانڈر انچیف گریسی جنگ بندی کی تجویز کی یقیناً تائید کریگا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اقوام متحدہ کا کمیشن اس سلسلے میں تجویز پیش کرنے والا ہے اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کا مفاد اس میں ہے کہ پہل متحارب فریقوں میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو۔ اسے یہ بھی لازمی طور پر پتہ ہوگا کہ

اگر یہ جنگ جاری رہی تو ہندوستان کے وقار کا تحفظ ضروری ہو جائے گا اور ایسا اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ جنگ پاکستان کی سرزمین تک پہنچا دی جائے جبکہ ہندوستان اس کے لیے نہ تو سیاسی طور پر اور نہ ہی فوجی لحاظ سے تیار تھا۔ لہٰذا اس نے نہرو کی منظوری حاصل کرنے کے بعد 31 دسمبر کو گریسی کے نام ایک تار میں فوری جنگ بندی کی تجویز پیش کر دی جو فوراً ہی منظور کر لی گئی اور اس طرح یکم جنوری 1949ء کو یہ جنگ اختتام پذیر ہوئی......اس صورت حال کی اہمیت یہ تھی کہ ان دنوں جہاں تک کشمیر کے حالات پر اثر انداز ہونے کا تعلق تھا نیویارک کے معزز ایلچیوں کی حیثیت مقابلتاً بےعمل مسافروں سے زیادہ نہیں تھی۔[7] لیکن سیسر گپتا کا مؤقف یہ ہے کہ جنگ بندی کا سہرا فی الحقیقت برطانیہ کی بجائے حکومت ہندوستان کے سر باندھنا چاہیے کیونکہ جواہر لال نہرو کی خواہش تھی کہ کشمیر کی جنگ بڑھ کر بھرپور بین المملکتی جنگ کی صورت اختیار نہ کر لے۔ گپتا 13 دسمبر کو ہندوستانی ہوائی فوج کی کوٹلی کے نزدیک کامیاب بمباری اور پھر 14 دسمبر کو پاکستانی توپ خانے کی بیری پتن کے پل اور اس سے زیادہ کامیاب گولہ باری کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ تاہم وہ دعویٰ کرتا ہے کہ 1948ء کے اواخر میں پاکستان کے لیے مشکل فوجی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان نے موسم بہار کے حملے کے دوران وادی کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا تاآنکہ یہ پیش قدمی پاکستان کی باقاعدہ فوج نے روکی تھی۔ حکومت ہندوستان نے اپنے آپ پر خود ہی پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ جنگ کو پاکستان کی سرزمین میں نہیں پہنچائے گی۔ شمال میں پاکستانی فوج نے بلتستان، سکردو، کارگل، دارس اور لداخ کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا لیکن لداخ اور کارگل سے اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ 15 نومبر کو ہندوستانی فوج نے پونچھ کا محاصرہ توڑ دیا تھا اور اس طرح اسے فوجی لحاظ سے برتر مقام حاصل ہو گیا تھا۔[8]

چوہدری محمد علی لکھتا ہے کہ ''پاکستان میں جنگ بندی کے فیصلے پر اکثر کڑی تنقید کی جاتی ہے کہ یہ غیر دانشمندانہ تھا۔ چنانچہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کشمیر میں مقابلہ آرائی میں پاکستانی فوج نے ہندوستانی فوج پر اپنی فوقیت ثابت کر دی تھی۔ پیشتر اس کے، کہ ہندوستان پاکستان کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا، پاکستانی فوج کشمیر کو لے سکتی تھی۔ پاکستان کو معلوم تھا کہ ہندوستان استصواب میں سد راہ بننے اور کشمیر پر اپنے فوجی قبضہ کو برقرار رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ پاکستان کا اقوام متحدہ پر یہ اعتماد کہ وہ استصواب کرا سکے گی سراسر بے جواز اور عقل مسلمہ کے خلاف

تھا۔ میں اس زمانے میں فرانس میں بیمار پڑا تھا جہاں میں ظفر اللہ خان کے ہمراہ اقوام متحدہ کے کمیشن کے ساتھ مذاکرات کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس لیے میں اس معاملے میں ذاتی علم کی بنا پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ لیاقت علی خان کے نزدیک فیصلہ کن وجہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان عمومی جنگ سے احتراز کی خواہش تھی کیونکہ انہیں پورا یقین تھا کہ جنگ سے دونوں ملک تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ہندوستان نے کسی صورت بھی کشمیر میں اپنے نقصانات کو حتمی شکست کے طور پر قبول نہیں کرنا تھا بلکہ پاکستان کے خلاف جنگ جاری رکھ کر تلافیٔ مافات کی کوشش کرنی تھی۔ دونوں ملکوں میں سے کوئی بھی طویل جنگ لڑنے کی لیے فوجی وسائل نہیں رکھتا تھا۔ دونوں ملکوں کو بہت جلد جنگی رسد کے حصول کے لیے دوسری طاقتوں پر انحصار کرنا پڑتا اور اس طرح نئی حاصل شدہ آزادی کو سنگین خطرہ لاحق ہو جاتا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا جس کی اساس کشمیر کے محاذ پر جیت کے فوری امکانات کی بجائے وسیع تر مصلحتوں پر تھی۔"[9]

لیکن چوہدری محمد علی نے یہ نہیں لکھا کہ اس سلسلے میں برطانوی سامراج کا بھی یہی خیال تھا اور لارڈ برڈ ووڈ کے بیان کے مطابق جنگ بندی اسی کی تحریک پر ہوئی تھی کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ یہ جنگ بڑھ کر بھرپور بین المملکتی جنگ کی صورت اختیار کر لے گی اور یہ اس کے اثر یا دباؤ کا نتیجہ تھا۔ کشمیر میں ابتدا ہی سے جو کاروائی کی گئی تھی وہ نیم دلانہ اور بزدلانہ تھی جب پاکستان آرمی کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے 27/اکتوبر 1947ء کو کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے کے بارے میں قائداعظم محمد علی جناح کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے اپنی صفائی میں یہی دلیل پیش کی تھی۔ 28/اکتوبر کو سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک نے لاہور میں یہی دلیل پیش کر کے جناح کو اپنا حکم واپس لینے پر آمادہ کیا تھا۔ جب ماؤنٹ بیٹن یکم نومبر 1947ء کو آکن لیک کی تجویز کے مطابق تنازعہ کشمیر پر پہلی بین المملکتی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے لاہور آیا تھا تو اس نے جناح کو یہی دھمکی دی تھی۔ اس نے کانفرنس کے بعد 7/نومبر کو حکومت برطانیہ کو جو اپنی رپورٹ بھیجی تھی۔ اس کے مطابق "بات چیت کے آخر میں جناح پر انتہائی قنوطیت طاری ہو گئی اور اس نے کہا کہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ انڈین ڈومینین پاکستان ڈومینین کی پیدائش پر ہی اس کا گلا گھونٹنے کے درپے ہے۔ اگر انہوں نے اپنا جبر و تشدد جاری رکھا تو پاکستان کو بہرصورت نتائج کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جناح کسی بھی مایوس کن مستقبل سے خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ

کہتا تھا کہ پاکستان کے لیے حالات پہلے ہی اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اس سے زیادہ خراب ہو ہی نہیں سکتے۔ میں نے اسے کہا کہ بلاشبہ جنگ ہندوستان کے لیے بہت نقصان دہ ہوگی لیکن پاکستان اور وہ خود اس جنگ میں بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ لارڈ اسمے نے جناح کو قنوطیت سے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔''[10] پھر ماؤنٹ بیٹن نے دسمبر 1947ء کے اوائل میں لیاقت علی خان کو اسی قسم کے نتائج سے متنبہ کر کے حکومت ہندوستان کے تجویز کردہ معاہدے کے مسودے پر بات چیت کرنے پر آمادہ کیا تھا اور دسمبر کے اواخر میں اس نے اپنی اس رائے کی بنا پر تنازعہ کشمیر کو اقوام متحدہ کے روبرو پیش کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی سامراج کے عالمی مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ برصغیر ہمہ گیر بدامنی اور خونریزی کا شکار نہ ہو بلکہ یہاں معاشی امن وامان اور سیاسی استحکام قائم رہے۔ لہٰذا وہ ابتدا ہی سے پاکستان کے ارباب اقتدار کو تلقین کرتا تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے مشتعل ہو کر ہندوستان بھرپور جنگ شروع کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے نتائج پورے برصغیر کے لیے بڑے خطرناک ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایک سے زیادہ مرتبہ نہرو کے روبرو بھی یہی دلیل پیش کر کے اسے پاکستان کے ساتھ بھرپور جنگ شروع کرنے سے باز رکھا تھا۔

جنگ بندی کے بعد اقوام متحدہ کا کمیشن اپنی دونوں قراردادوں پر عمل درآمد کروانے کے لیے 4رفروری 1949ء کو پھر برصغیر آیا۔ اس وقت تک پاکستان کے قبائلی لشکر اور پاکستانی رضا کار کشمیر سے نکل چکے تھے۔ صرف تھوڑی سی مقامی فوج آزاد کشمیر کے علاقے میں موجود تھی۔ کیونکہ کمیشن کی قراردادوں میں اس فوج کے وہاں سے نکالے جانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ حکومت ہندوستان کے نمائندوں نے کمیشن سے ملاقات کے دوران یہ مؤقف اختیار کیا کہ چونکہ چین میں ماؤزے تنگ کی زیر قیادت کمیونسٹوں کی فتوحات ہو رہی ہیں اس لیے کشمیر کو شمال سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور ہندوستان کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لہٰذا کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کی اتنی تعداد کا رہنا ضروری ہے جو بیرونی حملے کا مقابلہ کر سکیں۔ 3رمئی کو حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ کے کمیشن کے نام ایک میمورنڈم میں ہندوستان کے اس مؤقف کو غلط قرار دیا۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ اگر پاکستان جنگی اہمیت کے اس علاقے پر قابض ہوگا تو شمال سے کسی جارحیت کا امکان نہیں ہوگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جارحیت کی صورت میں مقامی عوام پاکستان کی بھرپور

حمایت کریں گے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سنکیانگ کے مسلمان عوام کی جانب سے پاکستان کے زیر تسلط علاقے پر حملے کا امکان اس صورت سے نسبتاً کم ہوگا کہ یہ علاقہ ہندوستان کے کنٹرول میں ہو اور پھر 30 رمئی کو حکومت پاکستان نے کمیشن کی جانب 28 راپریل کو پیش کردہ عارضی صلح کی ترمیم شدہ شرائط پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ہرچند کشمیر پر شمال سے کسی بیرونی حملے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تاہم اگر کبھی ایسی بعید از قیاس صورت پیدا ہوجائے تو اس سے نمٹنے کے لیے پاکستان سے بھی مشورہ کرنا چاہیے اور اس حملے کے مقابلے کے لیے پاکستانی فوجوں کے استعمال پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اگر اس علاقے میں اس مقصد کے لیے ہندوستانی فوجیں متعین کرنا ضروری ہو تو بھی وہاں ریاست کی سول انتظامیہ کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔[11] حکومت ہندوستان کشمیر سے اپنی فوجوں کا انخلا شروع کرنے کے اس لیے بھی خلاف تھی کہ آزاد کشمیر میں تھوڑی سی مقامی فوج موجود تھی۔ اس سلسلے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ جب تک آزاد کشمیر کی فوج کو ختم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک وہاں سے ہندوستانی فوج کا انخلاء شروع نہیں ہوگا۔ کمیشن کا مؤقف یہ تھا کہ چونکہ اس کی 31 راگست 1948ء اور 5 رجنوری 1949ء کی قراردادوں میں آزاد کشمیر فوج کو توڑنے کا کوئی ذکر نہیں اس لیے پاکستان کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن حکومت ہندوستان اپنے اس مطالبے پر بضد رہی اور اس بنا پر کمیشن کی کئی ماہ کی بات چیت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کمیشن اور حکومت ہندوستان کے درمیان اس بات پر بھی اتفاق نہ ہوسکا کہ 13 راگست 1948ء کی قرارداد میں ہندوستانی فوج کے کثیر حصہ کے انخلا کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ یعنی یہ طے نہ ہو سکا کہ کشمیر میں استصواب تک امن و امان قائم رکھنے کے لیے دراصل کتنی ہندوستانی فوج کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ بالآخر کمیشن نے اگست 1948ء کے اواخر میں یہ تجویز پیش کی کہ یہ دونوں مسائل برائے ثالثی امریکی بحریہ کے اعلیٰ افسر ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو۔ نمٹز (Chester W. Nimitz) کے روبرو پیش کر دیے جائیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس شخص کو ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی منظوری سے تین چار ماہ سے منتظم استصواب مقرر رکھا تھا اور اس نے اس دوران تنازعہ کشمیر کے سارے پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کرلیا ہوا تھا۔ امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے اس تجویز کی تائید کی اور دونوں حکومتوں سے اپیل کی کہ وہ نمٹز کی ثالثی قبول کرلیں۔ حکومت پاکستان نے فوراً اس کی منظوری دے دی لیکن حکومت ہندوستان نے

اسے مسترد کر دیا اور وزیراعظم نہرو نے 4 ستمبر کو اپنی ایک تقریر میں امریکی صدر اور برطانوی وزیراعظم کی اس بے جامداخلت پر حیرت کا اظہار کیا۔

کمیشن نے ہندوستان کی اس ہٹ دھرمی کے پیش نظر دسمبر میں سلامتی کونسل کے روبرو اپنی قطعی ناکامی کی رپورٹ پیش کر کے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر سے فوجوں کے انخلا سے متعلقہ اختلافات کا تصفیہ کرانے کے لیے کسی ایک شخص کو مصالحت کنندہ کے فرائض سپرد کئے جائیں اور اگر مصالحت کی کوشش کامیاب نہ ہو تو ثالثی کرائی جائے۔ کمیشن کے اپنے مصالحتی کام سے دستبردار ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ 1949ء کے اوائل میں چیکوسلواکیہ میں کمیونسٹ انقلاب ہونے کے باعث ڈاکٹر جوزف کوربل امریکہ میں سیاسی پناہ لینے کے بعد کمیشن کی رکنیت سے الگ ہو گیا تھا اور چیکوسلواکیہ کی حکومت نے اس کی جگہ ڈاکٹر آلڈرچ چائل (Olderich Chyle) کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا۔ یہ نیا رکن کمیشن کے دوسرے ارکان سے تعاون نہیں کرتا تھا۔ ڈاکٹر کوربل کے بیان کے مطابق کمیشن کی خفیہ میٹنگوں میں جو کارروائی ہوتی تھی ڈاکٹر چائل اس کی تفصیل شیخ عبداللہ کو بتا دیا کرتا تھا۔[12] ڈاکٹر چائل کشمیر میں عارضی معاہدۂ امن کی تکمیل کے لیے کسی ایک فرد کی ثالثی کی تجویز کے خلاف تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ جس شخص کو اس محدود مقصد کے لیے ثالث مقرر کیا جائے گا وہ پورے تنازعے کا ہی ثالث بن بیٹھے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ثالثی کی تجویز کے ذریعے تنازعہ کشمیر میں بے جامداخلت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق کمیشن نے ثالثی کی تجویز ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو پیش کرنے سے پہلے اس سلسلے میں امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کی منظوری حاصل کر لی تھی اور یہی وجہ تھی کہ امریکی صدر اور برطانوی وزیراعظم نے اس تجویز پر عمل درآمد کرانے کے لیے اعلانیہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔[13]

سلامتی کونسل نے 29 دسمبر کو کمیشن کی رپورٹ پر غور شروع کیا تو تنازعہ کشمیر پر تقریروں کا پھر ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کونسل کے کئی اجلاس ہوئے مگر یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کشمیر میں آزادانہ استصواب کرانے کے لیے ہندوستانی فوجوں کا انخلاء کیسے ہو۔ بالآخر سلامتی کونسل نے کینیڈا کے نمائندہ جنرل اے۔ جی۔ ایل میکناٹن (A.G.L McNaughton) کو جو ان دنوں کونسل کا صدر تھا، ہدایت کی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں سے غیر رسمی بات چیت

کر کے اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرے۔ اس نے کئی ہفتے تک مجوزہ بات چیت کی اور پھر یہ منصوبہ پیش کیا کہ دونوں فریقوں کو اپنی فوجیں اس حد تک نکال لینی چاہئیں کہ جنگ بندی لائن کے دونوں طرف کسی کو بھی کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ بلتستان اور گلگت کا علاقہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی مقامی حکام کے زیر انتظام رہے گا اور ریاست میں اقوام متحدہ کا ایک ایسا نمائندہ مقرر کیا جائے جسے کونسل کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے وسیع اختیارات حاصل ہوں۔ پاکستان نے اس منصوبہ کو بہت معمولی ردوبدل کے بعد منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی مگر ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا۔ اس سلسلے میں اتفاق رائے نہ ہونے کی واحد وجہ یہ تھی کہ ہندوستان نے ریاست کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور اسے اب استصواب کرانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پاکستان میدان جنگ میں ہاری ہوئی بازی بین الاقوامی سطح پر اینگلو امریکی سامراج کی زیر سرپرستی بذریعہ افہام وتفہیم جیتنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی اس کوشش کی بنیاد امریکی سامراج کے ماہنامہ ''فارن افیئرز'' کی جنوری 1950ء کی اشاعت میں شائع شدہ اس نظریے پر تھی کہ ''چونکہ چین میں انقلاب کے بعد کمیونزم کے خلاف پاکستان کی جنگی اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اس لیے کشمیر آبادی اور جغرافیہ کے لحاظ سے پاکستان کا حصہ ہے۔ شیخ عبداللہ نہرو کا پٹھو ہے۔ ہندوستان کو کشمیر پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لیے بہت زیادہ فوج کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان معاشی لحاظ سے کمزور اور سیاسی طور پر غیر مستحکم ہو رہا ہے اور اب وہ صرف اسی صورت بچ سکتا ہے کہ پاکستان سے پائیدار بنیادوں پر صلح کرے۔ پاکستان کی مالی اور سیاسی حالت اپنے بڑے ہمسایہ کے مقابلے میں بہت اچھی ہے۔ پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک ایسے موقعہ پر مغرب کے خلاف ہوتے جا رہے ہیں جب کہ تیل کی جنگی اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور جب کہ اسلام کمیونزم کا سدباب کر سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نہرو کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ کشمیر کے معاملے میں اتنا زیادہ غیر مصالحانہ رویہ اختیار نہ کرے۔ تنازعہ کشمیر کا تصفیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کشمیر کا زیادہ تر علاقہ پاکستان کو دے دیا جائے اور دریائے چناب کے جنوب میں جموں کا علاقہ ہندوستان کے پاس رہنے دیا جائے۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان وہ پرانی سرحدیں بحال ہو جائیں گی جنہیں انگریزوں نے 1846ء میں وادی کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے پاس فروخت کر کے درہم برہم کیا تھا۔ ہندوؤں نے اس علاقے میں اپنے سوسالہ عہد اقتدار کے دوران جو کچھ کیا ہے اس کے پیش

نظر وہ اس سے زیادہ علاقے کے مستحق نہیں ہیں۔[14] قبل ازیں فروری 1948ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ بیون اور وزیر نوئیل بیکر (Noel Baker) نے اسی مؤقف کی بنیاد پر پاکستان کی حمایت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

5 رفروری کو نیویارک ٹائمز نے اس نقطۂ نگاہ کی بنا پر اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستان نے کشمیر سے فوجی انخلا کے بارے میں کینیڈا کے جنرل میکناٹن کو ثالث مقرر کرنے کی تجویز منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ہندوستان نے حیدرآباد پر بزورقوت اس لیے قبضہ کیا ہے کہ ریاست معاشرتی لحاظ سے ہندو اکثریت کی ہے لیکن اس کا حکمران مسلمان ہے۔ وہ کشمیر پر دعوے اس لیے کر رہا ہے کہ اس کا حکمران ہندو ہے اگرچہ یہ معاشرتی لحاظ سے مسلم اکثریت کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان چت بھی میری پٹ بھی میری کے اصول پر کارفرما ہے۔ اگر ہندوستان نیک نیت ہے تو اسے اقوام متحدہ کے مصالحتی کردار کو منظور کر لینا چاہیے۔ 7 رفروری کو سلامتی کونسل میں برطانیہ کے نمائندہ نے بھی اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ کشمیر سے فوجوں کے انخلا کے بارے میں جنرل میکناٹن کی تجویزوں کو منظور نہیں کیا گیا۔ اس نے کہا کہ اگر اس سلامتی کونسل نے اب اور آئندہ مؤثر طریقے سے کام کرنا ہے تو اس کی اتھارٹی کا احترام لازمی ہے۔ اس کی سفارشات اس لیے نہیں کی جاتیں کہ انہیں مسترد یا نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن ہندوستانی نمائندے پر اس نکتہ چینی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا 8 رفروری کو جواب یہ تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیشہ ہندوستان کو غلط بات پر رضامند کرنے کے لیے کیوں دباؤ ڈالا جاتا ہے کبھی تو دوسرے فریق کو صحیح بات پر رضا مند کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیے۔[15]

12 رفروری کو لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں یہ رائے ظاہر کی کہ اگرچہ ہندوستان کشمیری عوام کی اکثریت کی حمایت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن ساری دنیا کو معلوم ہے کہ یہ استصواب رائے عامہ سے مسلسل گریز کر رہا ہے۔ اس کے اس دوغلے رویے سے دنیا کی رائے عامہ یہی نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ ہندوستان کو دراصل کشمیر کی رائے عامہ پر اعتماد نہیں ہے۔

بالآخر سلامتی کونسل نے 14 رمارچ 1950ء کو ایک قرارداد منظور کی جس میں ہندوستان اور پاکستان کو ہدایت کی گئی کہ وہ جنرل میکناٹن کے پیش کردہ منصوبے کی بنیاد پر پانچ ماہ کے اندر ریاست سے فوجوں کے انخلا کا پروگرام مرتب کر کے اس پر عمل کریں۔ فوجوں کا انخلا اس طرح

ہونا چاہیے کہ جنگ بندی لائن کے دونوں طرف کسی کو بھی فوجوں کی موجودگی سے کوئی خطرہ لاحق نہ رہے۔ سلامتی کونسل نے پانچ رکنی مصالحتی کمیشن کو توڑ کر اس کی جگہ اپنا ایک نمائندہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ جسے فوجوں کے انخلا کے معاہدے کی تشریح و تعبیر کے سلسلے میں ثالثی کے اختیارات دیئے گئے اور ہدایت کی گئی کہ وہ تنازعہ کشمیر کے بہ عجلت اور پائیدار تصفیے کے لیے تجاویز پیش کرے۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ سوویت یونین حسب معمول غیر جانبدار رہا۔ اس نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ پاکستان نے اس قرارداد کو فوراً قبول کرلیا۔ سلامتی کونسل نے آسٹریلیا کے ہائی کورٹ کے ایک جج سر اوون ڈکسن (Owen Dixon) کو اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ سر اوون 27 رمئی کو برصغیر پہنچا۔ اس نے تقریباً دو ماہ تک ہندوستان، پاکستان اور ریاست جموں و کشمیر کے سارے علاقوں میں صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد 20 رجولائی کو نئی دہلی میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی ایک کانفرنس منعقد کر کے پہلے تو ہندوستان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ رائے ظاہر کی کہ کشمیر میں قبائلیوں کے حملے اور پاکستانی فوج کی مداخلت سے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہوئی تھی اور پھر اس نے فوجوں کے انخلا کے بارے میں اپنا منصوبہ پیش کیا۔ پاکستان نے یہ منصوبہ منظور کرلیا لیکن ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا کیونکہ وہ آزاد کشمیر فوج کو مکمل طور پر توڑے بغیر اپنی فوجوں کے تھوڑے سے انخلا پر بھی آمادہ نہیں تھا۔ سر اوون نے اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد ہمت نہ ہاری اور اس نے مزید دو تین ماہ تک دونوں حکومتوں کے ارباب اختیار سے گفت وشنید کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے اس دوران ریاست میں سے فوجوں کے انخلا اور وہاں استصواب کرانے کے بارے میں دو تین منصوبے پیش کئے جنہیں پاکستان نے منظور کرلیا لیکن ہندوستان نے ان میں سے کسی ایک پر بھی مکمل یا جزوی طور پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا آخری منصوبہ یہ تھا کہ صرف وادی کشمیر میں اقوام متحدہ کے زیر انتظام استصواب کرایا جائے اور ریاست کا باقی علاقہ ہندوستان اور پاکستان میں رائے شماری کے بغیر ہی تقسیم کرلیا جائے۔ پاکستان نے یہ منصوبہ بھی منظور کرلیا مگر ہندوستان کے لیے یہ بھی قابل قبول نہیں تھا۔ وزیراعظم نہرو نے ایک تار میں کہا کہ ''ہم ایسی تجویز کو کسی صورت منظور نہیں کر سکتے۔'' اس پر 23 راگست کو سر اوون ڈکسن نے سلامتی کونسل کے روبرو اپنی رپورٹ پیش کر دی جس کے آخر میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ہندوستان اپنی فوجوں کے انخلا اور استصواب کرانے پر کبھی رضامند نہیں

ہوگا اور اس نے کشمیری عوام کی منشا معلوم کرنے کے لیے جو طریقہ سوچ رکھا ہے وہ پاکستان کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہوگا۔

27 راگست 1940ء کو ماسکو ریڈیو نے سر اوون ڈکسن کے اس منصوبے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اینگلو امریکی سامراج کا پروگرام یہ ہے کہ وہ کشمیر میں اپنی انتظامیہ قائم کرے اور پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان عدم اتفاق کی آڑ لے کر استصواب کو غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کرے۔''[16] ماسکو کے اس تبصرے کا پس منظر یہ تھا کہ ان دنوں امریکہ اقوام متحدہ کے نام پر کوریا میں کمیونسٹوں سے نبرد آزما تھا اور سوویت یونین کو شبہ تھا کہ اینگلو امریکی سامراجی اقوام متحدہ کی انتظامیہ کی آڑ میں کشمیر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جو جنگی حکمت عملی کے تحت سوویت یونین اور چین کے خلاف انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ 6 ستمبر کو لندن ٹائمز کا اداریہ یہ تھا کہ ''ہندوستان کا یہ مؤقف صحیح ہے کہ کوریا کو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی حق خود ارادیت دینا چاہیے تو پھر وہ یہ حق کشمیری عوام کو کیوں نہیں دیتا۔ کشمیر، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کا اس سلسلے میں غیر مصالحانہ رویہ اس کے اخلاقی مؤقف پر دھبہ ہے۔ اس بنا پر اس کی امن پسندی کا دعویٰ مشکوک نظر آتا ہے اور اس کا ہمسایہ اس کے ایشیا کی ترجمانی کرنے کے حق کو چیلنج کرتا ہے۔[17] 20 ستمبر کو پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اور وزیر خزانہ غلام محمد نے امریکہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کو ایشیا کا لیڈر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے کہا کہ اگر ایشیا پر کسی ایک ملک یا کسی ایک فرد کی لیڈری مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو پاکستان میں اس کا بہت غیر موافق ردعمل ہوگا۔ پاکستان اور اس کے دوسرے ہمسائے ایسی پوزیشن کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ 21 ستمبر کو مدراس کے اخبار ''ہندو'' نے ان دونوں پاکستانی لیڈروں کی پریس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ہر ممکن کوشش کر رہا ہے کہ ہندوستان کو اس کا اپنا جائز مقام حاصل نہ ہونے پائے۔

سر اوون ڈکسن کی ناکامی کے بعد تنازعہ کشمیر کئی ماہ تک سرد خانے میں پڑا رہا حالانکہ اس دوران پاکستان کے عوام اس تنازعے کے بہ عجلت اور منصفانہ حل کے لیے بہت واویلا کرتے رہے۔ بالخصوص پنجاب میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی سامراج نواز خارجہ پالیسی پر بہت نکتہ چینی ہوئی۔ لوگوں کو شکایت یہ تھی کہ لیاقت علی خان نے اگرچہ پاکستان کو اینگلو امریکی سامراج

کا ایک طفیلی ملک بنا دیا ہے لیکن تنازعہ کشمیر کا پھر بھی پاکستان کے حق میں تصفیہ نہیں ہوا۔ پنجاب کی رائے عامہ اس بنا پر لیاقت علی خان سے اس قدر برہم تھی اسے 31 دسمبر کو یہ مؤقف اختیار کرنا پڑا کہ اگر تنازعہ کشمیر کو جنوری 1951ء میں منعقد ہونے والی برطانوی کامن ویلتھ کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل نہ کیا گیا تو پاکستان اس میں شرکت نہیں کرے گا۔ 3 جنوری کو لندن ٹائمز نے پاکستان کی اس دھمکی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ جب تک تنازعہ کشمیر حل نہیں ہوتا اس وقت تک ساری کامن ویلتھ بشمول ہندوستان اور پاکستان، ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں بین الاقوامی سلامتی کی تقویت کے لیے کوئی منصوبہ تیار نہیں کر سکے گی۔ اس قسم کے اجتماعات میں کسی مسئلہ پر پرائیویٹ بحث کی بھی اتنی اہمیت ہوتی ہے جتنی کہ کھلے اجلاس میں مفصل اور رسمی بحث کی ہوتی ہے۔[18] تاہم حکومت برطانیہ نے یہ مطالبہ تو پورا نہ کیا البتہ یہ یقین دلایا کہ اس مسئلہ پر غیر رسمی طور پر بات چیت ہو سکے گی۔ پنجابی مبصرین کی رائے یہ تھی کہ اگر اس موقع پر لیاقت علی خان برطانوی سامراج کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکتا اور ذرا جرأت کا مظاہرہ کر کے کامن ویلتھ کے اجلاس میں شرکت کرنے سے قطعی انکار کر دیتا تو اس کا مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا۔ پاکستان کی کامن ویلتھ سے وابستگی سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ اگر اس وقت پاکستان کی رائے عامہ کے مطالبے کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا جاتا کہ برطانوی کامن ویلتھ کشمیر کے مسئلہ کا تصفیہ کرانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کرے گی تو پاکستان اس ادارے سے نکل جائے گا تو یہ فیصلہ ان دنوں کے حالات میں کوئی معمولی واقعہ نہ ہوتا۔ اینگلو امریکی سامراج کو مشرق وسطیٰ میں فوجی گٹھ جوڑ کے لیے پاکستان کی خدمات کی سخت ضرورت تھی۔ اشتراکی اور مغربی طاقتیں برصغیر کے متعلق اپنی پالیسیاں وضع کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ پاکستان ان کے عالمی تضاد سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن وزیراعظم لیاقت علی خان نے اس عالمی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی بجائے کچھ اس قسم کا رویہ اختیار کیا کہ اگر میری تنخواہ میں اضافہ نہیں کرو گے تو پھر میں اسی تنخواہ پر ہی کام کرتا رہوں گا۔ غالباً اس نے یہ رویہ کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کی اس رائے سے متاثر ہو کر کیا تھا کہ پاکستان کو فی الحقیقت شمال سے خطرہ ہے اور اس خطرے کے سدباب کے لیے امریکہ کی سرپرستی ضروری ہے۔ میجر جنرل اکبر خان کے بقول جنرل محمد ایوب خان پر ان دنوں شمال سے خطرے کا بھوت سوار ہو گیا تھا بالفاظ دیگر اس نے اس وقت تک اپنے آپ کو اور پاکستان کو امریکی سامراج

کے پاس فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس بنا پر وہ لیاقت علی خان کے سیاسی فیصلوں پر اثرانداز ہوتا تھا۔

لیاقت علی خان غیر رسمی بات چیت کی یقین دہانی پر لندن چلا گیا۔ وہاں تقریباً سات گھنٹے تک مسئلہ کشمیر پر غیر رسمی بات چیت ہوئی جس کے دوران آسٹریلیا کے وزیراعظم رابرٹ مینزیز (Robert Menzies) نے کشمیر میں آزادانہ استصواب کرانے کے لیے تین تجاویز پیش کیں (1) کشمیر میں کامن ویلتھ فوجوں کو متعین کیا جائے یا (2) ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ فوج متعین کی جائے۔ (3) یا ناظم استصواب کو مقامی فوج تیار کرنے کا اختیار دیا جائے۔ پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے ہر تجویز پر رضامندی ظاہر کی مگر وزیراعظم نہرو نے اپنا منفی اور غیر معقول رویہ ترک کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی اور اس نے ان تینوں تجاویز کو مسترد کردیا۔ 15رجنوری کو چار سطروں کے ایک اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ مسئلہ کشمیر پر آزادانہ گفتگو ہوئی۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے تجاویز پیش کی گئیں اور اختلافات کسی حد تک کم کئے گئے اگرچہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا۔ چونکہ دونوں وزرائے اعظم محسوس کرتے ہیں کہ اس مسئلہ کو جلدی سے حل ہونا چاہیے لہٰذا انہیں امید ہے کہ اس بات چیت کے دوران جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم ان پر پوری طرح غور کریں گے۔ 17رجنوری کو نیویارک ٹائمز نے آسٹریلوی وزیراعظم کی تجاویز کے بارے میں نہرو کے متکبرانہ رویے کی مذمت کی۔ اخبار نے لکھا کہ نہرو کوریا کے تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ہمیں ہر قسم کی نصیحتیں کرتا رہا ہے۔ بظاہر اسے ساری دنیا کے سارے مسائل حل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی لیکن وہ اپنے گھر کا ایک تنازعہ حل نہیں کرسکتا اور لندن ٹائمز نے 24رجنوری کو مزید لکھا کہ اگر تنازعہ کشمیر کو پرامن طور پر حل کرنا ہے تو وہاں استصواب کرانا لازمی ہے اور جب تک ہندوستان اپنا رویہ نہیں بدلتا وہاں منصفانہ استصواب نہیں ہوسکتا۔ نہرو کے ملک کے لیے یہ موقعہ ہے کہ وہ سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث کے دوران ان اعلیٰ اصولوں کا اطلاق کرے جن کا وہ کوریا کے بارے میں اطلاق کرتا رہا ہے۔[19]

پاکستان میں ہندوستان کی ہٹ دھرمی کے سامنے برطانوی کامن ویلتھ کی بے بسی پر بہت غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ پنجاب میں یہ مطالبہ اور بھی زور پکڑ گیا کہ پاکستان کو کامن ویلتھ سے الگ ہونا چاہیے۔ پبلک جلسوں میں اس بنا پر بھی لیاقت علی خان کی مذمت کی گئی کہ اس نے

سوویت یونین سے دوستانہ روابطہ قائم کرنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی تھی حالانکہ اسے سٹالن نے سب سے پہلے دعوت نامہ بھیجا تھا۔ اینگلو امریکی سامراج نے لیاقت علی خان کو اس مشکل داخلی صورت حال سے نکالنے کے لیے اس کی اس طرح امداد کی کہ اس نے 21 رفروری 1951ء کو سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث کا ڈھونگ رچایا جو تقریباً چھ ہفتے جاری رہا۔ حسب معمول بڑی تقریریں ہوئیں اور کئی ملکوں نے پاکستان کے جائز موٴقف کی تائید کی اور ہندوستان کی ہٹ دھرمی پر افسوس کا اظہار کیا۔ بالآخر سلامتی کونسل نے 30 رمارچ کو امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے پیش کردہ ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کا ایک اور نمائندہ مقرر کیا جائے گا جو تین ماہ کے اندر فوجوں کا انخلا کرائے گا اور اگر اسے اس کام میں ناکامی ہوئی تو وہ اپنی رپورٹ میں بتائے گا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 ر اگست 1948ء اور 5 ر جنوری 1949ء کی قراردادوں کی تشریح وتعبیر کے بارے میں دونوں حکومتوں کے درمیان اختلافات کی نوعیت کیا ہے۔ قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر یہ نمائندہ ناکام ہو گیا تو دونوں حکومتوں کو ایک یا ایک سے زیادہ افراد کو بطور ثالث قبول کر لینا چاہیے۔ مجوزہ ثالث یا ثالثوں کا تقرر بین الاقوامی عدالت انصاف سے کروایا جائے گا۔ سوویت یونین نے اس قرارداد پر بھی رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ پاکستان نے اسے منظور کر لیا لیکن ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا کیونکہ اس میں ثالثی کی تجویز شامل تھی جو اسے کسی صورت بھی قابل قبول نہیں تھی۔

ہندوستان کے موٴقف کی بنیاد یہ تھی کہ کشمیر قانونی طور پر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے۔ کسی بھی بیرونی طاقت کو اس میں مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ امریکہ اور برطانیہ اس سلسلے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں اور وہ خواہ مخواہ پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کے برعکس سوویت یونین کا رویہ دانش مندانہ ہے۔ اس نے ابھی تک کشمیر کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اپریل 1951ء میں ایک امریکی سینیٹر ڈاکٹر فرینک پی۔ گراہم (Frank P. Graham) کو اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ 30 رمارچ کی قرارداد پر عمل درآمد کرائے۔ اس شخص نے تقریباً دو سال تک نئی دہلی اور کراچی میں گفت وشنید کی مگر فوجوں کے انخلا کے بارے میں کوئی تصفیہ نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ اس نے اٹھارہ ماہ کے دوران سلامتی کونسل کے روبرو اپنی پانچ رپورٹیں

پیش کیں اور ہر رپورٹ میں یہی بات کہی کہ فوجوں کے انخلا کے بارے میں دونوں ملکوں کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں لہٰذا غیر جانبدارنہ استصواب کے لیے کوئی کاروائی نہیں ہوسکتی۔ اس کی بالاصرار تجویز یہ تھی کہ اقوام متحدہ کی فوج کی نگرانی میں استصواب کرایا جائے۔ دریں اثنا 28/اگست 1951ء کو نیویارک ٹائمز نے ایک اداریے میں افسوس ظاہر کیا کہ نہرو نے ایشیا کی لیڈری کا موقعہ کھو دیا ہے۔ اخبار نے لکھا کہ نہرو نے ایشیا کی لیڈری حاصل کرنے کی بجائے اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہوکر ہندوستان کی عدم دلچسپی کا اعلان کر دیا ہے اور ہندوستان کو دنیا میں ایک تیسری قوت بنانے کی کوشش ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ دونوں عالمی تحریکوں...... کمیونزم اور جمہوریت...... کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ اس سے وہ اور ہندوستان ادھر کے رہے ہیں نہ ادھر کے۔ اس نے اپنی عظمت کو خود ہی مسترد کر دیا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر سوویت یونین نے نہرو کی ''تیسری قوت'' بننے کے عزم سے فائدہ اٹھانے اور ہندوستان اور مغربی سامراج کے درمیان تضاد کی خلیج کو وسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جب 10/جنوری 1952ء کو سلامتی کونسل میں ڈاکٹر گراہم کی دوسری رپورٹ پر بحث ہوئی تو سوویت مندوب جیکب ملک نے پہلی مرتبہ کشمیر کے مسئلے پر لب کشائی کی۔ اس نے کہا کہ ''امریکہ اور برطانیہ یکے بعد دیگرے اپنے منصوبے پیش کر کے مسئلہ کشمیر کے تصفیہ میں بدستور مداخلت کر رہے ہیں۔ یہ منصوبے سامراجی نوعیت کے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد تنازعہ کشمیر کے حقیقی تصفیے کی کوشش پر نہیں ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کشمیر کو طول دیا جائے اور کشمیر پر اقوام متحدہ کی امداد کے بہانے امریکہ اور برطانیہ کی بالادستی قائم کی جائے۔ ان منصوبوں کا آخری مقصد یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں کشمیر میں متعین کی جائیں اور اس طرح اس علاقے کو اینگلو امریکی نوآبادی اور فوجی اڈے کی حیثیت دے دی جائے۔'' سوویت مندوب نے مزید کہا کہ ''کشمیر میں غیر ملکی فوجیں متعین کرنیکی تجویز امریکہ کی خواہش کے مطابق بار بار پیش کی جا رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سوویت یونین سے متصلہ علاقے میں فوجی اڈے قائم کئے جائیں۔ اگست 1950ء میں صدر ٹرومین اور وزیراعظم ایٹلی نے ثالثی کی جو تجویز پیش کی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ سوویت یونین کی حکومت کی رائے یہ ہے کہ تنازعہ کشمیر صرف اسی صورت

میں حل ہوسکتا ہے کہ وہاں کے عوام کو کسی بیرونی مداخلت کے بغیر کشمیر کی آئینی حیثیت کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔ اس حق کی کارفرمائی جمہوری طور پر منتخبہ دستور ساز اسمبلی کی وساطت سے ہوسکتی ہے۔"[20]

چونکہ سوویت مندوب کی تنازعہ کشمیر کے بارے میں یہ پہلی تقریر بہت حد تک ہندوستان کے مؤقف کی تائید کرتی تھی اس لیے شیخ عبداللہ نے 25ر مارچ کو اپنی دستور ساز اسمبلی میں سوویت مندوب کی اس خیال آرائی کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ اب تنازعہ کشمیر پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کیا جارہا ہے۔ سوویت مندوب کی تقریر نے اس تنازعے کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔[21] تاہم اس کے فوراً بعد سلامتی کونسل کے ایک اجلاس میں جب پاکستان کے وزیر خارجہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اسے سوویت مندوب کی طرف سے یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ جس دستور ساز اسمبلی کا ذکر اس نے کیا ہے اس سے اس کی مراد ایسی دستور ساز اسمبلی نہیں، جیسی ہندوستان کی جانب سے وضع کی جارہی ہے۔ سوویت مندوب نے پاکستانی وزیر خارجہ کے اس بیان کو چیلنج نہ کیا۔ ہندوستان نے سوویت یونین کی مداخلت کو یہ معنی پہنائے کہ وہ کشمیر سے متعلق ہندوستان کے مؤقف کی بالواسطہ حمایت کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جنوبی ایشیا میں اینگلو امریکی عزائم کے بارے میں ماسکو کے سارے شبہات اور پاکستان میں رجعت پسند اور سامراج نواز عناصر کے غلبے کے باوجود سوویت یونین ہمیشہ اس مؤقف پر کاربند رہا کہ کشمیر کی حیثیت کا فیصلہ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر خود کشمیر کے عوام کو کرنا چاہیے۔ اس وقت تک سوویت یونین نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کوئی جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کا قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی سلامتی کونسل کی طرف سے متعدد قراردادوں کی کوئی مخالفت کی تھی۔ لہٰذا اس وقت تک پاکستان کو سوویت یونین کے ویٹو کا کوئی خدشہ نہیں تھا اور پاکستان کو سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹانے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر گراہم نے اپنی آخری رپورٹ 27ر مارچ 1953ء کو پیش کی جس میں محض دعا کی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ 40 کروڑ باشندوں کے قائدین کو گفت وشنید کے ذریعے اس تنازعے کا پرامن تصفیہ کرنے کی توفیق عطا کرے۔

لیکن پاکستان کے ارباب اقتدار نے اس کے بعد دسمبر 1952ء سے لے کر جنوری 1953ء تک سلامتی کونسل کو حرکت میں لانے کی کوئی کوشش نہ کی حالانکہ کونسل کی فضا مقابلتاً

پاکستان کے لیے سازگار تھی۔۔کونسل کی اکثریت فوجوں کے انخلا اور استصواب کی تجاویز کے حق میں تھی۔ان کی اس بے عملی کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پاکستان میں غلام محمد کی زیر قیادت سامراج نواز بیوروکریسی نے اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس وطن فروش سول،فوجی اور عدالتی بیوروکریسی کو ہندوستان کی بجائے''شمال'' کی جانب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا۔اس کی داخلی اور خارجی پالیسی امریکی سامراج کے مفادات کے بالکل تابع ہوگئی تھی اور امریکی سامراج مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کو اتنا ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بالکل ہی کمیونسٹ بلاک کا حصہ بن جائے۔

باب: 10

# جموں میں ہندوؤں کی ایجی ٹیشن اور شیخ عبداللہ کی گرفتاری

ڈاکٹر گراہم کی ناکامی کے چند ماہ بعد مقبوضہ کشمیر میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کی موہوم امید بھی ختم ہوگئی۔ شیخ عبداللہ کے ''ذاتی دوست'' جواہر لال نہرو نے 19 راگست 1953ء کو اسے گرفتار کر کے اس کی جگہ اس کے ایک موقع پرست نائب بخشی غلام محمد کو کشمیر کی وزارت عظمیٰ کی گدی پر بٹھا دیا۔ حکومت ہندوستان کی جانب سے اس غیر متوقع اقدام کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ہندوستان کے آئین میں ریاست جموں و کشمیر کو جو خاص مقام دے رکھا تھا وہ اسے ختم کر کے ریاست کو آئینی طور پر وہی مقام دینا چاہتی تھی جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل تھا۔ بالفاظ دیگر وہ ریاست جموں و کشمیر کو آئینی طور پر ہندوستان کا اٹوٹ انگ قرار دے کر اس علاقے سے متعلقہ بین الاقوامی تنازعے کو ہمیشہ کے لیے اور قطعی طور پر اپنے حق میں حل کرنا چاہتی تھی۔ شیخ عبداللہ حکومت ہندوستان کے اس منصوبے کے راستے میں حائل تھا۔ وہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی سپیشل پوزیشن کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اسے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے ''ذاتی دوست'' ہونے کا زعم تھا۔ نہرو نے اسے ابتدا ہی سے یقین دلایا ہوا تھا کہ ہندوستان کی زیر سرپرستی ریاست کی حیثیت تقریباً ایک آزاد و خود مختار ملک کی ہو گی۔ یعنی ریاست کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اسے وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو برصغیر کی تقسیم سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ کو حاصل تھے۔ چنانچہ جب 52-1951ء میں جموں کے انتہا پسند

ہندوؤں نے بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں کی انگیخت پر ریاست کے ہندوستان کے ساتھ مکمل ادغام کے لیے کشمیر کی حکومت کے خلاف پرتشدد تحریک چلائی تو شیخ عبداللہ نے کچھ اس قسم کی تقریریں شروع کر دیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کو عارضی سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔ وہ اشارۃً کشمیر کی مکمل آزادی وخودمختاری کی باتیں بھی کرتا تھا اور یہ بھی شکائتیں کرتا تھا کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت سے اچھا سلوک نہیں ہو رہا ہے۔ قدرتی طور پر حکومت ہندوستان شیخ عبداللہ کے اس قسم کے مشکوک رویے کو برداشت نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس نے پہلے تو اس کی نیشنل کانفرنس اور ریاستی کابینہ میں پھوٹ ڈلوائی اور پھر اسے مختلف بدعنوانیوں کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

شیخ عبداللہ کے اس عبرتناک سیاسی زوال کی ابتدا دراصل اکتوبر 1947ء میں ہی ہو گئی تھی جبکہ اس نے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے فوراً بعد چیف ایمرجنسی ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا تھا۔ وہ اس قسم کا نمائشی عہدہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ مکمل اختیارات مانگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریاست کے غیر ریاستی ہندو وزیراعظم مہر چند مہاجن کو الگ کر دیا جائے اور اس کی جگہ اسے ایک بااختیار وزیراعظم بنایا جائے۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی حیثیت محض ایک آئینی سربراہ کی ہو اور وہ ریاستی امور میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ دوسری طرف مہاراجہ اور اس کا وزیراعظم اپنے اختیارات شیخ عبداللہ کو منتقل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ دونوں بہت ہی متعصب ہندو تھے۔ ان کے لیے شیخ عبداللہ جیسا قوم فروش مسلمان بھی قابل برداشت نہیں تھا۔ وہ اپنی قوم فروشی یا قوم پرستی کے باوجود پیدائشی مسلمان تھا۔ وہ اسے محض ایک زرخرید پٹھو کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے اس صورت حال کے پیش نظر دسمبر میں اپنے ''ذاتی دوست'' جواہر لال نہرو سے ان کے خلاف شکائتیں شروع کر دیں۔ اس کی پہلی شکایت تو یہ تھی کہ حکومت ہندوستان نے اس کی نیشنل کانفرنس کے رضا کاروں کے لیے جو اسلحہ بھیجا تھا وہ وزیراعظم مہاجن نے ان مسلمان رضا کاروں میں تقسیم کرنے کی بجائے راشٹریہ سیوک سنگھ کے حوالے کر دیا ہے اور اس اسلحہ سے صوبہ جموں میں مسلمانوں کا منظم طریقے سے قتل عام ہو رہا ہے۔ اس نے دوسری شکایت گاندھی سے کی۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے وزیراعظم مہر چند مہاجن نے صوبہ جموں میں ہزاروں نہتے مسلمانوں کو قتل کروایا جبکہ ان

خانماں بربادوں کے قافلے پاکستان کی طرف جارہے تھے۔ اس کی تیسری شکایت یہ تھی کہ وزیراعظم مہاجن نے ریاستی فوج کے مسلمان سپاہیوں کو قتل کروادیا جبکہ ان سے ہتھیار لے کرانہیں جموں لایا جارہا تھا۔ مہر چند مہاجن لکھتا ہے کہ ''شیخ عبداللہ کی اس قسم کی شکائیتوں کی بنیاد صرف یہ تھی کہ یہ شخص صرف ظاہراً قوم پرست تھا۔ دراصل یہ ایک فرقہ پرست مسلمان تھا جسے ہندوؤں کے جانی و مالی نقصان کی کچھ پرواہ نہیں تھی لیکن مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچتا تھا تو اسے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔'' مہاجن کے بیان کے مطابق ''ان دنوں شیخ عبداللہ نے جموں میں مہاراجہ سے انٹرویو کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی کہ ریاست کشمیر کو سوئٹزرلینڈ کی طرح ایک آزاد ریاست قرار دیا جائے اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی اس کی آزادی کی ضمانت دیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو اس کی اس تجویز سے اتفاق تھا لیکن میں نے اس تجویز کی تائید کرنے سے انکار کردیا تھا۔''[1]

بالآخر حکومت ہندوستان نے مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے وزیراعظم مہر چند مہاجن کی زبردست مخالفت کے باوجود شیخ عبداللہ کو مارچ 1948ء کے اوائل میں ایک بااختیار وزیراعظم کے عہدہ پر فائز کردیا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اکتوبر اور نومبر 1947ء میں صوبہ جموں کے تقریباً دولاکھ مسلمانوں کے قتل عام اور تقریباً 3 لاکھ مسلمانوں کی ان کے گھروں سے جبری بے دخلی کے بعد وادی کشمیر میں ہندوستانی ارباب اقتدار کے خلاف مسلم عوام کی نفرت میں بے انتہا اضافہ ہوا تھا۔ وہ مہر چند مہاجن جیسے انتہائی متعصب، تنگ نظر اور کمینے شخص کو اپنے حکمران کے طور پر کسی صورت قبول نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کے حق میں ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کسی مسلمان کو وزارت عظمٰی کی گدی پر بٹھانا ضروری ہوگیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شیخ عبداللہ ایک تجربہ کار سیاسی لیڈر کی حیثیت سے محض نمائشی عہدہ زیادہ دیر قبول نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عنان اقتدار پوری طرح اس کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ لہٰذا اس نے اپنے ''ذاتی دوست'' کو ایک قسم کا الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر ریاست کا اقتدار مہر چند مہاجن جیسے فرقہ پرست ہندو کے ہاتھ میں رہا تو وادی کشمیر کی مسلم رائے عامہ کبھی بھی ہندوستان کے حق میں نہیں ہو سکے گی۔ لیکن تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت ہندوستان کو سلامتی کونسل کے اجلاس میں شیخ عبداللہ کی خدمات کی ضرورت تھی۔ جنوری اور فروری 1948ء میں تنازعہ کشمیر پر بحث کرنے کے لیے سلامتی کونسل کا جو پہلا اجلاس ہوا تھا اس میں سوویت یونین کے سوا تقریباً سارے ممالک نے پاکستان کے

مؤقف کی تائید کی تھی۔ حکومت ہندوستان چاہتی تھی کہ سلامتی کونسل کے 8/ مارچ کو شروع ہونے والے دوسرے اجلاس میں شیخ عبداللہ کو کشمیری مسلمانوں کے نمائندہ و بااختیار وزیر اعظم کے طور پر پیش کر کے اولاً یہ ثابت کیا جائے کہ کشمیر کی مسلم رائے عامہ ہندوستان کے حق میں ہے اور ثانیاً پاکستان کے اس الزام کی تردید کی جائے کہ ریاست میں مسلمانوں کی بالکل اسی طرح نسل کشی کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے جیسی کہ چند ماہ قبل مشرقی پنجاب میں کی گئی تھی۔ چنانچہ شیخ عبداللہ ریاست کا ''بااختیار'' وزیر اعظم مقرر ہونے کے بعد نیویارک گیا تو وہاں اس نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف بہت زہر افشانی کی۔ اس نے اعلان کیا کہ ''ہم پاکستان کے ساتھ الحاق پر موت کو ترجیح دیں گے۔ ہم اس قسم کے ملک سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے'' اور پاکستانی مندوب ظفر اللہ خان کا جواب یہ تھا کہ ''اگر اس قسم کا شخص ریاست کی انتظامیہ کا سربراہ ہو تو استصواب کیسے غیر جانبدارانہ طور پر ہو سکتا ہے؟۔''[2]

شیخ عبداللہ اپریل میں نیویارک سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وادی کشمیر کی مسلم رائے عامہ پہلے سے بھی زیادہ ہندوستان کے خلاف ہو گئی ہے اور پریم ناتھ بزاز کے بیان کے مطابق اسے اور دوسرے ''قوم پرست'' کشمیری عناصر کو یہ بھی احساس ہو گیا کہ انہوں نے پاکستان کے ایام طفلی میں ہی جاں بحق ہونے کے بارے میں جو قیاس آرائی کی ہوئی تھی اسے واقعات نے بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ قیاس آرائی ہندوستانی سیاست دانوں کی اس پیش گوئی کی بنیاد پر کی تھی کہ پاکستان چند ہفتے سے زیادہ عرصے تک نہیں چل سکے گا۔ اس لیے انہوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان سے الحاق کیا تھا۔ مگر جب وہ پیش گوئی صحیح ثابت نہ ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ جب تک پاکستان قائم ہے کشمیر کے مسلمانوں کے رضا کارانہ طور پر ہندوستان کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہونے کی کبھی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تو انہوں نے اور کشمیر کے ڈوگرہ ہندوؤں نے اپنے سیاسی حربوں میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔[3] ڈوگرہ ہندوؤں کا نیا مؤقف تو یہ تھا کہ اگر کشمیری مسلمان ہندوستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو نہ رہیں۔ وہ بے شک پاکستان چلے جائیں۔ ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو چکا ہے اب اس فیصلے کو کسی قیمت پر بھی بدلا نہیں جا سکتا۔ ان کے برعکس شیخ عبداللہ اور دوسرے قوم پرست عناصر کا خیال تھا کہ اگر سیاسی اقتدار صحیح معنوں میں کشمیری مسلمانوں کو منتقل کر دیا جائے تو وہ ہندوستان میں شامل رہنے پر

آمادہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ شیخ عبداللہ نے پہلے تو مقامی کمیونسٹوں سے صلاح مشورہ کر کے اشاروں کنایوں سے ریاست کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا مگر جب حکومت ہندوستان کی جانب سے ڈانٹ پڑی تو اس نے پینترا بدل کر یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرہ راج کے خاتمہ کا یقین دلانے کے لیے مہاراجہ ہری سنگھ کو گدی سے ہٹا دیا جائے۔

وزیراعظم نہرو نے اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ 20 رجون 1949ء کو مہاراجہ ہری سنگھ تخت سے دستبردار ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا کرن سنگھ ریجنٹ مقرر ہوا۔ شیخ عبداللہ نے اپنی اس کامیابی کو ایک عظیم انقلاب قرار دے کر کشمیری مسلمانوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ آئندہ اقتدار ڈوگرہ راج کے پاس نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنی تقدیر کے خود مالک ہوں گے۔ مگر اس کھوکھلے نعرے کا کوئی اثر نہ ہوا اور کشمیر کی مسلم رائے عامہ ہندوستان کے ساتھ رہنے پر رضامند نہ ہوئی۔ دوسری طرف صوبہ جموں کے ڈوگرہ ہندوؤں نے مہاراجہ ہری سنگھ اور بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں کی شہ پر 1949ء کے اوائل سے شیخ عبداللہ کی حکومت کے خلاف جو ایجی ٹیشن شروع کر رکھی تھی اس نے شدت اختیار کر لی۔ یہ ایجی ٹیشن بظاہر ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے ایک رکن مہیر لال چٹوپادھیا کی اس رپورٹ کے پیش نظر شروع کی گئی تھی جو اس نے صوبہ جموں کا دورہ کرنے کے بعد مارچ میں حکومت ہندوستان کو پیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ''جموں کے ہندوؤں کو یقین ہے کہ استصواب ہوا تو 90 فیصد مسلمان پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے۔ ان کو تشویش ہے کہ انہیں رفتہ رفتہ اقتدار سے الگ کر دیا جائے گا کیونکہ اب انہیں مہاراجہ کی وہ حمایت حاصل نہیں ہے جو قبل ازیں انہیں میسر ہوا کرتی تھی۔''[4] جون میں ڈوگرہ ہندوؤں کی یہ علیحدگی پسندانہ ایجی ٹیشن ذرا اور زیادہ شدید ہوئی تو شیخ عبداللہ کی حکومت نے ان کے ستر سالہ لیڈر پریم ناتھ ڈوگرہ کے علاوہ ان کی جماعت پرجا پریشد کے تقریباً 300 ارکان کو گرفتار کر لیا۔ مگر تقریباً تین ماہ بعد ستمبر میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے بعض سرکردہ ارکان کی مداخلت کے نتیجے میں انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ کو اس تعمیل ارشاد کا معاوضہ یہ دیا گیا کہ 17 ر اکتوبر کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایک آئینی شق منظور کی جس میں یہ وعدہ کیا گیا کہ ہندوستان کے آئین کا بحیثیت مجموعی ریاست جموں و کشمیر پر اطلاق نہیں ہوگا۔

جب ریاست کو آئینی طور پر یہ ''خصوصی درجہ'' ملا تو گردھاری لال ڈوگرہ،

بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی، ڈی۔ پی۔ دھر، جی۔ ایم۔ صادق اور بعض دوسرے مقامی کمیونسٹ عناصر نے شیخ عبداللہ کو مشورہ دیا کہ اگر بنیادی قسم کی معاشی اصلاحات کی جائیں تو کشمیری مسلمانوں کا ہندوستان کے بارے میں رویہ بدل جائے گا۔ ریاست جموں و کشمیر کے یہ کمیونسٹ عناصر پاکستان اور ہندوستان کے روس نواز کمیونسٹوں کی طرح عقل کے اندھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بنیادی معاشی تضاد عوام کے حق میں حل کر دیا جائے تو دوسرے سارے تضادات خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ بنیادی معاشی تضاد بورژوا اسٹیٹ مشینری کی موجودگی میں بھی حل کئے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے مارکس اور لینن کے محض فقرے یاد کئے ہوئے تھے لیکن انہیں مارکسزم اور لینن ازم کی روح تک کبھی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کا مشورہ شیخ عبداللہ کو لے ڈوبا۔ ان کے مشورہ کے مطابق شیخ عبداللہ نے 1950ء کے اوائل میں دو آرڈیننس جاری کئے۔ ایک آرڈی ینس کے ذریعے ریاست کی بڑی جاگیریں ختم کر دی گئیں اور دوسرے آرڈی ینس کے تحت غریب کسانوں پر قرضوں کا بوجھ ہلکا کرنے کا اعلان کیا گیا۔ چونکہ ان اقدامات کی ضرب بڑے بڑے ہندو جاگیرداروں اور ساہوکاروں پر پڑتی تھی اس لیے انہوں نے حسب توقع پہلا کام تو یہ کیا کہ بورژوا اسٹیٹ مشینری کے تعاون سے ان اصلاحات کو عملی طور پر ناکام بنا دیا اور پھر انہوں نے شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ایک طرف تو کشمیر کی مسلم رائے عامہ بدستور اس سے اور اس کے ہندوستانی آقاؤں سے نفرت کرتی رہی کیونکہ اس کی اصلاحات پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا اور دوسری طرف مراعات یافتہ ہندو عناصر اس کی جان کے دشمن بن گئے۔ انہیں مہاراجہ ہری سنگھ کی سبکدوشی پر بھی بہت غصہ تھا چونکہ جواں سال مہاراجہ کرن سنگھ بھی اپنے باپ کی معزولی اور ایک سو سالہ ڈوگرہ راج کے خاتمے پر بہت ناخوش تھا اس لیے وہ عبداللہ کے خلاف ہندو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی پشت پناہی کرتا تھا۔ ہندوؤں کے مراعات یافتہ عناصر یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وادی کشمیر کی مسلمان بھیڑیں ڈوگرہ شیروں پر حکومت کر سکتی ہیں۔ وہ کھلم کھلا کہتے تھے کہ اگر دو ہزار بھیڑوں کے دماغ کو یکجا کر دیا جائے تو پھر بھی ان میں ایک شیر کے دل و دماغ کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

شیخ عبداللہ نے اس کا علاج یہ سوچا کہ ریاست میں عام انتخابات کے ذریعے ایک

دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ ریاست میں منتخب نمائندہ حکومت قائم ہوگی جو مہاراجہ کی بجائے منتخب اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ یہ اسمبلی نہ صرف ڈوگرہ راج کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر کے ریاست کے لیے آئین مرتب کرے گی بلکہ یہ بھی طے کرے گی کہ زمینداروں کو کس شرح سے معاوضہ دیا جائے گا۔ شیخ عبداللہ کے ''ذاتی دوست'' وزیراعظم جواہر لال نہرو کو اس پروگرام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا اپنا پروگرام یہ تھا کہ اس ''منتخب'' اسمبلی کے ذریعے ریاست کے الحاق کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کرا کے یہ اعلان کر دیا جائے گا کہ کشمیر کی رائے عامہ نے ہندوستان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے لہٰذا اب استصواب کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اکتوبر 1951ء میں دونوں ''ذاتی دوستوں'' کے پروگرام پر کچھ اس طرح عمل ہوا کہ ساری دنیا ششدر رہ گئی۔ شیخ عبداللہ کی حکومت اور اس کی نیشنل کانفرنس نے عام انتخابات سے پہلے نہ صرف وادی کشمیر میں اپنے مسلمان مخالفین پر بے پناہ جبر و تشدد کیا بلکہ صوبہ جموں میں ڈوگرہ ہندوؤں کو بھی انتخابی مہم چلانے کی اجازت نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیشنل کانفرنس کے سوا ریاست کی ساری سیاسی جماعتوں نے ''عام انتخابات'' کا بائیکاٹ کیا اور شیخ عبداللہ کی پچھتر ارکان پر مشتمل ساری کی ساری دستور ساز اسمبلی ''بلا مقابلہ'' منتخب ہوگئی۔ بقول جوزف کوربل کوئی ڈکٹیٹر اس سے بہتر ''کارنامہ'' انجام نہیں دے سکتا تھا۔ [5]

''جمہوریت پسند'' جواہر لال نہرو نے اپنے ''ذاتی دوست'' کی اس بے مثال انتخابی دھاندلی اور غنڈہ گردی پر کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ اس نے ''منتخب'' دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کے موقعہ پر خیر سگالی اور نیک خواہشات کا پیغام بھیجا۔ ہندوستان کے دوسرے ارباب اقتدار میں سے بھی کسی کو شیخ عبداللہ کے اس کارنامے پر شرم نہ آئی۔ ہندوستانی اخبارات نے جموں میں ڈوگرہ ہندوؤں پر شیخ عبداللہ کی زیادتیوں پر نکتہ چینی کی مگر انہوں نے وادی کشمیر میں ''شیر کشمیر'' کی انتخابی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ ہندوستانی لیڈروں اور اخبارات کے منافقانہ اور دوغلے رویے سے یہ حقیقت ایک مرتبہ اور واضح ہوگئی کہ بورژوا انتخابات کی بنیاد بالعموم غریب عوام سے دھوکے اور بددیانتی پر ہوتی ہے۔ جاگیردارانہ معاشرے میں تو ان انتخابات میں سرے سے کوئی انصاف ہوتا ہی نہیں اور بورژوا معاشرے میں انتخابات صرف اس وقت تک ''منصفانہ'' ہوتے ہیں جب تک کہ حکمران طبقے کے بنیادی مفادات کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ ریاست جموں

کشمیر میں جواہر لال نہرو اپنی ''جمہوریت پسندی'' کے بلند بانگ دعووں کے باوجود منصفانہ انتخابات کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''اگر دستور ساز اسمبلی کے انتخابات غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتے تو یہ بات یقینی تھی کہ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کو صوبہ جموں میں شکست فاش ہوتی۔ اگرچہ کانگرسی لیڈر اور ہندوستانی اخبارات یہ نہیں چاہتے تھے کہ وادی میں ''قوم پرستوں'' کو پاکستان نواز مخالفین سے شکست ہو اور انہوں نے ''قوم پرستوں'' کے ان ظالمانہ ذرائع کی پس پردہ تائید وحمایت کی تھی جو انہوں نے ان مخالفین کو کچلنے کے لیے استعمال کئے تھے۔ لیکن جب انہیں جموں کے ہندو ڈوگروں پر مظالم کی دلخراش رپورٹیں موصول ہوئیں تو وہ بہت بے چین ہوئے اور ہندوستانی پریس کے ایک طاقتور حصے نے ان رپورٹوں کی خوب تشہیر کی۔ لہٰذا کشمیر میں 47-1937ء کی برصغیر کی تاریخ دہرائی جانے لگی۔ یعنی مسلم نیشنلزم کے ہندو نیشنلزم کے ساتھ تصادم میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اول الذکر کی نمائندگی نیشنل کانفرنس کرتی تھی اور پرجا پریشد آخر الذکر کی نمائندہ تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ برصغیر میں نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ کو مکمل آزادی تھی لیکن یہاں کشمیر میں نیشنل کانفرنس اس حکومت ہندوستان کے زیر فرمان تھی جو پرجا پریشد کی روحانی حلیف تھی۔ اس لیے دونوں کے درمیان کشمکش میں بالآخر نیشنل کانفرنس کی شکست یقینی تھی۔''[6]

تاہم مدراس کے اخبار ''ہندو'' کی 13 راکتوبر کی رپورٹ میں جواہر لال نہرو سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ ''کشمیری عوام نے عام انتخابات میں جس طریقے سے ووٹ دیئے ہیں اس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ نیشنل کانفرنس اور ہندوستان کے ساتھ ہیں۔'' پھر اسی اخبار نے یکم نومبر کی اشاعت میں کشمیر دستور ساز اسمبلی کے صدر کی یہ تقریر شائع کی کہ ''کشمیر کو اقوام متحدہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ یہ ادارہ بین الاقوامی سازشوں کا اکھاڑہ بن گیا ہے۔ کشمیر اور اقوام متحدہ کے راستے الگ الگ ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ نیشنل کانفرنس نے کشمیر کے رائے دہندگان کے سامنے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا پروگرام پیش کیا تھا اور اس پروگرام پر ریاست کے ہر بالغ رائے دہندہ نے تصدیق کی مہر ثبت کر دی ہے۔''[7] دستور ساز اسمبلی کے صدر کے اس بیان سے جواہر لال نہرو کے پروگرام کی تکمیل ہوئی تو پھر شیخ عبداللہ نے بھی 20 رنومبر 1941ء کو اپنے پروگرام کو جامۂ عمل پہنا دیا۔ اس نے اسمبلی سے ایک آئین منظور کروایا جس میں

دفاع، امورخارجہ اورمواصلات کے علاوہ باقی تمام امور میں ریاست کی مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا۔ مہاراجہ کوسارے اختیارات سے محروم کرکے اسے ریاست کا محض آئینی سربراہ قرار دیا گیا اور یہ بھی طے کیا گیا کہ آئندہ ریاستی حکومت مہاراجہ کے بجائے اسمبلی کے روبرو جوابدہ ہوگی۔ خودسری کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے تضاد سے فائدہ اٹھا کر ریاست کی نیم آزاد حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا غالباً خیال یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان فوجی لحاظ سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا اور ہندوستان اس بنا پر ریاست کے ''نیشنل سٹیٹس'' کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا۔ اسے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ ہندوستان اور جموں کے انتہا پسند ہندوؤں کے متعصّبانہ رویے کے پیش نظر وادی کشمیر کے مسلمان ریاست کے ہندوستان سے مکمل الحاق پر کبھی برضا ورغبت آمادہ نہیں ہوں گے۔ البتہ اس کی رائے میں کشمیری مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جاسکتا تھا کہ کشمیر کی حیثیت سوئٹزرلینڈ کی طرح ایک آزاد ملک کی ہوگی اور ہندوستان و پاکستان دونوں ہی اس کی آزادی کی ضمانت دیں گے۔

حکومت ہندوستان نے وقتی طور پر شیخ عبداللہ کی اس کاروائی پر خاموشی اختیار کئے رکھی لیکن صوبہ جموں کے ڈوگرہ ہندوؤں نے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ 15رجنوری 1952ء کو جموں کے گاندھی میموریل کالج میں ایک سرکاری تقریب ہوئی تو گورنمنٹ کالج کے دس پندرہ ہندو طلبا نے شیخ عبداللہ کی موجودگی میں مظاہرہ کیا۔ انہیں اعتراض یہ تھا کہ اس تقریب میں ہندوستان کے قومی پرچم کے ساتھ نیشنل کانفرنس کا پرچم کیوں لہرایا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد چند طلبا کو کالج سے خارج کردیا گیا تو سینکڑوں ہندو طلبا کی ستیہ گرہ شروع ہوگئی اور پھر جب چند ستیہ گرہیوں کو گرفتار کیا گیا تو 8رفروری کو شہر میں زبردست مظاہرہ ہوا۔ مظاہرین نے صوبائی سیکرٹریٹ پر ہلہ بول کر اس کی عمارت کو نقصان پہنچایا اور فرنیچر نذر آتش کردیا۔ اس پر فوج طلب کر لی گئی۔ شہر میں 72 گھنٹے کا کرفیو نافذ کردیا گیا اور پرجا پریشد کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا جن میں پریم ناتھ ڈوگرہ بھی شامل تھا۔ ہندوستان کے اخبارات نے شیخ عبداللہ کی حکومت کی ڈوگرہ ہندوؤں کے خلاف اس کاروائی پر بہت شور مچایا اور بڑے بڑے ہندو لیڈروں نے بھی اس کی مذمت کی۔ جواہرلال نہرو کو بھی اپنے ''ذاتی دوست'' کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ چنانچہ اس نے اپریل میں اپنے ایک وزیر این۔ جی۔ آئنگر کو جموں بھیجا اور اس کے ''مشورے کے مطابق پرجا پریشد کے سارے

لیڈروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔""شیر کشمیر" کی پھونک نکل گئی۔ اسے ایک مرتبہ اور پتہ چل گیا کہ جب کبھی اس کی "قوم پرستی" اور ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے درمیان تضاد ہو گا تو ہندوستان کی مرکزی قیادت ہندو فرقہ پرستوں کا ساتھ دے گی۔ اس کا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام مسلمانوں کا سا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً کشمیری مسلمانوں کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا اور اس کا یہ گناہ تو بالکل ہی نا قابل معافی تھا کہ وہ برصغیر میں ایک اور مسلم ریاست کے قیام کا خواب دیکھ رہا تھا۔

حکومت ہندوستان کے اس جانبدارانہ رویے سے شیخ عبداللہ کی بڑی سبکی ہوئی۔ وہ سیاسی طور پر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ جواہر لال نہرو نے کشمیر کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کے بارے میں اس سے جو وعدہ کر رکھا تھا وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ثابت ہوا۔ لہٰذا اس نے ریاست کے الحاق کے مسئلہ پر پھر قلابازی کھائی۔ اس نے پہلے تو 11 / مارچ کو ایک تقریر میں آزاد کشمیر کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے آپ کو ان پاکستانی حکمرانوں سے آزاد کرانے کے لیے "مثبت اقدامات" کریں جو "تمہیں گمراہ کرنے اور حقائق سے بیگانہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔" اس نے وعدہ کیا کہ "ہم تمہیں آزاد کرانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔"[8] پھر اس نے 25 / مارچ کو دستور ساز اسمبلی میں ہندوستان کے عام انتخابات کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "ہندوستانی عوام نے ایک مرتبہ پھر جواہر لال نہرو کی ولولہ انگیز قیادت میں سیکولرازم اور جمہوریت کے اصول کو سر بلند کیا ہے۔ ہندوستان میں سیکولر جمہوریت کی فتح سے ان اصولوں کی تائید ہوتی ہے جن کے لیے کشمیر جدوجہد کرتا رہا ہے۔"[9] اور پھر اس نے 19 / اپریل 1952ء کو رنبیر سنگھ پورہ میں ایک سنسنی خیز تقریر کی جو بالآخر اس کے سیاسی زوال کا باعث بنی۔ اس نے کہا کہ "اگر ہندوستان کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں فرقہ پرستی قطعی طور پر ختم کر دی گئی ہے تو انہیں ایسا سوچنے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان میں ابھی تک فرقہ پرستی موجود ہے۔ بہت سے کشمیریوں کو یہ خدشہ لاحق ہے کہ اگر پنڈت نہرو کو کچھ ہو گیا تو ان کا اور ان کی پوزیشن کا کیا بنے گا؟"[10]

اگرچہ شیخ عبداللہ کی یہ تقریر جموں اور ہندوستان کے انتہا پسند ہندوؤں کو اشتعال دلانے کے لیے بہت کافی تھی لیکن اس نے اپنے "باغیانہ رجحان" کو اسی پر ختم نہ کیا۔ اس نے

18 رمئی کو نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کی میٹنگ بلائی اور اس مضمون کی قرارداد منظور کروانے کی کوشش کی کہ کشمیر کو ''مکمل آزادی وخودمختاری'' ملنی چاہیے۔ لیکن بخشی غلام محمد اور بعض دوسرے ارکان اس پر متفق نہ ہوئے۔ ہندوستانی اخبارات نے شیخ عبداللہ کے باغیانہ رجحان کے اس اظہار پر بہت شور مچایا۔ ہندوستان ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ ہندوستان کے آئین کی کشمیر سے متعلقہ دفعہ 370 کی تعبیر وتشریح خواہ کچھ ہی ہو کشمیر کے ارباب اختیار کو آئینی امور کے بارے میں کوئی اقدام کرنے سے پہلے اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔''[11]

جواہر لال نہرو بھی اپنے ''ذاتی دوست'' کی سرکشی کے بارے میں رپورٹوں سے بہت پریشان ہوا۔ اس نے پہلے تو شیخ عبداللہ کو دہلی بلایا مگر جب اس نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو نہرو خود سری نگر پہنچ گیا اور اس نے نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ارکان کو خطاب کرتے ہوئے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ ملحق رہنے سے نہ صرف کشمیری مسلمانوں کو بلکہ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ لیکن شیخ عبداللہ پر اس دلیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جموں میں ہندوؤں کی ایجی ٹیشن نے اس کی انا کو بری طرح مجروح کیا تھا۔ وہ ہندوستان کے ہندو فرقہ پرستوں سے بھی برگشتہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ پس پردہ کشمیر کی آزادی وخودمختاری کی تلقین کرتا رہا جب کہ بخشی غلام محمد وغیرہ اس کی مخالفت کرتے رہے۔ جب جون میں اس کی دستور ساز اسمبلی کا سیشن ہوا تو شیخ عبداللہ نے ایک قرارداد منظور کروائی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ نیشنل کانفرنس کے سرخ پرچم کو کشمیر کا قومی پرچم تصور کیا جائے گا۔

قدرتی طور پر ہندوستان کے حکمران بورژوا طبقے کے لیے شیخ عبداللہ کا یہ رویہ بالکل ناقابل برداشت تھا۔ اس نے ریاست جموں وکشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا بندوبست محض اخلاقی وجوہ کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پس پردہ اس کے توسیع پسندانہ عزائم کارفرما تھے۔ وہ جنگی اہمیت کے اس علاقے کے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات کی مزید اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے تو ہندوستان ٹائمز اور دوسرے ہندوستانی اخبارات نے شیخ عبداللہ کو متنبہ کیا کہ اس قسم کی بڑھکیں نہ مارے کیونکہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے اور پھر جموں کی پرجا پریشد نے جون کے تیسرے ہفتے میں جمہوریہ ہندوستان کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ایک یادداشت پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ''ہم جموں میں ہندوستان کے مکمل آئین کا اطلاق

چاہتے ہیں۔ہم سپریم کورٹ کا تحفظ چاہتے ہیں۔ہم سارے ہندوستانیوں کی طرح بنیادی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم وہی پرچم چاہتے ہیں جس کی ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اجازت ہے۔ ہم شیخ عبداللہ کا سرخ پرچم نہیں چاہتے۔ہم سمجھتے ہیں یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جموں کے ہندوستان کے ساتھ مکمل الحاق کے سدباب کی ہر کوشش کی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کریں۔کشمیر کی دستور ساز اسمبلی محض ایک پارٹی کی نمائندہ نہیں ہے۔''اس میں جموں کے عوام کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ چونکہ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں بھی ریاست کی نمائندگی اسی دستور ساز اسمبلی کے نامزد کردہ ارکان کرتے ہیں اس لیے ہندوستانی پارلیمنٹ میں بھی ہمارا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔''[12] ہندوستانی اخبارات میں پرجا پریشد کی اس یادداشت کی بہت تشہیر ہوئی اور بہت سے سرکردہ ہندو لیڈروں نے اپنے بیانات اور تقریروں میں اس کی پرزور تائید کی۔ ان کے پراپیگنڈے کا خلاصہ یہ تھا کہ شیخ عبداللہ کو ہم نے ہی ''شیر کشمیر'' بنایا ہے اور اب ہماری یہ بلی ہمیں ہی میاؤں کرنے لگی ہے۔

وزیراعظم جواہر لال نہرو سارے ہندوستان میں اپنے ''ذاتی دوست'' کے خلاف اس معاندانہ پراپیگنڈا سے بہت فکرمند ہوا۔اس نے جولائی میں شیخ عبداللہ اور اس کے بعض ساتھیوں کو دہلی بلایا کئی دن کی بات چیت کے بعد دونوں ''ذاتی دوستوں'' میں ایک معاہدہ ہوا جس کا اعلان جوہر لال نہرو نے 24رجولائی 1952ء کو ہندوستان کی لوک سبھا میں کیا۔اس معاہدے میں ریاست جموں وکشمیر کے ''سپیشل سٹیٹس'' کو تسلیم کرتے ہوئے یہ قرار دیا گیا کہ ''آئندہ ریاست کے سربراہ کو صدر ریاست کہا جائے گا اور اس کا انتخاب ریاستی اسمبلی کرے گی۔ریاست میں غیر ریاستی باشندوں کو مقامی حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی جائیداد خریدنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔صدر جمہوریہ ہند بیرونی حملے یا اندرونی بدامنی کے پیش نظر ریاست میں ہنگامی حالات کا اعلان کر سکے گا لیکن وہ ایسا کرنے سے پہلے مقامی حکومت کی رضامندی حاصل کرے گا اور ہندوستان کی سپریم کورٹ کے اختیارات کا ریاست میں محدود پیمانے پر اطلاق ہوگا۔اگرچہ نیشنل کانفرنس نے اس معاہدے کو اپنی شاندار فتح قرار دیا اور شیخ عبداللہ نے 25رجولائی کو اپنی جموں میں واپسی پر کانفرنس کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ کوئی کاغذی معاہدہ نہیں ہے بلکہ یہ دلوں کا ملاپ ہوا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔''لیکن دراصل یہ نام نہاد معاہدہ

وادی کشمیر کے مسلم عوام کے لیے ایک دھوکے کی ٹٹی تھی۔ جواہر لال نہرو نے اس معاہدے کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر کو بظاہر ''سپیشل سٹیٹس'' دیا تھا لیکن دراصل اس نے شیخ عبداللہ سے پرجا پریشد کے وہ سارے مطالبات منوا لیے تھے جو جون کے تیسرے ہفتے میں صدر جمہوریہ ہند کے روبرو پیش کئے گئے تھے۔ اس نے وقتی مصلحت کی بنا پر کشمیر کو محض کاغذ پر ''سپیشل سٹیٹس'' دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہندوستانی فوج کشمیر میں موجود ہے اور یہ کہ بورژوا سیاست میں فوج کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے گا اس فوج کی امداد سے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی کاروائی مکمل کر لے گا۔ شیخ عبداللہ کے پاس کوئی فوج یا پولیس نہیں تھی۔ وہ محض ایک کاغذی شیر تھا۔ وہ کسی معاہدے کو بزورِ قوت جامہ عمل نہیں پہنا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جواہر لال نہرو نے 24 ر جولائی کو لوک سبھا میں اس معاہدے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس معاہدے میں کوئی بات قطعی نہیں ہے۔ ہم رفتہ رفتہ اس میں مزید تفصیلات شامل کر لیں گے۔ ابتدا میں ساری ریاستوں نے صرف تین امور کے بارے میں انڈین یونین سے الحاق کیا تھا۔ لہٰذا اس امر کا امکان ہے کہ ہم دوسری ریاستوں کی طرح کشمیر میں بھی کچھ بعد مزید امور کا انتظام سنبھال لیں گے۔ چند ماہ بعد 17 ر فروری 1953ء کو نہرو نے کونسل آف سٹیٹ میں کہا کہ پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن ریاست کے ہندوستان سے مکمل الحاق کے لیے ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ کشمیر کا بھی ہندوستان کے ساتھ الحاق اس طرح ہوا تھا جیسا کہ دوسری ریاستوں کا ہوا تھا۔ یہ الحاق بالکل مکمل ہے۔ سردار پٹیل کی دانشمندانہ پالیسی کی وجہ سے دوسری ساری ریاستیں ہندوستان میں پوری طرح مدغم ہو چکی ہیں۔ جنگ، اقوام متحدہ اور بعض دوسری مشکلات کی وجہ سے ہم ابھی تک کشمیر میں اس پالیسی پر عمل نہیں کر سکے ہیں۔ تاہم گذشتہ سال دہلی میں شیخ عبداللہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس سے کشمیر کے ہندوستان میں ادغام کے عمل میں پیش قدمی ہوئی ہے۔

چنانچہ جب شیخ عبداللہ نے معاہدے کی ان شقوں پر عملدرآمد کی کوشش کی جن سے ریاست کے ''سپیشل سٹیٹس'' کی بو آتی تھی تو جموں کے ڈوگرہ ہندوؤں نے بہت برا منایا۔ ان میں سے ایک شق یہ تھی کہ ڈوگروں کے موروثی اقتدار کو ختم کر کے ریاست کے صدر کا انتخاب کیا جائے گا۔ پرجا پریشد کے لیڈر پریم ناتھ ڈوگرہ نے شیخ عبداللہ کی حکومت کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے 20 ر اکتوبر 1952ء کو ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ جموں میں سول

نافرمانی کی تحریک چلائی جائے گی۔ سارے ہندوستان کے اخبارات اور سرکردہ ہندو لیڈروں نے اس کے اس اعلان کی پرزور تائید و حمایت کی۔ تاہم شیخ عبداللہ نے 14 رنومبر کو مہاراجہ کرن سنگھ کو اس خیال سے ریاست کا پہلا صدر منتخب کروایا کہ اس طرح ہندوؤں کے علاوہ ہندوستان کے سارے انتہا پسند ہندوؤں کا غصہ بہت حد تک فرو ہو جائے گا۔ لیکن اس کا یہ خیال سراسر غلط ثابت ہوا۔ جب 24 رنومبر کو نئے صدر ریاست کی جموں میں آمد پر سرکاری طور پر استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تو ہندوؤں نے شہر میں مکمل ہڑتال کر کے زبردست مظاہرہ کیا۔ تقریب میں چند وزیروں اور افسروں کے سوا کوئی شخص شریک نہ ہوا اور پرجا پریشد کے رضا کاروں نے استقبالیہ محرابوں اور جھنڈیوں وغیرہ کو توڑ پھوڑ دیا۔ جب اس بنا پر 26 رنومبر کو پرجا پریشد کے لیڈر پریم ناتھ ڈوگرہ اور اس کے بعض ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تو ڈوگروں نے ایک پرتشدد تحریک شروع کر دی۔ ان کا نعرہ یہ تھا: ''ایک صدر، ایک جھنڈا اور ایک آئین۔'' وہ ریاست کشمیر کے الگ صدر، الگ جھنڈے اور الگ آئین کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کئی ہفتے تک پورے صوبہ جموں میں زبردست جلسے اور مظاہرے ہوتے رہے۔ چونکہ ڈوگرہ پولیس کی ہمدردیاں مظاہرین کے ساتھ تھیں۔ اس لیے شیخ عبداللہ کو امن و امان بحال کرنے کے لیے حکومت ہندوستان سے پولیس کی امداد طلب کرنا پڑی۔ تاہم صوبہ جموں میں شیخ عبداللہ کا اقتدار عملی طور پر ختم ہو گیا اور نئی دہلی کے نہرو۔ عبداللہ معاہدے کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ چونکہ ڈوگرہ مظاہرین ہندوستان کا قومی پرچم اور صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تصویریں اٹھا کر ستیہ گرہ کرتے تھے اس لیے ہندوستان کے اخبارات میں ان کی بہت تشہیر ہوئی۔ شیخ عبداللہ بے بس ہو گیا۔ اب اس کا اقتدار حکومت ہندوستان کے رحم و کرم پر تھا۔ اس نے اپنے ''ذاتی دوست'' جواہر لال نہرو سے جو ''سپیشل سٹیٹس'' حاصل کیا تھا اس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ مشرقی پنجاب کی سکھ پولیس اس کا اور اس کے وزیروں کا تحفظ کرنے پر مامور تھی۔ شیخ عبداللہ کی بے بسی کا یہ عالم ہو گیا کہ لداخ کے ہیڈ لامہ نے بھی ڈوگرہ ہندوؤں کے زیر اثر اپنے علاقے کی خود مختاری کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے بیانات کے مطابق لداخ کے بدھ عوام بھی جموں کے ہندوؤں کی طرح وادی کشمیر کے مسلمانوں کے غلبہ کے تحت رہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس نے 5 ردسمبر 1952ء کو ایک امریکی خبر رساں ایجنسی سے انٹرویو میں کہا کہ ''کشمیر کی آزاد ریاست میں

بدھوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ ماضی میں لداخ کا علاقہ صرف مہاراجہ کی وجہ سے کشمیر کے ساتھ وابستہ تھا۔ اب جبکہ موروثی حکمرانی ختم ہوگئی ہے تو یہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ کشمیر کی پولیس نے لداخی عوام پر بہت ظلم کئے ہیں اور وہ اب اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ان تبدیلیوں کا جائزہ لے رہے ہیں جو آج کل تبت میں ہو رہی ہیں۔''[13]

16 رجنوری 1953ء کو شیخ عبداللہ آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے حیدرآباد گیا تو وہاں اس پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ اس نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے ساتھ اپنی وفاداری کا بہت یقین دلایا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ جموں کے ہندوؤں کی شکایات کی تحقیقات کر کے ان کے انسداد کی کوشش کی جائے گی مگر ڈوگروں کی، ایجی ٹیشن پسند ہندوؤں کی جماعتیں آل انڈیا جن سنگھ، ہندو مہاسبھا، رام راجیہ پریشد اور اکالی دل اس ایجی ٹیشن کی زور شور سے پشت پناہی کر رہی تھیں۔ جن سنگھ نے دسمبر میں سالانہ اجلاس کے دوران اپنے صدر شیاما پرشاد مکرجی کو اختیار دیا تھا کہ وہ جموں کے ہندوؤں کی شکایات کے ازالہ کے لیے حکومت ہندوستان سے رابطہ قائم کرے اور اگر اسے اس میں ناکامی ہو تو ستیہ گرہ کا پروگرام مرتب کرے۔ انہی دنوں اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے لکھنؤ میں یہ بیان دیا تھا کہ ''اگرچہ ریاست کشمیر اس وجہ سے پاکستان میں شامل ہونی چاہیے تھی کہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اب اس ریاست میں شرنارتھیوں کو آباد کرنا چاہیے۔'' دیش پانڈے، تریودی اور بعض دوسرے ہندو ارکان پارلیمنٹ کا مؤقف یہ تھا کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کشمیر کی مسلم رائے عامہ کو نفسیاتی طور پر ہندوستان کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کے سلسلے میں ہندوستان کی یکجہتی کو گزند پہنچائے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہندوستان کے جمہوری اور غیر فرقہ وارانہ آئین کو قبول کرنے میں کیوں تامل کیا جا رہا ہے۔

مارچ 1953ء میں تنازعہ کشمیر کے بارے میں مکرجی۔ نہرو بات چیت ناکام ہوگئی تو جن سنگھ، ہندو مہاسبھا اور رام راجیہ پریشد نے دہلی میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ یہ تحریک تقریباً تین ماہ تک جاری رہی اور اس میں تقریباً چار ہزار افراد گرفتار ہوئے۔ شیخ عبداللہ نے جموں کے فرقہ پرست ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے 17 راپریل کو ایک ریڈیو تقریر میں اعلان کیا کہ ریاست کے لیے جو آئین مرتب کیا جا رہا ہے اس کے تحت صوبہ جموں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری

دی جائے گی۔ اس نے کہا کہ مجوزہ آئین کے تحت ریاست کا ہندوستانی مقبوضہ علاقہ تین یونٹوں پر مشتمل ہوگا۔ صوبہ جموں اور وادی کشمیر کی الگ الگ قانون ساز اسمبلیاں ہوں گی اور لداخ میں ایک منتخب ایڈوائزری کونسل قائم کی جائے گی۔ مرکزی حکومت کشمیر، جس کا نام ''اٹونومس فیڈریٹڈ یونٹ آف ری پبلک آف انڈیا'' ہوگا ان تینوں صوبائی حکومتوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی کیونکہ ایک جمہوری معاشرے میں ایک علاقہ کے لوگوں کا دوسرے علاقے کے لوگوں پر غلبے کا تصور نفرت انگیز ہوتا ہے۔ لیکن جموں اور ہندوستان کے فرقہ پرست ہندو اس اعلان سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔ 8رمئی کو شیاما پرشاد مکر جی نے اعلان کیا کہ میں آہنی پردے کے پیچھے حالات کا جائزہ لینے کے لیے کشمیر جاؤں گا اور اس مقصد کے لیے کوئی اجازت نامہ حاصل نہیں کروں گا۔ میں بالکل اسی طرح کشمیر جاؤں گا جس طرح کہ جواہر لال نہرو 1946ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد وہاں گیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے مکر جی کی اس دھمکی کے پیش نظر 9رمئی کو ایک آرڈیننس نافذ کیا جس میں کہا گیا تھا کہ جو شخص خصوصی اجازت نامے کے بغیر ریاست کی حدود میں داخل ہوگا اسے قید کی سزا دی جائے گی لہٰذا جب مکر جی حسب اعلان 11رمئی کو کشمیر میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا تو اسے گرفتار کر کے سری نگر کے نزدیک ایک ڈاک بنگلے میں نظر بند کر دیا گیا۔

اگلے دن جب اخباروں میں مکر جی کی گرفتاری کی خبر چھپی تو جموں میں مکمل ہڑتال ہوئی اور پر تشدد مظاہرے ہوئے۔ ہندوستان میں بھی جگہ جگہ جلسوں اور مظاہروں کے ذریعے حکومت کشمیر کی مذمت کی گئی۔ اس پر شیخ عبداللہ کا ردعمل یہ تھا کہ اس نے 15رجون کو ایک بیان میں کشمیر کی ''مکمل آزادی وخودمختاری'' کے تصور کا اشارۃً اعادہ کیا اور متنبہ کیا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے بارے میں خفیہ طور پر کوئی فیصلہ ہوا تو کشمیری عوام اسے قبول نہیں کریں گے۔ انہی دنوں ہندوستانی اخبارات میں شیخ عبداللہ کے مجوزہ آئین کا ایک مسودہ بھی شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''کشمیر کی خود اپنی آزاد فوج ہوگی اور ہندوستان ریاست کے صرف خارجی امور کا ذمہ دار ہوگا۔''

شیخ عبداللہ کے اس رویے کے پیش نظر جموں اور نئی دہلی میں اس کے خلاف احتجاجی تحریک اور بھی تیز ہوگئی اور پھر جون کے تیسرے ہفتے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ''شیر کشمیر'' کے بکری بننے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ 23رجون کو پیرانہ سال شیاما پرشاد مکر جی سری نگر کے ہری سنگھ

ہسپتال میں پھیپھڑوں کی بیماری کے باعث یکا یک فوت ہو گیا۔اس پر پورے ہندوستان کے ہندو حلقوں میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا۔جن سنگھ، ہندومہاسبھا اور رام راجیہ پریشد کا الزام یہ تھا کہ مکر جی کو قتل کیا گیا ہے۔اندرون کشمیر کا ردعمل یہ ہوا کہ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس میں پھوٹ پڑ گئی۔محی الدین کرا، میر واعظ ہمدانی اور بعض دوسرے لیڈر شیخ عبداللہ سے الگ ہو کر ان عناصر سے جا ملے جو ریاست سے ہندوستانی فوجوں کے انخلا اور آزاد استصواب رائے عامہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ سری نگر میں مسلمانوں کا زبردست مظاہرہ ہوا جس میں ''پاکستان زندہ باد'' اور ''آزاد کشمیر زندہ باد'' کے نعرے لگائے گئے۔ 27 رجون کو اس مظاہرے کے قائدین کو گرفتار کر لیا گیا تو کشمیری مسلمانوں میں ''ہندو سامراج'' کے خلاف نفرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔نہرو ان دنوں لندن میں تھا۔جب وہ واپس آیا تو اس نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو بہت ہی مکدر پایا۔کوئی شخص اس کے ''ذاتی دوست'' شیخ عبداللہ کے لیے کلمہ خیر نہیں کہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بیان میں جموں کے ہندوؤں سے اظہار ہمدردی کیا اور کہا کہ ان کی شکایات کا ازالہ ہونا چاہیے۔اس نے جموں پرجا پریشد سے اپیل کی کہ ''ایجی ٹیشن'' بند کر دیجئے اور امن وتعاون کی سیاست اختیار کیجئے۔اگر موجودہ صورت حال جاری رہی تو ریاست جموں وکشمیر اور ہندوستان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔'' یہ اپیل مؤثر ثابت ہوئی اور 7 رجولائی کو صوبہ جموں اور دہلی میں ایجی ٹیشن کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ ریاست کے سارے ہندو نظر بندوں کو فوراً رہا کر دیا گیا لیکن وادی کشمیر کے ان مسلمانوں کو رہائی نصیب نہ ہوئی جو غیر ملکی فوجوں کے انخلا اور استصواب رائے عامہ کا مطالبہ کرنے کی بنا پر قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔

شیخ عبداللہ کو صوبہ جموں کے ڈوگرہ ہندوؤں کی اس تیسری ایجی ٹیشن کی کامیابی سے بہت دکھ ہوا۔اس نے بے انتہا ہتک محسوس کی۔اسے یوں لگا کہ اس کے ''ذاتی دوست'' نہرو نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔اس کی ساری سیاسی کروفر اور قوت کا انحصار اپنے اس ''ذاتی دوست'' کی بھرپور تائید وحمایت پر تھا لیکن اب اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کے سیاسی آشیانے کو آگ لگ گئی ہے اور جن پتوں پر اس نے تکیہ کیا ہوا تھا وہی اس آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ وہ بالکل بوکھلا گیا۔اس نے 11 رجولائی کو اپنی نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے ہندوستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس امر کی ضمانت

دے سکے کہ جن شرائط کی بنیاد پر ریاست کا ہندوستان سے الحاق قائم ہے انہیں مستقبل میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ جن چند ہندوستانی لیڈروں نے پریشد کی ایجی ٹیشن کی مخالفت کی ہے وہ بھی صرف یہ کہتے ہیں کہ پریشد کے مقاصد صحیح ہیں لیکن اس کے حصول کا طریقہ غلط ہے۔ سارے ہندوستانی اخبارات نے بھی اس مؤقف کی تائید کی ہے۔ ہندوستان میں کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے جو ہندوستان اور کشمیر کے موجودہ تعلقات کو برقرار رکھنے کے حق میں ہو۔ اگرچہ پریشد کی ایجی ٹیشن ختم ہوگئی ہے لیکن نظریات اور مفادات کا تصادم بدستور موجود ہے۔ وہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ انضمام کا بدستور مطالبہ کر رہے ہیں اور جب تک وہ اپنے اس مؤقف پر قائم رہیں گے اس وقت تک ہندوستان اور کشمیر کے موجودہ تعلقات پر تلوار لٹکتی رہے گی۔''[14] دو دن بعد یعنی 13ر جولائی کو شیخ عبداللہ نے ایک پبلک جلسے میں بھی اسی قسم کی تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''ہندوستان اس وقت تک کشمیر کو حق خود اختیاری دینے پر آمادہ نہیں ہوگا جب تک کہ اسے پوری طرح یقین نہیں ہو جائے گا کہ رائے عامہ اس کی حمایت کرے گی۔ اگر مجھے پتہ چلا کہ ہم آزاد و خود مختار رہ کر ہی ترقی و خوشحالی کی راہ پر چل سکتے ہیں تو میں اس کے حق میں آواز اٹھانے میں کوئی تامل نہیں کروں گا اور اگر مجھے محسوس ہوا کہ ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے ترقی کر سکتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے ایسا کہنے سے نہیں روک سکے گی[15]۔'' پھر اس نے 24ر جولائی کو اپنی پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کشمیر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا شکوہ کیا۔ اس نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''حکومت ہندوستان کے تینوں مرکزی محکموں، دفاع، امور خارجہ اور مواصلات میں کشمیری مسلمانوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ بے روزگار کشمیری مسلمان اب بھی پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں۔ کیونکہ حکومت ہندوستان کی ملازمتوں کے دروازے ہندوؤں کے لیے تو کھلے ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے بالکل بند ہیں۔ جب میں مسلمانوں کی ان مشکلات و شکایات کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے فرقہ پرست کہا جاتا ہے۔ شیخ عبداللہ نے اگلے دن 25ر جولائی کو ایک اور تقریر میں کہا کہ پچھلے سال کے فرقہ وارانہ واقعات نے ہمارے تعلقات کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ہندوستان کے وہ عناصر اس کے ذمہ دار ہیں جو ریاست کو ہندوستان میں جبراً مدغم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن شرائط کے تحت ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہوا تھا ہم اب بھی ان کے حق میں ہیں

لیکن یہ انتہا پسند ہندوستانی عناصر ان کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس بنا پر کشمیری عوام کے ہندوستان پر اعتماد کو سخت دھچکا لگا ہے۔[16]''

شیخ عبداللہ کی اس تلخ نوائی کے دوران مرزا افضل بیگ، غلام محی الدین ہمدانی اور مبارک شاہ وغیرہ اس کے شامل حال تھے۔ وہ ان دنوں اپنی تقریروں میں ریاست کے ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام کی مخالفت کر کے کشمیری عوام کے لیے حق خود اختیاری کا مطالبہ کرتے تھے۔لیکن شیخ عبداللہ کے معتمد ترین نائب بخشی غلام محمد نے ہوا کا رخ دیکھ کر اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنے لیڈر کے خلاف حکومت ہندوستان کے ساتھ ساز باز کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے 26/جولائی کو اپنے ایک بیان میں شیخ عبداللہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس نے کہا کہ ''کشمیری عوام ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے دفاع کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔'' لیکن شیخ عبداللہ نے اس کے جواب میں اگست کے اوائل میں ایک ایسا بیان دیا کہ نئی دہلی کے ارباب اقتدار ششدر رہ گئے۔اس نے کہا کہ ''کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ ابتدائی الحاق مجبوری کے تحت ہوا تھا کیونکہ ہندوستان نے الحاق کے بغیر ہر قسم کی امداد دینے سے انکار کر دیا تھا۔'' قبل ازیں چونکہ شیخ عبداللہ نے اپنی نئی لائن کی توثیق کے لیے اپنی پارٹی کی مجلس عاملہ اور جنرل کونسل کے اجلاس 24 اور 26/اگست کو طلب کر لیے تھے اور یہ بھی اعلان کیا تھا کہ وہ 21/اگست کو عید کے موقعہ پر اپنے آئندہ کے پروگرام کی تفصیلات کا اعلان کرے گا اس لیے حکومت ہندوستان نے بھی جولائی کے آخری ہفتے میں صدر ریاست کرن سنگھ اور بخشی غلام محمد کو نئی دہلی بلا کر مناسب ہدایات دے دی تھیں۔حکومت ہندوستان کو شبہ تھا کہ شیخ عبداللہ اپنی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد کرے گا اور اس میں وہ ریاست کے ہندوستان کے الحاق کی توثیق کرنے کی بجائے وادی کشمیر کی مکمل آزادی کا اعلان کر دے گا۔

وزیر اعظم نہرو نے اس قسم کی اطلاعات کے پیش نظر انہی دنوں پہلے تو شیخ عبداللہ کو نئی دہلی بلانے کی ناکام کوشش کی اور پھر لیفٹیننٹ جنرل بی۔ایم۔کول کو دس دن کی چھٹی پر کشمیر بھیجا تاکہ وہ حالات کا موقعہ پر جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے۔ جنرل کول نے شیخ عبداللہ کے علاوہ صدر ریاست کرن سنگھ، بخشی غلام محمد اور ڈی۔پی۔دھر سے طویل ملاقاتیں کر کے یہ رائے قائم کی کہ شیخ عبداللہ کے عزائم بہت خطرناک ہیں اس لیے اس کے خلاف سخت اقدام کی ضرورت ہے۔

اس نے جب شیخ عبداللہ سے ملاقات کی تھی تو مؤخرالذکر نے کہا تھا کہ ''کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ عوام کی رائے کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ ممکن ہے کہ کشمیری عوام ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی کے ساتھ بھی شامل ہونا پسند نہ کریں بلکہ وہ آزادی کو ترجیح دیں۔'' شیخ عبداللہ نے مزید کہا تھا کہ ''اگر ہندوستان نے کشمیر کے معاملات میں مداخلت کا سلسلہ بند نہ کیا تو دوسرے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ ہندوستان کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ میں یونہی ''شیر کشمیر'' نہیں بن بیٹھا ہوں'' اور جب لیفٹیننٹ جنرل کول نے ڈی۔ پی۔ دھر اور بخشی غلام محمد سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے اسے بتایا کہ ان کی اطلاع کے مطابق شیخ عبداللہ چند دن میں گلمرگ جائیگا وہاں وہ پاکستان کے بعض دوستوں سے خفیہ ملاقات کر کے بعض معاملات طے کرے گا۔ پھر سری نگر واپس آ کر ان دونوں پر جھوٹے الزامات عائد کر کے انہیں گرفتار کر لے گا، ان کی جگہ کابینہ میں اپنے آدمیوں کو شامل کر لے گا اور بالآخر ایک پریس کانفرنس میں کشمیر کی آزادی کا اعلان کر کے ہندوستانی فوجوں کے انخلا کا مطالبہ کرے گا[17]۔

لیفٹیننٹ جنرل کول نے 2راگست کو واپس دہلی آ کر نہرو کو یہ رپورٹ پیش کی تو اس کے بیان کے مطابق نہرو کی رائے یہ تھی کہ ان ساری باتوں کے باوجود شیخ عبداللہ کو گرفتار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بین الاقوامی رائے عامہ پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ اس نے 3راگست کو پھر سری نگر آ کر صدر ریاست کرن سنگھ، بخشی غلام محمد اور ڈی۔ پی۔ دھر کو نہرو سے اپنی بات چیت کی تفصیل بتائی تو اس کے بعد 6راگست کو شیخ عبداللہ کی کابینہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے ایک ہندو وزیر شیام لال صراف نے پہلے تو خودسرکشی کا مظاہرہ کیا اور جب شیخ عبداللہ نے اسے مستعفی ہونے کو کہا تو اس نے اس کی تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ 7راگست کو ریاست کی چھ رکنی کابینہ کے تین وزراء بخشی غلام محمد، گردھاری لال ڈوگرہ اور شیام لال صراف نے وزیر اعظم شیخ عبداللہ کے نام ایک میمورنڈم میں الزام عائد کیا کہ وہ حکومت کی طے شدہ بنیادی پالیسیوں پر عمل نہیں کرتا۔ شیام لال صراف نے ایک خط بھی لکھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اس نے استعفیٰ کیوں نہیں دیا ہے۔ اس میمورنڈم اور اس خط کی نقول پہلے ہی صدر ریاست کشمیر کو بھیجی جا چکی تھیں۔ 22 سالہ صدر نے 8راگست کو شیخ عبداللہ کو طلب کر کے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایوان صدر میں پوری کابینہ کا اجلاس منعقد کر کے اپنے وزراء کے ساتھ اختلافات کو دور کرے۔ مگر شیخ نے اس مشورے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور اسی دن

اپنے رفیق خاص مرزا افضل بیگ کے ہمراہ گلمرگ چلا گیا۔ اگلے دن 9 راگست کو علی الصبح اسے اس کی کابینہ کی برطرفی کا حکم نامہ دیا گیا اور پھر اسے اور اس کے ساتھی افضل بیگ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس موقعہ پر ایک فوجی لیفٹیننٹ کرنل بلدیو سنگھ بھی موجود تھا۔ 10 راگست کو وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں اس سلسلے میں ایک مختصر سا بیان دیا جس میں دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ''حکومت ہندوستان کا شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے کوئی تعلق نہیں۔ 22 سالہ صدر ریاست نے از خود ہی بعض داخلی وجوہ کی بنا پر یہ اقدام کیا ہے۔'' 11 راگست کو ڈیلی ٹیلی گراف کا اس بیان پر تبصرہ یہ تھا کہ ''جب کسی پرسکون دن کو سیب گر پڑیں تو ایک چھوٹے بچے کے اس مؤقف کو صحیح تسلیم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ درخت اس نے نہیں ہلایا تھا بلکہ یہ کام تو ہوا نے کیا تھا۔ بالکل اسی طرح گذشتہ چند دنوں میں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں جو اتنے ڈرامائی اور ہندوستان کے اس قدر موافق ہیں کہ نہرو کے اس معصومانہ بیان پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے[18]۔'' نہرو کے اس سراسر جھوٹے بیان کی بنیاد اس سچائی پر تھی کہ بورژوا سیاست میں منافقت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور کسی بورژوا سیاسی لیڈر کو بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی ''ذاتی دوستی'' اس کے سیاسی مفادات سے بالاتر نہیں ہوتی۔ وہ جاگیردارانہ وفاداری کا قائل نہیں ہوتا۔ طویل القامت شیخ عبداللہ سیاسی علم و دانش اور فہم و فراست کے لحاظ سے اس قدر پستہ قد تھا کہ جب اس نے 27 راکتوبر 1947ء کو ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق نامہ پر دستخط کئے تھے تو اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کا ''ذاتی دوست'' اس کے ساتھ اس طرح بے وفائی اور غداری کرے گا۔ ہندوستانی اخبارات میں شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کی یہ وجہ بتائی گئی کہ اس نے پاکستان اور امریکہ کے ساتھ سازش کر کے ریاست جموں و کشمیر کی آزادی و خودمختاری کا اعلان کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا اور اقوام متحدہ میں امریکی مندوب ایڈلائی سٹیونسن (Adlai Stevenson) نے جب مئی میں سری نگر کا دورہ کیا تھا تو اس نے بھی اس سلسلے میں شیخ عبداللہ کی بے پناہ مالی امداد کا وعدہ کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ مگر جب نئی دہلی میں مقیم امریکی سفیر نے حکومت ہندوستان کو ان الزامات کے بارے میں کوئی ثبوت پیش کرنے کو کہا تو اسے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ بظاہر اس الزام کی بنیاد نیویارک ٹائمز میں 5 رجولائی کو شائع شدہ اس رپورٹ پر تھی کہ ''ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں

کے درمیان تنازعہ کشمیر کا تصفیہ ہو گیا ہے جس کے مطابق وادی کشمیر کو آزادی ملے گی اور دونوں حکومتیں اس کی آزادی کی ضمانت دیں گی۔ ریاست کے بقیہ علاقے کو موجودہ فائر بندی لائن کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔ غیر مصدقہ افواہ یہ ہے کہ جان فاسٹر ڈلس (John Foster Dulles) اس قسم کے تصفیے کے حق میں ہے [19]۔'' حکومت ہندوستان نے غیر مبہم الفاظ میں اس رپورٹ کی قطعی تردید نہیں کی تھی۔ اس کے محکمہ خارجہ کے ترجمان نے 10 رجولائی کو صرف یہ کہا تھا کہ ''یہ رپورٹ افواہوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض غیر ملکی افراد نے ہندوستان اور پاکستان کے دورے کے دوران اپنی ذاتی حیثیت سے اس قسم کے نظریات پیش کئے ہوں۔ حکومت ہندوستان نے اس معاملے پر کبھی غور نہیں کیا اور نہ ہی اس نے کبھی اس سلسلے میں رسمی یا غیر رسمی طور پر حکومت پاکستان سے کوئی بات چیت کی ہے۔'' اس تردید کا مطلب یہ تھا کہ ایڈلائی سٹیونسن نے مئی 1953ء میں اپنے برصغیر کے دورے کے دوران اس قسم کی تجویز پیش کی تھی اور حکومت پاکستان نے اس تجویز کے پیش نظر براہ راست گفت وشنید پر زور دیا تھا۔

قدرتی طور پر یہ تجویز سوویت یونین کے لیے تشویش ناک تھی کیونکہ اسے جائز طور پر خدشہ تھا کہ اگر وادی کشمیر کو موقع پرست شیخ عبداللہ کی زیر قیادت آزادی مل گئی تو امریکی سامراج وہاں اپنا اڈہ قائم کر لے گا۔ لہٰذا ہندوستان کی روس نواز کمیونسٹ پارٹی نے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے فوراً بعد 9راگست کو ہی ایک بیان میں الزام عائد کیا کہ ''شیخ عبداللہ نے امریکی سازشوں کا شکار ہو کر اقوام متحدہ کی زیر سرپرستی کشمیر کی آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔'' کمیونسٹ پارٹی نے کچھ عرصہ بعد ''کشمیر میں اینگلو امریکی سازش'' کے عنوان سے ایک پمفلٹ بھی شائع کیا جس میں بعض امریکی اور برطانوی لیڈروں کے بیانات اور اخباری رپورٹوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ شیخ عبداللہ سامراجی پٹھو بن گیا تھا اور اس نے وادی کشمیر کی آزادی کا منصوبہ بنا کر غداری کا ارتکاب کیا تھا [20]۔''

یہ کمیونسٹ پارٹی وہی پارٹی تھی جو 49-1948ء میں شیخ عبداللہ کی سب سے بڑی حلیف تھی اور کشمیر کی ''مکمل آزادی وخود مختاری'' کے حق میں تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس ترقی پسند یا انقلابی تھے یا کشمیری عوام میں کوئی کمیونسٹ تحریک زوروں پر تھی یا پارٹی کو کشمیریوں کے حق خودارادیت کا کوئی احترام تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف اور

صرف یہ تھی کہ ان دنوں سوویت پریس میں جواہر لال نہرو کو ہندوستان کا چیانگ کائی شیک قرار دیا جاتا تھا۔ اس لیے خیال تھا کہ اگر سوویت سرحدوں کے نزدیک ریاست جموں و کشمیر کمیونسٹوں کے زیر اثر آزاد یا نیم آزاد ریاست کا درجہ اختیار کر لے تو یہ بات سوویت یونین کے مفاد میں ہوگی۔ 1953ء میں اس پارٹی کی جانب سے شیخ عبداللہ کے خلاف قلابازی کھانے کی وجہ یہ تھی کہ 51-1950ء میں کوریا کی جنگ کے دوران ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے اور اس بنا پر اینگلو امریکی سامراج نہرو سے خفا تھا۔ علاوہ بریں پاکستان کے سامراج نواز حکمرانوں نے اپنے ملک کو امریکی سامراج کا طفیلی بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ لہٰذا اب یہ پارٹی کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام کے حق میں تھی اور جو شخص کشمیر کی آزادی و خودمختاری کی بات کرتا تھا وہ اسے سامراجی پٹھو قرار دیتی تھی۔ اب کشمیر کے بارے میں کمیونسٹ پارٹی اور انتہا پسند ہندوؤں کی رجعتی جماعتوں کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جواہر لال نہرو نے 17 ستمبر کو اس الزام کے بارے میں لوک سبھا میں حسب معمول ایک گول مول سا بیان دیا۔ اس نے کہا کہ ''اس قسم کے الزامات اکثر لگائے جاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی سچائی ہوتی ہے تو اس کے اظہار میں بہت مبالغہ کیا جاتا ہے اور اس بنا پر ان سے نبٹنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میں اس قسم کے معاملے کے بارے میں ہر اس حقیقت کو منظر عام پر نہیں لا سکتا جو ہمارے علم میں آتی ہے۔ تاہم میں عمومی طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ گذشتہ چند ہفتوں میں گذشتہ چند مہینوں میں بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے کے دوران ہمیں اس قسم کی مداخلت کی اطلاعات ملتی رہی ہیں۔ یہ مداخلت انفرادی تھی۔ اسے سرکاری مداخلت کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں بعض افراد کا رویہ مناسب نہیں رہا۔ ہمیں اس بنیادی حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کشمیر انتہائی جنگی اہمیت کا علاقہ ہے[21]۔''

لاہور کے ایک مشہور انگریزی اخبار کی ایک رپورٹ کے مطابق شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے ریاست کے الحاق کے مسئلے پر اپنی نئی پالیسی کی وضاحت کرنے کے لیے اردو زبان میں ایک تقریر لکھی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ''اگرچہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہر لحاظ سے مکمل ہے تاہم یہ اس لحاظ سے مشروط اور عارضی ہے کہ ابھی ریاست کے عوام کی جانب سے اس کی توثیق ہونا ہے۔ جولائی 1952ء میں کشمیر کے ''سپیشل سٹیٹس'' کے

بارے میں نئی دہلی میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ بھی عارضی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے کشمیر کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ اس کی خوشحالی کا انحصار پاکستان اور ہندوستان دونوں ہی سے تجارت پر ہے۔ اس کے دریاؤں اور سڑکوں کا رخ پاکستان کی جانب ہے۔ کشمیر کے لیے سب سے نزدیکی ریلوے سٹیشن راولپنڈی ہے اور کشمیر کے تاجر اپنی بیرونی تجارت کے لیے کراچی کی بندرگاہ کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن کو ہندوستان سے مالی اور اخلاقی امداد ملتی رہی ہے۔ اس لیے کشمیری مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ آئندہ ہندوستان کے وعدوں پر اعتماد کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے جب کبھی مسلمانوں کے لیے ان کے جائز حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی ہے یا ان کے مستقبل کے بارے میں آواز اٹھائی ہے تو ہندوستان میں میرے دوستوں نے مجھ پر فرقہ پرستی کا لیبل چسپاں کیا ہے۔ پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن نے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر دیئے ہیں اور ان کا درمیانہ طبقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر چہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق سے مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے لیے ترقی وخوشحالی کے دروازے کھل گئے ہیں لیکن وہ محض کنویں کے مینڈک بن کر رہ گئے ہیں۔ حکومت ہندوستان کے مرکزی محکموں میں مسلمانوں کی نمائندگی پہلے سے بھی کم ہو گئی ہے۔'' شیخ عبداللہ نے اپنی اس تقریر کے آخر میں لکھا تھا کہ ''کیا موجودہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ریاست کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات میں کوئی تبدیلی لانا ممکن نہیں؟ کیا موجودہ تعلقات میں کشمیر کے سارے لوگوں کو بلالحاظ مذہب وملت مساوی حقوق ومواقع حاصل ہو سکیں گے؟ اور کیا ریاست کی ترقی وخوشحالی کے راستے میں جو قدرتی وجغرافیائی رکاوٹیں حائل ہیں انہیں موجودہ تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے دور کیا جا سکتا ہے؟'' اس نے یہ تقریر انگریزی زبان میں ترجمہ کروانے کے لیے نئی دہلی بھیجی تھی۔ وہاں کسی طرح ہندوستان کو اس کا پتہ چل گیا تو اس کی فوج اور سول انتظامیہ فوراً حرکت میں آ گئی اور طے شدہ منصوبے کے مطابق 9/اگست کو اسے گرفتار کر لیا گیا[22]۔'' لیکن پریم ناتھ بزاز کی رائے یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے کشمیر کی آزادی وخودمختاری کا اعلان کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہوا تھا۔ اس نے گذشتہ چند ماہ میں جو باغیانہ تقریریں کی تھیں ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ اس طرح اپنی پارٹی کے انتہا پسند مسلم عناصر کے برافروختہ جذبات کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ ان عناصر میں پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن کی وجہ سے بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ جو لوگ شیخ سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ

ایک مجمع باز جذباتی مقرر ہے اور اقتدار کا بھوکا ہے۔ اس میں دھمکیاں دینے کی بے پناہ صلاحیت ہے اور بالآخر وہ گھٹنے ٹیکنے میں بھی کوئی تامل نہیں کرتا۔ اگر ہندوستان کا وزیراعظم فرقہ پرست ہندوؤں کی مذمت کر کے اس مضمون کا بیان دے دیتا کہ نیشنل کانفرنس کی رضامندی کے بغیر ریاست اور ہندوستان کے موجودہ تعلقات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو شیخ عبداللہ کی ساری شعلہ بیانی ختم ہوجاتی۔ وہ غالباً اپنے ''دیرینہ ذاتی دوست'' اور سرپرست جواہر لال نہرو سے اسی بات کی توقع کرتا تھا۔ ماضی میں اس کا یہ حربہ کامیاب ہوجاتا تھا لیکن 1953ء میں ہندوستان میں حالات کا رخ اس کے سخت خلاف تھا۔ اس کی یہ توقع اس مرتبہ پوری نہ ہوسکی۔ اس کے معتمدترین نائب بخشی غلام محمد کی سازش کامیاب ہوئی اور وہ ''شیر کشمیر'' کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد اسی دن ہی ریاست کی وزارت عظمیٰ کی گدی پر براجمان ہوگیا[23]۔''

جونہی بخشی غلام محمد کی نئی کابینہ کے حلف وفاداری اٹھانے کی خبر عوام تک پہنچی تو پوری وادی کشمیر میں اتنا زبردست ہنگامہ ہوا کہ قبل ازیں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ سری نگر کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے قصبے میں اس دن مکمل ہڑتال ہوئی۔ آمدورفت کے سارے ذرائع معطل ہوگئے اور کچھ دیر تک ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر یکا یک لاکھوں لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ انہوں نے ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر شہر میں بے شمار جلسے کئے، جلوس نکالے اور مظاہرے کئے جن میں ہندوستان کے خلاف اور پاکستان کے حق میں نعرے لگائے گئے۔ پولیس نے کئی دن تک لاٹھیوں اور آنسو گیس سے ان عوامی مظاہروں کو کچلنے کی کوشش کی مگر جب اسے ناکامی ہوئی تو پولیس اور ہندوستانی فوج نے امیرا کدل، زینا کدل، اننت ناگ، قاضی کنڈ، ترال گلگام، پٹن اور دوسرے متعدد مقامات پر نہتے عوام کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ امریکی جریدے ''لائف'' کے نامہ نگار کے بیان کے مطابق ہندوستانی پولیس اور فوج نے ایک لائن میں کھڑے ہو کر گولیوں کی بوچھاڑیں کی تھیں۔ یہ قتل عام اس قدر وسیع پیمانے پر ہوا کہ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس میں کتنے لوگ جاں بحق ہوئے۔ نہرو کا لوک سبھا میں بیان یہ تھا کہ اس سارے ہنگامے میں ''صرف'' تیس افراد لقمہ اجل ہوئے تھے لیکن بعض غیر ملکی اخبارات کا اندازہ یہ تھا کہ شہیدان آزادی کی تعداد 800 سے کم نہیں تھی۔ چونکہ یہ احتجاجی مظاہرہ خودرو اور غیر منظم تھا اس لیے ہندوستانی فوج چند ہفتوں میں اسے کچلنے میں کامیاب ہوگئی۔ عوام الناس اپنے سینوں میں ہندوستانی سامراج کے

خلاف نفرت کا طوفان دبائے بالآخر خاموش ہو گئے۔ وہ بے بس تھے۔ ان کی کوئی انقلابی تنظیم نہیں تھی۔ انہیں کسی نے آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کی تربیت نہیں دی تھی اور نہ ہی وہ انقلابی نظریات سے لیس تھے۔ پاکستان کے حکمران طبقے اپنی سامراج نوازی کے باعث کھوکھلے اخباری بیانات کے سوا ان کی کوئی امداد نہیں کر سکتے تھے اور ہندوستان میں ان کا کوئی حامی نہیں تھا۔

سارے ہندوستانی اخبارات اور ہر مکتب فکر کے سیاسی عناصر مظاہرین کی مذمت کر کے بخشی غلام محمد پر تعریف وتوصیف کے پھول نچھاور کرتے تھے حالانکہ وادی کشمیر کے ہر گھر میں اس پر لعنت بھیجی جا رہی تھی۔ کشمیری عوام اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ شخص بدترین موقع پرست اور بددیانت تھا۔ اس کی تعلیم بالکل واجبی یعنی صرف نویں جماعت تک تھی۔ یہ اپنے سکول کے زمانے میں عیسائی ہو گیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے پھر اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ اپنی مکاری اور شیخ عبداللہ کی خوشامد پسندی کے باعث نیشنل کانفرنس کا چیف آرگنائزر اور ریاستی کابینہ میں نائب وزیراعظم بن گیا تھا۔ چونکہ اس کے پاس سپلائز، تعمیرات عامہ اور ٹرانسپورٹ کے محکمے تھے اس لیے اس کے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں نے دو چار سال میں ہی بے پناہ دولت بنا لی تھی اور عوام نے اس رشوت خور اور بددیانت ٹولے کا نام ''بخشی برادرز کارپوریشن'' رکھا ہوا تھا۔ دولت اور اقتدار کی ہوس نے اس شخص کو بالکل اندھا کر رکھا تھا۔ اس نے جموں اور ہندوستان کے فرقہ پرست ہندوؤں اور شیخ عبداللہ کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اور ہندوستانی مسلح افواج کی عملی امداد سے اقتدار پر قبضہ کیا تھا اس کا کوئی اصول یا نظریہ نہیں تھا۔ اس نے وزیراعظم بننے کے بعد 11 راگست کو ایک نشری تقریر میں کہا کہ ''شیخ عبداللہ کی آزاد پالیسی کو بعض ایسی غیر ملکی طاقتوں کی تائید وحمایت حاصل تھی جو ریاست کے عوام کو آزادی اور حق خودارادیت دینے کی مخالفت کرتی رہی ہیں۔ سامراجی طاقتوں کے زیر اثر ''آزاد کشمیر'' ہندوستانی اور پاکستانی عوام کے لیے زبردست خطرے کا باعث ہو گا۔ ریاست کا جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے کہ اگر اسے اس قسم کی ''آزادی'' مل جائے تو ہم لازمی طور پر ایک تلخ اور پرتشدد بین الاقوامی تنازعے میں ملوث ہو جائیں گے اور اس امر کا امکان ہے کہ متعلقہ طاقتوں کے تصادم کے باعث یہ علاقہ ایک دوسرے کوریا کی حیثیت اختیار کر لے۔ اس نے مزید کہا کہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ ایسے تعلقات قائم ہو چکے ہیں کہ اب انہیں منقطع نہیں کیا جا سکتا[24]۔'' اس کی یہ تقریر دراصل اس کے اپنے

خیالات کی آئینہ دار نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور کشمیر کے بحران کے بارے میں حکومت ہندوستان کے مؤقف کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس کے ہفتہ عشرہ بعد 20 راگست کو جبکہ پوری وادی کشمیر میں خونریز مظاہروں کا سلسلہ جاری تھا اس نے ایک بیان میں یقین دلایا کہ کشمیر کے ''سپیشل سٹیٹس'' کے بارے میں جولائی 1952ء میں جونہرو۔عبداللہ معاہدہ ہوا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی لیکن تھوڑے ہی دن بعد جب اس کا اقتدار قدرے مستحکم ہو گیا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے پینترا بدل کر اعلان کر دیا کہ ''کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت دونوں ملکوں کو الگ نہیں کر سکتی۔'' لداخ کے ہیڈ لامہ نے اعلان کیا کہ ریاست میں استصواب ہو یا نہ ہو لداخ کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو چکا ہے اور اب اسے منسوخ نہیں کیا جا سکتا اور ہندوستان کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوھیہ کا بیان یہ تھا کہ ''کشمیر کا فیصلہ استصواب کے ذریعے نہیں ہوگا[25]۔''

بخشی غلام محمد نے ستمبر میں نیشنل کانفرنس کی میٹنگ بلائی جس میں شیخ عبداللہ کی مذمت اور ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کی گئی۔ اس نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''کشمیر پاکستان کے حکمران ٹولے سے کوئی تعلق قائم نہیں کرے گا کیونکہ ان کی پالیسی رجعت پسندانہ اور جاگیردارانہ ہے۔ اس نے بعض غیر ملکی طاقتوں کی مذمت کی جو ''بذریعہ پاکستان ہندوستان پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔'' اکتوبر میں ریاست کی ''دستور ساز اسمبلی'' کا اجلاس ہوا جس میں بخشی غلام محمد پر اعتماد کا اظہار کیا اور دسمبر میں حکومت ہندوستان نے اس کی مالی امداد کے لیے 14.47 ملین ڈالر کا قرضہ دے دیا۔ اس قرضے کی ادائیگی 6 رفروری 1954ء کو کی گئی جبکہ بخشی غلام محمد نے نئی دہلی میں مشوروں کے بعد واپس سری نگر آ کر ''دستور ساز اسمبلی'' سے ایک قرارداد منظور کروائی جس میں ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی باقاعدہ توثیق کی گئی۔ اسمبلی کے 75 ارکان میں سے 64 نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیئے۔ جو گیارہ ارکان اجلاس سے غیر حاضر تھے۔ ان میں سے چھ نظر بند تھے۔ یہ وہی دستور ساز اسمبلی تھی جو شیخ عبداللہ کے عہد میں ''بلا مقابلہ'' منتخب ہوئی تھی۔ بخشی غلام محمد نے اس قرارداد پر تقریر کے دوران پھر اعلان کیا کہ ''کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ قطعی طور پر الحاق ہو چکا ہے۔ اب ہمارے اس رشتے کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔''

''دستور ساز اسمبلی'' کے اس اجلاس میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی ایک رپورٹ بھی منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے آئین کی ان ساری شقوں کا ریاست میں اطلاق کیا جائے جو یہاں مرکزی حکومت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ضروری ہیں۔ ریاست کی اندرونی خود مختاری کا خیال رکھنا چاہیے لیکن اس کا ہندوستان کے آئین میں ذکر ہونا ضروری ہے۔'' اس رپورٹ پر پہلی کارروائی تقریباً دو ماہ بعد 13 اپریل کو ہوئی جبکہ ریاست اور ہندوستان کے درمیان محصولاتی نظام ختم کر دیا گیا اور اس طرح ریاست جموں و کشمیر پہلی مرتبہ معیشی طور پر ہندوستان کا انگ بن گئی۔ اس سے دو چار دن قبل جمہوریہ ہند کا صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنے ریاست کے پہلے دورے کے اختتام پر جموں میں یہ اعلان کر چکا تھا کہ ''تاریخ اور باہمی افہام و تفہیم نے کشمیر اور ہندوستان کے دیرینہ روابط کو اس قدر مضبوط کر دیا ہے کہ اب ان کی شکست و ریخت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر 14 مئی 1954ء کو صدر جمہوریہ ہند نے وہ اعلان کر دیا جس کے لیے شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری اور بخشی غلام محمد کی عزت افزائی کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ صدر کا اعلان یہ تھا کہ ''اگرچہ جولائی 1952ء کے معاہدے کے مطابق کشمیر کی داخلی خود مختاری کا احترام کیا جائے گا لیکن آئندہ ہندوستان کے آئین کی بیشتر شقوں کا ریاست جموں و کشمیر پر بھی اطلاق ہو گا۔''[26] مطلب یہ تھا کہ آئندہ کشمیر کو آئینی طور پر ہندوستان کا مکمل طور پر اٹوٹ انگ تصور کیا جائے گا۔ یہ ہندوستان کے مقبوضہ کشمیر میں نئی دہلی کے بورژوا ارباب اقتدار کی زیر ہدایت سات سالہ المیہ سیاسی ڈرامے کا ڈراپ سین تھا۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنے ''ذاتی دوست'' شیخ عبداللہ کے ساتھ کشمیر کے ''سپیشل سٹیٹس'' کے بارے میں معاہدہ کرنے کے بعد 24 جولائی 1952ء کو ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس معاہدے میں کوئی بات قطعی نہیں ہے۔ ہم رفتہ رفتہ اس میں مزید تفصیلات شامل کر لیں گے۔ ابتدا میں ساری ریاستوں نے صرف تین امور کے بارے میں ہندوستان سے الحاق کیا تھا۔ لہٰذا اس امر کا امکان ہے کہ ہم دوسری ریاستوں کی طرح کشمیر میں بھی کچھ عرصہ بعد مزید امور کا انتظام سنبھال لیں گے۔ اس وقت شیخ عبداللہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس سے دھوکا کیا گیا ہے اور یہ کہ اقتدار کی نمود کاغذی معاہدوں سے نہیں ہوتی بلکہ بندوق کی نالی سے ہوتی ہے۔ چونکہ کشمیر پر ہندوستانی فوج کا قبضہ تھا اس لیے شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کی شکست یقینی تھی۔

باب: 11

# آزاد کشمیر میں شرمناک کشمکش اقتدار

جس عرصے میں ہندوستان کے مقبوضہ کشمیر میں یہ المناک سیاسی ڈرامہ کھیلا جارہا تھا اس دوران پاکستان کے آزاد کشمیر میں بھی کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کو سخت نقصان پہنچا۔ 24/اکتوبر 1947ء کو راولپنڈی میں سردار محمد ابراہیم خان کی زیر قیادت آزاد کشمیر کی حکومت کے معرض وجود میں آنے کے بعد جو لوگ جنگ آزادی کی سیاسی رہنمائی کے ذمہ دار بنے تھے ان میں سے اکثر نہایت غیر ذمہ دار ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس جنگ آزادی کی فتح کے لیے بھرپور مساعی کرنے کی بجائے اپنی بیشتر توجہ متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی طرف مبذول رکھی۔ وہ نہ صرف آزاد کشمیر کے علاقے میں غیر مسلموں کی منقولہ وغیر منقولہ جائیدادوں کو غصب کرنے میں مصروف رہے بلکہ انہوں نے راولپنڈی، مری، ایبٹ آباد، سیالکوٹ، لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہری اور دیہاتی علاقوں میں بھی کروڑوں روپے کی متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرلیا۔ اس سلسلے میں راولپنڈی کے کمشنر اور حکومت پنجاب کے بعض اعلیٰ افسروں نے بھی ان کے ساتھ مل کر خوب ہاتھ رنگے۔ ان سب کا موٹو (Moto) یہ تھا کہ ''پیارے مال بناؤ۔ اگر ہمارے پاس مال ہوگا تو سب ہماری عزت کرنے پر مجبور ہوں گے اور اگر مال نہیں ہوگا تو کوئی نہیں پوچھے گا کہ بھیا کیستی؟''

28/فروری 1948ء کو جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا صدر چوہدری غلام عباس جموں سنٹرل جیل سے رہا ہوکر پاکستان پہنچا تو آزاد کشمیر کے لیے تعمیر کردہ بدنما سیاسی ڈھانچہ اور بھی بدنما ہوگیا۔ پریم ناتھ بزاز کا خیال یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے چوہدری غلام عباس کو اس یقین دہانی پر رہا کیا تھا کہ وہ پاکستان جاکر جناح کو کشمیر کی آزادی کی تجویز منظور کرنے کی ترغیب دے گا۔ عباس کو

اپنی اس کوشش میں تو کامیابی نہ ہوئی البتہ اس کے پاکستان میں ورود کی بنا پر آزاد کشمیر کی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس نے جب سیالکوٹ پہنچنے کے فوراً ہی بعد چوہدری حمید اللہ کی جگہ مسلم کانفرنس کی صدرات کا عہدہ سنبھالا تو چند ہفتوں بعد اس میں اور آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہوگئی۔ سردار ابراہیم نے ایک پریس کانفرنس میں بظاہر تو چوہدری غلام عباس کو آزاد کشمیر کی تحریک کا اعلیٰ ترین قائد تسلیم کر کے یہ اعلان کیا کہ اسے مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے آزاد کشمیر کی حکومت کو توڑنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے لیکن دراصل ان دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے بارے میں شکوک وشبہات دور نہ ہوئے اور اس بنا پر پس پردہ ان کے درمیان رسہ کشی جاری رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سردار ابراہیم کو ریاست کشمیر کے جموں اور وادی کشمیر کے عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی اور پونچھ کے علاقے میں بھی اسے کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں تھی وہ محض حکومت پاکستان کی مہربانی سے آزاد کشمیر کا صدر بنا ہوا تھا اور اسی وجہ سے اسے پاکستان اور ساری دنیا میں بڑی شہرت نصیب ہوئی تھی۔ اس کے برعکس چوہدری غلام عباس اپنی سیاسی بصیرت کی کمی کے باوجود جموں وکشمیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کا مسلمہ لیڈر تھا اور وہ نودولتیے سردار ابراہیم کے اقتدار کے ستارے کی اس قدر چمک دمک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ بریں صوبہ جموں کے جن لوگوں کو متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ میں کم حصہ ملا تھا یا کوئی بھی حصہ نہیں ملا تھا انہوں نے بھی اپنے ''قائد ملت'' کو صدر آزاد کشمیر کے خلاف برانگیختہ کیا تھا اور حکومت پاکستان میں اسکندر مرزا جیسے بعض سازشی افسروں نے آزاد کشمیر کی تحریک میں پھوٹ ڈالنے میں نہایت گھناؤنا کردار ادا کیا تھا۔ یہ بدکردار اعلیٰ حکام اپنے اس ناپاک مقصد میں محض اس لیے کامیاب ہوئے تھے کہ آزاد کشمیر تحریک کے بیشتر قائدین نہ صرف ان سے وظیفے وصول کرتے تھے بلکہ وہ اپنی بدعنوانیوں کے باعث حکومت پاکستان کی تعزیری کاروائی سے ڈرتے بھی تھے۔ یہ مفاد پرست قائدین ریاست کی آزادی کے لیے وہاں کے حریت پسند عوام پر بھروسہ کرنے کی بجائے پاکستان کی سامراج نواز افسر شاہی پر اعتماد کرتے تھے۔ چوہدری غلام عباس نے ان دنوں آزاد کشمیر میں عبوری قانون ساز اسمبلی کا انتخاب کرانے کا مطالبہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ لڑائی کے دوران عام انتخابات نہیں ہو سکتے۔

جنوری 1949ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن کی قرارداد کے مطابق کشمیر میں جنگ بندی ہوئی تو چوہدری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم خان کا باہمی تضاد منظر عام پر آ گیا کیونکہ اب اسے ہنگامی حالات کے پردے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ 2 مارچ کو چوہدری غلام عباس کی زیرصدارت سیالکوٹ میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں اس مضمون کی قرارداد منظور کی گئی کہ آئندہ آزاد کشمیر کا صدر وہ ہوگا جسے مسلم کانفرنس کا صدر نامزد کرے گا اور یہ نامزد صدر مسلم کانفرنس کے صدر کے مشورے کے مطابق اپنے وزراء نامزد کرے گا۔ اس قرارداد کا مطلب دراصل یہ تھا کہ آئندہ چوہدری غلام عباس نہ صرف مسلم کانفرنس کا مطلق العنان لیڈر ہوگا بلکہ آزاد کشمیر کی حکومت پر بھی اسی کا حکم چلے گا۔ اس کی آزاد کشمیر میں عملاً وہی حیثیت ہوگی جو پاکستان میں لیاقت علی خان کی ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے علاقوں میں ''قائد ملت'' بننے کے خواہاں تھے۔ مجلس عاملہ کے اس اجلاس میں مسلم کانفرنس کے عہدے داروں کے انتخابات کرانے یا آزاد کشمیر کی حکومت میں عوامی نمائندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی آزاد کشمیر میں قانون ساز اسمبلی کے انتخاب کی کوئی تجویز زیر بحث آئی تھی حالانکہ ان دنوں وہاں لڑائی بند ہو چکی تھی۔ سردار ابراہیم نے یہ فیصلہ بظاہر بلا چون و چرا منظور کر لیا اور 15 مارچ کو اس کی زیر قیادت آزاد کشمیر کی نئی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ اگرچہ اس ساری غیر جمہوری کارروائی کو پاکستان میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی تائید و حمایت حاصل تھی تاہم چوہدری غلام عباس کی آمریت کو پائیداری نصیب نہ ہوئی۔ حسب توقع خوشامدیوں، برآمدہ نشینوں اور حاشیہ برداروں نے اس کا گھیراؤ کر لیا اور ریاستی مہاجرین تھوڑے عرصے میں اس سے بددل و مایوس ہو گئے۔ جب چوہدری غلام عباس نے اپنا ستارہ تیزی سے زوال پذیر ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے 5 مئی کو صحت کی بنا پر سیاست سے عارضی طور پر ریٹائر ہونے کا اعلان کر کے اپنی جگہ ایک شخص اللہ رکھا ساغر کو مسلم کانفرنس کا قائم مقام صدر نامزد کر دیا۔ چونکہ وادی کشمیر کے بعض افراد نے اللہ رکھا ساغر کی مسلم کانفرنس کی غیر جمہوری نامزدگی پر اعتراض کیا تھا اور وہ اس کی قیادت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لیے اس نے وادی کے مہاجرین کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ وادی کشمیر کے جو لوگ اس کی قیادت پر اعتراض کرتے ہیں وہ دراصل شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے ایجنٹ ہیں۔ اس کے اس ناعاقبت اندیشانہ رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ

جموں کے مہاجرین اور وادی کشمیر کے مہاجرین کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی حالانکہ ان کی ریاست کے بیشتر علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا جارہا تھا اور پاکستان میں غریب ریاستی مہاجرین کی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ بالآخر میر واعظ یوسف شاہ آزاد کشمیر کی وزارت سے مستعفی ہوگیا۔ اس نے اپنی ایک الگ مسلم کانفرنس بنالی اور سردار ابراہیم نے بھی اللہ رکھا ساغر کی نامزد کردہ مجلس عاملہ کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پنجاب کے ہر باخبر شہری کو پتہ ہے کہ آزاد کشمیر کے لیڈروں کے درمیان اس المناک رسہ کشی کے پس پردہ دراصل دولت و اقتدار کی ہوس کارفرما تھی۔ ان میں سے بہت سوں کے سینوں میں کشمیر کی آزادی کی شمع فروزاں نہیں تھی۔ ان میں سے بیشتر مفاد پرست اور خودغرض تھے۔ یہ نہ صرف حقیقی جذبۂ آزادی سے محروم تھے بلکہ ان میں ان لاکھوں خانماں برباد ریاستی مہاجرین کے لیے احساس ہمدردی بھی مفقود تھا جو پنجاب کے مختلف علاقوں میں قائم شدہ امدادی کیمپوں میں انتہائی بدحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان مہاجرین کے پاس روٹی، کپڑے اور مکان میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ یہ ننگے تھے، بھوکے تھے، بیمار تھے اور ان کے سر پر کوئی چھت نہیں تھی۔ ان کا کوئی ذریعۂ روزگار نہیں تھا۔ آزاد کشمیر کے لیڈروں کو ان مہاجرین کی امداد کے لیے جو پیسے ملتے تھے وہ معلوم نہیں کہاں چلے جاتے تھے۔ البتہ لوگوں کو یہ دکھائی دیتا تھا کہ جگہ جگہ آزاد کشمیر کے لیڈروں اور ان کے بااثر کارکنوں کی لمبی لمبی موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ حالانکہ اگست 1947ء سے پہلے ان میں سے کسی ایک کے پاس کوئی موٹر نہیں تھی۔ ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر افلاس زدہ مہاجرین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں۔ ان مہاجرین نے کئی مرتبہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور بعض دوسرے مقامات پر اپنے مفاد پرست، خودغرض اور بےضمیر لیڈروں کے خلاف مظاہرے کئے مگر انہیں سختی سے دبا دیا گیا۔ پاکستان کے اخبارات میں ان کے خلاف رشوت ستانی، اقربا نوازی، خویش پروری، غبن اور دوسری بدعنوانیوں کے بےشمار الزامات عائد کئے گئے مگر ان کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ پاکستان کے بعض وزراء اور اعلیٰ حکام بھی ان کی بدعنوانیوں میں ملوث تھے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے خانماں برباد کشمیری مہاجرین کے لیڈروں، کارکنوں اور ان کے رشتہ داروں و دوستوں میں سے بالکل اسی طرح نو دولتیوں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا جس طرح کہ پاکستان کے دوسرے مہاجر و مقامی عوام کے لیڈروں، کارکنوں اور ان کے رشتہ داروں و دوستوں

میں سے نئے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا تھا۔ ان سب میں نوزائیدہ پاکستان کے تحفظ اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے یا ریاست جموں وکشمیر کی آزادی کے لیے کوئی جذبہ تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ ان کا اولین نصب العین یہ تھا کہ ''پیارے مال بناؤ'' یہ سب کے سب راتوں رات ''خاندانی رئیس'' بننے کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ تھے۔ ان کے لیے غیرت، دیانت، عزت نفس، شرم وحیا، حب الوطنی، انسانی ہمدردی، اخلاقی اقدار، معاشرت اور ثقافت جیسے الفاظ کے عملاً کوئی معنی نہیں تھے۔

سردار ابراہیم کی اس ''بغاوت'' کے پیش نظر چوہدری غلام عباس نے پھر مسلم کانفرنس کی صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس نے 10 رجنوری 1950ء کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کا ایک اجلاس بلایا جس نے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جب چاہے پارٹی کی تنظیم اور آزاد کشمیر حکومت میں ردوبدل کرسکتا ہے۔ چونکہ کشمیر کے ''قائد ملت'' کو اس کاروائی میں پاکستان کے ''قائد ملت'' کی تائید وحمایت حاصل تھی اس لیے میرواعظ یوسف شاہ کی مسلم کانفرنس کے کارکنوں نے اسی روز راولپنڈی میں مسلم لیگ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا جس میں عباس گروپ اور میرواعظ گروپ کے کئی افراد زخمی ہوئے اور جب سردار ابراہیم خان نیویارک میں سلامتی کونسل کے اجلاس کے بعد واپس آیا تو چوہدری غلام عباس نے 20 رمئی 1950ء کو اسے برطرف کر کے اس کی جگہ سید علی احمد شاہ کو آزاد کشمیر کا صدر مقرر کر دیا۔ سید علی احمد شاہ نے سردار ابراہیم کو اپنی وزارت میں شامل کرنا چاہا مگر نہ صرف اس نے انکار کر دیا بلکہ اس کے قبیلے کے ایک رکن کرنل شیر احمد شاہ نے بھی 2 رجون کو وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب آزاد کشمیر میں لیڈروں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی ڈرائنگ روموں اور کانفرنس ہالوں سے نکل کر کھلے میدان اور بازاروں میں پھیل گئی۔ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے خلاف جلسے اور مظاہرے شروع کر دیے اور اخبارات میں بیان بازی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اچھالا۔ عباس گروپ کا الزام یہ تھا کہ اس کے مخالف رشوت خور اور بددیانت ہیں جب کہ میرواعظ ابراہیم گروپ کا کہنا یہ تھا کہ چوہدری غلام عباس کا رویہ آمرانہ ہے اور وہ جب سے پاکستان میں پہنچا ہے اس نے آزاد کشمیر تحریک میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ اس گروپ کا یہ الزام بھی تھا کہ چوہدری غلام عباس اور اس کے پٹھوؤں نے صوبہ پرستی کا زہر پھیلا کر کشمیر کی جدوجہد

آزادی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔حکومت پاکستان چوہدری غلام عباس کے ساتھ تھی۔ مرکزی وزارت امور کشمیر کا قلمدان پنجاب کے ایک جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی کے پاس تھا۔ یہ شخص محلاتی سازشوں اور جوڑتوڑ کا ماہر تھا۔اس نے کشمیری لیڈروں کے درمیان سیاسی ہاتھا پائی کا خوب تماشا دیکھا۔نتیجتاً میرواعظ گروپ نے آزاد کشمیر میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جس نے جلد ہی ایک پرتشدد ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرلی۔تقریباً 500 افراد گرفتار کیئے گئے لیکن ایجی ٹیشن پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ بالآخر پاکستانی فوج کی امداد طلب کی گئی اور راولاکوٹ، پلندری اور پونچھ میں فوج اور ''باغیوں'' کے درمیان مسلح تصادم ہوئے۔ پاکستان کے اخبارات میں اس ''بغاوت'' کا ذکر نہیں کیا گیا تھا لیکن لوگوں تک سینہ بہ سینہ جو خبریں پہنچیں ان کے مطابق خاصا خون خرابہ ہوا تھا۔حکومت پاکستان نے اس صورت حال کے پیش نظر عباس گروپ کو کشمیریوں کی واحد نمائندہ تنظیم تسلیم کرنے کی پالیسی ترک کر دی اور یہ کوشش شروع کی کہ کسی نہ کسی طرح دونوں گروپوں میں کوئی مفاہمت ہوجائے۔اس نے آزاد کشمیر میں اپنی انتظامی گرفت بھی پہلے سے زیادہ مضبوط کرلی جب کہ ہندوستان اور ساری دنیا میں یہ پراپیگنڈہ جاری رہا کہ کشمیر میں آزادانہ غیر جانبدارانہ استصواب کا مطالبہ کرنے والے خود جمہوری اصولوں پر عمل نہیں کرتے۔مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر بھی آزاد کشمیر کے لیڈروں کی باہمی جوتم پیزار اور حکومت پاکستان کی سامراج نوازی کا بہت برا اثر پڑا۔ ان کے حوصلے بہت پست ہو گئے اور حکومت ہندوستان نے ریاست کے مکمل الحاق کے لیے دستور ساز اسمبلی کا ڈھونگ رچانے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

لیکن چوہدری غلام عباس کے آمرانہ رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔اس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ وہ پاکستان کے قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان کے نقش قدم پر چلنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ چونکہ پاکستان کا قائد ملت ملک میں جمہوریت کی نشوونما کی اجازت نہیں دے رہا تھا اس لیے کشمیر کا قائد ملت بھی مسلم کانفرنس اور آزاد کشمیر میں جمہوریت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔جیسے یو۔پی کے بیشتر مہاجرین لیاقت علی خان کو بوجوہ اپنا قائد ملت تصور کرتے تھے اسی طور صوبہ جموں کے بیشتر مہاجرین چوہدری غلام عباس کو اپنا قائد ملت سمجھتے تھے جبکہ پونچھ اور وادی کشمیر کے بیشتر مہاجرین کو اس کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا۔ پاکستانی عوام کا ایک خاصا حلقہ چوہدری غلام عباس کی

غیر جمہوری کاروائیوں کے باوجود اس کی عزت کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ہر ملنے والے کو اپنی ذاتی شرافت و دیانت کا تاثر دیتا تھا۔ اس کے خلاف متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرنے اور لوٹ مار کے الزامات بھی عام طور پر سننے میں نہیں آتے تھے۔ لوگوں کو کشمیر کی جدوجہد آزادی میں اس کی پندرہ بیس سالہ خدمات کا بھی علم تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نومبر 1947ء میں صوبہ جموں کے مسلمانوں کے قتل عام کے دوران اس کی بیٹی اور بہن اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس کے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں نے بھی متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی دوڑ میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا تھا جبکہ سردار ابراہیم اور اس کے گروپ کے متعدد ارکان راتوں رات کروڑ پتی بن گئے تھے۔ تاہم 8رجنوری 1951ء کو چوہدری غلام عباس نے اپنے خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کے کہنے پر ایک ایسی حرکت کی کہ جس سے اس کے وقار کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس نے آزاد کشمیر کی حکومت کے لیے ایسے قواعد کار نافذ کرنے کا اعلان کیا جن کا مقصد یہ تھا کہ آزاد کشمیر میں اس کے سوا کسی اور کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور اس کے اختیارات کو کوئی طاقت چیلنج نہیں کر سکے گی۔ ان قواعد کا لب لباب یہ تھا کہ چوہدری غلام عباس آزاد کشمیر کا اعلیٰ ترین سربراہ یا وائسرائے ہوگا۔ وہ آزاد کشمیر کے صدر اور وزراء کو نامزد کرے گا اور وہی انہیں محکمے الاٹ کرے گا۔ آزاد کشمیر کی حکومت اس کے سامنے جوابدہ ہوگی اور اگر اس کو کوئی سرکاری دستاویز دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوگی تو حکومت کا سیکرٹری جنرل مطلوبہ دستاویز اس کے سامنے پیش کر دے گا۔ اسے ہائی کورٹ کے ججوں کے تقرر کا بھی پورا اختیار ہوگا اور آزاد کشمیر کے وزراء کی کونسل جو قانون وضع کرے گی وہ اس کی منظوری کے بغیر نافذ نہیں ہو سکے گا اور اسے ہر مجوزہ قانون میں ردوبدل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔

حسب توقع چوہدری غلام عباس کی اس سکھا شاہی کا نہ صرف پونچھ اور وادی کشمیر کے سیاسی لیڈروں اور کارکنوں میں سخت مخالفانہ ردعمل ہوا بلکہ پاکستان کے جمہوریت پسند عناصر نے بھی اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے مخالف کشمیری لیڈروں نے 20رجنوری 1951ء کو اپنے کارکنوں کا ایک کنونشن منعقد کیا جس میں سہ روزہ بحث کے بعد پندرہ قراردادیں منظور کی گئیں۔ جن میں سے ایک قرارداد میں آزاد کشمیر کی حکومت پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ آزاد علاقوں میں جمہوری نظام رائج کیا جائے۔ ایک اور قرارداد میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ چونکہ چوہدری غلام عباس کی مسلم کانفرنس اپنی نمائندہ حیثیت کھو چکی ہے۔ اس لیے ریاستی

مسلمانوں کے لیے کوئی مؤثر کاروائی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس قرارداد کے مطابق کنونشن میں نئی مسلم کانفرنس کی نئی جنرل کونسل اور نئی مجلس عاملہ کا انتخاب کیا گیا۔ کرنل شیر احمد خان اس متوازی مسلم کانفرنس کا صدر منتخب ہوا اور جنرل سیکرٹری کے عہدہ کے لیے میر عبدالعزیز کا انتخاب کیا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد اس نئی مسلم کانفرنس کا صدر دفتر پونچھ کے علاقے میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں مطالبہ کیا گیا کہ آزاد کشمیر کی حکومت کی از سر نو تشکیل کی جائے۔ لیکن اس مطالبہ کی تکمیل نہ ہو سکی کیونکہ حکومت پاکستان مسلم کانفرنس کے دونوں گروہوں میں مصالحت کرانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی ناکامی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود پاکستان میں حکمران مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور اس سے مسلم کانفرنس کے سارے قائدین اور کارکن بھی متاثر ہوئے تھے۔ دوسری وجہ وزیر امور کشمیر نواب مشتاق احمد گرمانی کی جاگیردارانہ سیاست میں مضمر تھی۔ بعض حلقوں کا الزام یہ تھا کہ کشمیری لیڈروں کی دھڑے بندی میں اس شخص کی محلاتی سازشوں کا خاصہ حصہ ہے۔ اس نے چوہدری غلام عباس کے آمرانہ رویے میں اصلاح کرنے کی بظاہر کوئی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ آزاد کشمیر میں آمرانہ نظام کے باعث نہ صرف ریاست کی آزادی کے نصب العین کو نقصان پہنچ رہا تھا بلکہ کشمیر اور پاکستان کے جمہوریت پسند حلقوں میں بھی اس پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ کرنل شیر احمد خان اور ابراہیم خان گروپ کی جانب سے اخباروں، رسالوں، اشتہاروں اور پمفلٹوں کے ذریعے آزاد کشمیر میں آمریت کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کیا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''چوہدری غلام عباس کو آزاد کشمیر کی حکومت پر مکمل اختیار حاصل ہے جبکہ وہ خود کسی نمائندہ تنظیم کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ ایسے آمرانہ اختیارات تو مہاراجہ ہری سنگھ کو بھی حاصل نہیں تھے۔ حکومت پاکستان کو اس صورت حال کی فوری طور پر اصلاح کرنی چاہیے کیونکہ پاکستان کی جانب سے کشمیری عوام کے لیے حق خود اختیاری کے مطالبہ کا تقاضا یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام کو نئی استبدادیت سے نجات دلائی جائے۔'' بظاہر اس پراپیگنڈے کا مقصد بہت دلکش اور منصفانہ تھا لیکن دراصل یہ لوگ آزاد کشمیر میں فی الحقیقت جمہوری نظام رائج کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔ ابراہیم گروپ نے بھی اپنے عہد اقتدار میں آزاد کشمیر حکومت اور مسلم کانفرنس میں جمہوریت کا کوئی اصول رائج کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بیشتر ارکان متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرنے اور زراندوزی میں ہی مصروف رہے تھے۔ یہ لوگ چوہدری غلام عباس پر علاقہ پرستی کا

الزام عائد کرتے تھے لیکن یہ خود بھی اپنے عہد اقتدار میں اس الزام سے مبرا نہیں تھے۔ صوبہ جموں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے مہاجرین کو ان سے بہت سی شکایات تھیں جو سراسر بے بنیاد نہیں تھیں۔

8رمئی 1951ء کو ابراہیم گروپ کے ایک وفد نے وزیر امور کشمیر نواب مشتاق احمد گرمانی سے ملاقات کر کے اسے مطلع کیا کہ رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں کی وجہ سے آزاد کشمیر میں بہت بے چینی پائی جاتی ہے۔ گرمانی نے انہیں کہا کہ وہ اصلاح احوال کے لیے کوئی منصوبہ پیش کریں۔ چند دن بعد مطلوبہ منصوبہ پیش کر دیا گیا مگر اس پر تقریباً ایک ماہ تک کوئی عمل نہ ہوا۔ چنانچہ جون 1951ء میں ابراہیم گروپ کی مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے آزاد کشمیر میں ایک متوازی حکومت قائم کرنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ حکومت پاکستان اس صورت حال سے بہت فکر مند ہوئی اور اس نے جولائی کے اوائل میں اک بریگیڈ راولاکوٹ بھیج دیا تا کہ کشمیری لیڈروں کے دونوں دھڑوں کے درمیان کوئی مسلح تصادم نہ ہونے پائے۔ جب حکومت ہندوستان کو یہ خبر ملی تو اس نے اپنی بیشتر فوج مغربی پنجاب کی سرحدوں پر مجتمع کر کے دونوں ملکوں کے درمیان انتہائی کشیدگی کی صورت حال پیدا کر دی اور وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 15رجولائی کو ایک بیان میں پاکستانی عوام کو خبردار کیا کہ وہ اپنے ازلی دشمن کے ہمہ گیر حملے کی مزاحمت کے لیے تیار ہو جائیں۔ پھر اس نے 17رجولائی کو کراچی میں اپنے مکان کی بالائی منزل سے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان جنگ نہیں چاہتا......لیکن حملہ آوروں کے لیے پاکستان کا ''مکا'' تیار ہے۔ ان دنوں شیخ عبداللہ اپنی نام نہاد ''دستور ساز اسمبلی'' کے ''انتخابات'' کرانے کی تیاری کر رہا تھا اور اپنی تقریروں میں یہ اعلان کر رہا تھا کہ وہ پاکستان کے ''مقبوضہ'' آزاد کشمیر کے عوام کو بھی استبدادی چنگل سے آزاد کرائے گا۔ پاکستانی فوج نے فریقین کو مرعوب و متنبہ کرنے کے لیے ایک پریڈ کے ذریعے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا مگر ابراہیم گروپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس کی مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے ایک قرارداد میں متوازی حکومت کے قیام سے متعلقہ اپنی مجلس عاملہ کے فیصلے کی توثیق کر دی اور اعلان کیا کہ یہ حکومت 29راگست سے اپنا کام شروع کر دے گی۔ اس پر حکومت پاکستان کی تشویش میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ کشمیری لیڈروں کے دنوں دھڑوں کے درمیان مصالحت کرانے کی سنجیدگی سے کوشش کی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پنجاب کی سرحد کے نزدیک ہندوستانی فوجوں کی وسیع

پیمانے پر نقل وحرکت نے بڑی خطرناک صورت حال پیدا کر رکھی تھی اور پاکستانی فوجوں نے بھی سرحد پر مورچے سنبھال لیے تھے۔ 27راگست کو چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم کے درمیان مصالحت کی بات چیت شروع ہوئی جو تین دن تک جاری رہی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ دونوں قائدین ہوس اقتدار میں اندھے ہو چکے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے سخت نفرت تھی اور اس بنا پر دونوں ہی غریب و مظلوم کشمیری عوام کے بنیادی مفادات کو نظر انداز کر رہے تھے۔ حکومت پاکستان نے پھر مداخلت کی اور اس نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد ابراہیم گروپ کو آمادہ کر لیا کہ وہ متوازی حکومت کے قیام کے اعلان کو ایک ماہ کے لیے ملتوی کر دے۔ جب اس ایک ماہ کے دوران بھی کشمیری لیڈروں کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو 27رستمبر کو حکومت پاکستان کے ایک اعلیٰ افسر معین الدین نے تراڑ کھیل میں اعلان کیا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان خود آزاد کشمیر کا دورہ کر کے کشمیری لیڈروں کے باہمی تنازعے کا تصفیہ کرائے گا۔ لیاقت علی خان اس مقصد کے تحت مظفر آباد جانے کے لیے 16 راکتوبر 1951ء کو راولپنڈی پہنچا۔ لیکن جب اسی سہ پہر وہ راولپنڈی کے کمپنی باغ میں ایک پبلک جلسے کو خطاب کرنے کے لیے سٹیج پر آیا تو پنجابی شونزم اور مذہبی عصبیت نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اس قومی المیہ کی وجہ سے آزاد کشمیر کے تنازعے کے تصفیے میں مزید ایک ماہ کی تاخیر ہو گئی۔ نومبر میں پاکستان کے نئے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے راولپنڈی میں پہنچ کر کشمیری لیڈروں سے بات چیت کی اور یہ فیصلہ صادر کیا کہ آزاد کشمیر میں ساری پارٹیوں کی مخلوط حکومت قائم ہونی چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ سب کو سیاسی اقتدار اور عوامی استحصال میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ملے گا تو ان کی باہمی چپقلش ختم ہو جائے گی لیکن چوہدری غلام عباس کے لیے یہ فیصلہ قابل قبول نہیں تھا کیونکہ اس وقت تک اس کے اور سردار ابراہیم کے درمیان تضاد کی نوعیت معاندانہ ہو چکی تھی۔ اب ان دونوں کے درمیان صلح صفائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ جب خواجہ ناظم الدین نے چوہدری غلام عباس کو متذکرہ فیصلہ منظور کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی تو مؤخرالذکر نے ایک مرتبہ پھر سیاست سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر کے پاکستان کے وزیر اعظم کو آزاد کشمیر کی حکومت کا استعفیٰ پیش کر دیا۔ جس کے بعد حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کے نظم ونسق کی ذمہ داری وزارت امور کشمیر کے ایک افسر کے سپرد کر دی اور یہ اعلان کیا کہ تین ماہ کے اندر مسلم کانفرنس کی نئی

جنرل کونسل کا انتخاب ہو گا اور یہ کونسل مجلس عاملہ کا انتخاب کرنے کے علاوہ آزاد کشمیر حکومت کی تشکیل کرے گی۔ مگر اس اعلان پر کوئی عمل نہ ہوا۔ البتہ 2 / دسمبر کو چوہدری غلام عباس کے مخالف گروپ کے ایک لیڈر میر واعظ یوسف شاہ کو آزاد کشمیر کا ''ایڈمنسٹریٹر'' مقرر کر دیا گیا۔ سردار ابراہیم اور اس کے گروپ کو اس تقرر سے بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے اخباری بیانات کے ذریعے حکومت پاکستان کے اس فیصلے کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ فیصلہ کوئی جمہوری اصولوں پر مبنی تھا بلکہ اس لیے کہ چوہدری غلام عباس اور اس کے گروپ کو آزاد کشمیر کے سیاسی میدان میں فیصلہ کن شکست ہوگئی تھی۔ اس کی شکست کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لیاقت علی خان کی ہلاکت کے بعد پاکستان میں اس کی مؤثر پشت پناہی کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا اور دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ ابراہیم گروپ پونچھ کے علاقے کے سابق فوجیوں کی حمایت کی وجہ سے اس علاقے میں بدامنی پھیلا سکتا تھا اور غالباً اس گروپ کو آزاد کشمیر کی باقاعدہ فوج کے ایک حصے کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس کے برعکس عباس گروپ کی پشت پر آزاد کشمیر کے علاقے میں اس قسم کی کوئی مسلح قوت نہیں تھی۔ صوبہ جموں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے مہاجرین محض زبانی طور پر اپنے قائد ملت کی تائید وحمایت کر سکتے تھے۔ وہ بزور قوت اسے برسر اقتدار نہیں رکھ سکتے تھے۔ ابراہیم گروپ جو 1950ء میں پلندری اور راولاکوٹ کے علاقے میں اپنی مسلح قوت کا مظاہرہ کر چکا تھا اور اسی بنا پر اس نے جون 1951ء میں اپنی متوازی حکومت قائم کرنے کی کامیابی سے دھمکی دی تھی۔ چونکہ عباس گروپ کے پاس اس قسم کا حربہ استعمال کرنے کی کوئی قوت نہیں تھی اس لیے خواجہ ناظم الدین کی نحیف ونزار حکومت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ سردار ابراہیم اور کرنل شیر احمد خان کے طاقتور گروپ کا ساتھ دے۔ اگرچہ ان دونوں گروپوں کے درمیان یہ سیاسی لڑائی جمہوریت، انصاف، آزادی اور حب الوطنی کے نام پر لڑی جارہی تھی لیکن دراصل اس کی بنیاد کسی ایسے اصول پر نہیں تھی۔ اس کشمکش کی حقیقی بنیاد دولت و اقتدار کی ہوس تھی۔ دونوں میں سے کسی فریق کو بھی اس امر کا احساس نہیں تھا کہ ان کی اس سیاسی دھینگا مشتی سے مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ غالباً ان کی بے حسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود پاکستان کے اندر مسلم لیگی زعما ملک وقوم کے مستقبل سے بے پرواہ ہو کر انتہائی شرمناک کشمکش اقتدار میں مصروف تھے اور سامراج نواز سول اور فوجی بیورو کریسی اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر

پاکستان کی آزادی وخودمختاری کا سودا کر رہی تھی۔

پاکستان کے مسلم لیگی ارباب اقتدار نے سامراج نواز سول وفوجی بیوروکریسی کے زیراثر آزاد کشمیر کی حکومت کی آئینی وقانونی حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ البتہ 1948ء کے اوائل میں وزارت امور کشمیر کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا گیا تھا جو حکومت آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لیے کام کرتا تھا اور اسی محکمے کے ذریعے اقوام متحدہ کی ہدایات آزاد کشمیر فوج تک پہنچائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن نے آزاد کشمیر کی حکومت کے وجود کو قانونی طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور حکومت ہندوستان بھی آزاد کشمیر فوج کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ دسمبر 1951ء میں جب میر واعظ یوسف شاہ آزاد کشمیر کا ''ایڈمنسٹریٹر'' مقرر ہوا تو آزاد کشمیر کی جو تھوڑی بہت آزادی تھی وہ بھی سلب ہو گئی۔ وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی نے آزاد کشمیر کا نظم ونسق براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس طرح یہ علاقہ انتظامی طور پر پاکستان کا حصہ بن گیا۔ میر واعظ یوسف شاہ اس افسر شاہی کا محض ایک تنخواہ دار پٹھو تھا۔

مارچ 1952ء میں شیخ عبداللہ نے آزاد کشمیر کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے وہاں کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ پاکستان کے موجودہ حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مثبت اقدامات کریں۔ اس نے کہا کہ یہ پاکستانی حکمران تمہیں گمراہ کر کے حقائق سے بے خبر رکھتے ہیں۔ ہم ہر صورت تمہاری آزادی کے لیے اپنی مساعی جاری رکھیں گے۔ اپریل میں ابراہیم گروپ نے مسلم کانفرنس کے انتخابات کرائے تو میر واعظ اور اس کے ساتھیوں نے ان کا بائیکاٹ کیا اور عباس گروپ نے بھی ان میں کوئی خاص حصہ نہ لیا۔ 18رمئی 1952ء کو مظفرآباد میں مسلم کانفرنس کی نئی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا تو حسب توقع سردار ابراہیم اس کا صدر منتخب ہوا۔ قریشی محمد یوسف کا بطور جنرل سیکرٹری انتخاب ہوا اور راجہ محمد حیدر خان کو آزاد کشمیر کی حکومت کا صدر نامزد کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے نئی مسلم کانفرنس کے ان سارے فیصلوں کو تسلیم کرنے سے بظاہر اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ نئی تنظیم سارے کشمیری حلقوں کی نمائندہ نہیں تھی لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی اس وقت تک ابراہیم گروپ میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ 21رجون کو حکومت پاکستان نے از خود آزاد کشمیر کی ''حکومت'' کا اعلان کیا

جس کا صدر کرنل شیر احمد خان تھا یہ وہی کرنل شیر احمد خان تھا جو 1949ء میں عباس گروپ کے خلاف اقتدار کی کشمکش میں ابراہیم گروپ کا سب سے بڑا ستون تھا۔ اس شخص نے 1950ء میں جمہوریت، انصاف اور آزادی کے نام پر عباس گروپ کی آزاد کشمیر حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرائی تھی اور پھر اسی نے 1951ء میں متوازی حکومت قائم کرنے کا الٹی میٹم دیا تھا۔ لیکن 1952ء میں یہ یکا یک قلابازی کھا کر وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی کا پٹھو بن گیا۔ اس کی حکومت میں ایک شخص نور حسین بھی شامل تھا جو قبل ازیں ابراہیم گروپ کی کلیدی شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ عباس گروپ کی جانب سے چوہدری حمید اللہ، سردار عبدالقیوم اور پیر ضیاء الدین نئی حکومت میں شامل ہوئے اور میر واعظ یوسف شاہ کو وزارت امور کشمیر میں مشیر مقرر کر دیا گیا۔ ابراہیم گروپ نے اس ساری کاروائی کے خلاف احتجاج کیا مگر اسے درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ حکومت پاکستان کا مؤقف یہ تھا کہ چونکہ نئی حکومت میں کشمیریوں کے سارے گروپوں کے نمائندے شامل ہیں اس لیے اس کی جمہوری حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی کی نظر میں آزاد کشمیر کے عوام کی رائے کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ چونکہ ان دنوں خود پاکستان کے عوام کو حق رائے دہی سے محروم کیا جا رہا تھا۔ اس لیے آزاد کشمیر کے عوام کو یہ حق دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جنرل محمد ایوب خان، غلام محمد، اسکندر مرزا اور چوہدری محمد علی پر مشتمل سامراج نواز افسروں کے ٹولے کو جمہوریت اور عام انتخابات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حکومت آزاد کشمیر کے نئے صدر کرنل شیر احمد خان نے 28/اکتوبر 1952ء کو اپنی حکومت کے نئے قواعد کار کا اعلان کیا جن میں یہ بالکل واضح کر دیا گیا کہ آئندہ حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر کو آزاد کشمیر کے علاقے پر مکمل کنٹرول حاصل ہوگا اور آزاد کشمیر حکومت کی حیثیت حکومت پاکستان کے فرمان بردار پٹھوؤں کے ٹولے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دسمبر 1951ء تک چوہدری غلام عباس آزاد کشمیر میں اقتدار و اختیار کا سرچشمہ تھا۔ لیکن اب یہ پوزیشن وزارت امور کشمیر کے جائنٹ سیکرٹری کو حاصل ہوگئی تھی۔ نئے قواعد کار میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ "آزاد کشمیر حکومت کا صدر اس مسلم کانفرنس کی رضا مندی سے اپنے عہدے پر فائز رہے گا جسے حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر تسلیم کرے گی۔ وزارت امور کشمیر کا جائنٹ سیکرٹری اس مسلم کانفرنس کی کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے کا مجاز ہوگا اور وہ کسی بھی زیر بحث مسئلہ پر مشورہ دے سکے

گا۔آزاد کشمیر کی وزارتی کونسل کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہوگا لیکن کوئی مسودۂ قانون وزارت امور کشمیر سے مشورہ حاصل کئے بغیر وزارتی کونسل کے روبرو پیش نہیں کیا جائے گا اور اگر کونسل وزارت امور کشمیر کے مشورہ کے خلاف کوئی قانون منظور کرے گی تو وزارت امور کشمیر کی پیشگی منظوری کے بغیر اس کا اطلاق نہیں ہو سکے گا۔حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر آزاد کشمیر حکومت کے ملازمین کی عمومی نگرانی بھی کرے گی۔تا کہ وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہیں۔ یہ سرکاری ملازمین اپنے اعلیٰ افسروں کے احکامات کے خلاف وزارت امور کشمیر کے جائنٹ سیکرٹری کے روبرو اپیل کر سکیں گے اس جائنٹ سیکرٹری کا ہر فیصلہ قطعی ہوگا۔'' ان کے قواعد کار کا عملاً مطلب یہ تھا کہ چونکہ مسلم کانفرنس تین گروپوں میں منقسم تھی اس لیے آزاد کشمیر میں کوئی نمائندہ حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی اس علاقے کا نظم ونسق نوآبادیاتی طریقے سے چلاتی رہے گی اور آزاد کشمیر کی حکومت کی حیثیت ایک میونسپل کمیٹی سے زیادہ نہیں ہوگی جس کے ارکان کو کسی نہ کسی حد تک لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیوں کی اجازت ہوگی۔

چوہدری غلام عباس کو آزاد کشمیر پر وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی کی مکمل حاکمیت قائم ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اسے خوشی تھی کہ حکومت پاکستان نے ابراہیم گروپ کی مسلم کانفرنس کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس کے تین نمائندوں کو نئی آزاد کشمیر حکومت میں شامل کر لیا ہے۔لہٰذا اس نے پھر سیاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔14 مارچ 1953ء کو اس کی مسلم کانفرنس کے کارکنوں کا ایک کنونشن میرپور میں منعقد ہوا جس میں اس نے اپنی سیاسی ریٹائرمنٹ ختم کرنے کا اعلان کر کے یہ اعلان بھی کیا کہ ''میں نے مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے ایک پروگرام مرتب کر لیا ہے جس کا بہت جلد اعلان کر دیا جائے گا لیکن اس کی تنظیم کے ایک اور مؤقف کا بھی اسی موقع پر بذریعہ قرارداد اعلان کر دیا گیا کہ ''پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔'' اس اعلان کو اس قدر ضروری سمجھا گیا تھا کہ اس میں تاخیر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ چند دن بعد چوہدری غلام عباس نے گوجرانوالہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے پروگرام کا اعلان اس مطالبے کی صورت میں کیا کہ ''تنازعہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی وساطت سے یا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان براہ راست بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش

کرنے کی بجائے میری اور شیخ عبداللہ کی ملاقات کا بندوبست کیا جائے۔ ہم دونوں مل کر ریاست کا نظم ونسق چلائیں گے اور اس طرح اس تنازعہ کا تصفیہ کریں گے۔'' غالباً چوہدری غلام عباس نے یہ تجویز اس حقیقت کی بنا پر پیش کی تھی کہ شیخ عبداللہ نے 1948ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن سے رازداری کے ساتھ درخواست کی تھی کہ اس کی ملاقات آزاد کشمیر کے لیڈر سے کرائی جائے مگر کمیشن نے اس کی خواہش کی تکمیل اس لیے نہیں کی تھی کہ حکومت ہندوستان اس پر سازش کا الزام عائد کر یگی''[1] اور غالباً دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دنوں شیخ عبداللہ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ بین الاقوامی تنازعہ صرف ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔ دو افراد کی ملاقات سے اس کا کوئی تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ تاہم 9/اگست کو شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ہندوستانی اخبارات نے اس پر سازش اور غداری کے جو الزامات عائد کئے تھے ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ شیخ عبداللہ نے گلمرگ میں پاکستانی دوستوں سے خفیہ ملاقات کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل بی۔ ایم۔ کول نے بھی نہرو کو اسی مضمون کی رپورٹ پیش کی تھی۔ حکومت ہندوستان کی جانب سے اس الزام کی تائید میں کبھی کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ انہوں نے یہ بے بنیاد الزام چوہدری غلام عباس کی گوجرانوالہ کی تقریر کی بنیاد پر عائد کیا تھا۔

20/اگست 1953ء کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کشمیر کے بارے میں ایک سمجھوتے کا اعلان کیا گیا جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ کشمیر کے لیے ناظم استصواب کا تقرر اپریل 1954ء کے آخر میں ہوجائے گا۔ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد پاکستان کی سامراج نواز افسر شاہی کی جانب سے ہندوستان کے ساتھ اس سمجھوتے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس طریقے سے حکومت ہندوستان کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ اسے امریکہ سے جو ہتھیار ملنے والے ہیں انہیں کشمیر کی آزادی کے لیے ہندوستان کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا بلکہ ان سے اس خطرے کا سدباب کیا جائے گا جو اسے ''شمال'' کی طرف سے محسوس ہورہا تھا۔ بعض امریکی اخبارات کی اطلاعات کے مطابق روسی اور چینی کمیونسٹ ایجنٹ گلگت کے علاقے میں گھس آئے تھے اور پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے سنکیانگ، گلگت سرحد کی خلاف ورزی کے خلاف حکومت چین سے احتجاج کیا تھا۔''[2] چوہدری غلام عباس کے لیے یہ سمجھوتہ قابل قبول نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ

نہیں تھی کہ اسے اس سمجھوتے کے بارے میں اصولی طور پر کوئی اختلاف تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھی شیخ عبداللہ کی طرح خودسری وسرکشی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے 1946ء میں شیخ عبداللہ کی ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک کے دوران بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے 18 ستمبر کو اپنے گروپ کے کارکنوں کا ایک کنونشن لاہور میں منعقد کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اس کی تنظیم ساری پابندیوں اور ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر کشمیر کی جدوجہد آزادی کا ازسرنو آغاز کرے گی اور وہ حکومت پاکستان کی جانب سے کیے گئے کسی معاہدے کی پابند نہیں ہوگی۔ یہ قرارداد آزاد کشمیر حکومت کے وزیر خزانہ چوہدری حمیداللہ نے پیش کی اور اس کی تائید میں بڑی پرجوش تقریریں کی گئیں۔ چنانچہ اسی دن بظاہر آزاد کشمیر کے صدر کرنل شیر احمد خان نے لیکن دراصل حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر نے چوہدری حمیداللہ کو برطرف کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ وہ اقرباءنوازی اور دوسری بدعنوانیوں کا مرتکب ہوا ہے اور چوہدری حمیداللہ کا جواب یہ تھا کہ وزارت امور کشمیر کا کلرک آزاد کشمیر کے صدر سے زیادہ بااختیار ہے۔ دراصل یہ دونوں باتیں ہی صحیح تھیں۔ چوہدری حمیداللہ کے خلاف عائد کردہ الزام بھی بے بنیاد نہیں تھا اور اس نے وزارت امور کشمیر کی افسرشاہی کی آمریت کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔ آزاد کشمیر کے ایک سابق وزیر سید نذیر حسین شاہ کی ایک تقریر کے مطابق ''کشمیری عوام نے مسلم کانفرنس کے لیڈروں سے بہت امیدیں وابستہ کی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آزاد کشمیر کا علاقہ ان کے لیے جنت سے کم نہیں ہوگا جس میں اُنہیں سیاسی، معاشرتی اور معاشی آزادی ملے گی۔ لیکن انہیں چند سال کی جدوجہد آزادی کے بعد پتہ چلا ہے کہ ان کے لیے حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ علاقے میں قحط پڑا ہوا ہے۔ سینکڑوں لوگ بھوک سے جاں بحق ہو گئے ہیں اور جو زندہ ہیں ان میں بہت سے اس قدر بیمار اور کمزور ہیں کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ بے روزگاری اور فاقہ کشی کا دوردورہ ہے۔ ضروریات زندگی میں بے انتہا کمی ہو گئی ہے اور ٹیکسوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس معاشی بدحالی کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جرائم کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔''[3]

چوہدری نذیر حسین کا یہ دلخراش بیان بے بنیاد نہیں تھا۔ مسلم کانفرنس کے ہر گروپ کے لیڈروں نے اپنے عہد اقتدار میں غریب عوام کے معاشی اور معاشرتی مسائل حل کرنے کی طرف

کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ وہ صرف کھوکھلے نعرے لگاتے رہے تھے۔ علاقے میں زمینداری اور نوآبادیاتی نظام بدستور قائم رہا اور اس بنا پر رشوت ستانی، اقربا نوازی اور غنڈہ گردی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چوہدری حمید اللہ اور اسی قماش کے دوسرے لوگوں کو اس افسوسناک صورت حال کی ذمہ داری سے مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ اس کی برطرفی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے حکومت پاکستان کی ہندوستان سے صلح جوئی کی پالیسی کی مخالفت کی تھی۔ مظفرآباد کے ہفت روزہ ''کشمیر'' کی 26ردسمبر کی اشاعت میں چوہدری حمید اللہ کی برطرفی کی یہ وجہ بیان کی گئی تھی کہ ''پاکستان کی مسلم لیگی حکومت نے اپنی وزارت امور کشمیر کی وساطت سے آزاد کشمیر میں ایک انتہائی غیر جمہوری نظام نافذ کر رکھا ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کو ہندوستان کے مقبوضہ کشمیر کے عوام کی طرح کوئی حق خوداختیاری حاصل نہیں ہے۔ مسلم لیگی حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر میں بھی اس جاگیرداریت کا غلبہ قائم رکھا ہے جو کہ پاکستان کے عوام پر غالب ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ آزاد کشمیر میں بھی وہ معاشی نظام قائم رہے جو کہ ڈوگرہ شاہی کے تحت قائم تھا۔ اس نے اس ظالمانہ نظام میں کوئی تبدیلی لانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔''[4] یہی حقیقت 1947ء کے بعد آزاد کشمیر کے عوام کی ساری مشکلات و مصیبتوں کا باعث تھی اور اسی وجہ سے کشمیر کی جدوجہد آزادی میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی۔

مسلم کانفرنس کے تینوں گروپ زیادہ تر درمیانہ طبقہ کے موقعہ پرست عناصر پر مشتمل تھے۔ یہ حقیقی جذبۂ آزادی اور انقلابی نظریے سے محروم تھے۔ یہ غریب عوام کو مذہبی نعروں سے گمراہ کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے تھے۔ اس قسم کے منافق عناصر سے رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں کے سوا کوئی اور توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ ہی ان سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ یہ وزارت امور کشمیر کی آمریت کے خلاف سینہ سپر ہوں گے۔ چنانچہ چوہدری حمید اللہ کی برطرفی کے بعد بھی آزاد کشمیر حکومت میں رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔ مئی 1954ء میں سردار ابراہیم نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آزاد کشمیر میں روزافزوں رشوت ستانی اور آمریت کے خلاف سخت احتجاج کیا، تو جون میں آزاد کشمیر حکومت نے یعنی وزارت امور کشمیر نے اعلان کیا کہ آزاد کشمیر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ بورڈوں کے عام انتخابات کرائے جائیں گے

اور پھر وہاں نمائندہ حکومت قائم کی جائے گی۔لیکن ان انتخابات کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہ کی گئی، پاکستانی کی برسراقتدار افسر شاہی نے یہ دلکش اعلان محض اس لیے کیا تھا کہ آزاد کشمیر میں نوآبادیاتی آمرانہ نظام کے باعث دنیا میں پاکستان کی بدنامی ہو رہی تھی۔

17رجون 1954ء کو وزارت امور کشمیر کا جائنٹ سیکرٹری غیاث الدین مظفرآباد گیا تو مقامی سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کے دو وفود نے اس سے ملاقات کر کے مطالبہ کیا کہ ''آزاد کشمیر کے عوام کو اپنی حکومت کے امور خود طے کرنے کا حق دیا جائے اور عوام الناس کی معاشی بدحالی کی اصلاح کے لیے مقامی صنعت کو ترقی دی جائے۔''[5] 29رجولائی کو پاکستان کے وزیر امور کشمیر شعیب قریشی کی آزاد کشمیر کے ایڈیٹروں سے ملاقات کے دوران جب اس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا تو جواب ملا کہ آزاد کشمیر کے ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات کے بعد نمائندہ حکومت قائم کرنے کے بارے میں پہلے جو اعلان کیا جا چکا ہے اس میں کوئی ردوبدل نہیں کیا جائے گا۔تاہم اس نے کہا کہ ''وزارت امور کشمیر قائم رہے گی، اسے ختم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''[6] لیکن 28رکتوبر 1954ء کو لاہور کے اخبار نوائے وقت میں ''مکتوب آزاد کشمیر'' کے عنوان سے یہ رپورٹ چھپی کہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات کا اعلان تو عرصہ ہوا کیا گیا تھا لیکن اس اعلان کے فوراً بعد آزاد کشمیر کی سیاسیات میں بعض ایسے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تھے جن سے بعض حلقوں میں یہ قیاس آرائیاں کی جانے لگی تھیں کہ شاید انتخابات کی حقیقت محض اعلان تک محدود ہو۔ادھر سرکاری حلقوں کی طرف سے انعقاد کا یقین تو دلایا جاتا تھا لیکن بڑی ہوشیاری سے اس اعتراف سے پہلو بچایا جاتا تھا کہ ان انتخابات کا حکومت آزاد کشمیر کی تشکیل سے کوئی واسطہ ہوگا......اب آزاد کشمیر کے وزیر خزانہ غلام محمد نے یقین دلایا ہے کہ عام انتخابات ضرور ہوں گے لیکن اس نے یہ واضح نہیں کیا کہ یہ انتخابات کب ہوں گے۔''[7] 19ردسمبر 1954ء کو آزاد کشمیر کے ایک سابق وزیر چوہدری نور حسین نے ایک پریس کانفرنس میں حکومت پاکستان کے محکمہ امور کشمیر پر بدعنوانیوں کے شدید الزامات عائد کیے اور مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر کے موجودہ نظام کو معطل کر کے اس کے عائد کردہ الزامات کی تحقیقات کرائی جائے۔[8]

پاکستان کی افسر شاہی کی نااہلیوں اور بدعنوانیوں کی حالت یہ تھی کہ آزاد کشمیر کی حکومت کے چھوٹے درجہ کے ملازمین کو کئی کئی ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ ہر ماہ تنخواہوں کے بل

تو پاس ہوجاتے تھے مگران بلوں کی ادائیگی کے لیے انہیں بہت خجل خوار ہونا پڑتا تھا کیونکہ آزاد کشمیر کے خزانے میں کوئی رقم ہی نہیں ہوتی تھی۔ پاکستان کی وزارت امور کشمیر آزاد کشمیر کی حکومت کا سالانہ بجٹ بروقت منظور نہیں کرتی تھی۔بعض مقامی سیاسی حلقوں کا الزام یہ تھا کہ ''حکومت پاکستان اپنی مرضی کے بعض افسر یہاں بھیج دیتی ہے۔ نیز بعض گوشوارے کھولے جاتے ہیں، جن پر لاکھوں روپے اٹھ جاتے ہیں اور یہ اخراجات کشمیر کے نام ڈال دیئے جاتے ہیں۔ان حلقوں کا کہنا تھا کہ آزاد کشمیر کے عوام کو پاکستان سے مالی امداد کا حق حاصل ہے کیونکہ آزاد کشمیر کے دریاؤں اور جنگلوں سے پاکستان فائدہ اٹھا رہا ہے اور آزاد کشمیر سے جس قدر مال برآمد کیا جاتا ہے اس کا ٹیکس اور ڈیوٹی حکومت پاکستان وصول کرتی ہے۔ چونکہ یہاں کوئی نمائندہ حکومت نہیں ہے اس لیے وزارت امور کشمیر کے افسروں سے باز پرس نہیں ہوسکتی۔''[9]

بالآخر آزاد کشمیر کے سرکاری ملازمین اور سیاسی حلقوں کی روزافزوں بے چینی کی مسلسل رپورٹوں کے پیش نظر حکومت پاکستان اس کا نوٹس لینے پر مجبور ہوگئی۔14/مارچ 1955ء کی ایک اخباری اطلاع میں بتایا گیا کہ وزارت امور کشمیر کے جائنٹ سیکرٹری فضل کریم فضلی کے خلاف تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے جو مارچ کے آخری ہفتے میں شروع ہوگی۔تاہم اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ''فضلی لمبی چھٹی پر چلا گیا ہے اور وہ آج کل نئے جائنٹ سیکرٹری ایم اظفر کے ہاں قیام پذیر ہے۔''[10] اس رپورٹ سے ظاہر تھا کہ حکومت پاکستان کی یہ کارروائی محض آزاد کشمیر کے عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لیے کی گئی تھی۔ فضل کریم فضلی کے خلاف تحقیقات کا کوئی نتیجہ نہ نکلنا تھا اور نہ نکلا۔

19/اکتوبر 1955ء کو پاکستان کا وزیراعظم چوہدری محمد علی مظفرآباد گیا تو وہاں کی ساری سیاسی جماعتوں نے اس کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے جلسے کرکے احتجاجی تقریریں کیں اور مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر میں نمائندہ حکومت کے قیام کے لیے انتخابات کرائے جائیں۔ چوہدری محمد علی کا جواب یہ تھا کہ ''آزاد کشمیر میں نمائندہ حکومت کے قیام کا مسئلہ ایک جزوی مسئلہ ہے۔خواہ مقامی طور پر اس کی کتنی ہی اہمیت ہو۔اصل مسئلہ آزادئ کشمیر ہے۔اس مقصد کے لیے مجھے اگر جزوی مسائل کو کچھ عرصہ کے لیے پیچھے بھی کرنا پڑا تو ایسا کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کروں گا۔'' جب چوہدری محمد علی آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈروں کو یہ منفی جواب دے رہا تھا، اس وقت حکومت آزاد

کشمیر کے سرکاری ملازمین ہڑتال کرنے کے بعد سیکرٹریٹ کے سامنے مظاہرہ کررہے تھے۔ ان کا الزام یہ تھا کہ آزاد کشمیر کے نظم ونسق میں اصول وقواعد کے برعکس سیاسی مصلحتوں، رقابتوں اور دوسری عام برائیوں کو دخل ہے۔ ان برائیوں کا سہرا وزارت امور کشمیر کے سر پر ہے۔ پچھلے تین سال سے یہاں کا حکومتی نظام نئے رولز آف بزنس کے تحت ایسے خطوط پر چلایا جارہا ہے جن کی رُو سے اصل اقتدار یہاں سے منتقل ہوکر راولپنڈی چلا گیا ہے۔ وزراء حکومت محض نام کے وزیر رہ گئے ہیں۔ سارا اقتدار دو چار افسروں کے ہاتھوں میں ہے جو وزارت امور کشمیر کے نمائندہ ہیں۔[11] چنانچہ چوہدری محمد علی ابھی آزاد کشمیر میں ہی تھا کہ 26 ر اکتوبر کو راولپنڈی میں محکمۂ امور کشمیر کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ عنقریب آزاد کشمیر میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات کرائے جائیں گے۔ مظفرآباد اور پونچھ کے ڈپٹی کمشنروں کو مناسب احکامات دے دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ ان ڈسٹرکٹ بورڈوں کا نمائندہ حکومت کی تشکیل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور بورڈوں کے چیئرمین بھی ڈپٹی کمشنر ہوں گے۔ بورڈوں کے انتخابات کے لیے 10 ر جنوری 1956ء کی تاریخ مقرر کی گئی مگر بعد میں اسے غیر معینہ عرصہ کے لیے یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ انتخابی معرکوں میں علاقہ کا امن وسکون تہہ وبالا ہوجائے گا۔ 10 ر اپریل کو وزارت امور کشمیر کی تحریک پر مسلم کانفرنس کے مختلف گروپوں میں صلح ہوئی تو 31 ر مئی کو آزاد کشمیر میں کرنل شیر احمد خان کی جگہ میر واعظ یوسف شاہ کی صدارت میں ایک نگران حکومت کی تشکیل ہوئی۔

اس حکومت کی بنیاد پاکستان کے ارباب اقتدار کے اس فیصلہ پر تھی کہ اگر کشمیری لیڈروں میں اتحاد پیدا ہوجائے تو آزاد کشمیر میں اسمبلی اور انتخاب کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ اسمبلی کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کرتے تھے کہ ''اس طرح آزاد کشمیر کے سادہ لیکن باشعور عوام میں یہ تاثر پیدا ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کشمیر سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں...... اس شوشہ کے پھیلنے سے صوبائی تعصب، قبیلہ پرستی اور مہاجر وغیر مہاجر کی تفریقات ابھرنے لگی ہیں...... اسمبلی کے قیام میں ایسے خطرات مضمر ہیں جن سے تحریک آزادئ کشمیر اور پاکستان سے الحاق کی جدوجہد کا پیش منظر بدل جائے گا...... اصل نصب العین انتخابی ہنگاموں کی اوٹ میں چلا جائے گا۔ علاقہ کا سکون وامن تہہ وبالا ہوجائے گا...... لوگوں کی عزت وآبرو محفوظ نہیں رہے گی...... پاکستان سے الحاق کا نصب العین بھی موضوع بحث بن جائے گا...... وزیراعظم

پاکستان کے دورۂ کشمیر کے موقعہ پر خود مختار کشمیر کا نعرہ بلند ہوا تھا اور امور کشمیر کے سابق وزیر سردار ممتاز علی، محترمہ فاطمہ جناح اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی آمد پر بھی یہ تصور زیر بحث لایا گیا تھا۔''[12] یہ نگران حکومت چھ ماہ سے زیادہ دیر تک قائم نہ رہی کیونکہ پاکستان کے وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی خواہش کے مطابق چوہدری غلام عباس کی مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم خان، میر واعظ یوسف شاہ کے نمائندے نور الدین اور سردار محمد ابراہیم خان میں مطلوبہ ''اتفاق واتحاد'' ہو گیا اور اس بنا پر ستمبر 1956ء میں مظفر آباد میں مسلم کانفرنس کا ''عظیم الشان'' متحدہ کنونشن منعقد ہوا جس میں متفقہ طور پر سردار عبدالقیوم خان کو حکومت آزاد کشمیر کا صدر اور سردار محمد ابراہیم خان کو مسلم کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ مگر چوہدری محمد علی کی حکومت کا تختہ الٹ جانے کے چند ماہ کے بعد 13/اپریل 1957ء کو کشمیری لیڈروں کے اس مصنوعی اتحاد و اتفاق کا شیرازہ بکھر گیا جبکہ سردار ابراہیم خان نے اپنی نامزد کردہ مجلس عاملہ کے دس ارکان کا ایک اجلاس مظفر آباد میں طلب کر کے یہ فیصلہ کروایا کہ آئندہ وہ خود سردار عبدالقیوم خان کی جگہ آزاد کشمیر کا صدر ہوگا۔ چونکہ اس تبدیلی میں وزارت امور کشمیر کی بیوروکریسی کا ہاتھ تھا اس لیے چوہدری غلام عباس اختلاف واحتجاج کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

تقریباً ایک سال بعد یعنی 26/اپریل 1958ء کو وزیر اعظم فیروز خان نون مظفر آباد گیا تو آزاد کشمیر کے نئے صدر سردار ابراہیم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعہ پر سردار عبدالقیوم خان اور بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ آزاد کشمیر میں قانون ساز اسمبلی قائم کی جائے اور صدر کا انتخاب براہ راست کرایا جائے۔ مگر جب ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور سردار ابراہیم خان نے وزارت امور کشمیر کے تعاون سے آزاد کشمیر کی حکومت کے علاوہ مسلم کانفرنس پر بھی اپنا آمرانہ قبضہ جاری رکھا تو چوہدری غلام عباس نے 15/جون کو یہ اعلان کر دیا کہ اس کی جماعت 27/جون کو جنگ بندی لائن کو توڑ کر ہندوستان کے مقبوضہ علاقے میں پر امن تحریک آزادی شروع کرے گی۔ اس نے اعلان کیا کہ ہمارے پاس دو لاکھ آزمودہ کار مجاہدین آزادی موجود ہیں۔ اگر انہیں جنگ بندی لائن عبور کرنے سے روکا گیا تو اس کے نتائج کی ذمہ داری نون حکومت پر عائد ہوگی۔ 19/جون کو پاکستان کے صدر اسکندر مرزا نے چوہدری غلام عباس کو نتھیا گلی میں طلب کیا اور ذاتی طور پر اپیل کی کہ کشمیر میں جنگی بندی لائن کو عبور کرنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ اس اقدام میں

زبردست خطرات مضمر ہیں اوراس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔مگر چوہدری غلام عباس اپنے فیصلے پر قائم رہااوراس نے پختہ عزم کا اظہار کیا کہ وہ تحریک آزادی کشمیر کے فیصلے کے مطابق جنگ بندی لائن لازمی طور عبور کرے گا۔" 21 رجون کو کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کاغان میں سیر وتفریح کے بعد لوٹا تو اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ "غلام عباس نے بڑے جتھے لے کر جنگ بندی لائن کو توڑنے کی جو دھمکی دی ہے اس سے نظم وضبط کا بڑا سخت مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔صدر کو جو ان دنوں نتھیا گلی میں آرام کر رہے ہیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ غلام عباس کو ملاقات کے لیے بلائیں اوراس کی بابت مناسب اقدام کی ہدایات کریں۔ یہ معلوم کر کے میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ انہوں نے یہ ہدایت کی ہے کہ جب تک عباس اوران کے آدمی جنگ بندی لائن پر نہ پہنچ جائیں، ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ اس کے بعد فوج بغیر طاقت استعمال کئے انہیں گرفتار کر لے۔ میں نے اسی وقت صدر کو ٹیلی فون کر کے اس طفلانہ فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ اگر کوئی کاروائی کرنی ہے تو پاکستان یا آزاد کشمیر کے علاقے کے سول حکام کے ذریعے کی جائے۔ اس پر کابینہ کا اجلاس ہوا اور میری سفارشات کو منظور کر لیا گیا۔"[13] اسی دن کراچی سے اس فیصلے کا اعلان کیا گیا کہ حکومت پاکستان جنگ بندی لائن کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گی کیونکہ اس طرح تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ میں رکاوٹ پیدا ہونے کا امکان ہے۔

25رجون 1958ء کو آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم خان نے جنگ بندی لائن توڑنے کی تحریک کی مخالفت کی اور یہ الزام عائد کیا کہ "چوہدری غلام عباس کی تحریک کے پس پردہ سیاسی مقاصد کارفرما ہیں۔" 27 رجون کو چوہدری غلام عباس اور سردار عبدالقیوم خان کی گرفتاری کے بعد راولپنڈی، مظفر آباد، مری، جہلم میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ مظفر آباد میں مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا گیا اور سینکڑوں رضا کاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ 28 رجون کو اعلان کیا گیا کہ کوئی شخص پرمٹ کے بغیر آزاد کشمیر میں داخل نہیں ہو سکے گا اور اسی دن راولپنڈی، گجرات، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، ایبٹ آباد اور کوہالہ میں چوہدری غلام عباس کے بہت سے رضا کاروں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ چوہدری محمد علی، جو ان دنوں کشمیر کی آزادی کے لیے ہندوستان کے خلاف جنگ کے نعرے لگا رہا تھا، چوہدری غلام عباس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر حکومت پاکستان کی

کشمیر کمیٹی سے مستعفی ہو گیا اور مغربی پاکستان کے سابق وزیر امور کشمیر مشتاق احمد گرمانی نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت پاکستان کشمیر کے سوال پر قومی پالیسی سے منحرف ہو گئی ہے۔ 30/جون کو لاہور میں کشمیریوں کی تحریک آزادی کی حمایت میں زبردست جلوس نکالا گیا تو اسی دن چوہدری غلام عباس کو راولپنڈی جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس نے جیل سے باہر نکلتے ہی ایک بیان میں اعلان کیا کہ ''کشمیریوں کو اپنے وطن جانے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔'' چنانچہ اسی شام اسے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ یکم جولائی کو سیالکوٹ میں پولیس اور کشمیری رضا کاروں کے درمیان تصادم ہوا جس کے بعد شہر میں مکمل ہڑتال کی گئی۔

4/جولائی کو پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے ''گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک اجلاس میں شرکت کی۔ جس میں صدر، وزیر اعظم اور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مع اپنی کابینہ کے شریک تھے۔ وزیر اعظم نے یہ اجلاس اس لیے منعقد کیا تھا کہ عباس نے اپنے والنٹیئر وں کے ساتھ جنگ بندی لائن توڑنے کا جو ارادہ کیا ہے اس سے نمٹنے کا کوئی واضح طریقہ سوچا جائے۔ نیز حکومت کو نیچا دکھانے کے لیے سیاسی پارٹیوں کی غیر ذمہ دارانہ اور گروہ بندی کی بڑھتی ہوئی کشاکش پر بھی غور و خوض کیا گیا۔ ''ایوب خان'' چوہدری عباس کی تحریک کے بارے میں حکومت کے فیصلوں سے خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا۔ کیونکہ آگے چل کر اس کا اثر فوج پر پڑنا ضروری تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ عباس اور اس کے آدمیوں کے بارے میں مضبوطی سے کاروائی کی جائے گی اور انہیں ملک میں گڑ بڑ پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی''[14] اور اگلے دن 5/جولائی کو وزیر اعظم نون نے اعلان کیا کہ ''پاکستان کسی حالت میں بھارت سے جنگ نہیں کرے گا۔'' تاہم چوہدری غلام عباس کی یہ تحریک کسی نہ کسی صورت میں مزید دو اڑھائی ماہ تک جاری رہی تا آنکہ جنرل محمد ایوب خان نے اکتوبر 1958ء میں ملک کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے فوجی آمریت نافذ کر دی۔

چوہدری محمد علی اور دوسرے پاکستانی مؤرخین آزاد کشمیر کے ان شرمناک سیاسی حالات کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ظفر اللہ خان بھی اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے۔ وہ اس حقیقت کی تو نشاندہی کرتا ہے کہ ''شیخ عبداللہ جس کو نہرو بڑے فخر سے کشمیر کے متعلق اپنے مؤقف کی تائید میں پیش کیا کرتا تھا آخر کار ہندوستان کے سلوک اور نہرو کی وعدہ خلافیوں سے سبق حاصل کر کے

کشمیر کے حق خود اختیاری کی تائید میں اٹھ کھڑا ہوا، جس کی پاداش میں نہرو نے اسے بغیر مقدمہ چلائے بارہ سال تک جیل میں رکھا''[15] لیکن اسے اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی توفیق نہیں ہوئی کہ حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کے عوام سے جو بدسلوکی کی اس سے کشمیر کی جدوجہد آزادی کو کس قدر نقصان پہنچا۔

آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار محمد ابراہیم خان نے بھی اپنی کتاب میں کشمیری لیڈروں کی مفاد پرستی، رشوت ستانی، دھڑے بندی اور دوسری بداعنونیوں کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کو حکومت آزاد کشمیر کے قیام کے وقت سے ہی آزاد کشمیر میں ایک حکمران سیاسی جماعت کی حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ ریاست کے آزاد علاقے میں ایسے حالات موجود نہیں تھے کہ یہاں نمائندہ قومی اسمبلی یا قانون ساز اسمبلی قائم کی جاتی اس لیے مسلم کانفرنس کو ہی اسمبلی کا درجہ بھی دے دیا گیا ہے۔ لیکن یہ صورت حال تسلی بخش نہیں تھی اور اس کی وجہ سے بہت پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ (1) ریاست کے سربراہ کا تقرر یا نامزدگی کرنے کا اختیار کسے حاصل ہو؟ (2) حکمران سیاسی جماعت کو سربراہ مملکت اور حکومت پر انتظامی و سیاسی امور میں کس حد تک برتری حاصل ہو؟ (3) حکومت کس تنظیمی ادارے یا جماعت کے سامنے جوابدہ ہو؟ یہ سوالات بڑے بحث طلب ہیں اور انہی مسائل پر اختلافات کے باعث آزاد کشمیر کے اکثر سیاسی رہنماؤں کے درمیان مخاصمت پیدا ہو گئی ہے اور ان بنیادی اختلافات کی بنا پر ہی تحریک آزادی کو بھی ماضی میں بہت نقصان پہنچا ہے۔''[16] گویا اس شخص کے نزدیک آزاد کشمیر کے عوام الناس کو رائے دہی کا حق دینے کا مسئلہ متنازعہ فیہ نہیں تھا۔ مسلم کانفرنس کے سارے دھڑے اس بات پر متفق تھے کہ چونکہ ریاست کے آزاد علاقے میں ایسے حالات موجود نہیں تھے کہ یہاں نمائندہ قومی اسمبلی یا قانون ساز اسمبلی قائم کی جاتی اس لیے آزاد کشمیر کے عوام کو عام انتخابات کے ذریعے وہ حق خود اختیاری دینے کی ضرورت نہیں تھی جس کا مطالبہ پوری ریاست کے عوام الناس کے لیے کیا جارہا تھا۔ تنازعہ صرف اس سوال پر تھا کہ عہدوں کی تقسیم کس طرح ہو اور کون کرے؟ سردار ابراہیم کو آزاد کشمیر کے عوام کے معاشرتی و معاشی مسائل سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ بظاہر اس کا خیال یہ ہے کہ تحریک آزادی عوام کے ان بنیادی مسائل کو حل کیے بغیر بھی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اس کا

چوہدری غلام عباس کے ساتھ معاشرتی ومعاشی پروگرام پر کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس سلسلے میں دونوں کا کوئی پروگرام تھا ہی نہیں۔ جھگڑا صرف کرسیوں کے لیے تھا اوران کی کرسیوں کی لڑائی نے کشمیر کی تحریک آزادی کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔ سردار ابراہیم کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ ''آزاد علاقے میں ایسے حالات موجود نہیں تھے کہ یہاں نمائندہ قومی اسمبلی یا قانون ساز اسمبلی قائم کی جاتی۔'' حقیقت یہ ہے کہ جنوری 1949ء میں جنگ بندی کے بعد آزاد علاقے میں ایسے حالات ہمیشہ موجود رہے تھے کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کرائے جاتے۔ میر عبدالعزیز، عبدالسلام یاتو (ہاتو) اور متعدد دوسرے ترقی پسند ومحب وطن کشمیری کارکن آزاد علاقے کے عوام کے لیے جمہوری حقوق کا مطالبہ کرتے رہے۔ مگر سردار ابراہیم اور چوہدری غلام عباس وغیرہ غیر نمائندہ مسلم کانفرنس کی بالادستی پر ہی مصر رہے۔ دولت، شہرت اور اقتدار کی ہوس نے ان کے دلوں پر مہریں لگا رکھی تھیں۔

باب: 12

# سامراج نواز افسر شاہی کی جانب سے دوطرفہ بات چیت کا ڈھونگ

آزاد کشمیر کے لیڈروں کی اس شرمناک کشمکش اقتدار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے قدامت پسند ارباب اقتدار کشمیر کے بارے میں خلوص نیت اور جرأت ایمانی سے بیگانہ تھے۔ جب تک لیاقت علی خان زندہ رہا وہ اس تنازعے کے تصفیے کے لیے اینگلو امریکی سامراج پر انحصار کرتا رہا۔ جب وہ جنوری 1951ء میں برطانوی کامن ویلتھ کی وساطت سے جواہر لال نہرو کو بین الاقوامی فوج کی نگرانی میں آزادانہ استصواب کرانے پر آمادہ کرنے میں ناکام ہوا تو اس نے سامراج کے خلاف پاکستانی رائے عامہ کے غیض و غضب کے مظاہروں کے باوجود اینگلو امریکی سامراج کا دامن نہ چھوڑا بلکہ اس نے امریکہ سے مفت ہتھیار حاصل کرنے کی امید میں کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان اور دوسرے سامراج نواز اعلیٰ افسروں کے مشوروں کے مطابق مشرق وسطیٰ کے لیے امریکہ کے مجوزہ فوجی معاہدے میں شرکت کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ اینگلو امریکی سامراج پاکستان کی اس خدمت گزاری کے انعام کے طور پر سلامتی کونسل کے ذریعے ہندوستان پر دباؤ ڈال کر کشمیر کا فیصلہ پاکستان کے حق میں کرا دے گا۔ مگر جب کئی ماہ تک اس خوش فہمی کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو پنجاب کے جاگیرداروں کے ایک گروہ، درمیانہ طبقہ کے شونسٹوں اور دقیانوسی ملاؤں نے رائے عامہ کو اس کے خلاف اس قدر برانگیختہ کر دیا کہ بالآخر وہ 16/اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں گولیوں کا شکار ہو گیا۔ یہ الزام بے بنیاد نظر نہیں آتا تھا کہ پنجاب میں لیاقت علی خان کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈا کی مہم اور پھر

اس کی ہلاکت پنجابی جاگیرداروں کے اس گروہ اور غلام محمد ٹولے کی سازش کا نتیجہ تھی۔

لیاقت علی کے جاں بحق ہونے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف پیش قدمی نہ ہوئی۔ اس دوران اقوام متحدہ کے امریکی نمائندہ ڈاکٹر گراہم نے اپنی ناکامی کی آخری رپورٹ پیش کی تو اس کے تین چار دن بعد یعنی یکم اپریل 1953ء کو پاکستان کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کو باقاعدہ دعوت دی کہ وہ کراچی آئے تاکہ متنازعہ مسائل کا براہ راست گفت وشنید کے ذریعے حل تلاش کیا جائے۔ 8/اپریل کو نہرو نے اپنے جواب میں ناظم الدین کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ پہلے اس سلسلے میں افسروں کی سطح پر گفتگو ہونی چاہیے۔ خواجہ ناظم الدین نے نہرو کے نام یہ دعوت نامہ غالباً گورنر جنرل غلام محمد کے کہنے پر لکھا تھا اس کا پس منظر یہ تھا کہ 3/فروری کو نیو یارک ٹائمز میں رائٹر کے مضمون کی رپورٹ چھپی تھی کہ ''تبت میں کمیونسٹوں کی فوجی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک ہوائی اڈا لہاسہ کے علاقہ میں اور دوسرا مشرقی تبت میں مہارنگو کے نزدیک تعمیر کیا جا رہا ہے۔ فوجی مقاصد کے لیے تین بڑی سڑکیں بن رہی ہیں۔ ایک سڑک شمال مغربی تبت میں کشمیر کی سرحد کے نزدیک سنکیانگ سے روڈوک تک مکمل ہو چکی ہے۔'' پھر 24/فروری کو لاہور کے ایک اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چینی تاجروں سے منسوب کر کے یہ رپورٹ شائع کی گئی تھی کہ ''لہاسہ میں چینیوں کے فوجی نقشوں میں سکم، بھوٹان اور کشمیر کے شمال مغربی صوبہ لداخ کو تبت کا ایک حصہ ظاہر کیا گیا ہے۔ لہاسہ کے ایک فوجی سکول میں چینی افواج کے افسر اور جوان ہندی، اردو اور نیپالی زبان سیکھ رہے ہیں۔'' اس دعوت نامے کا مقصد ہندوستان کو یقین دلانا تھا کہ امریکہ کے مجوزہ فوجی گٹھ جوڑ میں پاکستان کی شمولیت ہندوستان کے خلاف نہیں ہوگی۔ نہرو نے یہ دعوت نامہ اس لیے قبول کر لیا کہ وہ بین المملکتی گفت وشنید اور صلح جوئی کی آڑ میں ریاست کے ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام کا کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔

15/اپریل 1953ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے حکومت چین سے احتجاج کیا کہ اس کی جانب سے سنکیانگ، گلگت سرحد کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اس کے تین دن بعد 18/اپریل 1953ء کو خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تو اسی دن مدراس کے اخبار ''ہندو'' نے ایک رپورٹ میں امید ظاہر کی کہ چونکہ گورنر جنرل غلام محمد ہندوستان کے ساتھ

گہرے اور دوستانہ تعلقات استوار کرنے کا خواہاں ہے، اس لیے دونوں ملکوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ ازسرنو شروع ہونے کا امکان ہے۔ برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ بیون نے امرت بازار پتریکا سے ایک انٹرویو میں کہا کہ نہرو اور غلام محمد دو ہی ایسے اشخاص ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قریبی تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔[1] پاکستان کے نئے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ''اگر نہرو گفت وشنید کے ذریعے تنازعات حل کرنے پر آمادہ ہو گا تو میں ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کروں گا۔'' اس نے 27/اپریل کو ہندوستان کی ایک خبر رساں ایجنسی سے انٹرویو کے دوران کہا کہ ''ایشیا میں امن واستحکام کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔'' اس نے نہرو کے سیاسی تجربے اور تدبر کی تعریف کی اور کہا کہ میں اسے اپنا ''بڑا بھائی'' سمجھتا ہوں۔ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعات کے تصفیہ کے بارے میں پرامید ہوں۔ ایک مرتبہ ان تنازعات کا تصفیہ ہو جائے تو ہم ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ''مشترکہ دفاع'' کی تجویز پر غور کر سکتے ہیں۔'' جب ہندوستانی نامہ نگار نے اس سے پوچھا کہ آیا پاکستان کے حکام، سیاست دان اور اخبارات متفقہ طور پر ہندوستان کے ساتھ پرامن تصفیہ کے خواہاں ہیں تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''میرا خیال ہے کہ سارے صحیح الخیال لوگوں کو میری تائید وحمایت کرنی چاہیے اور وہ کریں گے۔ میں بہرصورت ہندوستان سے دوستی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں۔''[2] دراصل یہ باتیں اپنے کٹھ پتلی وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کی وساطت سے گورنر جنرل غلام محمد کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ''مشترکہ دفاع'' اور صلح جوئی کی باتیں کرنے سے حکومت ہندوستان پاکستان کی امریکی فوجی معاہدوں میں شمولیت پر اعتراض نہیں کریگی۔ ویسے بھی اینگلو امریکی سامراج کی ابتدا ہی سے خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سوویت یونین اور چین کے خلاف ''مشترکہ دفاع'' کا نظام قائم ہو جائے۔ اگرچہ نہرو کے لیے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی تاہم وہ اپنی داخلی مصلحتوں کی بنا پر براہ راست گفت وشنید کا ڈھونگ رچانے کے حق میں تھا۔ چنانچہ اس نے 29/اپریل کو پاکستان کے نئے وزیر اعظم سے بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور 14/مئی کو یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے افسروں نے دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات کے لیے ایجنڈا تیار کر لیا ہے۔

17رمئی 1953ءکوآل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے ہند۔ پاک تعلقات میں بہتری کا خیرمقدم کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ''یہ بات ان مسائل کوحل کرنے کے لیے مدومعاون ثابت ہوگی جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنے کے راستے میں حائل ہیں۔''16رمئی کوامریکی لیڈر ایڈلائی سٹیونسن نے صوبہ سرحد کے دورے کے دوران ایک انٹرویو میں رائے ظاہر کی کہ تنازعہ کشمیر کےحل کے امکانات روشن ہیں۔''[3] وہ چند دن قبل سری نگر میں شیخ عبداللہ سے ملاقات کر چکا تھا جبکہ جموں میں ڈوگرہ ہندوؤں کی پرتشدد ایجی ٹیشن زوروشور سے جاری تھی اور آل انڈیا جن سنگھ کے لیڈر شیاما پرشاد مکرجی کوکشمیر میں بلا اجازت داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کر کے سری نگر کے نزدیک ایک ڈاک بنگلے میں نظر بند کیا جا چکا تھا۔ 11 رمئی کو پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے ایک بیان میں انکشاف کیا کہ وہ ہندوستان کے وزیراعظم جواہرلال نہرو سے لندن میں ملاقات کرے گا۔ جبکہ دونوں وزرائے اعظم ملکہ برطانیہ کی تاج پوشی کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے وہاں جائیں گے۔ اس نے کہا کہ اگر دونوں ملکوں کے باہمی تنازعات کا تصفیہ ہو جائے تو ان کے درمیان سودمند تعاون کی راہیں کھل جائیں گی۔ اگلے دن ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے ایک مشترکہ اعلان میں بوگرہ کے اس بیان کی تصدیق کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ دونوں وزرائے اعظم جون کے اوائل میں لندن میں کشمیر، اقلیتوں اور متروکہ جائیدادوں کے بارے میں ''ابتدائی بات چیت'' کریں گے اور متنازعہ مسائل کے بارے میں رسمی بات چیت ان کی لندن سے واپسی کے بعد ہوگی۔

اس اعلان کے مطابق وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے 13رجون 1953ءکولندن میں نہرو سے مسئلہ کشمیر پر غیر رسمی گفتگو کی تو نہرو نے اسے یہ تاثر دیا کہ وہ کشمیر کے عوام کوحق خودارادیت کے استعمال کا موقعہ دینے پر بالکل تیار ہے۔ سیاسی علم ودانش سے بے بہرہ کھلنڈرا وزیراعظم بوگرہ نہرو کی'' عالمانہ، دلکش اور دلچسپ گفتگو'' سے بہت مرعوب ومتاثر ہوا اور اس نے 5 اور 6رجون کو ''بڑے بھائی'' سے ملاقاتوں کے بعد ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ چونکہ دونوں ملکوں کی سیاسی فضا تصفیے کی حق میں ہے اس لیے سارے تنازعات کے حل کے امکانات روشن ہیں۔ اس نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''نہرو نے میری مشترکہ دفاع کی تجویز پر سرد پانی ڈال دیا ہے۔'' تاہم اس نے 9رجون کوکیمبرج میں ایک اجتماع کوخطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''اس سلسلے میں ابھی تک

پرامید ہوں کیونکہ پورے برصغیر میں اب تازہ ہوا چل رہی ہے۔'' اس نے ایک سوال کے جواب میں یقین دلایا کہ ابھی تک پاکستان میں امریکی فوجی اڈوں کے قیام کے بارے میں کسی نے کوئی استفسار نہیں کیا اور اگر کسی نے کبھی ایسی کوشش کی تو اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ نہرو نے اس سے اگلے دن بوگرہ کی ''مشترکہ دفاع'' کی تجویز مسترد کرنے کی یہ وجہ بیان کی کہ مشترکہ خارجہ پالیسی کے بغیر مشترکہ دفاع کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور مشترکہ خارجہ پالیسی ہمیں بآسانی فوجی معاہدوں میں ملوث کر دے گی اور یہ بات ہماری بنیادی پالیسی کے خلاف ہوگی۔''[4] لیکن امریکی سامراج کے پٹھو اور گورنر جنرل غلام محمد کے کٹھ پتلی وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ وہ کسی نہ کسی طرح نہرو کو امریکہ کے فوجی معاہدوں کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔ وہ سیاسی طور پر اس قدر احمق تھا کہ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ہندوستان کے قومی بورژوا طبقہ کے اپنے توسیع پسندانہ عزائم ہیں جو امریکی سامراج کا دُم چھلّہ بننے سے پورے نہیں ہو سکتے۔ جب 12 رجون کو ان دونوں کی تیسری ملاقات ہوئی تو اس کے بعد بھی بوگرہ بدستور پرامید اور خوش و خرم تھا۔ اس نے 13 رجون کو پاکستانی طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہیں یہ خوشخبری سنائی کہ ''نہرو کا رویہ اطمینان بخش رہا ہے۔''

25 رجولائی 1953ء کو نہرو کراچی آیا تو ''نہرو زندہ باد'' کے پرجوش نعرے لگائے گئے۔ الطاف حسین کے روزنامہ ''ڈان'' میں نہرو کی پورے صفحے پر تصویر چھاپی گئی اور کارٹون میں یہ دکھایا گیا کہ ''عناد، شک و شبہ اور خدشہ'' کو سرخ بانات کے نیچے کچلا جا رہا ہے اور زیڈ۔اے۔ سلہری کے ''ٹائمز آف کراچی'' میں ''ایک عظیم آدمی'' کے زیر عنوان دو کالمی ادارتی قصیدہ شائع کیا گیا۔ حالانکہ ان دنوں شیخ عبداللہ جموں کے ہندوؤں کی ایجی ٹیشن سے تنگ آ کر ہندوستان کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس نے 13 رجولائی کو یوم شہدا کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ حکومت ہندوستان اس وقت تک کشمیری عوام کو حق خود ارادیت نہیں دے گی جب تک اسے یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ یہاں کی رائے عامہ اس کی حمایت کرے گی اور پھر اس نے 24 رجولائی کو ہندوستان کی فوج اور دوسرے مرکزی محکموں میں کشمیری مسلمانوں کی عدم نمائندگی کا بڑے تلخ الفاظ میں شکوہ کیا تھا۔

کراچی میں دونوں وزرائے اعظم کی رسمی بات چیت تین دن تک جاری رہی اور 28 رجولائی کو جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں کہا گیا کہ ''وزرائے اعظم کی ملاقات کے دوران

بیشتر وقت تنازعہ کشمیر پر تبادلۂ خیالات میں گزرا اور اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا...... یہ مذاکرات بنیادی طور پر ابتدائی نوعیت کے تھے۔ ان سے دونوں وزرائے اعظم کے درمیان مزید بات چیت کے لیے راہ ہموار ہوگئی ہے جو مستقبل قریب میں نئی دہلی میں دوبارہ شروع ہونے کی توقع ہے۔'' وزیراعظم بوگرہ کی نہرو ''مصالحانہ رجحان'' سے اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی کہ اس نے یہ پیش گوئی کر دی کہ مسئلہ کشمیر کا چھ ماہ کے اندر اندر تصفیہ ہو جائے گا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے بہت تپاک کے ساتھ گلے مل کر نہرو کو کراچی سے رخصت کیا اور نہرو نے دہلی پہنچ کر اخبار نویسوں سے انٹرویو کے دوران کہا کہ ''پاکستان نے جس گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا اور میری میزبانی کی ہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔'' تاہم اس نے کہا کہ ''مسئلہ کشمیر کا حل اب بھی اتنا ہی دور ہے جتنا کہ میرے دورۂ کراچی سے پہلے تھا۔'' اس پر وزیراعظم بوگرہ کو اپنی پیش گوئی پر نظر ثانی کرنا پڑی اور اس نے 29رجولائی کو ایک پریس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کے تصفیے کی مدت چھ ماہ سے بڑھا کر ایک سال تک کر دی۔ لیکن اس سیاسی احمق کی یہ پیش گوئی صرف دس دن کے بعد یعنی 9راگست کو بے بنیاد ثابت ہوگئی جبکہ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد پوری وادی کشمیر میں زبردست بغاوت پھیل گئی۔

پاکستان میں اس واقعہ پر بہت سخت ردعمل ہوا۔ عوام الناس نے یہ محسوس کیا کہ مکار نہرو نے محض مقبوضہ کشمیر میں یہ کاروائی کرنے کے لیے بے وقوف بوگرہ کے ساتھ صلح جوئی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ پنجاب میں بے شمار جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ جن میں بعض عناصر نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ کشمیر کی آزادی کے لیے جہاد شروع کیا جائے۔ وزیراعظم بوگرہ اور اس کا آقا و مولا گورنر جنرل غلام محمد پاکستانی عوام کے غیض وغضب کے اس مظاہرے سے گھبرا گئے کیونکہ انہوں نے چند دن قبل بین المملکتی مصالحت کا پرچم لہرا کر کراچی کے عوام سے ''نہرو زندہ باد'' کے نعرے لگوائے تھے۔ 10راگست کو روزنامہ ''ڈان'' نے اپنے اداریے میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ایسے حالات میں نہرو کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کہ وہ بین المملکتی معاہدات کے مطابق کشمیر میں منصفانہ اور آزادانہ استصواب کرائے۔ بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اب محمد علی کے دہلی جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کھلے حقائق کا سامنا کیا جائے اور ایک مرتبہ پھر سلامتی کونسل کی طرف رجوع کیا جائے۔ لیکن وزیراعظم بوگرہ پر اس ادارتی مشورے کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اسی دن یعنی 10راگست کو ہی نہرو کے نام ایک

تارارسال کیا جس میں اس سے 17 راگست سے پہلے ملاقات کی درخواست کی گئی۔نہرو نے پہلے تو یہ درخواست منظور کرنے میں پس و پیش کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ''ایسی کانفرنس سے زیادہ توقعات پیدا ہو جانے کی صورت میں بعد میں مایوسی کا امکان ہوتا ہے۔'' لیکن بالآخر وہ 17 راگست کو نئی دہلی میں پاکستان کے وزیراعظم سے ملاقات پر رضامند ہو گیا۔ جب اس موعودہ ملاقات کے لیے وزیراعظم بوگرہ نئی دہلی روانہ ہوا تو اسی دن کراچی کی عوام نے قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی زیر قیادت مظاہرہ کیا جس کے اختتام پر ایک قرارداد کے ذریعے پاکستانیوں سے اپیل کی گئی کہ وہ کشمیری بھائیوں کی جنگ آزادی میں شرکت کرنے کے لیے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کریں۔ کراچی کے عوام کو بے پناہ غصہ تھا کہ انہیں مصالحت وصلح جوئی کے گمراہ کن پراپیگنڈے کے ذریعے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وزرائے اعظم کی یہ کانفرنس چار دن جاری رہی۔ جبکہ وادی کشمیر میں ہندوستانی فوج اور پولیس نہتے مسلم عوام کی وسیع پیمانے پر خونریزی کرتی رہی۔ 17 راگست کو نہرو نے لوک سبھا میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوطرفہ بات چیت کی اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''جو لوگ عصر حاضر کی دنیا اور ہمارے دونوں ممالک کے سمجھنے سے قاصر ہیں اور جو بصیرت سے محروم ہیں صرف وہی بین المملکتی تصادم کے نقطۂ نگاہ سے سوچتے ہیں حالانکہ جغرافیہ، تاریخ اور مشترکہ ماضی ناگزیر طور پر ان دونوں ممالک کو یکجا کرتے ہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ آج کل جب کہ کشمیر میں زبردست خونریزی ہو رہی ہے بین المملکتی کشیدگی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ دوستانہ گفت وشنید کا ڈھونگ کشمیر میں عوامی بدامنی کو کچلنے میں ممدومعاون ثابت ہو رہا تھا۔ مگر سامراجی پٹھو غلام محمد اور اس کے کٹھ پتلی وزیراعظم بوگرہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی اور نہ آئی۔ 20 راگست کو ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ''(1) تنازعہ کشمیر ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق کچھ اس طرح حل ہونا چاہیے کہ ریاستی عوام کی زندگی میں ذرا سی بھی گڑبڑ نہ ہو۔ (2) عوام کی منشاء معلوم کرنے کے لیے سب سے زیادہ قابل عمل طریقہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب کا ہی ہے۔ (3) پہلے ابتدائی مسائل سے متعلقہ معاہدوں پر عمل کیا جائے گا اور پھر اپریل 1954ء تک ناظم استصواب مقرر کیا جائے گا۔''

اس اعلامیہ کا منفی پہلو یہ تھا کہ ناظم استصواب کے تقرر کے لیے ''عبوری ٹائم ٹیبل'' کی

اصطلاح استعمال کی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سلسلے میں ہندوستان جو ٹال مٹول کر رہا تھا اسے برداشت کیا جائے گا لیکن اس میں سیاسی اعتبار سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ اہمیت کی حامل تھی کہ ہندوستان نے تنازعہ کشمیر کو ایک ایسے سیاق وسباق میں حل کرنے کے لیے پاکستانی وزیراعظم کی رضامندی حاصل کر لی جس کا اقوام متحدہ کے زیر اہتمام حاصل کردہ نتائج سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس اعلامیہ میں ان وعدوں اور معاہدوں کا کوئی ذکر نہیں تھا جو فریقین نے قبل ازیں کئے تھے اور جنہیں عالمی تنظیم کے نمائندوں نے قلمبند کر رکھا تھا اور یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اگر دونوں وزرائے اعظم اس مسئلہ کو دوطرفہ بنیاد پر حل کرنے میں ناکام رہے تو اس مقصد کے لیے کونسی متبادل راہ اختیار کی جائے گی۔ ناظم استصواب کے تقرر کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا گیا تھا کہ جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ ایڈمرل نمٹز (Nimitz) کی جگہ کسی اور شخص کا تقرر ہوگا حالانکہ نمٹز کا تقرر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے کیا تھا اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی اس تقرر کو منظور کر چکے تھے۔ علاوہ بریں اعلامیہ میں ریاست کی عوام کی زندگی میں ذرا سی گڑبڑ سے متعلق جو اصطلاح استعمال کی گئی تھی اس سے بھی ہندوستان کی اس بنیادی دلیل کو بالواسطہ تقویت ملی تھی کہ استصواب سے ریاست کی آبادی بڑے پیمانے پر بے گھر ہو جائے گی۔

پاکستان کے باشعور سیاسی حلقوں میں اس شرمناک معاہدے پر بڑی بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا۔ عام تاثر یہ تھا کہ پاکستان کی عوام دشمن افسر شاہی نے امریکی سامراج کی زیرِ ہدایت کشمیر کے ہندوستان کے زیر تسلط رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ آئندہ اس تنازعہ کے حل کے لیے بین الاقوامی سطح پر کوئی کوشش نہیں ہوگی اور اس سلسلے میں دوطرفہ کوشش کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ لیکن وزیراعظم بوگرہ اس اعلامیہ کو آگے کی سمت ایک بڑا قدم خیال کرتا تھا۔ اس نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''بڑا بھائی بہت فراخدل ثابت ہوا ہے۔'' اس نے ہندوستان کے عوام سے اپیل کی کہ ''وہ ماضی کو بھول جائیں۔ پاکستان میں جو عناصر جہاد کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے نہرو کے اس غلط بیان کو صحیح تسلیم کیا کہ ان دنوں کشمیری عوام پر فائرنگ نہیں ہو رہی تھی اور اس طرح اس بدبخت نے کشمیر میں صورت حال معمول پر لانے میں حکومت ہندوستان کی مؤثر امداد کی۔ اس سامراجی پٹھو کو اس اعلامیہ کی بنا پر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہونے کے امکانات

بہت روشن نظر آتے تھے چنانچہ اس نے اس کانفرنس میں ''امور خارجہ یا دفاع کے معاملوں میں مشترکہ پالیسیوں'' کا بھی ذکر کیا۔ دراصل یہ کھلنڈرا اور بڑبولا وزیر اعظم محض ایک لاؤڈ سپیکر تھا۔ یہ جو کچھ کہتا تھا اس میں اس کی اپنی سوچ اور عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا وہ محض غلام محمد، اسکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان پر مشتمل سامراج نواز افسر شاہی کے ٹولے کی ترجمانی کرتا تھا اور اس موقعہ پر غالباً اس نے کچھ زیادہ ہی ترجمانی کر دی تھی۔ بوگرہ موقع پرست اور احمق تھا اور افسروں کا یہ غدار ٹولہ وطن عزیز کو امریکی سامراج کے پاس فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ نہرو نے ان سب کی بے ضمیری سے فائدہ اٹھایا اور اس نے چند دن کے بعد حسب معمول اس معاہدے کی ایسی تاویلیں کیں کہ پاکستانی عوام نہایت بے بسی کی حالت میں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ انہیں اپنے جرم ضعیفی کی بڑی سخت سزا ملی تھی۔

جب وزیر اعظم بوگرہ نے 21/اگست 1953ء کو اپنی کابینہ کو وزیر اعظم نہرو سے اپنی بات چیت کی تفصیل بتائی تو بعض وزراء نے اس پر سخت مایوسی اور اختلاف کا اظہار کیا۔ بوگرہ نے انکشاف کیا کہ ''(1) نہرو کسی امریکی، کسی انگریز یا کسی روسی کو ناظم استصواب مقرر کرنے کے سخت خلاف ہے۔ (2) وہ کشمیر میں اپنی اتنی فوج رکھنا چاہتا ہے جس سے تبت کی جانب سے کسی دخل اندازی کا سدباب ہو سکے۔ (3) وہ استصواب سے پہلے کسی بھی کشمیری مہاجر کی واپسی کو برداشت نہیں کرے گا۔'' کابینہ کے اس اجلاس میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے بتایا کہ ''نہرو کے ایک رفیق خاص رفیع احمد قدوائی نے اسے بتایا ہے کہ ماضی میں ہندوستان ایڈمرل نمٹز کو بطور ناظم استصواب کام کرنے کی اجازت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اب حکومت ہندوستان نے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کشمیر کے عوام کو رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دے گی اور اس رائے شماری کا جو نتیجہ نکلے گا ہندوستان اسے قبول کر لے گا۔'' بوگرہ کا اصرار یہ تھا کہ نہرو کشمیر کا تصفیہ کرنے میں مخلصانہ دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ اس نے ''نوشتۂ دیوار پڑھ لیا ہے۔'' اس پر کابینہ کے بعض ارکان نے وزیر اعظم بوگرہ پر سخت تنقید کی۔ ایک وزیر نے کہا کہ وزیر اعظم نے ایڈمرل نمٹز کو ہٹانے کی تجویز مان کر امریکہ کی توہین کی ہے۔ امریکہ ہندوستان اور پاکستان کے جھگڑوں میں ملوث ہونے کا خواہاں نہیں اور اب وہ اس شاندار موقع سے فائدہ اٹھا کر اس مخمصے سے نکل جائے گا۔ کشمیر میں غیر جانبدارانہ استصواب کرانے کی ضمانت صرف یہی تھی کہ

وہاں ایڈمرل نمٹز کی نگرانی میں مضبوط انتظامیہ قائم ہوگی۔ اب نمٹز کو ہٹانے کی تجویز کی منظوری سے یہ ضمانت ختم ہوگئی ہے۔ اس وزیر نے مزید کہا کہ اب ہمارے لیے یہی مناسب ہوگا کہ ہم ''جوں کی توں'' حالت کو برقرار رکھیں اور اس مسئلہ کو اس وقت تک زندہ رکھیں جب تک کہ ہم اسے تسلی بخش طور پر حل کرانے کے قابل نہیں ہوجاتے اس طرح ہمارے عوام موجودہ صورت حال کا ذمہ دار ہمارے بجائے ہندوستان کو ٹھہرائیں گے۔''[5]

چونکہ کابینہ کے اس اجلاس میں بعض وزرا نے وزیراعظم پر جو تنقید کی تھی وہ دراصل پاکستان کی رائے عامہ کی آئینہ دار تھی اس لیے بوگرہ نے ایڈمرل نمٹز کے ناظم استصواب کے عہدے سے مستعفی ہونے کے دو دن بعد یعنی 5 ر ستمبر 1953ء کو نہرو کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ ''مجھ پر اور میرے رفقاء پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ آیا میں نے ہندوستان کے وزیراعظم سے کوئی خفیہ مفاہمت کر لی ہے...... چونکہ مشترکہ اعلامیہ میں نہ صرف کشمیر کے حالیہ واقعات کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس میں نے اعلامیہ میں پاکستانی پریس کی زبان بندی کرنے کا بھی وعدہ کر دیا ہے مبادا دونوں ملکوں کے درمیان تعاون و امن کی فضا خراب ہوجائے اس لیے مجھ پر کشمیر کو قربان کر دینے کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔ مجھ سے یہ بھی پوچھا جا رہا ہے کہ اگر پاکستانی اخبارات میں کشمیر کے واقعات کی رپورٹیں شائع ہوئیں تو کیا ان کو ہندوستان کے خلاف پراپیگنڈا قرار نہیں دیا جائے گا جس کے بارے میں میں نے ہندوستان کے وزیراعظم سے مشترکہ اعلامیہ میں ہمنوائی کرتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔''[6]

بوگرہ نے نومبر 1953ء کے اوائل میں اپنے ایک خط میں نہرو کی توجہ اس حقیقت کی طرف بھی مبذول کرائی کہ ہندوستان میں اکھنڈ بھارت کا پراپیگنڈا بدستور جاری ہے۔ روزنامہ پربھات نے اپنے 19 ر اگست کے اداریے میں لکھا تھا کہ ''پاکستان کے لیڈروں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستانی عوام کی اکثریت 1947ء کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتی اور جب بھی اسے موقع ملا اسے ختم کرنے کے لیے میدان میں آجائے گی۔'' ٹائمز آف انڈیا نے 13 ر ستمبر کی ایک رپورٹ میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ایک لیڈر کڈنڈا راؤ سے یہ بیان منسوب کیا گیا تھا کہ ''جنگ استصواب سے بہتر ہے۔ تنازعہ کشمیر کا واحد حل یہ ہے کہ کشمیر کا مشرقی بنگال سے تبادلہ کر لیا جائے۔'' ٹائمز آف انڈیا کی 27 ر ستمبر کی ایک رپورٹ کے مطابق مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی

وزیراعظم بخشی غلام محمد نے بارامولا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''استصواب ہو یا نہ ہو، کشمیر میں عام طور پر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہمارا بچاؤ ہندوستان میں ہی ہے۔ معاشی، ثقافتی اور معاشرتی حالات نے ہماری تقدیر ہندوستان سے وابستہ کر دی ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اس رشتے کو نہیں توڑ سکتی۔'' 20ر ستمبر کو انبالہ کے اخبار ''ٹربیون'' نے ایک رپورٹ میں بخشی غلام محمد سے یہ بیان منسوب کیا کہ ''پاکستان کشمیر پر اپنا تسلط کشمیریوں کی لاشوں پر ہی قائم کر سکتا ہے ......ہم نے ہندوستان میں شامل ہونے کا جو فیصلہ کر رکھا ہے اب اسے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔'' پھر اس نے اپنی ایک اور تقریر میں الزام عائد کیا کہ ''برطانیہ اور امریکہ براستہ پاکستان عقبی دروازے کے ذریعے کشمیر میں اپنے پاؤں جمانے کی سازش کر رہے ہیں۔''[7]

بوگرہ کے اس خط کے بعد دونوں وزرائے اعظم کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی جس کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت ہندوستان کشمیر سے اپنی فوجوں کے انخلاء، ناظم استصواب کے تقرر اور آزادانہ استصواب کے سارے وعدوں سے منحرف ہوگئی۔ وزیراعظم نہرو نے اس انحراف کی وجہ اپنے 9ر دسمبر 1953ء کے خط میں بتائی۔ اس نے نیویارک ٹائمز کی ایک تشویشناک خبر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ''مجھے نہیں معلوم ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی معاہدہ یا فوجی امداد کے بارے میں موجودہ پوزیشن کیا ہے۔ لیکن ذمہ دار اخبارات کا کہنا ہے کہ امریکہ پاکستان کو بڑے پیمانے پر فوجی امداد، ساز و سامان، اسلحہ اور ٹریننگ دے گا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس طرح پاکستان میں دس لاکھ فوج کو ٹریننگ دی جائے گی۔ بلاشبہ امریکہ کا خیال ہے کہ ان فوجوں کو کمیونسٹ ملکوں کے خلاف کسی ممکنہ جنگ میں استعمال کیا جا سکے گا ...... بہرحال منشا خواہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر اسلحہ بندی اور فوجی توسیع کی جا رہی ہے، لازمی طور پر ہندوستان میں ردعمل کا باعث بنے گا۔ دونوں ملکوں کے درمیان نفسیاتی ماحول خراب ہو جائے گا اور ہمارے درمیان ہر فیصلہ طلب معاملہ اس سے متاثر ہوگا ...... یہ معاملہ اتنی زیادہ اہمیت اور دور رس نتائج کا حامل ہے کہ اگرچہ میں نے اس سلسلے میں کراچی میں متعین اپنے ہائی کمشنر کو اس سلسلے میں آپ سے رابطہ قائم کرنے کی ہدایت کی ہے تاہم میں خود بھی ایک مرتبہ پھر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ اس معاملہ کا ہمارے زیرغور تمام بڑے مسائل پر اور بالخصوص مسئلہ کشمیر پر ناگزیر طور پر اثر پڑے گا۔ ہم ریاست کشمیر سے فوجیں ہٹا لینے کے سوال پر عرصۂ دراز سے تبادلۂ خیالات کرتے

رہے ہیں......اگر پاکستان کی افواج میں اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی جلدی سے توسیع ہو گی تو اس سے سارے مسئلہ کی ہیئت ہی بدل جائے گی......اگر پاکستان امریکہ کی امداد سے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرے گا تو کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کی گفتگو مضحکہ خیز ہو جائے گی۔'' وزیر اعظم بوگرہ نے 17 ردسمبر 1953ء کو نہرو کے اس خط کے جواب میں لکھا کہ ''ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدہ کرنے والا ہے یا یہ کہ امریکہ پاکستان میں اپنے فوجی اڈے قائم کر رہا ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ پاکستان کو فوجی ساز و سامان دینے کے بارے میں کچھ غیر رسمی گفت و شنید ہو رہی ہے۔''[8]

بوگرہ کا بیان سراسر غلط تھا۔ اسے اتنا بڑا جھوٹ لکھتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ پاکستان کی امریکہ کے فوجی معاہدوں میں شمولیت، پاکستان میں امریکی فوجی اڈے کے قیام اور پاکستان کو ''وسیع پیمانے'' پر فوجی امداد دینے کی بات چیت دراصل 1951ء سے ہی ہو رہی تھی جبکہ لیاقت علی خان اور جنرل ایوب خان کو ہندوستان کی بجائے ''شمال'' سے زیادہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اکتوبر 1953ء میں کمانڈر انچیف ایوب خان اس سلسلے میں قطعی فیصلہ کرنے کے لیے واشنگٹن گیا تھا اور پھر نومبر کے وسط میں گورنر جنرل غلام محمد اور وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے بھی اسی مقصد کے لیے واشنگٹن جا کر امریکی صدر کے دربار میں حاضری دی تھی۔ نیویارک ٹائمز اور دوسرے امریکی اخبارات نے پاکستان کے سامراجی پٹھوؤں کے ان دوروں کی بنیاد پر ہی متذکرہ خبریں شائع کی تھیں۔ بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ یہ خبریں بالکل صحیح تھیں اور وزیر اعظم بوگرہ نے نہرو کے نام اپنے 17 ردسمبر کے خط میں شرمناک جھوٹ بولا تھا۔ نہرو نے 21 ردسمبر 1953ء کو جواب دیا کہ ''یہ حقیقت ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے کہ پاکستان کو فوجی امداد کے بارے میں کوئی بات چیت ہو رہی ہے۔ آپ کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ہو گی جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ اس قسم کی فوجی امداد سے جنوبی ایشیا کی صورت حال میں لازمی طور پر بہت بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان نہ صرف فوجی لحاظ سے امریکہ کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے بلکہ اس نے اپنے آپ کو طاقتوں کے اس گروپ کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔ اس سے مشرق وسطیٰ کی صورت حال بھی متاثر ہوئی ہے اور آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس کا مشرق وسطیٰ کے ممالک میں

بہت برا ردعمل ہوا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کو اس میں اور بھی زیادہ دلچسپی ہے کیونکہ اس بنا پر ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس نئی صورت حال کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ پاکستان کو کتنی فوجی امداد ملتی ہے بلکہ یہ اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ پاکستان کو اس قسم کی امداد مفت مل رہی ہے۔ اس سے موجودہ صورت حال میں کیفیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور اس لیے یہ ہند۔ پاک تعلقات پر اور بالخصوص مسئلہ کشمیر پر اثر انداز ہوئی ہے......اس نئی صورت حال پر از سر نو اور مختلف بنیادوں پر غور وخوض کرنا ہوگا...... میں آپ کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہم نے اب تک جو بھی کامیابی حاصل کی ہے اس پر پانی پھر جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن میں آپ کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ افسوسناک صورت حال امریکہ کی اس تجویز کی بنا پر پیدا ہوئی ہے کہ پاکستان کو فوجی امداد دی جائے گی۔"[9]

پاکستانی عوام کے لیے جواہر لال نہرو کا یہ منافقانہ رویہ حیرت انگیز نہیں تھا۔ نہرو یورپ کے سوشل جمہوریت پسندوں کی طرح ذومعنی باتیں کرنے اور ہر معاملے میں دوغلا رویہ اختیار کرنے کا ماہر تھا۔ جب وزیر اعظم بوگرہ نے 20/اگست کو ناظم استصواب کے تقرر کے بارے میں نئی دہلی کے معاہدے پر دستخط کئے تھے تو باشعور پاکستانی عوام کو یقین تھا کہ وادی کشمیر میں حالات معمول پر آجائیں گے تو نہرو کسی نہ کسی بہانے اس دعوت سے منحرف ہو جائے گا۔ وہ قبل ازیں کئی مرتبہ ایسا کر چکا تھا۔ اس کی پوری سیاست اسی قسم کی منافقت اور بددیانتی پر مبنی تھی۔ اس کے مقابلے میں سردار پٹیل کٹر امسلم دشمن ہونے کے باوجود مقابلتاً راست گو اور دیانت دار تھا۔ پٹیل نے اپنی مسلم دشمنی پر کبھی جمہوریت اور سیکولرازم کا پردہ نہیں ڈالا تھا۔ اگر چہ پاکستان کی عوام دشمن افسر شاہی نے ہمارے ملک کی آزادی وخود مختاری کو امریکی سامراج کے پاس فروخت کرنے کی مذموم اور قابل نفرت حرکت کی تھی لیکن اس کا مسئلہ کشمیر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پاکستان کے سامراج نواز حکمران ٹولے کے جرم کی سزا کسی بھی اصول کے تحت وادی کشمیر کے لاکھوں بے گناہ عوام کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ متنازعہ فیہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ حکومت پاکستان کو امریکی سامراج سے مفت فوجی امداد لینی چاہیے یا نہیں بلکہ تنازعہ اس مسئلہ پر تھا کہ کشمیر کے عوام کو ان کا بنیادی حق خود ارادیت ملنا چاہیے یا نہیں؟ پاکستان کا حکمران ٹولہ ملک کی آزادی وخود مختاری کو امریکی سامراج کے پاس فروخت کرنے میں محض ہندوستان کے کوتاہ اندیش اور کم ظرف ارباب اقتدار

کے اس قسم کے منافقانہ ومعاندانہ رویے کی بنا پر کامیاب ہوا تھا۔ اس ٹولے نے پاکستانی عوام کو کامیابی کے ساتھ قائل کرلیا تھا کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار مسئلہ کشمیر کو پرامن طریقے سے حل کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گے بلکہ وہ پہلے دن سے کوشش کررہے ہیں کہ خود پاکستان بھی ہر لحاظ سے کمزور رہے تاکہ وہ مناسب وقت پر اسے بھی ہڑپ کرلیں۔ اس لیے اس ٹولے نے پاکستانی عوام کو یہ بھی یقین دلایا تھا کہ امریکہ سے فوجی امداد کی وصولی کے بعد پاکستان مضبوط وطاقتور ہوگا تو کشمیر کو بزورقوت آزاد کرایا جائے گا۔ عوام الناس اس گمراہ کن یقین دہانی پر محض اس لیے خاموش ہو گئے تھے کہ ان کا ہندوستان کے توسیع پسندوں کے ساتھ قومی تضاد مصنوعی نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد نہ صرف ٹھوس سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقائق پر تھی بلکہ اس میں لاکھوں انسانوں کی زندگیوں اور عزت وآبرو کا خون بھی شامل تھا۔ بعض پاکستانی ارباب اقتدار کی دلیل یہ تھی کہ ہندوستانی توسیع پسندوں کے ہاتھوں پاکستان کی مکمل تباہی سے بہتر ہے کہ یہ ملک فی الحال سامراج کے ایک طفیلی ملک کی حیثیت سے زندہ رہے اور یہ دلیل پاکستان کے درمیانہ طبقے کے لیے قابل قبول تھی۔ یہ طبقہ بوجوہ ہر چیز کو ہندو کی غلامی پر ترجیح دیتا تھا۔

تاہم وزیراعظم بوگرہ نے نہرو کو مطمئن کرنے کے لیے ایڈمرل نمٹز کی جگہ ایک نئے ناظم استصواب کے تقرر پر رضامندی ظاہر کردی اور پھر اس نے 4رفروری 1954ء کو نہرو کے نام ایک خط میں درخواست کی کہ غیر متعلقہ مسائل کی آڑ لے کر کشمیر کے بارے میں کئے گئے وعدوں سے انحراف نہ کیا جائے۔ بوگرہ نے اس مرتبہ صحیح طور پر لکھا تھا کہ آپ نے ایک غیر متعلقہ مسئلہ کو یعنی فوجی ساز وسامان کے متعلق امریکہ اور پاکستان کی گفت وشنید کو تنازعہ کشمیر کے تصفیہ سے منسلک کردیا ہے اور میری تمام یقین دہانیوں اور وضاحتوں کے باوجود آپ یہ کہتے ہیں کہ جس سیاق وسباق میں اس مسئلہ کو حل کیا جانا تھا وہ پورے کا پورا تبدیل ہوگیا ہے کیونکہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں پاکستان کو فوجی امداد ملنے کا امکان ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک بالکل غیر معمولی پوزیشن ہے کہ آپ ایک ایسے اقدام کو جس کا مقصد محض پاکستان کے دفاع کو مضبوط کرنا ہے، ایک خطرناک صورت حال قرار دیتے ہیں۔ بہر حال مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر پاکستان اور امریکہ کی گفت وشنید کو ہندوستان اور پاکستان کے اختلاف کے تصفیہ کی راہ میں ایک اور رکاوٹ بنادیا گیا ہے۔''[10] بوگرہ

کے اس خط کے تقریباً دو ہفتے بعد پاکستان اور ترکی کے درمیان ہمہ گیر اشتراک و تعاون کے معاہدے پر دستخط ہوئے جس کا برطانوی سامراج نے خیر مقدم کیا اور پھر 25رفروری کو امریکہ کی جانب سے با قاعدہ اعلان کیا گیا کہ پاکستان کو فوجی امداد دی جائے گی۔

وزیر اعظم نہرو نے اس اعلان پر یکم مارچ 1954ء کو تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''امریکہ نے پاکستان کو فوجی امداد کی جو گرانٹ دی ہے اس نے ہندوستان اور ایشیا کے لیے سنگین صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اس نے ہمارے درمیان کشیدگیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسائل کے حل کے راستے میں مزید مشکلات حائل کر دی ہیں...... ماضی میں دوسرے ملکوں کی مداخلت ہی کی وجہ سے یہ مسائل حل نہیں ہوئے۔ حال ہی میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک نئی اور زیادہ دوستانہ فضا پیدا ہوگئی تھی اور دونوں وزرائے اعظم کے درمیان براہ راست صلاح مشورے کے ذریعے ان مسائل کو حل کرنے کی جانب پیش قدمی ہو رہی تھی۔ اب یہ پیش قدمی رک گئی ہے اور نئی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ امریکہ کی جانب سے پاکستان کو جو فوجی امداد دی جا رہی ہے وہ ان مسائل میں ایک قسم کی مداخلت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ اس کے نتائج سابقہ مداخلت کے نتائج سے زیادہ دور رس ہوں گے۔'' نہرو نے مطالبہ کیا کہ ''کشمیر میں اقوام متحدہ کے مبصروں کے گروپ میں سے امریکیوں کو واپس بلایا جائے کیونکہ اب امریکہ ہند۔ پاک مسائل میں جانبدار بن گیا۔''[11]

نہرو نے 5رمارچ کو اپنے اس بیان کی نقل وزیر اعظم بوگرہ کو بھیج دی اور اس کے ساتھ منسلکہ خط میں لکھا کہ ''ہمارے دونوں ملکوں نے کافی عرصے تک ان بعض ضروری ابتدائی کاروائیوں پر بات چیت کی ہے جن کے بغیر استصواب کی جانب کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ان ابتدائی کاروائیوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ کشمیر میں کتنی فوج رہنی چاہیے لیکن اب جبکہ اسلحہ کے دباؤ نے سابقہ پر امن اور تعاون کے طریقے کی جگہ لے لی ہے اور امریکہ سے پاکستان کو وافر فوجی امداد مل رہی ہے تو ہماری وہ باتیں بالکل غیر متعلق ہوگئی ہیں جو ہم نے فوجوں کی تعداد کے بارے میں کہی تھیں۔ اب ہم ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے جیسا کہ ہم پہلے لینے پر آمادہ تھے۔ اب ہم پوری آزادی کے ساتھ ریاست کشمیر میں اتنی فوجیں اور فوجی سامان رکھیں گے جو ہم اس نئے خطرے کے سدباب کے لیے ضروری سمجھیں گے...... میں آپ کو پھر کہتا ہوں کہ پاکستان نے

امریکہ سے فوجی امداد قبول کر کے نہ صرف تنازعہ کشمیر کو ایک بالکل نئی سمت پر ڈال دیا ہے بلکہ اس نے پورے ایشیا کے واقعات وحالات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔"[12] نہرو کے اس آخری خط کا مطلب یہ تھا کہ اب مسئلہ کشمیر کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر یا بین المملکتی سطح پر گفت وشنید کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ وہ فروری 1948ء سے ہی جبکہ اینگلو امریکی سامراج نے سلامتی کونسل سے پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرانے کی کوشش کی تھی، یہ مؤقف اختیار کرنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔

ہندوستان میں انتہا پسند ہندوؤں کے بااثر حلقے نہرو پر مسلسل یہ تنقید کرتے تھے کہ اس نے دسمبر 1947ء میں تنازعہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی جانب رجوع کر کے غلطی کی تھی ان حلقوں کا کہنا یہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر نے اپنی ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق نامے پر جو دستخط کئے تھے انہیں قانوناً چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا ہندوستان کو اقوام متحدہ سے رجوع کرنے کی بجائے اپنی پوری فوجی قوت استعمال کر کے ریاست جموں و کشمیر کے سارے علاقے پر بلاتاخیر قبضہ کر لینا چاہیے تھا۔ اس وقت پاکستان اتنا کمزور تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ ہمہ گیر جنگ نہیں لڑسکتا تھا۔ نہرو ان حلقوں کی نکتہ چینی سے اکثر بہت پریشان ہوتا تھا لیکن اب اس نے اپنے "ذاتی دوست" شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد اپنے "چھوٹے بھائی" محمد علی بوگرہ کو کشمیر کے بارے میں کورا جواب دے کر اپنے آپ کو اس نکتہ چینی سے بالاتر کر لیا تھا۔ سیسر گپتا کے مؤقف کے مطابق "اب تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لیے افسروں کی کمیٹیوں کی میٹنگ کا مقصد فوت ہو گیا تھا اور نہ ہی نئے ناظم استصواب کے تقرر کی کوئی ضرورت باقی رہی تھی۔ کشمیر اسمبلی ہندوستان کے حق میں فیصلہ کر چکی تھی اور ویسے بھی ہندوستان کے نقطۂ نگاہ سے کشمیر کا ہندوستان سے الحاق قانونی اور آئینی لحاظ سے مکمل ہو چکا تھا۔ ہندوستان نے استصواب پر اس لیے رضامندی ظاہر کی تھی کہ ریاستی عوام اپنے مستقبل کے بارے میں اپنی خواہش کا اظہار کریں تاہم مناسب حالات پیدا کئے بغیر موجودہ استصواب کا انعقاد ممکن نہیں تھا۔"[13]

پاکستان کے باشعور حلقوں کے لیے نہرو کی یہ قلابازی غیر متوقع نہیں تھی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کشمیر کی جو بازی 48-1947ء میں مسلم لیگ کی غلط پالیسی کی وجہ سے میدان جنگ میں ہاری جا چکی تھی وہ سفارتی سطح پر جیتی نہیں جاسکتی تھی۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا اور

نہ کبھی ہوسکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ اگر پاکستان امریکہ کے فوجی گٹھ جوڑ میں شامل نہ ہوتا تو اس تنازعہ کو اقوام متحدہ کی وساطت سے یا دوطرفہ گفت وشنید کے ذریعے مزید چند برسوں کے لیے زندہ رکھا جاتا لیکن یہ بات ہرگز ممکن نہیں تھی کہ نہرو براہ راست گفت وشنید کے نتیجے میں کشمیر کا علاقہ پاکستان کے حوالے کر دیتا۔ 20/اگست 1953ء کے اعلامیہ کے مطابق بوگرہ نے نہرو کا یہ منصوبہ منظور کر لیا تھا کہ کشمیری مہاجرین کو ان کے اپنے گھروں کو جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور کسی چھوٹے ملک کی کسی معمولی شخصیت کو ناظم استصواب مقرر کیا جائے گا جسے کوئی انتظامی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ ہندوستانی فوج کافی مقدار میں مقبوضہ کشمیر میں موجود رہے گی کیونکہ نہرو کو تبت سے دخل اندازی کا خطرہ تھا۔ لہٰذا کسی معقول دلیل کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اگر پاکستان نے اینگلو امریکی سامراج سے فوجی گٹھ جوڑ نہ کیا ہوتا تو نہرو جنوبی ایشیا کو عالمی سرد جنگ سے الگ رکھنے کے لیے تنازعہ کشمیر کے منصفانہ اور باعزت حل پر رضامند ہو جاتا۔ پاکستان کے جو بھارت نواز اور روس نواز عناصر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ سیاسی طور پر احمق ہیں یا بد دیانت ہیں یا انہوں نے دنیا کی تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ معاندانہ قومی یا طبقاتی تضاد انصاف کی بنیاد پر بین الاقوامی یا دوطرفہ گفت وشنید کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کا حل بزور قوت اس فریق کے حق میں ہوتا ہے جس کے پاس عوام اور فوجی ساز وسامان کی طاقت زیادہ ہوتی ہے اور جو معاشرتی ومعاشی طور پر ارتقا کے مقابلتاً اونچے مرحلے میں ہوتا ہے۔

جواہر لال نہرو کے اس دوٹوک جواب کے باوجود دونوں وزرائے اعظم کے درمیان مزید کئی ماہ تک بے سود خط وکتابت ہوتی رہی۔ نہرو نے اپنے خطوں میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی تجویز کا بھی اعادہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ سے فوجی امداد مت لو۔ ماضی کے تلخ تجربوں کو بھول جاؤ اور ہندوستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر کے تنازعہ کشمیر کے حل اور پاکستان کے دفاع کے لیے اپنی طاقت کی بجائے حکومت ہندوستان کی ''نیک خواہشات'' پر اعتماد کرو۔ وزیر اعظم بوگرہ نے نہرو کی اس تجویز کا وہی جواب دیا جو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 1950ء میں دیا تھا۔ اس نے اپنے 21/ستمبر 1954ء کے جواب میں لکھا کہ پاکستان جنگ نہ کرنے کے اعلان پر دستخط کرنے پر آمادہ ہے بشرطیکہ پہلے یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ کشمیر کے علاوہ دوسرے سارے تنازعات کا پرامن تصفیہ کیسے ہوگا؟ دونوں

فریقوں کو مجوزہ اعلان میں وعدہ کرنا چاہیے کہ اگر براہ راست گفت وشنید اور اقوام متحدہ کی مصالحانہ کوشش ناکام ہوجائے گی تو کسی تیسرے فریق کی ثالثی قبول کر لی جائے گی۔ بوگرہ نے مزید لکھا ہے کہ آپ نے پاکستان کو امریکہ کی فوجی امداد کی آڑ لے کر تنازعہ کشمیر کے لیے کئے گئے وعدوں سے جو انحراف کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دراصل اس تنازعہ کو مخلصانہ طور پر حل کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اس نے لکھا کہ یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ آپ کو بین الاقوامی امن کے بارے میں تو بہت تشویش ہے اور آپ سارے ایشیا کے عوام کے حق خودارادیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن آپ نے گذشتہ سات سال سے ریاست جموں و کشمیر کے 40 لاکھ عوام کو اس بنیادی حق سے محروم رکھا ہوا ہے۔ ان حالات میں ہم دونوں کے درمیان مزید خط و کتابت بے سود ہے اور اب پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ پھر سلامتی کونسل کی طرف رجوع کرے۔"[14]

بوگرہ کے اس خط سے تین دن قبل یعنی 18 ستمبر 1954ء کو پاکستان کا وزیرخارجہ سر ظفراللہ خان منیلا میں حکومت پاکستان کی ہدایات کے برعکس سیٹو کے فوجی معاہدے پر دستخط کر چکا تھا۔ وہ منیلا سے سیدھا نیویارک پہنچا وہاں سے اس نے وزارت خارجہ کے عہدے سے استعفیٰ دیا اور پھر امریکی سامراج کی تائید وحمایت سے بین الاقوامی عدالت انصاف کا جج مقرر ہو گیا۔ نہرو نے 29 ستمبر کو بوگرہ کے خط کا جواب دیا جس میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ بین المملکتی تنازعات کے تصفیہ کے لیے براہ راست گفت وشنید ناکام ہو گئی ہے۔ اس نے پھر جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیش کش کی اور اپنے اس مؤقف کا بھی اعادہ کیا کہ ہمارے تنازعات کا کسی غیرملکی مداخلت کے بغیر تصفیہ ہونا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ تم کچھ بھی کرو پرنالہ وہیں رہے گا۔ ہم نے بزور قوت کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے اور ہم وہاں سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ البتہ ہم کشمیر کی موجودہ جنگ بندی لائن کو معمولی ردوبدل کے بعد بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

چونکہ ان دنوں اینگلوامریکی سامراج کو مشرق وسطیٰ کے تقریباً سارے عرب ممالک میں اپنے مجوزہ فوجی گٹھ جوڑ کے بارے میں سخت مخالفت درپیش تھی اس لیے اس کی پالیسی یہ تھی کہ پاکستان کو امریکی فوجی امداد کے اعلان کی بنا پر ہندوستان میں جس خفگی وناراضگی کا اظہار کیا جارہا ہے اسے جتنا ممکن ہو سکے کم کیا جائے۔ چنانچہ 24 اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں پاکستان آئین ساز اسمبلی کے توڑ دیئے جانے کی صورت میں بورژوا جمہوریت کے قتل کے بعد

افسر شاہی کا جو سامراج ٹولہ برسر اقتدار آیا اسے ہدایت کی گئی کہ آئندہ تنازعہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر نہ اٹھایا جائے بلکہ نہرو کی منت خوشامد کر کے اسے دوطرفہ بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اینگلو امریکی سامراج سوویت یونین اور چین کے خلاف شدید عالمی سرد جنگ کے اس زمانے میں ایک چھوٹے اور کمزور پاکستان کو مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کے تحفظ وفروغ کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں ضرور تھا لیکن وہ اس پس ماندہ اور جاگیردارانہ ملک کی خاطر ایک بڑے اور ترقی پذیر بورژوا ہندوستان کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حسب توقع غلام محمد، اسکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان پر مشتمل اس قوم فروش ٹولے نے اپنے بیرونی آقاؤں کی ہدایات پر بڑی وفاداری سے عمل کیا۔ صوبہ سرحد کے سابق کانگرسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کو اس مقصد کے لیے نئی مرکزی کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس ٹولے کی جانب سے اینگلو امریکی سامراج کی فرمانبرداری کا پہلا مظاہرہ نومبر 1954ء کے اوائل میں ہوا جبکہ نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ یہ شخص نہرو کے ''علم و دانش'' اور ''اخلاق و خلوص'' کا بہت قائل ہو گیا تھا۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہر قیمت مصالحت کے حق میں تھا اور اسی وجہ سے اس نے پاکستانی ہائی کمشنر کی حیثیت سے 54-1953ء میں بوگرہ۔نہرو بات چیت کا ڈھونگ رچانے میں مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ اس نے 10رنومبر 1954ء کو لاہور میں کہا کہ پاکستان کی نئی حکومت کا ہندوستان کے بارے میں رویہ زیادہ مصالحانہ ہے اور دونوں حکومتوں کے درمیان براہ راست بات چیت بارآور ہو سکتی ہے۔ 14رنومبر کو گورنر جنرل غلام محمد اور اس کا وزیر داخلہ اسکندر مرزا ڈھاکہ جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر ٹھہرے تو غلام محمد نے مقامی اخبار نویسوں سے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''مجھے جواہر لال نہرو پر تم لوگوں (ہندوستانیوں) سے زیادہ اعتماد ہے۔ ہمیں ماضی کو بھول کر ہند۔پاک کی تاریخ میں نیا باب شروع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔'' اسکندر مرزا نے کہا کہ ''دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات جتنی جلدی ہو اتنا ہی بہتر ہوگا۔''[15]

اسکندر مرزا نے اپنے اس دوستانہ خیال کا اظہار اس حقیقت کے باوجود کیا تھا کہ وزیر اعظم بوگرہ نے اپنے 21رستمبر 1954ء کے خط میں اور نہرو نے اپنے 29رستمبر کے خط میں تسلیم کر لیا تھا کہ دوطرفہ براہ راست بات چیت ناکام ہو گئی ہے۔ بوگرہ نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ

اب پاکستان کے پاس سلامتی کونسل سے رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ 16 ر نومبر کو الطاف حسین کے روزنامہ ''ڈان'' اور زیڈ۔اے۔سلہری کے ''ٹائمز آف کراچی'' میں ایک ہی مضمون کی خبریں شائع کی گئیں جن میں پیش گوئی کی گئی کہ ''براہ راست گفت وشنید کے ذریعے ہند۔پاک تعلقات کا بہت جلد تصفیہ ہو جائے گا۔''

ٹائمز آف کراچی کے ایڈیٹر زیڈ۔اے۔سلہری کو گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں دستور ساز اسمبلی کی برطرفی، جمہوریت کے قتل اور مسلم لیگ کی موت پر بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اگر مروجہ جمہوری نظام قائم رہا تو خواجہ ناظم الدین اور فضل الرحمان کی سازش سے پاکستان میں بنگالیوں کا غلبہ قائم ہو جائے گا۔ یہ شخص کراچی میں پنجابی شونزم کا صحافتی نمائندہ تھا اور اسے اس حیثیت سے آئے دن سیاسی قلابازیاں کھانے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ شخص جولائی 1953ء میں نہرو کو ''ایک عظیم آدمی'' قرار دیتا تھا اور اس یقین کا اظہار کرتا تھا کہ براہ راست گفت وشنید سے سارے بین المملکتی تنازعات حل ہو جائیں گے۔لیکن اگست 1953ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد کشمیر کی آزادی کے لیے جہاد کی تلقین کرنے لگا تھا۔نومبر 1954ء میں پھر براہ راست گفت وشنید کے حق میں ہو گیا تھا اور پیش گوئی کرتا تھا کہ براہ راست گفت وشنید سے سارے تنازعات حل ہو جائیں گے۔

20 ر نومبر 1954ء کو برطانیہ کے اخبار مانچسٹر گارڈین میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ ''کراچی کی نئی حکومت کی ''متعصب'' سیاست دانوں سے وابستگی نسبتاً کم ہو گی۔ یہ بات تقریباً وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ غلام محمد کی یہ نئی حکومت کشمیر کی تقسیم کی بنیاد پر اس تنازعہ کے تصفیہ کی نئی راہ پر گامزن ہو گی۔ اگر یہ مسئلہ استصواب کے بغیر حل ہو جائے تو بہت سی پیچیدگیوں کا سدباب ہو جائے گا۔'' تقریباً اس مضمون کی خبر جولائی 1953ء میں نہرو۔بوگرہ ملاقات اور شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے قبل نیو یارک ٹائمز میں چھپی تھی۔ان دونوں خبروں میں فرق صرف یہ تھا کہ نیو یارک ٹائمز کی خبر میں وادی کشمیر کی ''آزادی'' کا ذکر تھا لیکن مانچسٹر گارڈین کی خبر میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔ بظاہر برطانوی اخبار کا خیال تھا کہ تقسیم موجودہ جنگ بندی لائن پر ہی ہو گی جیسا کہ جواہر لال نہرو 1948ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن سے ملاقات کے دوران بتا چکا تھا۔

4ر دسمبر 1954ء کو نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان نے

وزیراعظم جواہر لال نہرو سے ملاقات کر کے یہ تجویز پیش کی کہ بین المملکتی تنازعات کے تصفیہ کے لیے براہ راست بات چیت کا سلسلہ پھر شروع ہونا چاہیے۔ نہرو نے حکومت پاکستان کی اس قلابازی کا خیر مقدم کیا کیونکہ بظاہر اس کی رائے یہ تھی کہ غیر ملکی مداخلت یا ثالثی کے بغیر براہ راست باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کشمیر کے بیشتر علاقے پر ہندوستان کا قبضہ تھا اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا واقعات و حالات اس کے حق میں جا رہے تھے۔ لہٰذا اس نے 15 ردسمبر کو لوک سبھا کو بتایا کہ تین ماہ قبل ستمبر 1954ء میں ہند۔ پاک بات چیت ناکام نہیں ہوئی تھی۔ دراصل یہ معطل ہوئی تھی اور اب حکومت پاکستان نے دوطرفہ بات چیت دوبارہ شروع کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ہندوستان کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہم ایسی بات چیت کے لیے بالکل تیار ہیں۔ نہرو نے 20 ردسمبر کو حکومت پاکستان کی تجویز کا بذریعہ خط رسمی طور پر خیر مقدم کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ رائے ظاہر کی کہ ''اس مقصد کے لیے دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات بہت جلدی نہیں ہوسکتی۔''

تاہم پاکستان کا وزیراعظم محمد علی بوگرہ ایشیائی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جکارتہ جاتے ہوئے جب 25 ردسمبر کو تھوڑی دیر کلکتہ کے ہوائی اڈے پر ٹھہرا تو اس نے مقامی اخبار نویسیوں سے انٹرویو کے دوران کہا کہ ''آئندہ جب دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات ہوگی تو تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے ''نئی راہ'' تلاش کی جائے گی اور اب حکومت پاکستان اس مسئلہ کو اقوام متحدہ میں پیش نہیں کرے گی۔'' لیکن 21 رجنوری 1955ء کو یہ بڑبولا اور احمق وزیراعظم اپنی بات سے پھر گیا۔ اس نے لندن میں ایک انٹرویو میں کہا کہ ''اگر برطانوی دولت مشترکہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے کوئی اقدام اٹھائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اور اگر دولت مشترکہ نے کوئی کارروائی نہ کی تو پاکستان اس کے تصفیہ کے لیے اقوام متحدہ پر زور دے گا۔'' جواہر لال نہرو نے اس کے اس بیان کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ شخص پاکستان میں ایک نمائشی وزیراعظم ہے۔ حقیقی اقتدار غلام محمد کی زیر قیادت سامراج نواز افسروں کے ٹولے کے پاس ہے اور یہ ٹولہ اینگلو امریکی سامراج کی ہدایت کے مطابق ہندوستان سے کسی قسم کی محاذ آرائی نہیں کرسکتا۔''

باب: 13

# ازسرِ نومحاذ آرائی اور سوویت یونین کی مداخلت

25 ر جنوری 1955ء کو پاکستان کی سامراج نواز افسر شاہی کا سرغنہ گورنر جنرل غلام محمد ہندوستان کے یوم جمہوریہ کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے نئی دہلی گیا۔ اس کے ہمراہ چوہدری محمد علی، اسکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب بھی تھے۔ اس نے نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے انٹرویو کے دوران اپنے اس بیان کا اعادہ کیا جو اس نے 14 ر نومبر 1954ء کو لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ ''مجھے نہرو پر تم لوگوں (ہندوستانیوں) سے زیادہ اعتماد ہے۔'' یہ سامراجی پٹھو سمجھتا تھا کہ نہرو کی اس طرح منت خوشامد کر کے وہ نہ صرف اسے اینگلو امریکی سامراج کے دائرہ اثر میں لانے میں کامیاب ہو جائے گا بلکہ تنازعہ کشمیر کو بھی پاکستان کے حق میں حل کرالے گا۔ اس کی ذہنیت ایک ایسے بزدل غنڈے کی سی تھی جس کی بڑھک موثر نہ ہو تو فوراً اپنے حریف کے پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ اس نے 1948ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن سے ملاقات کے دوران کہا تھا کہ ''نہرو پاکستان کے وجود سے نفرت کرتا ہے اور وہ ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس فوج ہے اور اسلحہ بھی ہے۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کراچی پر دھاوا بول سکتا ہے۔ وہ میرے گھر میں آ کر میرے سینے میں چھرا گھونپ سکتا ہے۔ لیکن میں مر جاؤں گا کبھی گھٹنے نہیں ٹیکوں گا اور جس عظیم نظریے کے لیے میں زندہ رہا ہوں وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ ہم اپنے کشمیر کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''[1] لیکن وہ اب یہ کہتا تھا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ماضی کی تلخیوں کو بھول جائیں ...... مجھے یقین ہے کہ جواہر لال نہرو دونوں ملکوں کے

درمیان خوش گوار تعلقات کا خواہاں ہے۔ پاکستان کی بھی یہی خواہش ہے'' اور پھر اس نے اسی رات کو ایک سرکاری عشائیے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''میرا خیال ہے کہ کشیدگی کا یہ تاریک دور بہت ہی زیادہ عرصے سے جاری ہے۔ اب اسے مکمل طور پر ختم ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے سارے تنازعات کو ختم کرنا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کے لیے غلط فہمیوں اور تلخیوں کا ورثہ نہ چھوڑیں۔''[2] اس نے اگلے دن 26 رجنوری کو جواہر لال نہرو سے بات چیت کی اور پھر وہ 27 رجنوری کو ابوالکلام آزاد سے ملا۔ اس کے اس سہ روزہ دورے سے کوئی ٹھوس نتیجہ تو برآمد ہوا لیکن ہندوستان کے سیاسی حلقوں کی رائے یہ تھی کہ غلام محمد نے ہند۔ پاک تعلقات کی بہتری کی راہ ہموار کر دی ہے۔ مدراس کے اخبار ''ہندو'' کا تبصرہ یہ تھا کہ ''غلام محمد کا دورہ دونوں ملکوں کے تعلقات کی تاریخ میں نہایت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔'' نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان کا بھی یہی خیال تھا اور روزنامہ ''ڈان'' اور روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' نے بھی 16 رجنوری کو اس خیال سے اتفاق کیا تھا۔

اپریل 1955ء میں بنڈونگ میں پہلی ایشیائی کانفرنس کے دوران اینگلو امریکی سامراج کو اچھی طرح پتہ چل گیا کہ ہندوستان اور چین کے درمیان حقیقی تضاد موجود ہے اور اسے ہوا دے کر اس کی نوعیت کو معاندانہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے پاکستانی پٹھوؤں نے دوطرفہ بات چیت کے ذریعے بین المملکتی تنازعات کا تصفیہ کرنے کی کوشش زور شور سے جاری رکھی۔ وزیراعظم بوگرہ اس مقصد کے لیے وزیراعظم نہرو سے ملاقات کرنے کے لیے 14 رمئی کو نئی دہلی گیا۔ وزیر داخلہ جنرل اسکندر مرزا اور وزیر تعلیم کرنل عابد حسین اس کے ہمراہ تھے۔ ابتدائی پروگرام تو یہ تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد دو دن پہلے یعنی 12 رمئی کو خود نئی دہلی جا کر نہرو سے غیر رسمی بات چیت کرے گا تا کہ وزیراعظم کی رسمی بات چیت میں کوئی مشکل حائل نہ ہو مگر وہ اپنی شدید علالت کے باعث دہلی کا سفر اختیار نہ کر سکا اور بات چیت کا سارا کام محمد علی بوگرہ کو ہی سرانجام دینا پڑا۔ اس نے دو دن کے بعد یعنی 16 رمئی کو بتایا کہ بات چیت آگے بڑھ رہی ہے اور پھر 17 رمئی کو اس نے اخبار نویسوں کو یہ مژدہ دیا کہ ''تمہیں کل اچھی خبر دی جائے گی۔'' لیکن یہ ''اچھی خبر'' والا ''کل'' کبھی نہ آیا۔ 18 رمئی کو جو مختصر مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا اس سے پاکستانی عوام کو یہ تاثر ملا کہ تنازعہ کشمیر وہیں کا وہیں ہے اور اس دوطرفہ بات چیت سے اس کے حل کی کوئی صورت پیدا

نہیں ہوئی۔ صرف چار سطروں پر مشتمل اعلامیہ کا مضمون یہ تھا کہ ''بات چیت کے دوران مسئلہ کشمیر کے سارے پہلوز یر بحث آئے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب دونوں حکومتیں زیر بحث مختلف نکات پر پوری طرح غور کر لیں گی تو اس مسئلہ پر پھر بات چیت کی جائے گی۔''

تاہم لندن ٹائمز کے نئی دہلی میں مقیم نامہ نگار نے اسی دن یہ رپورٹ بھیجی کہ پانچ روزہ گفت وشنید کے دوران ''یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے کہ کشمیریوں کی منشا معلوم کرنے کے لیے استصواب کی تجویز بالکل اس طرح موت سے ہمکنار ہوگئی ہے جس طرح کہ ماضی میں اس سلسلے میں پیش کردہ ساری تجویزیں بے نتیجہ ختم ہوگئی تھیں۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام ہی کریں گے لیکن ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں گے۔''[3] بوگرہ نے اسی دن یہ انٹرویو دیا کہ ''میں بات چیت سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ ہم نے اب جن طریقوں پر بحث کی ہے ممکن ہے کہ وہ نئے ہوں۔ اب رویہ اتنا بے لچک نہیں ہے جتنا کہ پہلے تھا، کچھ نئے خیالات پیدا ہوئے ہیں۔''[4] اس کے اس انٹرویو کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات میں یہ خبر بھی چھپی کہ وزیر داخلہ میجر جنرل اسکندر مرزا نے اپنے دہلی میں قیام کے دوران مسئلہ کشمیر پر بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ ہندوستان کے وزیر داخلہ پنڈت پنت کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت اور مسافروں کی آمدورفت کی سہولتوں کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے ویزا سسٹم میں آسانی پیدا کرنے اور قرضوں کی ادائیگی وغیرہ کے بارے میں بھی بات چیت کی تھی۔ اس کی اس قسم کی بات چیت کی بنیاد بظاہر حکومت پاکستان کی اس نئی پالیسی پر تھی کہ ''پہلے چھوٹے چھوٹے معاملات کا تصفیہ ہو جائے تو پھر بڑے تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لیے فضا سازگار ہو جائے گی۔''[5] قبل ازیں لندن ٹائمز نے اپنی 3 رمئی کی خبر میں بتایا تھا کہ پاکستان چھوٹے چھوٹے معاملات کے تصفیہ کی خاطر کشمیر کی موجودہ فائر بندی لائن کو عارضی سرحد قبول کر لے گا تاآنکہ تنازعہ کشمیر کو الگ اور معروضی طور پر نبٹایا جا سکے۔'' ''سنڈے آبزرور'' کی 8 رمئی کی رپورٹ یہ تھی کہ ''دونوں ملکوں کے درمیان کچھ اس قسم کا تصفیہ ہونے کا امکان ہے کہ ہندوستان وادی کشمیر پر اپنا قبضہ برقرار رکھے گا اور اس کے بدلے میں پاکستان کو دوسرے معاملات میں خاصی رعایت دیدے گا۔''[6]

اسکندر مرزا کے اس رویے کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ اینگلو امریکی سامراج کی خواہش تھی کہ

تنازعہ کشمیر کو بالائے طاق رکھ کر دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنے چاہئیں تاکہ ہندوستان اور چین کے درمیان تضاد کی چنگاری کو ہوا دے کر اسے شعلوں میں تبدیل کیا جائے۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ سٹالن کی موت کے بعد نہرو کی وساطت سے سوویت یونین اور چین کے درمیان قومی تضاد میں شدت پیدا کی جائے کیونکہ بنڈونگ کانفرنس میں اپنی سبکی کے بعد نہرو یہ کام سرانجام دینے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کی 18 رمئی کی رپورٹ یہ تھی کہ ''ہند۔ پاک تنازعہ اب حل ہونے کو ہے۔ باخبر حلقوں کے مطابق پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کی موجودہ بات چیت میں ایک بہت بڑی پیش قدمی یہ ہوئی ہے کہ تنازعہ کشمیر بہت جلد اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں سے خارج کر دیا جائے گا۔ دونوں وزرائے اعظم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تنازعہ دونوں ملکوں کو خود ہی حل کرنا چاہیے۔ اس امر کی نمایاں علامتیں موجود ہیں کہ دونوں ملکوں نے جموں وکشمیر کے عوام کی منشا معلوم کرنے کے لیے استصواب کی جو راہ اختیار کر رکھی تھی وہ اب بدل دی گئی ہے۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد نے تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے حالانکہ وہ بات چیت کے دوران یہاں موجود نہیں تھا۔ اگر پاکستانی گورنر جنرل کو اگلے مہینے برائے علاج زیورچ نہ جانا ہوتا اور نہرو کو جون میں ماسکو کا دورہ نہ کرنا ہوتا تو ہند۔ پاک مذاکرت جاری رہتے۔''

وزیراعظم بوگرہ جب 14 رمئی کو نئی دہلی پہنچا تھا تو اس نے اعلان کیا تھا کہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے ''1955ء کی راہ اختیار کی جائے گی جس کی بنیاد ''نئے خیالات'' پر ہوگی۔ اس نے بات چیت کے دوران کشمیری عوام کی منشا معلوم کرنے کے لیے استصواب کے بجائے ''ریفرنڈم'' اور ''انتخاب'' کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ لندن ٹائمز نے ان الفاظ کی یہ تعبیر کی تھی ''پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال استصواب کے بے سود مطالبے پر اصرار نہیں کیا جائے گا'' اور نیویارک ٹائمز کی 19 رمئی کی رپورٹ یہ تھی کہ ''پاکستان اور ہندوستان ایک ایسے منصوبے پر بات چیت کر رہے ہیں جس کے تحت پوری ریاست میں استصواب نہیں کرایا جائے گا بلکہ ریاست کی موجودہ تقسیم کو ہی معمولی ردو بدل کے بعد تسلیم کر لیا جائے گا۔ پاکستان وادی میں استصواب چاہتا ہے لیکن ہندوستان کی خواہش یہ ہے کہ ایک منتخب دستور ساز اسمبلی کے ذریعے وہاں کے لوگوں کے رائے معلوم کی جائے۔''[7] لارڈ برڈووڈ لکھتا ہے کہ ''نہرو کی دلیل یہ تھی کہ اتنے اہم فیصلے کی ذمہ داری

جاہل کشمیریوں کے کاندھوں پر ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کی جانب سے ان کے کسی نمائندہ ادارے کو فیصلہ کرنا چاہیے۔"[8]

بوگرہ نئی دہلی میں اپنی اس شرمناک کارگزاری کے بعد واپس کراچی پہنچا تو اسے فوری طور پر یہ احساس نہ ہوا کہ پاکستان میں 18 رمئی کے مشترکہ اعلامیہ اور اس کے بارے میں غیر ملکی اخبارات کی خبروں کا بہت برا ردعمل ہوا ہے۔ اس نے 21 رمئی کو مسلم لیگ کے اخبار "پاکستان سٹینڈرڈ" سے ایک انٹرویو کے دوران اس اطلاع کی تصدیق کی کہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے نئے خیالات زیر بحث آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ "عوام کی منشا کئی طریقوں سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ مقام افسوس ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں امریکہ کے انتخابی اداروں کا سا نظام رائج نہیں ہے۔"[9] اس کے اس انٹرویو پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اخبارات اور سیاسی لیڈروں نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور اس سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ وہ 25 رمئی کو روزنامہ "ڈان" سے ایک انٹرویو کے دوران اپنی "نئی راہ" کے مؤقف سے منحرف ہو گیا۔ اس نے کہا کہ "یہ بالکل غلط ہے کہ میں نے کشمیری عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے استصواب کی بجائے کسی اور طریقے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔" "ڈان" نے اسی دن اس انٹرویو پر تبصرہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ "بھارت سے دوطرفہ بات چیت کا سلسلہ ختم کر کے کشمیر کا مقدمہ پھر اقوام متحدہ کے روبرو پیش کیا جائے۔ اب ہم امریکہ سے یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ نہ صرف خود اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر پر ہماری پوری طرح حمایت کرے گا بلکہ اپنے سارے مغربی اتحادیوں کو بھی ہماری حمایت کرنے پر آمادہ کرے گا۔" "ڈان" کے اس اداریے کی اشاعت پر بوگرہ نے 26 رمئی کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے "نئے خیالات" اور "نئی راہیں" پاکستانی عوام کے لیے بالکل ہی قابل قبول نہیں ہیں۔ اس پر پہلے تو اس قسم کے سوالات کی بوچھاڑ ہوئی کہ "کیا واقعی تم نے دہلی میں بات چیت کے دوران استصواب کی بجائے "ریفرنڈم" اور "انتخاب" کی باتیں کی تھیں؟ اور پھر اس سے پوچھا گیا کہ "اگر براہ راست بات چیت پھر ناکام ہو گئی تو سلامتی کونسل سے رجوع کیا جائے گا یا نہیں؟" بوگرہ اس سوال سے بوکھلا گیا اور اسے جواباً یہ کہنا پڑا کہ "ہم سلامتی کونسل سے کشمیر کا مقدمہ ہرگز واپس نہیں لیں گے۔ ہمارے اس مؤقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ پوری ریاست میں استصواب رائے عامہ ہونا چاہیے۔" اس نے تسلیم کیا

کہ ''اگر پاکستان کی کوئی حکومت تنازعہ کشمیر کے ایسے حل پر رضامند ہوجائے جو پاکستانی عوام کے لیے اطمینان بخش نہ ہوتو وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔''[10]

یکم جون 1955ء کو بوگرہ نے اپنی نشری تقریر میں بھی یقین دلایا کہ ''حکومت پاکستان کشمیر میں استصواب کرانے کے مؤقف سے کبھی دستبردار نہیں ہوگی۔ اگر دونوں وزرائے اعظم کی آئندہ ملاقات میں اس تنازعے کے حل کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو دوطرفہ بات چیت جاری رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر دوطرفہ بات چیت پھر ناکام ہوگئی تو ہندوستان سے مذاکرت کا سلسلہ قطعی طور پر ختم کر دیا جائے گا اور ہم سلامتی کونسل سے پھر رجوع کریں گے۔'' لاہور کے روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' نے اپنے 3ر جون کے اداریے میں محمد علی بوگرہ کی اس قلابازی پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ اس نے پھر حکومت پاکستان کا ابتدائی مؤقف اختیار کرلیا ہے کہ صرف غیر جانبدار استصواب سے ہی تنازعہ کشمیر کا منصفانہ حل ہوسکتا ہے۔ اخبار نے مزید لکھا کہ ''جب وزیراعظم دہلی سے واپس آیا تھا تو اس نے پنڈت نہرو سے اپنی ملاقات کو ''اطمینان بخش'' قرار دیا تھا لیکن اب وہ کہتا ہے کہ دہلی میں کوئی اطمینان بخش پیش قدمی نہیں ہوئی تھی۔'' نوابزادہ مظہر علی خان کی زیر صدارت ''پاکستان ٹائمز'' کی اس نکتہ چینی کی بنیاد بظاہر سوویت یونین کی اس نئی پالیسی پر تھی کہ ''چونکہ اینگلو امریکی سامراج کشمیر میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنے کے عزائم رکھتا ہے اس لیے تنازعہ کشمیر کا تصفیہ نہرو کے منصوبے کے مطابق ریاست کی موجودہ تقسیم کی بنیاد پر ہو جانا چاہیے۔'' سیسر گپتا بڑے افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ ''محمد علی بوگرہ کشمیر کے بارے میں ''نئی راہ'' اور ''نئے خیال'' سے محض اس لیے منحرف ہو گیا تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد جو کشمیر کے بارے میں پاکستان کی ''نئی راہ'' کا معمار اعلیٰ تھا، 20رمئی کو برائے علاج زیورچ چلا گیا تھا۔ وہ اس قدر بیمار ہوگیا تھا کہ پھر اپنے عہدہ کے فرائض نہیں سنبھال سکا تھا اور 1955ء میں اس کی جگہ اسکندر مرزا نے لے لی تھی اور وزیراعظم بوگرہ بھی اس سیاسی اتھل پتھل کا شکار ہوکر پاکستان کے سیاسی میدان کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں ان دنوں پاکستان سیاسی عدم استحکام کے دور سے گزر رہا تھا اور بوگرہ کو اس صورت حال سے نبٹنے میں کامیابی نہیں ہورہی تھی۔ مسلم لیگ مارچ 1953ء کے بعد حالات پر کبھی کنٹرول قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ مشرقی بنگال میں 1952ء کا جگتو فرنٹ ٹوٹ گیا تھا اور مغربی پاکستان میں ری پبلیکن پارٹی قائم ہوگئی تھی۔''[11]

تاہم اس امر کا امکان تھا کہ وزیراعظم بوگرہ کی اس قلابازی کے باوجود دوطرفہ بات چیت کا سلسلہ جاری رہتا کیونکہ اینگلو امریکی سامراج کی کمیونزم کے خلاف عالمی پالیسی کا تقاضا یہی تھا۔لیکن 8رجولائی کو ہندوستان کے وزیر داخلہ گوبند بلبھ پنت نے سری نگر میں ایک پریس کانفرنس کوخطاب کرتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کہہ دیں کہ پاکستانی رائے عامہ اور بھی برہم ہوگئی اوراس بنا پر کراچی کی سامراج نواز افسر شاہی کے لیے دوطرفہ بات کا مزید ڈھونگ رچانا قطعی طور پر ناممکن ہوگیا۔ پنڈت پنت نے اپنی پریس کانفرس میں کہا تھا کہ ''بلاشبہ ہم نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے موقعہ پر بعض بیانات دیئے تھے۔ جب ہم نے یہ بیانات دیئے تھے اس وقت کے حالات آج کے حالات سے مختلف تھے۔اس وقت کے بعد بہت سے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔گذشتہ آٹھ سال کے دوران کشمیر میں ترقی کی ایک خاص پالیسی پرعمل ہوتا رہا ہے اورآج کل بہت سی ترقیاتی اسکیمیں زیرعمل ہیں۔ پاکستان امریکہ کے ساتھ فوجی گٹھ جوڑ میں شامل ہوگیا ہے۔ کشمیر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخبہ دستور ساز اسمبلی اپنا قطعی فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس نے دستور ساز اسمبلی کے انتخابات سے پہلے جوقراردادیں منظور کی تھیں اور بعد میں شیخ عبداللہ نے اسمبلی میں جوافتتاحی تقریر کی تھی اس سے یہ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ دستور ساز اسمبلی کی تشکیل اس اہم مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے مقصد کے تحت ہوئی تھی۔ان حالات میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اب حالات کے دھارے کو بدلا نہیں جاسکتا۔میری اس رائے کا تعلق جموں وکشمیر کے اس علاقے سے ہے جو ہمارے پاس ہے۔ریاست کے دوسرے علاقے نے بھی اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ غالباً وہاں کے لوگوں کو یہ موقع ہی نہیں دیا گیا ہے۔ وہاں کے حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔حکومت پاکستان استصواب کے لیے معقول شرائط تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی ہے اورآئندہ بھی اس کی آمادگی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔''[12] پنڈت پنت کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے دسمبر 1947ء میں استصواب کرانے کا جو وعدہ کیا تھا اب اس پرعمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اب ہم نے اپنے مقبوضہ علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کرلیا ہے۔آئینی طور پر ریاست کا ہندوستان سے مکمل الحاق ہو چکا ہے۔اب ہم پاکستان کوصرف یہی رعایت دے سکتے ہیں کہ جوتھوڑا سا غیر پیداواری علاقہ پاکستان کے قبضہ میں ہے وہ اسی کے پاس رہے۔لیکن اگر وہ پوری ریاست پر اپنا حق جتانے پر بدستور مصر رہا تو پھر ہم اس کے مقبوضہ علاقے کو بھی ہتھیا لیں گے۔لارڈ برڈوڈ کی

اطلاع کے مطابق ان دنوں بخشی غلام محمد کی نیشنل کانفرنس نے ریاست میں اپنے مخالفین کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے ''امن بریگیڈ'' کے نام سے ایک پرائیویٹ فوج منظم کر رکھی تھی۔

پنڈت پنت کی اس پریس کانفرنس کا پس منظر امریکی فارن پالیسی ایسوسی ایشن کے صدر یوسٹیس سیلیگمین (Eustace Seligman) کی اس رپورٹ میں نمایاں تھا جو اس نے جون 1955ء میں ہندوستان کا مطالعاتی دورہ کرنے کے بعد پیش کی تھی۔ سیلیگمین کا تاثر یہ تھا کہ ''ہندوستان پاکستان کو فوجی امداد ملنے اور کشمیر میں استصواب کرانے کے اس لیے خلاف ہے کہ اس طرح مسلمانوں کے ہندو انڈیا میں دوبارہ شامل ہونے کے رستے میں رکاوٹیں حائل ہوں گی...... اگر ہندوستان کے اس نقطۂ نگاہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ برصغیر کی تقسیم غلط تھی اور بعد میں تاریخی قوتیں ناگزیر طور پر اس غلطی کی اصلاح کریں گی تو منطقی طور پر اس رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑے گا کہ جو کاروائی پاکستان کو مضبوط کرنے کے لیے کی جائے گی وہ ترقی کے دھارے کو پیچھے کی طرف دھکیلے گی۔''[13] پنت نے دراصل اپنی ان باتوں میں کوئی نیا موقف اختیار نہیں کیا تھا۔ اگرچہ جواہر لال نہرو اعلانیہ طور پر تو یہی کہتا رہا تھا کہ ہندوستان استصواب کے وعدے سے منحرف نہیں ہوگا لیکن 1948ء میں کشمیر کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد وہ بند کمروں میں مسلسل یہی تجویز پیش کرتا تھا کہ موجودہ جنگ بندی لائن کی بنیاد پر ریاست کو تقسیم کر لیا جائے۔ اس نے لیاقت علی خان، اقوام متحدہ کے کمیشن اور محمد علی بوگرہ سے یہی باتیں کہی تھیں۔

سیسر گپتا کے بیان کے مطابق گورنر جنرل غلام محمد اس تجویز پر متفق ہو گیا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کے بدلے میں دوسرے متنازعہ معاملات طے کرتے وقت پاکستان کو خاصی رعایتیں دی جائیں اور نہرو مطلوبہ رعایتیں دینے پر آمادہ تھا۔ لیکن ''بدقسمتی'' سے غلام محمد بیمار ہو گیا اور اس کے بعد پاکستان میں کسی کو اس تجویز پر عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگر سیسر گپتا کا یہ بیان صحیح ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غلام محمد اینگلو امریکی سامراج کے وفادار پٹھو کی حیثیت سے نہرو کو اس کی حسب خواہش کشمیر کی تقسیم کا لالچ دے کر اسے اینگلو امریکی فوجی گٹھ جوڑ میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محمد علی بوگرہ بھی اسی مقصد کے تحت ''نئی راہ'' ''نئے خیالات'' اور ''مشترکہ خارجی و دفاعی پالیسی'' کی باتیں کرتا تھا۔ لیکن اس سامراجی مقصد کی تکمیل اس لیے نہ ہو سکی کہ ہندوستان کے قومی بورژوا طبقے کا امریکی سامراج کے ساتھ تضاد تھا اور سوویت یونین نے

اس تضاد سے فائدہ اٹھانے کے لیے بالآخر جواہر لال نہرو کو یقین دلایا تھا کہ وہ نہ صرف تنازعہ کشمیر کے بارے میں بلکہ دوسرے معاملات میں بھی ہندوستان کی پوری طرح تائید وحمایت کرے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب کی رائے عامہ تنازعہ کشمیر کے اس قسم کے تصفیہ پر کبھی رضامند نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ پنجاب کے عوام نے پاکستان کی اینگلو امریکی فوجی گٹھ جوڑ میں شمولیت کو محض اس فریب کے تحت قبول کیا تھا کہ اس طرح کشمیر کو بزور قوت آزاد کرانا ممکن ہو سکے گا۔ محمد علی بوگرہ کا 26 رمئی کا یہ بیان غلط نہیں تھا کہ ''اگر پاکستان کی کوئی حکومت تنازعہ کشمیر کے ایسے حل پر رضامند ہو جائے جو پاکستانی عوام کے لیے اطمینان بخش نہ ہو تو وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔''

حکومت پاکستان نے 14 رجولائی 1955ء کو حکومت ہندوستان کے نام ایک مراسلے میں پنڈت پنت کے اس بیان پر سخت احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے سرکاری مؤقف کی وضاحت کی جائے۔ جواہر لال نہرو اس سے دو دن قبل ماسکو کے دورے سے یہ حتمی وعدہ لے کر واپس آیا تھا کہ آئندہ سوویت یونین کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کی مکمل تائید وحمایت کرے گا۔ تاہم اس نے 16 رجولائی کو ایک پبلک جلسے میں پاکستان کے احتجاجی مراسلے کا حسب معمول گول مول اور ذومعنی جواب دیا۔ جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی تھا وہ اس پر اب بھی قائم ہے اور آئندہ بھی قائم رہے گا۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''محض اس قسم کے اعلانات کو بار بار دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اگر ہم اندھے کی طرح ایک ہی جگہ چکر لگاتے رہیں گے تو یہ غیر دانشمندانہ بات ہوگی۔ دہلی کی بات چیت میں پرانی اندھی راہ کی بجائے تعمیری راہ اختیار کی گئی تھی۔ یہ مسئلہ اسی قسم کی قابل عمل راہ سے ہی حل ہو سکتا ہے۔'' نہرو کا مطلب یہ تھا کہ اگر محض استصواب کی باتیں کرنے سے تمہاری تسلی ہوتی ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن فیصلہ ریاست کی موجودہ تقسیم کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ اس نے 15 راگست کو لوک سبھا میں بھی اسی قسم کی باتیں کر کے اپنے منافقانہ رویے کو برقرار رکھا۔ اس نے کہا کہ ''ہم اپنے وعدوں پر قائم ہیں لیکن اس عرصے میں جو کچھ ہوا ہے ہم اسے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔''[14]

6 راگست 1955ء کو میجر جنرل اسکندر مرزا نے مخبوط الحواس اور فالج زدہ گورنر جنرل غلام محمد کو ''چھٹی'' دیدی تو 7 راگست کو پاکستان کی نئی دستور ساز اسمبلی میں محمد علی بوگرہ کی بجائے چوہدری محمد علی کو نیا وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ نئے وزیر اعظم نے اپنی پہلی نشری تقریر میں کہا کہ

برصغیر میں سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعاون بہت ضروری ہے اور دونوں ملکوں کے مفاد کا تقاضا ہے کہ تنازعہ کشمیر کو جلد از جلد حل کیا جائے۔ وزیراعظم نہرو نے تقریباً دو ہفتے بعد یعنی 22/اگست کو راجیہ سبھا میں اس تقریر کا سہ معنی جواب دیا۔ اس نے کہا "(1) ہندوستان نے ازخود کشمیر کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے بارے میں اعلان کیا تھا۔ (2) اس اعلان میں استصواب کا کوئی ذکر نہیں تھا اور (3) استصواب کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد کی منظوری کے بعد کئی واقعات ہوئے ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔"[15] پاکستان کے عوام اور اخبارات نے نہرو کے اس بیان پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور اپنی اس پختہ رائے کا اعادہ کیا کہ برہمنی سامراج کشمیری عوام کو حق خودارادیت کبھی نہیں دے گا۔ وزیراعظم چوہدری محمد علی نے اس صورت حال کے پیش نظر 2/ستمبر کو اعلان کیا کہ کشمیر کا مسئلہ ایک ایسا قومی مسئلہ ہے جو ساری سیاسی جماعتوں کے مفادات سے بالاتر ہے۔ لہٰذا میں ایک ماہ کے اندر ساری جماعتوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس بلاؤں گا جس میں اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک قومی منصوبہ تیار کیا جائے گا۔ 9/ستمبر کو لندن ٹائمز نے گورنر جنرل اسکندر مرزا کے حوالے سے یہ رپورٹ شائع کی کہ "اگر ہندوستان اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا تو کشمیر کا مسئلہ پھر سلامتی کونسل کے روبرو پیش کیا جائے گا۔"

چوہدری محمد علی کی مجوزہ کانفرنس 26/نومبر 1955ء کو منعقد ہوئی۔ جس میں ایک قرارداد کے ذریعے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی ہٹ دھرمی کی مذمت کی گئی سلامتی کونسل کی بےعملی پر مایوسی کا اظہار کیا گیا اور حکومت پاکستان پر زور دیا گیا کہ "وہ جموں وکشمیر کے عوام کو حق خودارادیت دلانے کے لیے اپنی ساری کوشش قومی بنیاد پر مربوط کر کے شدید تر کر دے۔" اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان سے دوطرفہ بات چیت نہیں ہوگی بلکہ حسب سابق ہندوستان سے محاذ آرائی کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا۔ چوہدری محمد علی کی جانب سے یہ قرارداد منظور کروانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ چوہدری خود پنجابی تھا اور اسے اس حیثیت سے اچھی طرح معلوم تھا کہ پنجاب میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں عوام کے جذبات کس قدر شدید ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس کل جماعتی کانفرنس میں سوویت یونین سمیت ساری بڑی طاقتوں کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی ساری قوم متحد و متفق ہے اور

یہاں کی کوئی حکومت اس مسئلہ کے غیر منصفانہ حل پر رضامند نہیں ہوسکتی تھی۔ غالباً اسی لیے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں سارے ملکوں کے سفیروں کو دعوت دی گئی تھی۔

لیکن سوویت یونین کی پالیسی پر اس کانفرنس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان ماسکو کے ارباب اقتدار کے احتجاجات کے باوجود یکم جولائی 1955ء کو اینگلو امریکی سامراج کے بغداد پیکٹ میں شامل ہو چکا تھا اور اس بنا پر سوویت یونین کی حکومت وزیراعظم جواہر لال نہرو کو یقین دلا چکی تھی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے مؤقف کی پوری تائید وحمایت کرے گی۔ سوویت لیڈروں کی جانب سے ہندوستان کو یہ یقین دہانی اس لیے بھی اہم تھی کہ اینگلو امریکی سامراج اپنے پاکستانی پٹھوؤں کی وفاداری کے صلے کے طور پر تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے ان کی کوئی مؤثر امداد نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ وہ جواہر لال نہرو کی خفگی کے پیش نظر حکومت پاکستان پر مسلسل یہ دباؤ ڈال رہا تھا کہ تنازعہ کشمیر کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان کے ساتھ صلح جوئی کی پالیسی پر عمل کرو۔ دسمبر 1955ء کے اوائل میں سوویت وزیراعظم مارشل بلگانن، جواہر لال نہرو کے دورۂ ماسکو کے جواب میں ہندوستان آیا۔ اس کے ہمراہ سوویت کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری خروشچوف بھی تھا یہ دونوں نہرو کی خواہش کے مطابق سری نگر بھی گئے وہاں مارشل بلگانن نے 9ردسمبر کو ایک بیان میں ریاست جموں وکشمیر کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''ہندوستان کا شمالی علاقہ'' قرار دیا اور اگلے دن 10ردسمبر کو خروشچوف نے ایک ایسا بیان دیا جس سے پاکستانی عوام کے جذبات بے انتہا مجروح ہوئے۔ اس نے کہا کہ ''ہندوستان کی تقسیم ہندوستان کے عوام کے مفادات کے تحت عمل میں نہیں آئی تھی...... ہمیں یقین ہے کہ جب جذبات ٹھنڈے ہو جائیں گے اور لوگوں کو ہندوستان کی اس مصنوعی تقسیم کی اہمیت کا احساس ہو جائے گا تو انہیں اس پر افسوس ہوگا...... لیکن جب تک یہ دونوں ریاستیں موجود ہیں ان کی سرحدوں کی اس قسم کی تشکیل نو کی کوئی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بعض طاقتیں چاہتی ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سرحدوں کی تبدیلی ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور یہ تشدد وخونریزی کے بغیر نہیں ہوتی۔ کشمیر کے عوام اپنی ریاست کو جمہوریۂ ہند کا ایک صوبہ بنانے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جمہوریۂ ہند امن کی جدوجہد اور متنازعہ مسائل کے پرامن حل کی کوشش میں ہمارا اتحادی ہے لیکن بدقسمتی سے ہم یہ بات پاکستان کے بارے میں نہیں کہہ سکتے...... ہم بغداد پیکٹ کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ پاکستان

اس کا نہایت سرگرم رکن ہے حالانکہ اس میں اس کی شمولیت سے اس کو یا اس کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔'' خروشچوف نے اپنے بیان میں انکشاف کیا کہ ''پاکستان نے کراچی میں مقیم سوویت سفیر سے یہ کہا تھا کہ سوویت لیڈروں کو کشمیر جانے سے انکار کر دینا چاہیے۔ پاکستان کا یہ مطالبہ دوسرے لوگوں کے معاملات میں ایک بے مثال مداخلت کی حیثیت کا حامل تھا'' اور پاکستانی ارباب اقتدار اس طرح ''اپنی حد سے کچھ تجاوز کر گئے تھے۔'' پھر خروشچوف اور بلگانن نے 14 دسمبر کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، ہم نے اپنے وہاں کے دورے کے دوران دیکھا ہے کہ کشمیری عوام اپنی قومی آزادی پر بہت خوش ہیں۔ وہ اپنے علاقے کو جمہوریۂ ہند کا ایک جزولاینفک سمجھتے ہیں''[16] اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ''کشمیری عوام اپنے معاملات غیر ملکی مداخلت کے بغیر طے کر لیں گے اور یہ مسئلہ کشمیری عوام کی اپنی منشا کے مطابق حل کر لیا جائے گا۔''[17]

اگر دسمبر 1955ء کی عالمی صورت حال کو پیش نظر رکھا جائے تو سوویت لیڈروں کے بیانات ناقابل فہم نہیں ہیں۔ بلاشبہ ان دنوں اینگلو امریکی سامراج سوویت یونین اور چین کا گھیراؤ کرنے کی جارحانہ پالیسی پر عمل پیرا تھا اور پاکستان کے قوم فروش حکمرانوں نے اس ملک کو سامراجی پالیسی کا ایک مہرہ بنا دیا تھا۔ لہٰذا پاکستان کے خلاف ایک ''سپر پاور'' کے لیڈروں کا ردعمل ویسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ ہوا۔ لیکن جو بات پاکستانی عوام کے لیے انتہائی قابل اعتراض اور تکلیف دہ تھی وہ یہ تھی کہ سوویت رہنماؤں کے اس رویے کا مارکسزم اور لینن ازم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ نظریاتی طور پر تو ساری دنیا کے مظلوم اور غلام عوام کی آزادی و خودمختاری کے علمبردار تھے۔ لیکن عملی طور پر ان کی عالمی پالیسی اور امریکی سامراج کی عالمی پالیسی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کو ہزیمت دینے کے لیے ہر حربے کو جائز تصور کرتی تھیں۔ وہ پاکسان کے سامراج نواز حکمران ٹولے کے جرائم کی سزا نہ صرف کشمیر کے 40 لاکھ عوام کو دے رہے تھے بلکہ وہ 10 کروڑ عوام کے پیارے وطن پاکستان کے وجود کے جواز کو بھی چیلنج کر رہے تھے۔

عظیم لینن کی قائم کردہ کمیونسٹ پارٹی کے حقیر جنرل سیکرٹری خروشچوف کا یہ بیان سراسر غلط اور جھوٹا تھا کہ ''کشمیر کے عوام اپنی ریاست کو جمہوریۂ ہند کا ایک صوبہ بنانے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔'' حقائق اس کی اس بکواس کے بالکل برعکس تھے۔ پہلی حقیقت تو یہ تھی کہ شیخ عبداللہ نے

اکتوبر 1951ء میں جس دستور ساز اسمبلی کا ''بلا مقابلہ'' انتخاب کرایا تھا اس کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں تھی۔ دوسری حقیقت یہ تھی کہ جب جنوری 1952ء میں سوویت یونین کے نمائندے نے مسئلہ کشمیر پر پہلی مرتبہ لب کشائی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کی منتخب دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ہوسکتا ہے،'' تو اس کے فوراً ہی بعد اس سوویت نمائندے نے پاکستان کے وزیر خارجہ کو یقین دلایا تھا کہ اس کی مراد اس دستور ساز اسمبلی سے نہیں ہے جس کا شیخ عبداللہ نے ''بلا مقابلہ'' انتخاب کرایا تھا۔ تیسری حقیقت یہ تھی کہ شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری اس شبہ کی بنا پر عمل میں آئی تھی کہ وہ اپنی اس غیر نمائندہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعے وادی کشمیر کی آزادی کا اعلان کرنے والا تھا۔ چوتھی حقیقت یہ تھی کہ جب شیخ عبداللہ کو گرفتار کیا گیا تھا تو اس کے بعد پوری وادی کشمیر میں عوام الناس نے بغاوت کردی تھی جسے کچلنے میں تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ لگا تھا اور اس دوران سینکڑوں کشمیری عوام بھارتی فوج اور پولیس کی گولیوں سے جاں بحق ہوئے تھے اور پانچویں حقیقت یہ تھی کہ جب کشمیر کے پٹھو وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد نے فروری 1954ء میں اسی غیر نمائندہ دستور ساز اسمبلی سے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا ''قطعی'' فیصلہ کروایا تھا ان دنوں وادی کشمیر کے سینکڑوں محبان وطن جیلوں میں مقید تھے۔ خروشچوف نے نہ صرف روایتی سامراجیوں کی طرح ان حقائق کو نظر انداز کر کے کشمیر کے مظلوم وغلام عوام کو حق خود ارادیت دینے سے انکار کر دیا تھا بلکہ یہ بھی فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ ''کشمیری عوام اپنی قومی آزادی پر بہت خوش ہیں۔'' پاکستان کے سامراج نواز حکمران ٹولے کے جرائم کی سزا کشمیر کے بے گناہ عوام کو دینے کا فیصلہ صرف خروشچوف جیسا بد دیانت اور احمق لیڈر ہی کر سکتا تھا۔ مظلوم عوام کے حق خود ارادیت کے عظیم ترین علمبردار لینن کا کوئی سچا پیروکار اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ سوویت لیڈروں نے اپنے ان بیانات میں کراچی کے سامراج نواز ٹولے کے جرائم کی سزا پاکستان کے دس کروڑ بے گناہ عوام کو دینے کا فیصلہ بھی صادر کیا تھا۔

جب خروشچوف نے یہ کہا تھا کہ ''ہندوستان کی تقسیم ہندوستان کے عوام کے مفادات کے تحت عمل میں نہیں آئی تھی۔'' تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ برصغیر کی تقسیم غلط تھی اور یہ سامراج کے مفادات کے تحت عمل میں آئی تھی۔ برصغیر کے کروڑوں مسلمان عوام کی خواہش کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اس قسم کا احمقانہ بیان کوئی ایسا شخص ہی دے سکتا تھا جسے سامراجی مفاد نے اندھا کر

رکھا ہوا اور جو مارکسزم اور لینن ازم کی ابجد سے بھی ناواقف ہو۔ اس طرح اس نے نہ صرف کشمیری عوام کو بلکہ پاکستانی عوام کو بھی آزادی کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنے اس بیان سے سائنسی سوشلزم یا اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی تھی۔ اس نے پاکستان کے کروڑوں محب الوطن عوام کو یہ تاثر دیا تھا کہ کمیونسٹوں کا سوشلزم کا نعرہ بھی سامراجیوں کے جمہوریت کے نعرے کی طرح سیاسی فریب اور مصلحت پر مبنی ہے۔ اس نے پاکستان میں سوشلزم کی تحریک کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے یہاں کے رجعت پسند اور سامراج نواز عناصر کو یہ مؤثر پراپیگنڈا کرنے کا موقع دیا تھا کہ سوشلزم کا نظریہ پاکستان کے وجود کا دشمن ہے اور سوویت یونین پاکستان کا اتنا ہی دشمن ہے جتنا کہ بھارت ہے۔ اس نے اس طرح پاکستانی عوام میں یہاں کے سامراجی پٹھوؤں کے اس مؤقف کو فروغ دیا تھا کہ پاکستان کا تحفظ محض مغربی سامراج کا سہارا لینے سے ہی ہوسکتا ہے اور بھارت کے ہاتھوں پاکستان کی بربادی سے بہتر ہے کہ اسے سامراج کے ایک طفیلی ملک کی حیثیت سے زندہ رکھا جائے۔ خروشچوف نے دونوں ملکوں کی سرحدوں میں تبدیلی کے خطرناک نتائج کا جو ذکر کیا تھا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان کی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے حق میں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ کشمیر جمہوریۂ ہند کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے اس لیے اس کی سرحدوں میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے اور چونکہ اس طرح غلامی کشمیری عوام کا مقدر بن چکی ہے اس لیے اب انہیں اپنی آزادی کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرنی چاہیے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خروشچوف نے اپنے اس بیان میں پاکستان کی علاقائی سالمیت کو تسلیم کر لیا تھا تو اس کی اس ''فیاضانہ رعایت'' پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ وہ اسی بیان کے ابتدائی حصے میں پاکستان کے وجود کے جواز کو ہی چیلنج کر چکا تھا اور یہ بھی کہہ چکا تھا کہ جب عوام کے جذبات ٹھنڈے ہوں گے تو انہیں برصغیر کی تقسیم پر افسوس ہوگا۔ اس کے ان الفاظ کا اس کے سوا کچھ اور مطلب نہیں ہوسکتا تھا کہ پاکستانی عوام پچھتائیں گے اور وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے اپنے ملک کو پھر ہندوستان میں ضم کر دیں گے۔ یہی بات جواہر لال نہرو اور دوسرے ہندوستانی ارباب اقتدار ابتدا ہی سے کہہ رہے تھے۔ جون 1947ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد میں بھی یہی بات کہی گئی تھی۔ اگر خروشچوف کے دماغ پر مارکس اور لینن کی تعلیمات کا ذرا سا بھی اثر ہوتا اور اس کے دل پر سامراجی عزائم نے جہالت کی مہریں نہ لگائی ہوتیں تو اسے یہ

احساس ہوتا کہ ہندوستان اور پاکستان کے قومی تضاد کی بنیاد نہایت تلخ سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقائق پر ہے اور یہ تضاد یکطرفہ فیصلہ صادر کرنے سے حل نہیں ہوسکتا اور اگر خروشچوف اینڈ کمپنی کی عالمی پالیسی کی بنیاد مارکسزم اور لینن ازم پر ہوتی تو پاکستان کے سامراج نواز حکمران ٹولے کو پاکستانی عوام کے ہاتھوں سزا دلوائی جاسکتی تھی اور مغربی سامراج کی جانب سے اس علاقے کو اپنی عالمی سرد جنگ کی لپیٹ میں لینے کی جو کامیاب کوشش کی جارہی تھی اس کو مؤثر طریقے سے ناکام کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان بدبختوں نے کراچی کے سامراجی پٹھوؤں کو ان کی قوم فروشی کے جرم کی سزا دلوانے کی بجائے کشمیر اور پاکستان کے بے گناہ عوام کی آزادی کے لیے سزائے موت کا حکم صادر کر دیا۔ فلسفہ تاریخی مادیت کے نقطۂ نگاہ سے برصغیر کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس میں سوویت لیڈروں کے اس غیر مارکسی اور انقلاب دشمن کردار کا ذکر ہمیشہ برے الفاظ میں کیا جائے گا۔

حسب توقع ہندوستان کا حکمران طبقہ سوویت لیڈروں سے بہت خوش ہوا کیونکہ جواہر لال نہرو کے بقول ان کے بیانات میں ''صحیح باتیں'' کہی گئی تھیں اور انہوں نے ''بڑے غور و خوض'' کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ پاکستان کے وزیراعظم چوہدری محمد علی نے 11 دسمبر 1955ء کو اپنے ایک بیان میں سوویت لیڈروں کی مذمت کی۔ اس نے کہا کہ ان لیڈروں کے یہ اعلانات اس بنا پر ''غیر معمولی'' ہیں کہ ان کا ملک نوآبادیاتی نظام کی مذمت کرتا ہے اور اس سلامتی کونسل کا رکن ہے جس نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ کشمیر کے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ آزاد استصواب کے ذریعے کیا جائے گا۔ چوہدری محمد علی نے مزید کہا کہ بغداد پیکٹ ایک ''دفاعی معاہدہ'' ہے۔ حیرت ہے کہ سوویت لیڈروں نے اس معاہدے میں سے تنازعہ کشمیر کے بارے میں اپنے موجودہ رویے کا جواز پیدا کر لیا ہے۔ 17 دسمبر کو پاکستان کے وزیر خارجہ حمید الحق چوہدری نے اپنے ایک بیان میں وزیراعظم بلگانن پر الزام عائد کیا کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ حمید الحق چوہدری کے بیان میں اس حد تک صداقت تھی کہ جن دنوں سوویت لیڈروں نے تنازعہ کشمیر کے پرامن حل کے سارے راستے مسدود کر دیئے تھے ان دنوں اینگلو امریکی سامراج ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ کشمیر کے باوجود مصالحت کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگرچہ برصغیر میں سامراج نے پاکستان کو اپنے فوجی گٹھ جوڑ میں شامل کر کے سرد جنگ کی ابتدا کی تھی لیکن اس میں خطرناک حد تک شدت

پیدا کرنے کی ذمہ داری سوویت لیڈروں پر عائد ہوتی تھی۔

بظاہر سوویت لیڈروں کی ایک پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اتنی کشیدگی پیدا کر دی جائے کہ برصغیر کے بارے میں امریکی سامراج کے سارے منصوبے ناکام ہو جائیں اور دوسری پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے قومی تضاد سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو سوویت حلقۂ اثر میں شامل کیا جائے۔ ایشیا میں ہندوستان جیسے بڑے ملک کی شمولیت کے بغیر امریکی سامراج کا کوئی فوجی یا غیر فوجی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی ہندوستان ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی جہاں نہ صرف سوویت یونین کے فالتو اور فرسودہ مال کی بآسانی کھپت ہوسکتی تھی بلکہ بڑی سودمند سرمایہ کاری کی بھی بے پناہ گنجائش تھی۔

25 ردسمبر کو گورنر جنرل اسکندر مرزا نے بھی تقریباً اسی قسم کا بیان دیا جیسا کہ وزیر خارجہ حمیدالحق چوہدری دے چکا تھا۔ اسکندر مرزا نے کہا کہ ''کچھ عرصہ سے ہمارے خارجی امور کو عالمی طاقتی سیاسیات میں الجھانے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور یہ بھی کوششیں کی گئی ہیں کہ مسئلہ کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ہمارے تعلقات میں حائل کر دیا جائے۔'' اس سامراجی پٹھو کے اس بیان کے پس منظر میں اینگلو امریکی سامراج کی یہ ہدایت تھی کہ ہندوستان کے ساتھ پہلے چھوٹے چھوٹے متنازعہ معاملات کا تصفیہ کیا جائے اور پھر اس بنا پر سازگار فضا پیدا ہو تو مسئلہ کشمیر کو پرامن طریقے سے حل کیا جائے۔

سوویت یونین کے وزیراعظم بلگانن نے 29 ردسمبر کو ماسکو میں اپنے دورۂ ہندوستان کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اسکندر مرزا کے اس بیان کا جواب دیا جس میں مسئلہ کشمیر میں سوویت یونین کے غیر لیننی موقف کا پہلے سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا۔ اس نے کہا کہ ''جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے یہ مسئلہ ان ممالک نے پیدا کیا تھا جو اس علاقے میں اپنے غیر مبہم فوجی وسیاسی مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ بعض ممالک نے اس مسئلہ پر پاکستان کی حمایت کی آڑ لے کر ہندوستان کے اس حصے میں خود کو مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کشمیر کو ہندوستان سے مصنوعی طور پر الگ کیا جائے، وہاں اپنے فوجی اڈے قائم کیے جائیں اور اس طرح کشمیر کے گردونواح کے علاقے پر دباؤ ڈال کر اس کے لیے خطرہ پیدا کیا جائے...... کشمیر کے عوام مسئلہ کشمیر کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ کشمیر کو ہندوستان کا جزو لاینفک قرار دیتے ہیں......

سوویت یونین مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کی پالیسی کی اس لیے حمایت کرتا ہے کہ یہ پالیسی ایشیا کے اس علاقہ میں امن کے استحکام کے اصولوں کے مطابق ہے۔ ہم نے یہ بات اس وقت بھی کہی تھی جب ہم کشمیر میں تھے، ہم نے 14/دسمبر کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں بھی اپنے اس بیان کا اعادہ کیا تھا اور ہم آج بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔''[18] بلگانن کے اس بیان کے مطابق اس حقیقت کے بارے میں شک وشبہ کی بالکل کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سوویت یونین نے امریکی سامراج کے خلاف اپنی عالمی سرد جنگ میں لاکھوں کشمیری عوام کے بنیادی حق خودارادیت کو قربان کر دیا ہے اور کروڑوں پاکستانی عوام کے جذبۂ آزادی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ سٹالن کی موت کے بعد ماسکو کا حکمران ٹولہ 1955ء میں روایتی سامراجیت کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

اینگلو امریکی سامراج نے پاکستان پر اس زبردست حملے کے جواب میں صرف اتنی کاروائی کی کہ 8/مارچ 1956ء کو سیٹو کی وزارتی کونسل کے اجلاس کے بعد جو اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں پاکستان کے اصرار پر یہ فقرہ بھی شامل کر لیا گیا کہ ''مسئلہ کشمیر کا اقوام متحدہ کی وساطت سے یا براہ راست گفت وشنید کے ذریعے تصفیہ ہونا چاہیے۔'' اگرچہ اینگلو امریکی سامراج نے اپنے اس فقرے میں محض اپنی ''نیک خواہش'' کا ہی اظہار کیا تھا اور آسٹریلیا کے وزیر خارجہ کے بیان کے مطابق کشمیر کا ذکر محض لیڈروں کے بیانات کے جواب میں کیا گیا تھا تاہم ہندوستان کے وزیراعظم نہرو نے اس پر بہت برا منایا۔ حکومت ہندوستان نے سیٹو ممالک کے نام ایک احتجاجی مراسلے میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس قابل اعتراض اعلامیہ پر کامن ویلتھ کے ممالک نے بھی دستخط کئے ہیں۔

تاہم جب 23/مارچ 1956ء کو سوویت یونین کا اول نائب وزیراعظم اے۔ آئی۔ مکویان پاکستان کے یوم جمہوریہ کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے چالیس ارکان پر مشتمل وفد کے ہمراہ کراچی آیا تو معلوم ہوا کہ دسمبر 1955ء میں بلگانن اور خروشچوف کے دورۂ ہندوستان کے بعد ماسکو کے ارباب اقتدار نے اپنی برصغیر کی پالیسی پر کچھ نظرثانی کی ہے۔ مکویان نے 25/مارچ کو کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ بلگانن اور خروشچوف نے ہندوستان میں رائے عامہ کا اندازہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا تاہم ''ہم مسئلہ کشمیر کا قطعی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فیصلہ خود کشمیر کے عوام کو ہی کرنا چاہیے۔'' اس نے اپنے کراچی میں قیام کے دوران

پاکستان کے پارلیمانی وفد کوسوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور پاکستان کو معاشی امداد کی بھی پیش کش کی۔ مگر نیویارک ٹائمز کی 27/مارچ کی رپورٹ کے مطابق مکویان کی یہ پیشکش فوراً مسترد کر دی گئی۔ حکومت پاکستان کے ایک ترجمان نے اعلانیہ طور پر کہا کہ ہمارے ہاں کوئی بھی شخص ان کی امداد کا خواہاں نہیں اور حکومت کی بھی یہی پالیسی ہے۔'' اس دن ماسکو میں پاکستانی سفارت خانے کی ایک تقریب میں وزیر خارجہ مولوٹوف نے اشارۃً کہا کہ سوویت یونین پاکستان میں بھی ویسا ہی فولاد سازی کا کارخانہ تعمیر کرنے پر آمادہ ہے جیسا کہ اس نے ہندوستان میں قائم کیا ہے۔ مگر اس کی اس پیش کش کا بھی کوئی جواب نہ دیا گیا۔

پھر روزنامہ ''ڈان'' کی 7/اپریل کی ایک رپورٹ کے مطابق لندن کے سوویت سفارت خانے میں ایک تقریب کے موقعہ پر سوویت وزیر صنعت مالنکوف نے کشمیر میں استصواب کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''سوویت یونین نے اس مسئلہ پر بالکل کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔'' لیکن حکومت پاکستان نے سوویت لیڈروں کے ان ریمارکس کو بھی قابل اعتنانہ سمجھا۔ ان دنوں پاکستان میں صدر اسکندر مرزا اور کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کا ڈنکا بجتا تھا اور یہ دونوں پاکستان کی سامراج نواز خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی نام نہاد اسلام پسندی بھی خارجہ پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس نے اندرون ملک جماعت اسلامی سے عملاً گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور جماعت اسلامی کا اسلامی نظام کے زیر عنوان واحد نصب العین یہ تھا کہ پاکستان رہے یا نہ رہے، تنازعہ کشمیر منصفانہ طور پر حل ہو یا نہ ہو سوشلزم کا سدباب بہر قیمت اور بہر طور ہونا چاہیے۔ اس کا یہ نصب العین امریکی سامراج کے عالمی نصب العین کے عین مطابق تھا۔

سوویت ارباب اقتدار نے کشمیر اور پاکستان کے بارے میں اپنی معاندانہ پالیسی پر قدرے نظر ثانی اس لیے کی تھی کہ غالباً انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ دسمبر 1955ء میں بلگانن اور خروشچوف نے مسئلہ کشمیر اور پاکستان کے بارے میں جو احمقانہ بیانات دیئے تھے ان کی بنا پر وادی کشمیر اور پاکستان کے عوام الناس میں سوویت یونین کے خلاف بے انتہا نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ پاکستانی عوام سوویت یونین کو ویسا ہی قومی دشمن تصور کرنے لگے تھے جیسا کہ وہ بھارت کو سمجھتے تھے اور اس بنا پر وہ بہ امر مجبوری اپنے ملک کے حکمران ٹولے کی سامراج نواز پالیسی کی

تائید وحمایت کرنے لگے تھے۔ تاہم کراچی کی برسراقتدار افسر شاہی نے سوویت یونین کی پالیسی میں قدرے تبدیلی کی ان علامتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ وہ پاکستان کو امریکی سامراج کے فوجی معاہدوں میں شامل کر کے سوویت یونین و چین کے خلاف اور اینگلو امریکی سامراج کے حق میں اتنی دور جا چکے تھے کہ اب ان کی واپسی کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ انہوں نے ملک وقوم کی آزادی وخود مختاری کو امریکی سامراج کے پاس قطعی طور پر فروخت کر دیا تھا اور اب اس کے پکے سودے میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا وہ پاکستان کے دفاع اور تنازعہ کشمیر کے تصفیے کے لیے امریکی سامراج پر اور بھی زیادہ انحصار کرنے لگے۔

19راپریل 1956ء کو تہران میں بغداد پیکٹ کی کونسل کا اجلاس ہوا تو اس کے اعلامیہ میں بھی پاکستان کے اصرار پر یہ فقرہ شامل کر لیا گیا کہ ''فلسطین اور کشمیر کے تنازعات پر جلد از جلد تصفیہ ہونا چاہیے کیونکہ ان تنازعات نے پورے علاقے میں کشیدگی پیدا کر رکھی ہے۔'' چونکہ یہ اعلامیہ بے جان اور بے معنی فقروں پر مشتمل تھا اور یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ بغداد پیکٹ کی حیثیت ایک کاغذی شیر سے زیادہ نہیں ہوگی اس لیے سوویت یونین نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ تاہم برصغیر میں محاذ آرائی اور کشیدگی کی فضا قائم رہی۔ 2رجون کو ''لندن ٹائمز'' کا اس صورت حال پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''پاکستان کے بارے میں ہندوستان کا رویہ ابھی تک 1947ء کی تقسیم کے واقعات وجذبات سے متعین ہوتا ہے۔ بہت سے ہندوستانی ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ 1947ء میں ان کے ملک کے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے اور وہ ابھی تک اس واقعہ کو ایک المیہ تصور کرتے ہیں ...... یہ جذبہ ہندوستانی منطق پر چھایا ہوا ہے۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ جو امور دونوں میں اختلاف کا باعث ہیں وہ خارجی تصور نہیں کئے جاتے۔'' ......اور پھر 26رجون کو اسی اخبار نے یہ رائے ظاہر کی کہ ''بدقسمتی سے یہ خیال فروغ پا رہا ہے کہ ہندوستان کی جانب سے کشمیر کے پاکستان کو منتقل کرنے کے خلاف ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کی رائے میں اگر ایسا ہوا تو پاکستان کو بطور ایک آزاد ملک استحکام نصیب ہو جائے گا۔ ہندوستان اب بھی پاکستان کی شکست وریخت کا خواہاں ہے۔''[19]

جون 1956ء کے آخری ہفتے میں سوویت یونین کا ایک تجارتی وفد کراچی آیا اور اس نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان 1957ء

میں تقریباً دو کروڑ روپے کی مالیت کی تجارت ہوگی۔ سوویت وفد کے قائد نے یہ بھی پیش کش کی کہ اس کا ملک پاکستان میں تیل کی تلاش اور اس کی صفائی میں مدد کرنے پر آمادہ ہوگا مگر حکومت پاکستان نے اس کی اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ اگست میں ایک پاکستانی پارلیمانی وفد کو محمد ایوب کھوڑو کی زیر قیادت سوویت یونین کا دورہ کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ یہ دورہ اگست 1956ء کے دوسرے ہفتے میں مکمل ہوا تو روزنامہ ڈان نے یہ رپورٹ شائع کی کہ بلگانن اور خروشچوف نے پاکستانی پارلیمانی وفد سے دو گھنٹے کی ملاقات کے دوران یقین دلایا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ گہرے تعلقات استوار کرنے کے خواہاں ہیں۔ کھوڑو کا تاثر یہ تھا کہ ''روسیوں نے ابھی تک مسئلہ کشمیر پر اپنا قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ خروشچوف نے اس سلسلے میں سری نگر میں جو کچھ کہا تھا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ سوویت یونین قطعی طور پر ہندوستان کا جانب دار بن گیا ہے۔''

باب: 14

# ہند۔چین سرحدی تنازعہ اور پاکستان کی غیر مشروط صلح جوئی

سوویت ارباب اقتدار نے کشمیر اور پاکستان کے بارے میں اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کا فی الحقیقت کوئی فیصلہ کیا تھا یا ان کی جانب سے وہ سفارتی حربے جن کا ذکر پچھلے باب کے آخر میں کیا گیا ہے محض پاکستان کو امریکی سامراج سے بددل کرنے کے لیے استعمال کئے جا رہے تھے اس کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا ممکن نہیں کیونکہ حکومت پاکستان نے اس سلسلے میں سوویت لیڈروں کے صدق و خلوص کی آزمائش کرنے کے لیے عملی طور پر کوئی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس بے عملی یا بے نیازی کی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ کشمیر اور پاکستان کے بارے میں سوویت لیڈروں کے بالکل غیر مبہم اعلانات کے بعد ان کی نیت کے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ علاوہ بریں سوویت لیڈروں کے یک طرفہ اعلانات کے بعد نئی دہلی نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام کے لیے بڑی تیزی سے ضروری کارروائیاں کرلی تھیں۔

وزیراعظم جواہر لال نہرو نے 29 / مارچ 1956ء کو لوک سبھا میں کہا تھا کہ ''ہندوستان تنازعہ کشمیر کے کسی ایسے تصفیہ پر رضامند نہیں ہوگا جو ریاست کے موجودہ انتظامات کو درہم برہم کر دے یا مہاجروں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع کر دے۔'' اس نے 2 / اپریل کو ایک پریس کانفرنس میں اپنے الفاظ کی حسب معمول گول مول طریقے سے وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا تھا کہ ''میں اب کشمیر میں استصواب رائے عامہ کے حق میں نہیں ہوں۔'' 4 / اپریل کو اس نے الٰہ آباد میں ایک پبلک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر کشمیر کے موجودہ انتظامات میں کوئی

تبدیلی پیدا کی گئی تو آج کل کے مسائل سے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے'' اور پھر 13/اپریل کو اس نے نئی دہلی کے ایک پبلک جلسے میں کہا تھا کہ ''میں نے تقریباً ایک سال قبل پاکستانی لیڈروں کو بتایا تھا کہ ہندوستان موجودہ جنگ بندی لائن کی بنیاد پر کشمیر کی تقسیم قبول کر کے ساری ریاست پر اپنے قانونی دعوے سے دستبردار ہو جائے گا۔ میں جب مسئلہ کشمیر کے بارے میں قابل عمل راہ'' کا ذکر کیا کرتا تھا تو میرا مطلب یہی ہوتا تھا۔''[1] وزیراعظم نہرو کے یہ اعلانات وزیر داخلہ پنڈت پنت کے جولائی 1955ء کے بیان کے عین مطابق تھے۔ ان اعلانات کی بنیاد یہ تھی کہ اس وقت تک بانہال کی سرنگ کی تعمیر تقریباً مکمل ہو گئی تھی اور اس طرح ہندوستان کا وادی کشمیر کے ساتھ بذریعہ سڑک سارے سال کا رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

پاکستان میں نہرو کے ان اعلانات کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ اب جبکہ سوویت یونین کی بھرپور تائید وحمایت کے بعد ہندوستان نے کشمیر پر ہر لحاظ سے اپنا قبضہ مستحکم کر لیا ہے تو اس تنازعے کے پرامن حل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ ہندوستان استصواب کے وعدے سے اعلانیہ منحرف ہو رہا ہے اس لیے پاکستان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کشمیر کو بزور قوت آزاد کرایا جائے۔ پبلک جلسوں اور اخبارات میں یہ مطالبے کئے جاتے تھے کہ (1) کشمیر کو بذریعہ جنگ آزاد کراؤ۔ (2) اقوام متحدہ سے علیحدگی اختیار کرو اور (3) بھارت سے سفارتی تعلقات منقطع کرو۔ تاہم باشعور سیاسی حلقوں کے لیے یہ حقیقت بڑی اہم اور قابل توجہ تھی کہ پاکستان کے عوام اپنے نعروں میں پاکستان کو مغربی سامراجیوں کے فوجی معاہدوں سے الگ کرنے کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی میاں افتخار الدین جیسے بائیں بازو کے سیاسی لیڈر اس قسم کا مطالبہ کرتے بھی تھے تو عوام الناس اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پاکستان کے سارے عوام سامراج کے پٹھو بن گئے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سوویت لیڈروں نے دسمبر 1955ء میں کشمیر اور پاکستان کے بارے میں یک طرفہ اعلانات کر کے سارے محب الوطن عوام کو ذہنی طور پر سامراجی کیمپ میں دھکیل دیا تھا۔ عوام الناس یہ باور کرنے لگے تھے کہ وہ کسی بڑی طاقت کی مدد کے بغیر نہ تو کشمیر کو آزاد کرا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے وطن عزیز کا دفاع کر سکتے ہیں۔ اگست 1947ء کے بعد کے بہت سے تلخ تجربوں نے انہیں یقین دلا دیا ہوا تھا کہ بھارت ان کا قومی دشمن ہے اور وہ پاکستان کے وجود کو کبھی بھی برداشت نہیں کرے

گا اور پھر دسمبر 1955ء کے بعد انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ سوویت یونین ان کے قومی دشمن کا حلیف ہے اور وہ پاکستان کے وجود کے جواز کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا انہیں وقتی طور پر پاکستان کے سامراجی فوجی معاہدوں میں شمولیت پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان میں اس وقت تک اتنا سیاسی شعور پیدا نہیں ہوا تھا کہ ملک کی آزادی وخود مختاری کا تحفظ محض کسی بیرونی طاقت کی امداد کے سہارے نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ پاکستان کو سامراجیوں سے جو فوجی امداد ملے گی اس سے نہ صرف کشمیر کو آزاد کرا لیا جائے گا بلکہ اس سے ملک کا دفاع بھی کیا جائے گا۔ بعض مجمع باز اور کوتاہ اندیش سیاسی عناصر نے تو انہیں یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی تھی کہ جب ہم فوجی طور پر طاقتور ہو جائیں گے تو اس بے انصافی کا بھی ازالہ کیا جائے گا جو 1947ء میں دونوں ملکوں کی سرحد بندی کے موقع پر کی گئی تھی۔ کچھ دقیانوسی مولوی ایسے بھی تھے جو دہلی کے لال قلعے پر ہلالی پرچم لہرانے کی باتیں کرتے تھے۔ یہ ذہنی طور پر قرون وسطیٰ میں رہتے تھے۔ انہیں یہ خوش فہمی تھی کہ محض جہاد کا نعرہ لگانے سے پورے برصغیر کو فتح کیا جا سکے گا۔ ان کے دماغوں میں شجاعت و بہادری کا تصور ہزار بارہ سو سال پرانا تھا۔ یہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ابھی تک گھوڑوں اور تلواروں کی باتیں کرتے تھے۔

پاکستانی عوام کی تنازعہ کشمیر کے پرامن حل سے مکمل مایوسی اور بھارت کے خلاف ان کے جذبات کی برانگیختگی کا ایک نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے بھی ہندوستان کے ساتھ جنگ کے خطرے کا ذکر شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپریل 1955ء کے اوائل میں اپنی دو ایک تقریروں میں متنبہ کیا کہ نہرو نے حال ہی میں کشمیر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے اس علاقے کے امن کو سنگین خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ دنیا کی ساری امن پسند اقوام کو اس صورت حال کا نوٹس لینا چاہیے۔ پاکستان کے صدر اسکندر مرزا کا بھی یہی خیال تھا کہ نہرو کی تقریروں سے ایشیاء کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے۔ کیونکہ وہ بین الاقوامی سطح پر کیے گئے وعدوں سے پھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چوہدری محمد علی نے نہرو کے اس دعوے کی تردید کی تھی کہ پاکستان نے دوطرفہ بات چیت کے دوران کشمیر کی تقسیم پر غور نہیں کیا اور نہ ہی آج کل اس پر کوئی غور کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چوہدری محمد علی کا یہ بیان سو فیصد صحیح نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ 1955ء میں نہرو۔ بوگرہ بات چیت کے دوران کشمیر کی کسی نہ کسی طرح تقسیم کی تجویز زیر بحث آئی تھی ان دنوں ساری دنیا کے

مشہور اخبارات میں اس مضمون کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ مگر حکومت پاکستان نے ان کی فوری طور پر غیر مبہم الفاظ میں تردید نہیں کی تھی بلکہ بوگرہ نے اپنی ''نئی راہ'' اور اپنے ''نئے خیالات'' کا ذکر جاری رکھا تھا۔ ہندوستانی اخبارات کا کہنا یہ تھا کہ بوگرہ کی ''نئی راہ'' سے مراد نہرو کی یہ تجویز تھی کہ کشمیر کو موجودہ جنگ بندی لائن کی بنیاد پر تقسیم کر لیا جائے اور وادی کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ استصواب کی بجائے منتخبہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعے کرایا جائے۔ وہ اس اسمبلی کا انتخاب بین الاقوامی نگرانی کی بجائے ہندوستان کی نگرانی میں کرانا چاہتا تھا۔

لندن ٹائمز کی 18 رمئی 1955ء کی اشاعت کی ایک رپورٹ میں استصواب کے بغیر کشمیر کی تقسیم کے امکان کا ذکر کیا گیا تھا اور بعض دوسرے غیر ملکی اخبارات کی بھی رپورٹیں یہ تھیں کہ ''نہرو۔ بوگرہ بات چیت میں ریاست جموں وکشمیر کی تقسیم کی تجویز زیر بحث آئی تھی۔ پاکستان کی تجویز یہ تھی کہ نہ صرف ریاست کے شمالی اور مغربی علاقے بدستور اس کے قبضے میں رہنے چاہئیں۔ بلکہ ریاستی اور پونچھ کے اضلاع کے بعض علاقے بھی اسے ملنے چاہئیں جو اس وقت ہندوستان کے قبضہ میں تھے۔'' بوگرہ جب ''نئی راہ'' کا ذکر کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ نہرو کی متذکرہ تجویز ماننے پر بالکل رضامند ہو گیا تھا بلکہ غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ریاست کی جزوی طور پر تقسیم پر آمادہ تھا بشرطیکہ وادی کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ آزادانہ انتخابات یا ریفرنڈم کے ذریعے کرایا جائے۔ چونکہ فریقین کے لیے ایک دوسرے کی یہ تجویزیں قابل قبول نہیں تھیں اس لیے نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق یہ بات چیت ناکام ہو گئی تھی۔ اگرچہ 18 رمئی 1955ء کے اعلامیہ میں دوطرفہ گفت وشنید جاری رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن وزیر اعظم بوگرہ بعد میں پاکستانی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت اور اپنے ''آقا اور مولا'' گورنر جنرل غلام محمد کی شدید علالت کے باعث اپنی اس ''نئی راہ'' سے منحرف ہو گیا تھا اور اس نے حکومت پاکستان کی ''پرانی راہ'' اختیار کر لی تھی کہ پوری ریاست کے مستقبل کا فیصلہ بذریعہ استصواب رائے عامہ ہونا چاہیے۔ چوہدری محمد علی مئی 1955ء کے ان تلخ حقائق سے اچھی طرح آگاہ تھا لیکن اس نے اپنے متذکرہ تردیدی بیان میں ان کا ذکر محض اس لیے نہیں کیا تھا کہ ان دنوں پاکستان کے عوام میں نہرو کے استصواب کے وعدے سے منحرف ہونے سے بہت اشتعال پھیلا ہوا تھا اور حکومت پاکستان یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ وہ استصواب کے مؤقف پر بدستور قائم ہے اور قائم رہے گی۔

چوہدری محمد علی نے 15 را پریل 1956ء کو سیٹو کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے کی غرض سے تہران جانے سے پہلے ایک بیان میں کہا کہ ''ہندوستان کے ساتھ براہ راست بات چیت صرف استصواب کرانے کی غرض سے ہوسکتی ہے۔ اگر نہرو استصواب کے لیے تیار نہیں ہے تو پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ پھر سلامتی کونسل کی طرف رخ کرے'' اور وزیر خارجہ حمید الحق چوہدری نے کہا کہ ''کشمیر کوئی جائیداد کا ٹکڑا نہیں کہ جسے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کیا جاسکے۔ ہندوستان کے ساتھ براہ راست بات چیت صرف اسی مسئلے پر ہوسکتی ہے کہ استصواب کس طریقے سے کرایا جائے۔''

اس قسم کے بیانات، تقریروں کا سلسلہ دو تین ماہ تک جاری رہا تا آنکہ ستمبر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ہندوستان کے ایک متعصب ہندو پبلشر نے مذہبی لیڈروں کے بارے میں ایک کتاب شائع کی جس میں پیغمبر اسلام (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا ذکر بہت توہین آمیز الفاظ میں کیا گیا تھا۔ اس پر پہلے تو ہندوستانی مسلمانوں نے زبردست احتجاجی تحریک شروع کی اور پاکستان کے مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا۔ 21 رستمبر کو کراچی میں مکمل ہڑتال ہوئی اور پھر بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جس میں ہندوستان کی توسیع پسندی اور اسلام دشمنی کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ تاہم ہندوستان کے ارباب اقتدار نے پاکستان میں گذشتہ چند ماہ کی اس قسم کی تقریروں، تحریروں اور نعروں کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور وہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام کی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ جب بانہال سرنگ کی تعمیر مکمل ہوگئی تو 17 رنومبر 1956ء کو کشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی نے اس فیصلے کا اعلان کردیا کہ ''آئندہ ریاست جموں وکشمیر آئینی طور پر ہندوستان کا جزو لاینفک ہوگی۔'' اس پر حکومت پاکستان نے 28 رنومبر کو اقوام متحدہ سے کہا کہ وہ ہندوستان سے اس فیصلے کی وضاحت طلب کرے۔ اس سے اگلے دن پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ ہندوستان کشمیر میں یک طرفہ کارروائی کرکے رائے عامہ کی خلاف ورزی کررہا ہے۔ پھر اس نے 7 ردسمبر کو ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ چونکہ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کے اس آئینی فیصلے کا اطلاق 26 رجنوری 1957ء کو جمہوریۂ ہند کے یوم آزادی کے موقعہ پر ہوتا ہے۔ اس لیے حکومت پاکستان تقریباً چار سال بعد

سلامتی کونسل سے مسئلہ کشمیر پر غور کرنے کی پھر درخواست کرے گی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ''پوری ریاست جموں وکشمیر میں ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کی جگہ اقوام متحدہ کی فوجوں کو متعین کیا جائے۔''

جب پاکستان کی یہ درخواست 2رجنوری 1957ء کو سلامتی کونسل کے روبرو پیش کر دی گئی تو ہندوستانی اخبارات نے اس کی ایک وجہ یہ بیان کی کہ ستمبر 1956ء میں چوہدری محمد علی کی جگہ حسین شہید سہروردی پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ یہ اس وقت سے اپنے سارے سابقہ بیانات کے برعکس ہندوستان کے ساتھ محاذ آرائی کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ چونکہ اس نے اس دوران سویز اور ہنگری کے بحرانوں کے بارے میں مغربی سامراجیوں کے مؤقف کی بھرپور تائید وحمایت کی تھی اس لیے اسے امید تھی کہ سلامتی کونسل میں سامراجیوں کا ٹولہ پاکستان کے حق میں کوئی فیصلہ کروا دے گا۔ اقوام متحدہ کی فضا پاکستان کے لیے اس لیے بھی سازگار تھی کہ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی سامراجی سویز اور ہنگری کے بحرانوں کے دوران نہرو کے بیانات اور اقدامات سے سخت خفا ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے سرکاری مؤرخ سیسر گپتا نے ہندوستانی اخبارات کے اس موقف کی تائید میں کراچی کے ایک مؤرخ خواجہ سرور حسن کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے جو پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ریلیشنز کے ماہنامے کی مارچ 1957ء کی اشاعت میں چھپی تھی۔ اس اقتباس کے مطابق ''جب 1956ء کے اواخر میں پاکستانی مندوب نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہنگری اور کشمیر کے واقعات کی مماثلت کا ذکر کیا تھا تو بہت سے مندوبین نے اس پر مبارک بادیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ان میں ایسے ممالک کے مندوبین بھی شامل تھے جو قبل ازیں پاکستان سے کوئی ہمدردی ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں پتہ چل گیا کہ مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں پھر پیش کرنے کے لیے موافق فضا پیدا ہو گئی ہے۔''[2] علاوہ بریں برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا اور دوسرے مغربی ممالک کے اخبارات کی نہرو پر شدید نکتہ چینی سے بھی یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ سلامتی کونسل کی فضا ہندوستان کے خلاف ہو گئی ہے۔ لندن کے اخبار سنڈے ایکسپریس کا پاکستان کی درخواست پر تبصرہ یہ تھا کہ ''نہرو نے اقوام متحدہ میں برطانیہ کی سویز پالیسی پر حملہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا تھا اس نے خود کو ہمارا کھلا اور خطرناک دشمن ثابت کیا تھا۔ لہٰذا اب برطانیہ کو کھل کر اس شخص کی منافقت کا پردہ چاک کرنا چاہیے۔ یہ ایک

طرف تو نو آبادیاتی نظام اور طاقت کے استعمال کی مذمت کرتا ہے۔لیکن دوسری طرف اس نے برملا جارحیت کے ذریعے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' سڈنی کے ڈیلی ٹیلی گراف کی رائے یہ تھی کہ ''نہرو بین الاقوامی سٹیج پر سب سے بڑا بہروپیا ہے'' اور سڈنی مارننگ ہیرلڈ کا خیال تھا کہ ''نہرو اپنے کمیونسٹ مہمانوں کی طرح اخلاق کے دوغلے معیار کا حامل ہے۔''

جب 16رجنوری 1957ء کو سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث شروع ہوئی تو پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے اس مسئلہ کے حل کے لیے محمد علی بوگرہ کی ''1955ء کی نئی راہ'' کی بجائے حکومت پاکستان کی 1948ء کی ''پرانی راہ'' اختیار کی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ کشمیر میں ساری بیرونی فوجوں کے انخلاء کے بعد اقوام متحدہ کے مقرر کردہ ناظم استصواب کی نگرانی میں کشمیری عوام کو حق خودارادیت دینا چاہیے۔ اس نے سلامتی کونسل کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ جنوری 1949ء کے بعد سے لے کر اب تک اس مسئلہ کے حل کے لیے گیارہ تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ پاکستان نے ان میں سے ہر تجویز کو مانا ہے لیکن ہندوستان نے سب کو مسترد کر دیا ہے اور اب ہندوستان پاکستان کو امریکہ کی فوجی امداد کی آڑ لے کر استصواب کے وعدے سے ہی پھر رہا ہے۔ فیروز خان نون نے اعلان کیا کہ جب تک تنازعہ کشمیر کا تصفیہ نہیں ہوگا اس وقت تک برصغیر میں امن قائم نہیں ہوگا۔لیکن اگر ہندوستان کشمیر میں استصواب کرانے پر رضا مند ہو جائے تو پاکستان نہ صرف جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دے گا بلکہ اس اعلان پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دے گا کہ اگر کسی جانب سے ہندوستان پر حملہ ہوا تو اسے پاکستان پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس نے اپنی تقریر کے آخر میں سلامتی کونسل سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان کو اس امر کی ہدایت کرے کہ کشمیر کی غیر نمائندہ دستور ساز اسمبلی نے ریاست کی حیثیت میں جس قسم کی تبدیلی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اسے منظور نہ کیا جائے، ریاست سے بیرونی فوجوں کو نکالا جائے اور ان کی جگہ ریاست کے تحفظ کا کام بلا تاخیر اقوام متحدہ کی فوج کے سپرد کیا جائے۔''

ہندوستان کے نمائندہ کرشنا مینن نے 23رجنوری کو بڑی لمبی جوابی تقریر کی جس میں وہ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کے بارے میں اپنے ملک کے پرانے مؤقف سے بالکل ہی منحرف ہو گیا۔ 1952ء میں ہندوستان کے نمائندہ سر بی۔ این۔ راؤ کا تحریری طور پر پیش کردہ مؤقف یہ تھا کہ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی جو بھی فیصلہ کرے گی اس کا تنازعہ کشمیر پر کوئی اثر نہیں ہوگا اور

ہندوستان کشمیر کے مستقبل کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر کئے گئے وعدوں کا پابند رہے گا۔لیکن اب جنوری 1957ء میں کرشنا مینن کی تند و تلخ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق پہلے دن سے ہی غیر مشروط، پختہ اور مستقل ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کوئی گنجائش نہیں۔اقوام متحدہ کے کمیشن کی قراردادوں کے مطابق ریاست جموں وکشمیر سے ہندوستانی افواج کا انخلاء صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ پہلے پاکستان کی ساری افواج آزاد کشمیر سے نکل جائیں۔ چونکہ پاکستان نے سارے عرصے میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا اس لیے اب ہندوستان پر اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ چونکہ اس عرصے میں حالات بہت بدل چکے ہیں اس لیے اب ہندوستان ان قراردادوں کا پابند نہیں ہے اور چونکہ ''کشمیر کی نمائندہ'' دستور ساز اسمبلی نے ریاست کو ہندوستان کا جزو لاینفک قرار دیدیا ہے اس لیے مسئلہ کشمیر حل ہوگیا اور اب کوئی تنازعہ باقی نہیں رہا جس پر سلامتی کونسل یا کسی اور ادارے کو کچھ کہنے یا کرنے کا حق حاصل ہو۔''

تاہم سلامتی کونسل نے 24رجنوری 1957ء کو آسٹریلیا، کولمبیا، برطانیہ اور امریکہ کی مشترکہ طور پر پیش کردہ ایک قرارداد منظور کی جس میں سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی ان ساری قراردادوں کی توثیق کی گئی کہ ریاست جموں وکشمیر کا فیصلہ بذریعہ استصواب رائے عامہ وہاں کے عوام کی منشاء کے مطابق ہوگا۔ ''کشمیر کی دستور ساز اسمبلی نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی فیصلہ کیا ہے اس کو موجودہ استصواب کے اصول کے مطابق تصور نہیں کیا جائے گا۔فریقین کو چاہیے کہ وہ ریاست کی موجودہ حیثیت میں کوئی ردوبدل نہ کریں۔'' سلامتی کونسل کے گیارہ ارکان میں سے دس نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیئے لیکن سوویت یونین کے نمائندے نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ وہ حسب سابق اس مسئلہ پر غیر جانبدار ہی رہا۔ حالانکہ اس نے اپنی تقریر میں مبہم طریقے سے کشمیر کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی کے فیصلے کو جائز قرار دیا تھا۔اس کا یہ غیر جانبدار رویہ بلگانن اور خروشچوف کے دسمبر 1955ء کے اس اعلان کے منافی تھا کہ کشمیر ہندوستان کا جزو لاینفک بن چکا ہے اور مکویان کے مارچ 1956ء کے اس بیان کے مطابق تھا کہ ''ہم مسئلہ کشمیر کا قطعی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔اس کا فیصلہ خود کشمیر کے عوام کو ہی کرنا چاہیے۔'' تاہم کرشنا مینن نے اس قرارداد کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ ''ہندوستان اس کی پابندی نہیں کرے گا۔کشمیر آئینی طور پر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے۔اب اس کی حیثیت

میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ سلامتی کونسل ہندوستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنے کی مجاز نہیں۔'' چنانچہ 26/جنوری کو نئی دہلی میں جمہوریہ ہند کے یوم آزادی کے موقعہ پر اعلان کر دیا گیا کہ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی نے 17/نومبر 1956ء کو ریاست جموں و کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ مکمل انضمام کے بارے میں جو آئینی فیصلہ کیا تھا اس کا آج سے اطلاق ہو گیا ہے۔

سلامتی کونسل کا اگلا اجلاس 30/جنوری 1957ء کو ہوا تو پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے مطالبہ کیا کہ ''مسئلہ کشمیر کے حل میں جو تعطل پیدا ہو گیا ہے اسے دور کرنے کے لیے کوئی مؤثر اقدام کیا جائے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ پوری ریاست سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کو نکال لیا جائے، جنگ بندی لائن کی دونوں طرف کے مقامی ملیشیا کو توڑ دیا جائے اور پھر اقوام متحدہ کی فوج متعین کر کے وہاں کے لوگوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں غیر جانبدارانہ استصواب کے ذریعے یہ بتائیں کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔''[3] ہندوستان کے نمائندہ کرشنا مینن نے 8/فروری کو اپنی تقریر میں فیروز خان نون کی اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اگر کشمیر میں موجودہ انتظامات کو درہم برہم کر کے فرقہ وارانہ اور مذہبی قوتوں کو مکمل کھیلنے کی اجازت دی گئی تو پورے برصغیر میں اس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ اس دلیل کا مطلب یہ تھا کہ اگر کشمیر کے استصواب میں مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ صادر کیا تو ہندوستان کی مسلم اقلیت پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ ہندوؤں کے مذہبی جذبات بھڑکیں گے اور وہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرینگے۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے کشمیری مسلمانوں کو بطور یرغمال ہندوستان کے زیر تسلط ہی رہنا چاہیے۔ بخشی غلام محمد کی کابینہ کے ایک ''کمیونسٹ'' نائب وزیر داخلہ ڈی۔ پی۔ دھر نے بھی لارڈ برڈ ووڈ سے ملاقات کے دوران کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں یہی دلیل دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ''اگر کشمیری مسلمانوں نے استصواب میں پاکستان کے حق میں رائے دی تو نہرو کی حکومت کا تخت الٹ جائے گا اور ہندوستان کی مسلم اقلیت کو بہت نقصان پہنچے گا۔''[4]

سلامتی کونسل کی اکثریت ہندوستان کے اس قسم کے دلائل سے متاثر نہ ہوئی کیونکہ بیشتر مغربی ممالک کی حکومتیں نہرو کی روس نواز پالیسی سے خفا تھیں۔ امریکہ، برطانیہ اور بعض

دوسرے ممالک کے نمائندوں کو پاکستان کے نمائندے کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حل میں پیدا شدہ تعطل کو دور کرنے کے لیے فوری طور پر کوئی کاروائی ہونی چاہیے۔ چنانچہ 14 رفروری کو برطانیہ، امریکہ، کیوبا اور آسٹریلیا نے مشترکہ طور پر ایک قرارداد پیش کی جس میں سلامتی کونسل کے صدر گنار یارنگ سے یہ درخواست کی گئی کہ ''وہ سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی قراردادوں کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی تجاویز کا جائزہ لے اور پھر یہ بتائے کہ اس تنازعہ کے تصفیہ کے لیے فوجوں کے انخلاء اور دوسری شرائط پوری کرنے کی غرض سے کیا کاروائی ہونی چاہیے۔ اسے ان تجاویز کا جائزہ لینے کے دوران ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کے بیانات اور اقوام متحدہ کی عارضی فوج کے استعمال کی تجویز کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔'' ہندوستان کے نمائندہ کرشنا مینن نے اس قرارداد کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ''ہم نے ہندوستان میں غیر ملکی فوجوں کے خلاف تین سو سال تک جدوجہد کی ہے۔ اب سلامتی کونسل ہمیں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی کہ ہم اپنی مقدس سرزمین پر غیر ملکی فوجوں کی موجودگی منظور کر لیں۔ اگر کسی ملک نے اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمارے علاقے میں اپنی فوجیں بھیجیں تو ان فوجوں کو اس چارٹر کا تحفظ حاصل نہیں ہوگا۔ ہندوستان سلامتی کونسل کی اس مجوزہ قرارداد کا پابند نہیں ہوگا اور وہ کشمیر سے اپنی فوجوں کے انخلاء کی کسی تجویز پر عمل نہیں کرے گا۔'' کرشنا مینن کی اس فرعونیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسے سوویت یونین کے نمائندے نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج متعین کرنے کی ہر تجویز کی مخالفت کرے گا۔ چنانچہ سوویت نمائندے نے اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کشمیر سے ہندوستانی فوجوں کے انخلاء اور وہاں اقوام متحدہ کی عارضی فوج متعین کرنے کی تجویز پر اعتراض کیا۔ اُس نے کہا کہ اگر کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج بھیجی گئی تو یہ کاروائی اقوام متحدہ کے چارٹر کے منافی ہوگی اور اس سے کشمیری عوام کے قومی جذبات کی کھلم کھلا توہین ہوگی۔ اس نے مزید کہا کہ اب کشمیر میں استصواب کرانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔[5] برطانیہ، امریکہ، عراق، فرانس اور دوسرے بعض ممالک نے اس قرارداد کے حق میں تقریریں کیں اور یہ رائے ظاہر کی کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج متعین کرنے کی تجویز ہمدردانہ غور کی مستحق ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے اس قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ سلامتی کونسل نے کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج

بھیجنے کی تجویز کو قابل غور سمجھا ہے۔

جب 18 ر فروری 1957ء کو قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو نو ممالک نے اس کے حق میں ووٹ دیے۔ سویڈن نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا اور سوویت یونین نے اپنا حق استرداد استعمال کر کے اسے نامنظور کر دیا۔ اس طرح سوویت یونین نے مسئلہ کشمیر پر پہلی مرتبہ اپنے ویٹو کا حق استعمال کر کے ہندوستان کے توسیع پسندوں کے دل جیت لیے اور پاکستانی عوام کے دلوں میں اپنے خلاف نفرت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اگر سوویت یونین اس قرارداد کے بارے میں بھی اپنے سابقہ غیر جانبدارانہ رویہ پر قائم رہتا تو اس کا ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا کہ اقوام متحدہ کی فوجیں واقعی کشمیر میں متعین ہو جاتیں۔ ان غیر ملکی فوجوں کی نگرانی میں آزادانہ استصواب ہوتا اور پھر کشمیر کی ریاست پاکستان میں شامل ہو جاتی۔ یہ قرارداد دراصل بے ضرر اور بے معنی الفاظ کا مجموعہ تھی۔ اس میں اقوام متحدہ کی فوج کو کشمیر بھیجنے کے فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا بلکہ صرف اتنا کہا گیا تھا کہ گنار یارنگ جب مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی قراردادوں کی روشنی میں ہندوستان اور پاکستان کی تجاویز پر غور کرے تو اقوام متحدہ کی فوج متعین کرنے کی تجویز کو بھی ملحوظ خاطر رکھے۔ اگر یارنگ اپنی رپورٹ میں ایسی فوج متعین کرنے کی تجویز پیش کرتا اور اس تجویز کی بنیاد پر سلامتی کونسل کوئی اور قرارداد منظور کرنے کی کوشش کرتی تو سوویت یونین اس وقت اسے ویٹو کر سکتا تھا اور اگر وہ نہ بھی ویٹو کرتا تو ہندوستان اس تجویز کو منظور کرنے سے ایسے ہی انکار کر سکتا تھا جیسے کہ اس نے اس قسم کی پہلی ساری تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ کشمیر کا بیشتر علاقہ ہندوستان کے فوجی قبضے میں تھا۔ فیروز خان نون کے بیان کے مطابق مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی فوج کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہاں کے ہر بارہ بالغ افراد کے لیے ایک فوجی سپاہی موجود تھا۔ ایسی حالت میں اقوام متحدہ کی مجوزہ فوج کو ہندوستان کے تعاون کے بغیر وہاں نہیں بھیجا جا سکتا تھا اور ہندوستان کی مرضی کے بغیر وہاں استصواب کرانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دراصل مغربی سامراجیوں نے نہرو کی ہنگری اور سویز کی پالیسی پر اظہار ناراضگی کرنے کے لیے چار سال کے بعد سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث کا ڈھونگ رچایا تھا اور ان کا یہ مقصد پورا بھی ہو گیا تھا کیونکہ نہرو نے مسئلہ کشمیر پر بحث کے فوراً ہی بعد ہنگری کے مسئلہ پر قلابازی کھا کر سوویت یونین پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی۔ اسے سویز کے بحران کے بارے میں قلابازی کھانے

کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوئی تھی کہ اس مسئلہ پر اس کی پالیسی اور صدر آئزن ہاور کی پالیسی میں کوئی خاص فرق نہیں تھا یا امریکی سامراج نے اس بحران میں اینگلو فرانسیسی سامراج کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ اس نے اس بحران کی آڑ لے کر یورپی سامراجیوں کو مشرق وسطیٰ سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ پاکستان کے سامراج نواز حکمران ٹولے کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ سلامتی کونسل کی کسی قرارداد سے کشمیر پاکستان کو نہیں مل جائے گا۔ میدان جنگ میں ہاری ہوئی بازی قراردادوں کے ذریعے جیتی نہیں جا سکتی۔ تاہم اس ٹولے کا خیال تھا کہ اس طرح ملک میں سیاسی عدم استحکام ختم ہو جائے گا۔ اس کا اقتدار مستحکم ہو جائے گا اور آئندہ پاکستانی عوام اس کی سامراج نواز پالیسی کی تائید وحمایت کرنے میں اس حقیقت کے باوجود تامل نہیں کریں گے کہ اس پالیسی سے مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک میں پاکستان کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

سلامتی کونسل نے 18رفروری 1957ء کی قرارداد کے استرداد کے بعد 21رفروری کو ایک اور نہایت ہی بے ضرر قرارداد منظور کی جس میں کونسل کے صدر یارنگ کو ہدایت کی گئی کہ وہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی قراردادوں کی روشنی میں ہندوستان اور پاکستان کی تجاویز کا جائزہ لے کر 15راپریل تک اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کونسل کے دس ارکان نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔ چونکہ اس قرارداد میں اقوام متحدہ کی فوج کا کوئی ذکر نہیں تھا اس لیے سوویت یونین نے غیر جانبدار رہنا ہی مناسب سمجھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے اس قرارداد کے حسن وقبح پر کوئی تبصرہ نہ کیا البتہ اتنا کہا کہ کشمیر کے عوام کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حق خود ارادیت ملنا چاہیے۔ ہندوستان کے نمائندہ کرشنا مینن نے کہا کہ ہم سلامتی کونسل کے صدر کا احترام کے ساتھ خیر مقدم کریں گے لیکن انہیں اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ ''کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے اور اب اس کی سرحدوں میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتا۔'' ہندوستانی اخبارات نے اپنی حکومت کے اس نئے مؤقف کی پرزور تائید کی۔ روزنامہ ''ہندوستان ٹائمز'' نے 23رفروری کو اپنے ایک اداریے میں لکھا کہ ''جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اب کشمیر میں استصواب کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہندوستان وہاں سے فوجوں کے انخلاء کی کسی تجویز پر بھی غور نہیں کر سکتا۔ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ انضمام قطعی ہے اور اس کے بارے میں کسی اعتراض یا شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اگر

یارنگ اس بنیاد پر بات چیت کرنے پر آمادہ نہیں تو اسے یہ بے معنی سفر کرنا ہی نہیں چاہیے۔'' تاہم پاکستان کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کا خیال تھا کہ ''یارنگ کے دورے سے ہندوستان کی ہٹ دھری مزید بے نقاب ہو جائے گی اور اس طرح ہمارے اخلاقی مؤقف کو تقویت پہنچے گی۔''

یارنگ 14 / مارچ 1957ء کو کراچی پہنچا اور پھر اس نے 11 / اپریل تک نئی دہلی اور کراچی میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں سے بات چیت کرنے کے بعد 29 / اپریل کو سلامتی کونسل کے روبرو اپنے مشن کی ناکامی کی رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کے مطابق یارنگ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک ثالث مقرر کرنا چاہیے جو ہندوستان کے اس اعتراض کا تصفیہ کرے گا کہ پاکستان نے اپنے مقبوضہ علاقے کی فوجی صورت حال میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے برخلاف کوئی تبدیلی کی ہے یا نہیں اور یہ بھی بتائے گا کہ گفت و شنید جاری رکھنے کے لیے موافق فضا موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر فوجوں کے انخلاء کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل نہیں ہوا گا تو یہ ثالث مزید بتائے گا کہ ان پر کیسے عمل کیا جائے۔ پاکستان نے حسب معمول اس تجویز کو منظور کر لیا لیکن ہندوستان نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ''ثالثی کی تجویز پر عمل کرنے سے کشمیر کی خود مختاری کی خلاف ورزی ہو گی اور یہ عمل اس کے علاقے کے بارے میں ہندوستان کے حقوق اور اس کی ذمہ داریوں کے منافی ہو گا اور یہ بھی تاثر پیدا ہونے کا امکان ہو گا کہ اس مسئلہ سے پاکستان کا کوئی تعلق قائم ہے۔'' یارنگ کی اس رپورٹ کے بعد قدرتی طور پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہندوستان کے ارباب اقتدار اور اخبارات نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ تاثر دیا کہ اب کشمیر کا مسئلہ بالکل ختم ہو چکا ہے کیونکہ یارنگ نے اپنی رپورٹ میں یہ تسلیم کیا تھا کہ اقوام متحدہ کی 49-1948ء کی قراردادوں کے بعد حالات میں بہت تبدیلی آ چکی ہے۔

پاکستان کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی نے اپنی سامراج نواز پالیسی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے جولائی 1957ء میں برطانیہ اور امریکہ کے دورے کے دوران ہندوستان کے غیر مصالحانہ رویے پر نکتہ چینی کی اور اس کے ساتھ ہی اپنے سامراجی آقاؤں کو یقین دلایا کہ پاکستان کمیونزم کے عالمی خطرے کے سدباب کے لیے بدستور ان کے نقش قدم پر چلتا رہے گا۔ اس نے اس دورے میں چین کے

خلاف بھی ہرزہ سرائی کی حالانکہ چند ماہ قبل پیکنگ میں اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا تھا اور حکومت چین نے پاکستان کی سیٹو میں شمولیت کے باوجود مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے مؤقف کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہی تھی اور نہ ہی کوئی اقدام کیا تھا۔ اپریل 1955ء میں بنڈونگ کانفرنس سے پہلے جب ہندوستان میں ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کے نعرے لگے تھے تو حکومت چین نے ان دنوں بھی مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کے موقف کی تائید میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا اور نہ ہی بعد میں وزیراعظم چواین لائی نے کشمیر کے متنازعہ علاقے کا دورہ کر کے سوویت لیڈروں کی طرح کشمیر اور پاکستان کے خلاف یک طرفہ فیصلہ صادر کیا تھا۔ لیکن سامراجی پٹھو حسین شہید سہروردی کے نزدیک چین کے اس مسلسل دوستانہ رویے کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اسے بھی کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کی طرح سوویت یونین کے علاوہ چین سے بھی زبردست خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

24 ستمبر 1957ء کو سلامتی کونسل میں یارنگ کی رپورٹ پر بحث شروع ہوئی تو پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر میں آزادانہ استصواب کرانے کے لیے اقوام متحدہ کی فوج متعین کی جائے۔ اس نے کہا کہ ''اگر ہندوستان اپنے مقبوضہ علاقے میں فوج کا وجود برداشت نہیں کر سکتا تو مجوزہ بین الاقوامی فوج پاکستان کے مقبوضہ آزاد کشمیر میں متعین کر دی جائے تاکہ ہندوستان پاکستانی حملے کے خطرے کی آڑ لے کر اپنی فوجوں کے انخلاء سے انکار نہ کر سکے۔''[6] ہندوستان کے نمائندہ کرشنا مینن نے اپنی تقریر میں اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ ہندوستان کے لیے ثالثی کی تجویز بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ملک کی سالمیت کے سوال کو کسی ثالث کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کہا کہ ہندوستان کی کوئی حکومت کشمیر کے علاقے پر ایک سے زیادہ ممالک کے مشترکہ اقتدار کی تجویز بھی منظور نہیں کر سکتی کیونکہ اس طرح ہندوستان کے مزید حصے بخرے ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ کشمیر ہندوستان کا جزو لاینفک ہے اس لیے اس علاقے کے عوام پر حق خود ارادیت کے اصول کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی تنازعہ نہیں ہے کیونکہ یہ ریاست قانونی اور مستقل طور پر ہندوستان میں ضم ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر یارنگ نے بھی اس موقع پر مختصر سی تقریر کی جس میں اس نے اپنے ملک سویڈن کی حکومت کی اس رائے کا اعادہ کیا کہ تنازعہ کشمیر کے بعض قانونی پہلوؤں کو برائے فیصلہ بین الاقوامی عدالت کے سپرد کر دینا چاہیے۔ سوویت نمائندہ نے اپنی تقریر میں

یارنگ رپورٹ کے اس حصے کی تعریف کی جس میں کہا گیا تھا کہ دونوں حکومتیں ابھی تک اس تنازعہ کا پرامن حل تلاش کرنے پر آمادہ ہیں۔ تاہم اس نے کہا کہ ''کشمیر میں بین الاقوامی فوج بھیجنے یا اس مسئلہ کو مختلف ثالثوں اور مصالحت کنندوں کے سپرد کرنے کی ہر تجویز کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندوستان پر دباؤ ڈالا جائے۔'' 18 رنومبر تک سب نمائندوں کی تقریر بازی کا تماشا ختم ہو گیا تو برطانیہ اور چار دوسرے ممالک نے ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس میں اس امر پر تشویش کا ظہار کیا گیا تھا کہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 راگست 1948ء اور 5 رجنوری 1949ء کی قراردادوں پر عمل کرانے کے لیے ریاست سے بیرونی فوجوں کا جلد از جلد انخلا ہونا چاہیے۔ قرارداد کے دوسرے حصے میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر فرینک گراہم کو اس سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تصفیہ کرانے کی از سر نو کوشش شروع کر دینی چاہیے اور اپنی نئی کوشش کے نتیجے کے بارے میں جلد از جلد رپورٹ پیش کرنی چاہیے۔

پاکستان نے حسب معمول اس قرارداد کو منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی مگر ہندوستان نے حسب معمول اسے مسترد کر دیا۔ کرشنا مینن نے اس کی ایک وجہ یہ بتائی کہ مجوزہ قرارداد میں کشمیر کے تنازعہ کا ذکر ہے حالانکہ ہندوستان کا مؤقف یہ ہے کہ کشمیر کے بارے میں کسی ''تنازعے'' کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس پر سوویت نمائندے نے جب 21 رنومبر کو یہ دھمکی دی کہ وہ اس قرارداد کو ویٹو کر دے گا تو 2 ردسمبر کو ایک ترمیم شدہ قرارداد منظور کی گئی جس میں صرف اتنا کہا گیا کہ ڈاکٹر گراہم کو اس مسئلہ کا تصفیہ کرانے کی ایک اور کوشش کرنی چاہیے۔ پاکستان میں اس قرارداد پر بہت مایوسی ظاہر کی گئی۔ روزنامہ ''ڈان'' نے 6 ردسمبر کو اپنے ایک اداریے میں کہا کہ ''ہمارے ملک کے عوام جن کو اب تک یہ امید دلائی جاتی رہی ہے کہ کشمیر کے مسئلہ پر کمیونسٹوں کے سوا ساری دنیا پاکستان کی حمایت کرتی ہے اور اقوام متحدہ میں مغربی طاقتیں پاکستان کا پوری طرح ساتھ دیں گی، یہ جاننا چاہیے کہ انہیں اس موقعہ پر مغربی طاقتوں نے کیوں دھوکا دیا ہے...... روسی ارباب اقتدار اپنے طفیلیوں اور غیر وابستہ اتحادیوں کی بہر صورت اور آخر وقت تک حمایت کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے خواہ مؤخر الذکر ملکوں کا نصب العین بالکل غیر منصفانہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے برعکس مغربی طاقتیں اپنے دوستوں اور اتحادیوں کے منصفانہ نصب العین کی بھی نہایت بزدلی سے حمایت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لہٰذا پاکستان کے بیشتر عوام یہ سوچنے پر

مجبور ہو گئے ہیں کہ پاکستان کو مغربی طاقتوں کا دم چھلا بنے رہنے میں کوئی فائدہ نہیں۔''

روزنامہ ''ڈان'' کے اس اداریے کی حیثیت دراصل ایک کھوکھلی دھمکی سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ ان دنوں پاکستان کا کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان ملک میں فوجی آمریت قائم کر کے اسے امریکی سامراج کی گود میں مزید دھکیلنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ علاوہ بریں مغربی طاقتوں کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی تنازعے کی چنگاری فلک شگاف شعلوں کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ وہ ایسے موقعہ پر ایک طفیلی ملک پاکستان کی خاطر ہندوستان کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھیں بلکہ ان کی خواہش یہ تھی کہ کشمیر کے تنازعے کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان کو چین کے خلاف نہ صرف پاکستان کی بلکہ ساری مغربی دنیا کی تائید وحمایت کا یقین دلایا جائے۔ ان دنوں اس حقیقت کے آثار بھی روز بروز نمایاں ہو رہے تھے کہ سوویت یونین اپنی ہمہ جہت پرامن بقائے باہمی کی پالیسی کے تحت مغربی طاقتوں کے ساتھ مل کر چین کے خلاف ہندوستان کی حمایت کرے گا۔ مغربی طاقتیں اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ ان کے عالمی مفاد کا تقاضہ یہ تھا کہ ہندوستان اور چین کے درمیان متوقع محاذ آرائی میں کشمیر اور پاکستان کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ وہ اب تک کشمیر اور پاکستان کو محض ہندوستان کی پالیسی کو اپنے حق میں متاثر کرنے کے لیے استعمال کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے تنازعہ کشمیر کو پاکستان کے حق میں حل کرانے کے لیے کبھی بھی بھرپور کوشش نہیں کی تھی۔

ڈاکٹر فرینک گراہم 12 رجنوری 1948ء کو کراچی پہنچا اور پھر اس نے 15 رفروری تک نئی دہلی اور کراچی میں سرکاری نمائندوں سے بات چیت کرنے کے بعد 18 رمارچ کو سلامتی کونسل کے روبرو اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر گراہم نے یہ تجویز پیش کی کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان گفت وشنید کا سلسلہ پھر شروع ہونا چاہیے۔ اس نے اس مجوزہ گفت وشنید کے لیے جو پانچ نکات مرتب کئے تھے ان میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ اقوام متحدہ کی فوج کو پاکستان کے مقبوضہ آزاد کشمیر میں متعین کرنے کے امکان پر غور کیا جائے تاکہ اس علاقے کے دفاع کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کی سابقہ ساری تجویزوں کی طرح ڈاکٹر گراہم کی یہ تجویز بھی مان لی لیکن ہندوستان نے حسب معمول اسے بھی مسترد کر دیا کیونکہ متذکرہ پانچ نکات میں استصواب کا بھی ذکر موجود تھا اور

یہ ایسی بات تھی جس پر ہندوستان اب ایک منٹ کے لیے بھی غور کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ چونکہ اس کے نقطۂ نگاہ سے کشمیر آئینی طور پر ہندوستان کا ایک جز و بن چکا تھا۔ اس لیے اب اس علاقے کے عوام کو حق خودارادیت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ علاوہ بریں ہندوستان کو پاکستان کے مقبوضہ آزاد کشمیر کے علاقے میں بھی غیر ملکی فوجوں کی موجودگی پر اعتراض تھا۔ ڈاکٹر گراہم کی اس چھٹی ناکامی پر پاکستان میں پھر بہت واویلا ہوا۔ اس وقت تک فیروز خان نون ملک کی وزارت عظمیٰ کی گدی پر براجمان ہو چکا تھا۔ وزیراعظم نون نے 8/ مارچ کو قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈروں کے جنگی نعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ ''اگر برطانیہ اور امریکہ نے تنازعہ کشمیر میں پاکستان کی مثبت طریقے سے حمایت نہ کی تو ہم مغربی کیمپ سے الگ ہو جائیں گے اور ان لوگوں سے مصافحہ کرلیں گے جو مغربی معاہدوں کی وجہ سے ہمارے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اگر امریکہ اور برطانیہ نے اس مسئلہ کو حل نہ کروایا تو کشمیر کے عوام کے پاس کمیونسٹ کیمپ میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔'' اس نے انکشاف کیا کہ ''ہم نے اپنا ایک وفد چین کے وزیراعظم کے پاس بھیجا ہے اور ہم روس کو بھی یہ ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ کشمیر کے معاملے میں اپنا رویہ تبدیل کرے۔''

فیروز خان نون پنجاب کا ایک نہایت رجعت پسند اور احمق جاگیردار تھا۔ وہ سامراج کا پشتینی پٹھو تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس قسم کی کھوکھلی دھمکیوں سے مغربی طاقتوں کو اپنی عالمی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دے گا، اسے نہیں معلوم تھا کہ امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے نزدیک ہندوستان اور چین کے درمیان متوقع محاذ آرائی کس قدر اہمیت کی حامل تھی اور وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ لداخ کے علاقے میں چین کی سڑک کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد وہاں فریقین کی فوجوں کی تھوڑی بہت نقل وحرکت شروع ہو چکی تھی۔ جواہر لال نہرو نے اس تشویشناک صورت حال کے پیش نظر یکم جنوری 1958ء کو اپنے ''ذاتی دوست'' شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ شیخ عبداللہ کشمیری قوم پرست ہے اس لیے لداخ کے علاقے میں چین کی ''دست درازی'' کے خلاف ہندوستان کی حمایت کرے گا مگر اس نے جیل سے باہر نکلتے ہی کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کی جانب سے ہندوستان سے الحاق کی مذمت کی۔ اس نے اپنی تقریروں میں مزید کہا کہ (1) 1947ء میں کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ جو الحاق ہوا تھا وہ عارضی تھا۔ (2) اس مسئلہ کا

قطعی فیصلہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے ہونا چاہیے اور (3) پاکستان نے 1947ء میں کشمیر پر محض اس لیے حملہ کیا تھا کہ جموں میں مسلمانوں پر مظالم کئے جا رہے تھے۔[7] نہرو کو اپنے ''ذاتی دوست'' کی اس قسم کی تقریروں سے بہت مایوسی ہوئی اور غصہ آیا۔ چنانچہ 19/اپریل 1958ء کو شیخ عبداللہ کو گرفتار کر کے پھر جیل میں ڈال دیا گیا۔ لندن کے ہفت روزہ ''اکونومسٹ'' نے 28/مارچ 1958ء کو پاکستان کے وزیراعظم کی بڑھک کا یہ جواب دیا کہ ''اگر پاکستانی برطانوی دولت مشترکہ کی رکنیت سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو بخوشی ایسا کر سکتے ہیں۔'' برطانیہ کے وزیراعظم ہیرلڈ میکمیلن نے بھی فیروز خان نون کی اس یاوہ گوئی کا سخت نوٹس لیا تھا اس نے 2/اپریل کو اپنے ایک پیغام میں پاکستانی وزیراعظم کو سرزنش کر کے ہدایت کی تھی کہ ''ڈاکٹر گراہم کی رپورٹ پر اتنے سخت بیانات مت دو اور اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی باتیں بھی نہ کرو۔'' اس پر فیروز خان نون نے 20/اپریل کو اپنے جواب میں لکھا تھا کہ ''ذاتی طور پر میں نے ڈاکٹر گراہم کی رپورٹ پر تبصرہ نہیں کیا۔ ہم ہر اس بات سے احتراز کرتے رہے ہیں جو پرامن فضا کو خراب کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔'' برطانوی وزیراعظم میکملین نے 19/مئی کو پاکستانی وزیراعظم نون کے نام ایک اور پیغام بھیجا جس میں نون کی اس بنا پر تعریف کی گئی تھی کہ اس نے گراہم رپورٹ پر بحث و تمحیص کی شدت کم کر دی ہے۔ میکملین کا خیال تھا کہ اگر اس مرحلہ پر ریاست سے فوجوں کے انخلاء اور استصواب کے جلد انعقاد کے لیے سلامتی کونسل سے کوئی درخواست کی گئی تو حالات مزید خراب ہو جائیں گے۔ اس کی بجائے دونوں وزرائے اعظم کے درمیان براہ راست مذکرات کے لیے کوئی ایسی بنیاد تلاش کرنی چاہیے جو دونوں کے لیے قابل قبول ہو اور جس کا دائرہ مسئلہ کشمیر تک محدود نہ ہو۔ باہمی مذاکرات کے درمیان کوشش کرنا چاہیے کہ دونوں ملکوں کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں اور مشکلات کی بنیادی وجہ دور ہو جائے۔ چونکہ فیروز خان نون کو امریکہ کے صدر آئزن ہاور کی طرف سے بھی اس قسم کا پیغام موصول ہو چکا تھا اس لیے میکمیلن کا مشورہ یہ تھا کہ گذشتہ دس سال کے ناگوار اور بے نتیجہ اختلافی مباحثوں کی بجائے ہندوستان اور پاکستان کو خوش گوار مستقبل کی طرف گامزن ہونا چاہیے تاکہ دونوں ملک اپنے عوام کی خوشحالی اور اطمینان کے لیے مل جل کر کام کر سکیں۔'' برطانوی وزیراعظم کا یہ مشورہ جواہر لال نہرو کے اس مؤقف کے عین مطابق تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کی بنیاد تنازعہ کشمیر پر نہیں تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ برصغیر کو

مذہبی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں ممالک کو اپنے سارے اختلافات نظر انداز کر کے چین کے خلاف متحد ہونا چاہیے۔ فیروز خان نون کا جواب یہ تھا کہ ''نہرو کہتا ہے کہ اسے چین کے خلاف ہتھیار چاہئیں۔ میں اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر چین نے کبھی ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے دوش بدوش برصغیر کے دشمن کے خلاف لڑیں گے۔''[8]

امریکہ اور برطانیہ کے سامراجی آقاؤں کی جانب سے پاکستان کے غیر ذمہ دار وزیراعظم کی سرزنش مؤثر ثابت ہوئی۔ فیروز خان نون تھوڑے ہی دنوں بعد اعلانیہ قلابازی کھا کر ہندوستان کے ساتھ غیر مشروط دوستی کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے 5 رجولائی 1958ء کو لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ''پاکستان کسی مسئلہ پر اور کسی بھی حالت میں ہندوستان سے جنگ نہیں کرے گا۔'' اس نے مزید کہا کہ ''میں تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے جنگ کے سوا تمام پر امن ذرائع اختیار کروں گا۔'' نون کے اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ اس نے پاکستان کے سارے سابقہ حکمرانوں کی پالیسی کے برعکس جواہر لال نہرو کے جنگ نہ کرنے کے غیر مشروط اعلان کی پرانی پیش کش کو از خود ہی قبول کر کے کشمیر کے بیشتر علاقے پر ہندوستان کے قبضہ کو اعلانیہ تسلیم کر لیا تھا۔ بالفاظ دیگر اس نے نہرو کی 1948ء کی تجویز منظور کر لی تھی کہ کشمیر کو موجودہ جنگ بندی لائن کی بنیاد پر تقسیم کر لیا جائے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کسی مسئلہ پر اور کسی بھی حالت میں بھارت سے جنگ نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں تو آپ بھارت کے وزیراعظم نہرو کی طرف سے چند سال قبل پیش کردہ تجویز کے مطابق بھارت کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ ''میری پیش رو حکومت نے اس وقت یہ تجویز منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اب بھی اس پالیسی کی پابندی کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ اگر ہم کسی حالت میں بھی بھارت سے جنگ نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں لازمی طور پر بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لینا چاہیے۔

سوال:۔ لیکن اب آپ غیر مشروط طور پر کسی مسئلے کے متعلق اور کسی بھی حالت میں ہندوستان سے جنگ نہ کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ کیا آپ کا بحیثیت وزیراعظم یہ اعلان، جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی حیثیت نہیں رکھتا؟

جواب: مجھے معلوم نہیں کہ میرا یہ اعلان کیا حیثیت رکھتا ہے لیکن میں اس اعلان پر ہمیشہ قائم

رہوں گا کہ ہم کسی حالت میں بھی ہندوستان سے جنگ نہیں کریں گے اور تمام متنازعہ مسائل کو پرامن طریقے سے حل کریں گے۔

سوال:۔ جنگ نہ کرنے کے تحریری معاہدے اور جنگ نہ کرنے کے زبانی معاہدے میں کیا فرق ہے؟

جواب: مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میرا اعلان بالکل واضح ہے کہ ہم کسی مسئلے پر کسی صورت میں بھی بھارت سے جنگ نہیں کریں گے۔ البتہ اگر بھارت نے ہم پر حملہ کیا تو ہم ہر ممکن طریقے سے اپنی حفاظت کریں گے۔"[9]

وزیراعظم نون کی جانب سے ہندوستان کے توسیع پسندوں کے سامنے غیر مشروط طور پر اعلانیہ گھٹنے ٹیکنے کا داخلی پس منظر یہ تھا کہ اقوام متحدہ کے مصالحت کنندہ ڈاکٹر گراہم کی آخری ناکامی کے بعد جب ہندوستان نے مئی میں ستلج ویلی پراجیکٹ کی نہروں میں پانی کی سپلائی روک دی تھی تو حزب اختلاف کے چوہدری محمد علی، حسین شہید سہروردی، خان عبدالقیوم خان اور بعض دوسرے لیڈروں نے ہندوستان کے خلاف جنگ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے اور اس بنا پر پاکستان کی سیاسی فضا بہت دھماکہ خیز ہوگئی تھی۔ ان دنوں عام خیال یہ تھا کہ نئے آئین کے تحت عام انتخابات 1958ء کے اواخر میں ہونگے اور یہ زعماء پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ قومی تضاد سے فائدہ اٹھا کر متوقع انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ ان کی اس قسم کی انتخابی مہم امریکی سامراج کے عالمی مفاد کے لیے خطرناک نتائج پیدا کرسکتی تھی۔ ان دنوں لداخ میں ہندوستان اور چین کے سرحدی فوجی دستوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جھڑپ ہو چکی تھی جس میں ہندوستانی فوجی یونٹ کو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر اینگلو امریکی سامراج اور دوسرے مغربی سامراجیوں کی پالیسی یہ تھی کہ کشمیر اور پاکستان کے مفادات کو نظر انداز کرکے چین کے خلاف ہندوستان کی بھرپور حمایت کرنی چاہیے اور اس مقصد کے لیے سی۔ آئی۔ اے نے پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان کی زیر قیادت فوجی آمریت قائم کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا تھا۔ ایوب خان اپنے سامراجی آقاؤں کی ہدایت کے مطابق ہندوستان کے ساتھ کسی بھی مسئلہ پر اور کسی صورت میں بھی جنگ کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی یکم جون 1958ء کی ڈائری کے مطابق کشمیر کے بارے میں اعلیٰ سطح کی کانفرنس میں اس سے

پوچھا گیا تھا کہ ''کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی طرف سے نہروں کا پانی بند کر دینے کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جذباتی طور پر تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہم ابھی جا کر ہندوستان پر دھاوا بول دیں۔ لیکن دانائی کا تقاضا کچھ اور ہے جس کی میں نے ان لوگوں سے وضاحت کی [10]۔'' بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ ایوب خان کی ''دانائی کا تقاضا'' دراصل یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کو ''شمال سے خطرے'' کے سدباب کے لیے ''مشترکہ دفاعی نظام'' قائم کرنا چاہیے۔'' اسے ہندوستان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کے نزدیک تنازعہ کشمیر کی کوئی اہمیت باقی رہی تھی۔ چنانچہ جب اکتوبر 1958ء میں اس نے اقتدار پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے جواہر نہرو کو ''شمال سے خطرے'' سے آگاہ کیا اور پھر اس ''خطرے'' کے سدباب کے لیے ''مشترکہ دفاع'' کی غیر مشروط پیش کش کی۔''

باب: 15

# سامراج کی پالیسی میں اتار چڑھاؤ کی وجوہ

تنازعہ کشمیر کی اس المناک داستان پر ذرا توجہ سے نظر ڈالی جائے تو یہ حقائق صاف دکھائی دیتے ہیں کہ:

(1) 1947ء میں برطانوی سامراج کے وزیراعظم ایٹلی کی زیر قیادت برسراقتدار ٹولے نے ایک طے شدہ منصوبے کے بعد ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان کے بورژوا ارباب اقتدار کے حوالے کیا تھا حالانکہ برصغیر کی تقسیم جس اصول کی بنیاد پر ہوئی تھی اس کے مطابق یہ علاقہ پاکستان میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔

(2) فروری 1948ء میں برطانیہ کے وزیرامور دولت مشترکہ نوئیل بیکر نے وزیرخارجہ بیون کی ہدایت کے مطابق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں یہ کوشش کی تھی کہ یہ متنازعہ علاقہ اقوام متحدہ کی امداد سے پاکستان کو مل جائے مگر ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن، برطانیہ کے وزیرخزانہ سر سٹیفورڈ کرپس اور وزیراعظم ایٹلی کی مخالفت کے باعث اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور پھر سلامتی کونسل میں ایک ایسی قرارداد منظور کی گئی جس کا عملاً مقصد یہ تھا کہ یہ علاقہ ہندوستان کے پاس ہی رہے۔

(3) 1949-50ء میں برطانوی سامراج نے نیم دلانہ کوششیں کیں کہ تنازعہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوئی پرامن تصفیہ ہو جائے اور اگر وادی کشمیر کا علاقہ پاکستان کو مل جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔

(4) 1951-52ء میں اینگلو امریکی سامراج نے کھلم کھلا کوشش کی کہ اقوام متحدہ کی امداد سے وادی کشمیر پاکستان کو مل جائے۔

(5) 1951-53ء میں اینگلوامریکی سامراج نے یہ کوشش کی کہ تنازعہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر مزید زیر بحث لا کر ہندوستان کے حکمران قومی بورژوا طبقے کی خفگی میں اضافہ نہ کیا جائے بلکہ دوطرفہ بات چیت کے ذریعے کسی نہ کسی طرح کی تقسیم کی بنیاد پر تنازعہ کشمیر کا پرامن تصفیہ کرادیا جائے۔

(6) 1957-58ء میں اینگلوامریکی سامراج کی پالیسی یہ تھی کہ کشمیر کا جو علاقہ ہندوستان کے قبضہ میں ہے وہ اس کے پاس رہنے دیا جائے اور تنازعہ کشمیر کو بالائے طاق رکھ کر چین کے خلاف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاعی نظام قائم کیا جائے۔

برصغیر کی تاریخ کا کوئی سنجیدہ طالب علم ان حقائق کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے ثبوت میں بے شمار دستاویزی اور واقعاتی شہادتیں موجود ہیں۔ تاہم بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کشمیر کے بارے میں اینگلوامریکی سامراج کی پالیسی میں یہ اتار چڑھاؤ کیوں آتے رہے ہیں؟ ان کا پہلا سوال یہ ہے کہ برطانوی سامراج نے 1947ء میں کشمیر کا جنگی اہمیت کا علاقہ ہندوستان کو کیوں دیا تھا جبکہ اسے پاکستان کے حکمران جاگیردار طبقے کی وفاداری پر کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے تھا؟ اس کا ناقابل تردید جواب جو اس سلسلۂ تاریخ کی پہلی دو جلدوں میں تفصیل کے ساتھ دیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ ہندوستان کے بورژوا طبقے کی طرح برطانوی سامراج نے بھی برصغیر کی تقسیم کو بہ امر مجبوری منظور کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ تقسیم عارضی ہوگی اور پاکستان زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس کے عالمی مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ کشمیر کا جنگی اہمیت کا علاقہ ایسے ملک کو نہ دیا جائے جس کا اپنا مستقبل غیر یقینی ہے اور جو بظاہر خود اپنے دفاع کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ امریکی مؤرخ پروفیسر نارمن براؤن کے بیان کے مطابق برطانوی سامراج کی اس پالیسی کی بنیاد اس تصور میں پنہاں تھی کہ ''شمال مغربی علاقہ ہندوستان سے الگ ہوا تو یہ دفاعی لحاظ سے غیر محفوظ ہوگا۔ ماضی میں شمال کی طرف سے جتنے حملے ہوئے تھے یہ علاقہ ان کی کامیابی سے مزاحمت نہیں کرسکا تھا۔ اس علاقے کے وسائل زیادہ نہیں ہیں اور یہ جن مختلف علاقوں (پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان) پر مشتمل ہے ان میں کوئی یکجہتی نہیں ہے۔ اس کے دفاع کے لیے پورے ہندوستان کی بھرپور امداد وحمایت کی ضرورت رہی ہے۔ برطانیہ نے برصغیر میں اپنے

سامراجی اقتدار کے ابتدائی دور میں ہی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا اور اس نے اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر انیسویں صدی میں ہندوستان کے لیے اپنی فوجی پالیسی وضع کی تھی۔ اس نے شمالی سرحد کے دفاع کے خیال سے ہی سندھ پر 44-1842ء میں قبضہ کیا تھا اور پھر اس نے اس مقصد کے تحت 49-1845ء میں سکھوں کی سلطنت کو تباہ کر کے پنجاب کا الحاق کیا تھا۔ انہوں نے پہلے 42-1838ء میں اور پھر 80-1878ء میں افغانستان سے جو دو جنگیں لڑی تھیں۔ ان کے پس پردہ بھی یہی مقصد کارفرما تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے دفاع کے لیے ضروری ہے کہ پورا برصغیر متحد و متفق رہے۔"[1]

1846ء میں وادی کشمیر کا علاقہ سکھوں کے ایک ہندو صوبیدار راجہ گلاب سنگھ کے پاس فروخت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برطانوی سامراج ان دنوں خود روس اور چین سے متعلقہ اس دفاعی اہمیت کے علاقے پر کنٹرول رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سکھوں کو پوری طرح شکست نہ ہونے کے باعث پنجاب کی حالت ابتر تھی اور شمال مغربی سرحدی صوبے و افغانستان کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ چونکہ راجہ گلاب سنگھ بہت جابر حکمران تھا اس لیے خیال تھا کہ وہ اس علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کر کے اسے روس اور ہندوستان کے درمیان ایک بفر سٹیٹ کی حیثیت دے دیگا۔ برطانوی مؤرخ پروفیسر السٹیئر لیمب لکھتا ہے کہ "برطانیہ کو شمال کی جانب سے روسی توسیع پسندی کے خلاف گلگت کے علاقے کو بفر علاقہ بنانے میں بے انتہا دلچسپی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کشمیر کی خودمختاری کا تصور اس کے دفاعی منصوبوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔"[2]
پریم ناتھ بزاز اور پروفیسر لیمب کا بیان یہ ہے کہ اگرچہ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پورے برصغیر پر برطانوی سامراج کا اقتدار مستحکم ہو گیا تھا لیکن وہ زار شاہی کے توسیع پسندانہ عزائم کے بارے میں بدستور فکرمند تھا۔ اس کی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ روسیوں کو بہر قیمت برصغیر کی سرحد سے دور رکھا جائے۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہ صرف افغانستان کو برطانیہ کی سرپرستی میں بفر سٹیٹ کا کردار ادا کرنے پر مجبور کیا تھا بلکہ اس نے چینی ترکستان میں بھی ایک ایسی ہی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ریاست کشمیر کو بھی قراقرم کے پہاڑی علاقوں کے دفاع کے لیے بطور بفر سٹیٹ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مہاراجہ رنبیر سنگھ نے 1864ء میں درہ قراقرم سے آگے شمالی لداخ کے علاقے پر قبضہ کر کے وہاں اپنی فوجی چوکی قائم

کر لی تھی تو برطانیہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔لیکن جب 79-1878ء میں وادی کشمیر میں ہولناک قحط کے باعث تقریباً ساٹھ فیصد آبادی نیست و نابود ہوگئی اور ریاست کی روایتی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تو برطانوی سامراج نے ریاست پر کچھ نہ کچھ کنٹرول کرنے کا فیصلہ کیا۔ گلگت اور اس کے گردونواح کے علاقوں کے دفاع کے لیے مہاراجہ کی غیر مقبول حکومت پر مزید انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ برطانوی سامراج کو بالآخر کشمیری مسلمانوں کی مظلومیت پر ''ترس'' آیا۔1884ء میں وزیر ہند لارڈ کمبرلے نے پارلیمنٹ میں کہا کہ ''بلاشبہ ریاست جموں وکشمیر کی انتظامیہ میں اصلاحات کی فوری ضرورت ہے۔جن حالات میں اس ملک کی خودمختاری موجودہ حکمران ہندو خاندان کے حوالے کی گئی تھی ان کے پیش نظر حکومت برطانیہ کو مسلمان آبادی کے حق میں غالباً بہت پہلے مداخلت کرنی چاہیے تھی۔'' 1855ء میں رنبیر سنگھ فوت ہوا تو برطانوی مداخلت کا موقعہ پیدا ہو گیا۔اس نے بڑے بیٹے پرتاپ سنگھ کی اس شرط پر حمایت کی کہ وہ نہ صرف سری نگر میں برطانوی ریذیڈنٹ کا تقرر قبول کرے گا بلکہ وہ اس ریذیڈنٹ کی زیر نگرانی اصلاحات بھی کرے گا۔ چونکہ اگلے چند سال کے دوران پامیر میں اور شمالی افغانستان کی سرحد پر روسی فوجوں کی نقل وحرکت میں اضافہ ہو گیا تھا اس لیے برطانیہ کو کشمیر میں مزید احتیاطی اقدامات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے پہلے تو گلگت کے علاقے پر اپنا موثر کنٹرول قائم کیا اور پھر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو اس صحیح یا غلط الزام کے تحت معزول کر دیا کہ اس نے برطانوی ریذیڈنٹ کے خلاف سازش کی ہے اور وہ روسیوں کے ساتھ خفیہ طور پر غدارانہ خط وکتابت کرتا رہا ہے۔ برطانوی ریذیڈنٹ کی زیر صدارت سٹیٹ کونسل تقریباً پندرہ سال تک ریاست کا نظم ونسق چلاتی رہی۔ جب 1905ء میں پرتاپ سنگھ کو بحال کیا گیا تو اس وقت تک پامیر کے علاقے میں روسی فوجیں پسپا ہو چکی تھیں۔[3] 1935ء میں برطانیہ نے حکومت کشمیر سے گلگت اور اس کا نواحی علاقہ ساٹھ سال کے پٹے پر حاصل کر لیا۔اس کے بعد اس علاقے پر ریاست جموں کشمیر کی حکومت کا عملی طور پر کوئی کنٹرول نہ رہا۔علاقے کے نظم ونسق کی ساری ذمہ داری برطانوی ریذیڈنٹ پر عائد ہوتی تھی۔گلگت میں پہلے برطانوی ایجنٹ کرنل ڈیورنڈ نے اپنی کتاب ''دی میکنگ آف اے فرنٹیئر''(The Making of a Frontier) میں لکھا ہے کہ ''بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم نے ریاست میں مداخلت کیوں کی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ کارروائی محض روس کی وجہ

سے کی ہے۔ اگر چہ گلگت کا یہ کھیل بہت مہنگا ہے لیکن یہ غیر ضروری نہیں ہے۔"[4]

جوزف کوربل اور متعدد دوسرے امریکی اور برطانوی مورخین کے بیان کے مطابق برطانوی سامراج کی اس پالیسی کا تاریخی پس منظر یہ تھا کہ جب آخری روسی سلطنت کا بانی "پیٹر دی گریٹ" 1722ء میں بحیرہ کیسپین کی خلیج استرآباد پہنچا تھا تو اس نے ہندوستان کی طرف اشارہ کر کے یہ کہا تھا کہ "یہاں سے اونٹوں پر بلخ اور بدخشاں تک بارہ دن کا سفر ہے اور پھر وہاں سے ہمیں کوئی ہندوستان کی طرف جانے سے نہیں روک سکتا۔" اس نے وسطی ایشیا کی فتح کا منصوبہ بنا کر اپنے ایک کمانڈر شہزادہ بیکووچ کو حکم دیا تھا کہ "ایک ایسی فوج تیار کرو جو وسطی ایشیا سے ہندوستان پر حملہ کر سکے۔" 1791ء میں روس کی ملکہ کیتھرائن نے بخارا اور کابل کے راستے ہندوستان پر حملے کے منصوبے پر غور کیا تھا اور پھر اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نپولین کی فرانسیسی سلطنت اور زار پال اور الیگزینڈر اول کی روسی سلطنت کی نظریں ہندوستان پر لگی رہی تھیں کیونکہ وہ دونوں ہی اپنے مشترکہ دشمن برطانیہ کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ زار پال نے لکھا تھا کہ "فرانس اور روس کو ستر ہزار افراد پر مشتمل مشترکہ فوج ہندوستان کی سرحدوں پر بھیجنی چاہیے کیونکہ دونوں حکومتوں کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندوستان کو انگریزوں کے ظالمانہ چنگل سے آزاد کرانا چاہیے۔" اس نے 1801ء میں اپنے ایک کمانڈر اورلوف کو تحریری طور پر حکم دیا تھا کہ "تم ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرو گے۔ میں اس مہم کا کام کلی طور پر تمہارے اور تمہاری فوج کے سپرد کرتا ہوں۔ اس طرح تمہاری شان وشوکت دوبالا ہوگی اور تمہارے لیے میرے دل میں خصوصی جذبۂ خیر سگالی پیدا ہوگا۔ تم بہت سا مال و دولت حاصل کرو گے اور دشمن کے دل میں دہشت پھیلا دو گے۔ میرے پاس جتنے نقشے موجود ہیں وہ سب کے سب تمہیں بھیج رہا ہوں اور میری نیک تمنائیں تمہارے شامل حال رہیں گی۔" یہ نقشے صرف خیوا اور دریائے آمو تک تھے اور جب یہ کمانڈر وہاں تک پہنچا تھا تو پال کے جانشین الیگزینڈر اول نے اسے واپس بلا لیا تھا۔

جب 1807ء میں روس اور فرانس کے درمیان معاہدۂ امن ہوا تھا تو اس کے تقریباً ایک سال بعد نپولین نے روس کے فرمانروا کی اس بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کی تھی جو فرانس کی ترکی کے ساتھ سازباز کی بنا پر پیدا ہوگئی تھی۔ نپولین نے زار الیگزینڈر کو لکھا تھا کہ "اگر روس اور فرانس کی 50 ہزار فوج براستہ قسطنطنیہ، فرات تک پہنچ جائے گی تو انگلستان پر لرزہ طاری ہوجائے

گا۔میں ڈالماتیہ(Dalmatia) پر تیار ہوں اور جناب والا ڈینیوب(Danube) پر تیار ہیں۔ اگر ہم اس مشترکہ مہم کا انتظام کر لیں تو اس کے تقریباً ایک ماہ بعد ہم باسفورس پر ہوں گے۔'' الیگزینڈر نے اس شاندار پیش کش کا خیر مقدم کیا تھا اور جواباً لکھا تھا کہ ''جب ہم ترکی اور ہندوستان کے مسائل طے کر لیں گے تو انگلستان ہمارے ساتھ پرامن طریقے سے رہنے پر مجبور ہو جائے گا۔'' لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد جب نپولین نے روس پر حملہ کر دیا تو ہندوستان پر روس اور فرانس کی مشترکہ کارروائی کا منصوبہ خود بخود ختم ہو گیا تھا۔

1812ء میں نپولین کی فیصلہ کن شکست کے بعد روس کے کئی جرنیلوں نے ہندوستان پر حملے کے منصوبے بنائے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وسطی ایشیاء سے ہندوستان کی جانب بآسانی پیش قدمی ہو سکتی ہے۔ جنرل پیروسکی جب 1839ء میں خیوا پہنچا تھا تو اس کا خیال تھا کہ یہ کامیابی ''ہندوستان کو ہلانے'' کی جانب پہلے قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔1854ء میں جنرل دودھامل نے اور پھر اس سے اگلے سال جنرل خرلوف نے ہندوستان پر حملے کے منصوبے بنائے تھے۔ 1878ء میں جنرل سکوبیلوف نے ہندوستان پر تین اطراف سے حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جس کے مطابق ایک حملہ چترال اور کشمیر کے راستے ہونا تھا۔اس کی رائے یہ تھی کہ کشمیر کے راستے حملے کرانے کا منصوبہ فوجی نقطۂ نگاہ سے قابل عمل ہو گا۔ ایک اور جنرل وی۔ٹی۔لیبسی ڈوف کو اس رائے سے مکمل اتفاق تھا اور اس نے اس سلسلے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں اس نے کشمیر کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''کشمیر میں بآسانی بغاوت کرائی جا سکتی ہے کیونکہ وہاں کے عوام الناس پر ٹیکسوں کا بھاری بوجھ پڑا ہوا ہے۔'' اس نے چترال اور گلگت کی جنگی اہمیت پر زور دیتے ہوئے تفصیل سے بتایا تھا کہ کس طرح ان دونوں صوبوں پر حملہ ہو سکتا ہے۔لیکن ان سارے منصوبوں پر اس لیے عمل نہ ہو سکا کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور پوری انیسویں صدی کے دوران یورپ کی جانب سے روس میں مسلسل مداخلت ہوتی رہی تھی۔ ملکہ کیتھرائن ترکوں کے ساتھ جنگ اور پولینڈ کی تقسیم کی تیاریوں میں مصروف رہی تھی۔ پال اور الیگزینڈر اول کو نپولین کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔نکولس کریمیا کی جنگ میں مصروف رہا اور الیگزینڈر دوئم کو 1877-78ء میں بلقان کی جنگ سے ہی فرصت نہ ملی۔ بایں ہمہ جہاں تک وسطی ایشیا کا تعلق تھا اس دوران روس کی سلطنت میں باقاعدگی کے ساتھ توسیع ہوتی رہی۔حتیٰ کہ وہ 1891ء میں

ہندوستان کی سرحد کے نزدیک پامیر کے علاقے میں پہنچ گیا۔

اسی طرح روس کے حکمران سنکیانگ میں بھی بتدریج مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ جب انہوں نے 1870ء میں وسطی ایشیاء میں اپنا اقتدار مستحکم کرلیا تو سنکیانگ میں ان کے اثرورسوخ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اس صوبہ پر چین کی مرکزی حکومت کا کبھی بھی مؤثر کنٹرول نہیں رہا تھا اور اس کا اس سے رابطہ روس کے علاقے سے گزر کر ہوتا تھا۔ چونکہ اس صوبہ کی معیشت کا زیادہ تر انحصار روس کے ساتھ تجارت پر تھا اس لیے روسی فرماں رواؤں نے پہلے تو سنکیانگ میں تجارتی مراعات حاصل کیں اور پھر انہوں نے یہاں سیاسی مراعات کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کردیا جس کے نتیجے میں روس اور برطانیہ کے مفادات میں تصادم ہونا ناگزیر تھا۔ روس نے مشرق وسطیٰ اور شمالی چین میں جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی نظریں خلیج فارس، بحیرہ عرب اور چینی ترکستان پر لگی ہوئیں تھیں۔ وہ بحیرہ عرب میں گرم پانی کی بندرگاہ کے لیے ترستا تھا۔ لیکن جب بیسویں صدی کے اوائل میں جرمنی کی طرف سے ان دونوں کو خطرہ لاحق ہوگیا اور 1905ء میں روس کو جاپان کے ہاتھوں عبرتناک شکست ہوئی تو دونوں سامراجی طاقتوں نے 31/اگست 1907ء میں ایران، افغانستان اور تبت کی حیثیت کے بارے میں ایک معاہدہ کرلیا۔ جس کے تحت ایران عملی طور پر دونوں سلطنتوں میں تقسیم ہوگیا اور روس نے رسمی طور پر یہ تسلیم کرلیا کہ افغانستان کی حیثیت برطانیہ کے زیر اثر ایک ''بفرسٹیٹ'' کی رہے گی۔ روس اور برطانیہ دونوں ہی تبت کی علاقائی سالمیت کا احترام کرینگے۔ ان کی طرف سے اس کے داخلی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ اس علاقہ پر چین کی بالادستی قائم رہے گی۔ اس معاہدے میں سنکیانگ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ اس بات سے مطمئن ہوگیا تھا کہ اب مشرق وسطیٰ میں روس کی سلطنت کی مزید توسیع کا سدباب ہوگیا ہے۔ وہ تبت میں بھی اپنا اثرورسوخ نہیں بڑھائے گا اور اس طرح ہندوستان چاروں طرف سے محفوظ رہے گا حالانکہ ریاست جموں وکشمیر کی علاقائی حدود روس کے وسطی ایشیا کے مقبوضات کے اندر تک واقع تھیں۔ قبل ازیں 1889ء میں برطانوی سامراج نے اسی وجہ سے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو عملی طور پر معزول کرکے ریاست کا نظم ونسق خود سنبھال لیا تھا۔ لیکن جب 1905ء میں جاپان نے روسی سامراج کے غبارے کی پھونک نکال دی اور برصغیر کے ہندو سیاسی واخباری حلقوں کی طرف

سے زبردست دباؤ پڑا تو مہاراجہ کا اقتدار بحال کر دیا گیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب نومبر 1917ء میں لینن کے پرولتاری انقلاب کے تقریباً تین ہفتے بعد یعنی 3 دسمبر کو سوویت یونین کی ''کونسل آف پیپلز کمیسارز'' نے مشرق کے مسلمانوں، ترکوں، عربوں اور ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ سامراج کا طوق غلامی اتار کر روسی انقلاب کی امداد کریں تو برطانیہ کو پھر روس کی جانب سے خطرہ لاحق ہو گیا اور جب بیرونی مداخلتی فوجوں اور اندرونی رجعتی فوجوں کی شکست کے بعد روس کا پرولتاری انقلاب مستحکم ہو گیا اور ستمبر 1920ء میں تیسری انٹرنیشنل کے زیر اہتمام باکو میں مشرق کے سامراج دشمن عناصر کے نمائندوں کی کانفرنس ہوئی تو برطانوی سامراج پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ روس کا سامراجی ریچھ کمیونزم کا سرخ لبادہ پہن کر اور بھی خونخوار ہو گیا ہے۔ شراب وہی پرانی ہے صرف بوتل بدل گئی ہے۔ یعنی روس میں نئی انقلابی حکومت قائم ہونے سے ہندوستان کے بارے میں اس کے نصب العین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، صرف زبان اور تدابیر بدلی گئیں ہیں۔ اس کے لیے یہ حقیقت انتہائی خطرناک تھی کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی اور کانفرنس کے صدر گریگری زینوویف کی صدارتی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''ہم ساری اقوام اور سارے محنت کش عوام کی، بلاامتیاز رنگ و نسل، آزادی کے خواہاں ہیں۔ ہم ہندوستان کی بھی آزادی چاہتے ہیں جسے انگریز سرمایہ داروں نے نہایت ظالمانہ طریقے سے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔'' اس نے مشرقی اقوام کو مشورہ دیا تھا کہ ''اپنے آپ کو سامراج کے خلاف بالخصوص انگریزی سامراج کے خلاف، مقدس جنگ کے لیے منظم کرو۔'' اس کانفرنس سے قبل لینن کی حکومت از خود ہی 1907ء کا غیر مساوی معاہدہ منسوخ کر کے ایران میں اپنے خصوصی حقوق اور معاشی مراعات سے دستبردار ہو چکی تھی۔ چونکہ افغانستان کا بادشاہ امان اللہ خان روس کی اس فراخدلانہ خارجہ پالیسی سے بہت مطمئن ہوا تھا اور وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتا تھا جنہوں نے اسے 1919ء کی جنگ کے دوران موت کی سزا دینے کا اعلان کیا تھا۔ اس لیے لینن نے امان اللہ خان کے نام ایک مراسلے میں اس کی بہت تعریف کی اور یقین دلایا کہ ''سوویت یونین دنیا کی بہترین سامراجی طاقت یعنی برطانیہ کے خلاف افغان قوم کی فوجی امداد کرنے کو تیار ہے۔'' لینن کے اس دوستانہ مراسلے کا یہ اثر ہوا کہ ایران اور افغانستان دونوں ہی نے فروری 1921ء میں سوویت یونین کے ساتھ دوستی کے

ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔

لیکن اس معاہدے کے تقریباً ایک ماہ بعد یعنی 16 ر مارچ 1921ء کو سوویت یونین نے برطانیہ سے ایک تجارتی معاہدہ کیا جس میں یہ سیاسی وعدہ بھی کیا کہ ''وہ برطانوی مفادات اور برطانوی ایمپائر کے خلاف، فوجی، سفارتی، یا کسی طرح سے ایشیائی عوام بالخصوص ہندوستان اور افغانستان کی آزاد ریاست کے عوام کی کاروائیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔'' اس معاہدے کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں سوویت یونین کو نئی معاشی پالیسی کے تحت ملک کی تعمیر نو کے لیے مغربی مما لک سے قرضے اور تجارت کی سخت ضرورت تھی۔ تاہم اس نے پس پردہ ہندوستان اور دوسرے ایشائی مما لک کے انقلاب پسندوں کی تائید وحمایت جاری رکھی۔ 1920ء میں برلن میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی کیونکہ وہاں سے ماسکو زیادہ دور نہیں تھا اور لندن بھی نزدیک تھا جہاں کی کمیونسٹ پارٹی ہندوستان کے حالات پر بڑی توجہ دیتی تھی اور اس سے یہ توقع بھی کی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں امداد کرے گی۔ اسی سال سمرقند میں ایشیائی طلباء کی نظریاتی تعلیم کے لیے ایک سکول کھولا گیا جس کے 3500 طلباء میں سے ہندوستانیوں کی تعداد 931 تھی۔ انہی طلباء نے واپس ہندوستان آ کر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تنظیم کا کام شروع کیا تھا جبکہ برطانوی خفیہ پولیس کی اطلاع کے مطابق کابل میں سوویت سفیر وزیرستان اور شمال مغربی صوبہ سرحد کی طرف خاص توجہ دیتا تھا اور حریت پسند قبائلیوں کو اسلحہ بھی مہیا کرتا تھا۔ مئی 1920ء میں لینن نے انڈین انقلابی ایسوسی ایشن کے نام ایک پیغام میں اپیل کی تھی کہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اتحاد برقرار رکھیں۔''

تیسری انٹرنیشنل کی دوسری کانگرس جون 1920ء میں ہوئی تو اس میں قومی اور نوآبادیاتی مسائل پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ پھر جب جون 1921ء میں تیسری کانگرس منعقد ہوئی تو سٹالن نے انٹرنیشنل کی ایگزیکٹو کمیٹی میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''یورپ کی سامراجی طاقتوں کے سیاسی اقتدار پر ان کی نوآبادیات کے ذریعے دباؤ ڈالنا چاہیے۔'' اس کا خیال تھا کہ ''فروری 1921ء کے معاہدے کے تحت کابل میں جو سوویت قونصل خانہ قائم ہوا ہے اس کے ذریعے برطانوی ہندوستان سے مواصلاتی رابطہ قائم ہوسکتا ہے'' اور لینن نے کانگرس کے مکمل اجلاس کو

خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ''برطانوی ہندوستان میں جس رفتار سے انقلاب آگے بڑھے گا اسی رفتار سے ایک طرف تو وہاں کا صنعتی اور ریلوائی پرولتاری طبقہ منظم ہوگا اور دوسری طرف اسی رفتار سے برطانوی سامراج کے تشدد میں اضافہ ہوگا۔'' پھر 4/مارچ 1923ء کو ''پراودا'' میں لینن کا مشہور و معروف مضمون شائع ہوا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ''ایشیائی عوام جتنی جلدی آزاد ہوں گے اتنی جلدی ہی سرمایہ داری نظام پر کمیونزم کو فتح حاصل ہوگی۔ اس جدوجہد کا فیصلہ اس حقیقت کی بنیاد پر ہوگا کہ دنیا کی آبادی کی بھاری اکثریت روس، ہندوستان اور چین میں رہتی ہے۔''

برطانوی حکومت نے 16/مارچ 1921ء کے معاہدے کی ان ''خلاف ورزیوں'' کے خلاف کئی مرتبہ احتجاج کیا لیکن سوویت حکومت کا مسلسل مؤقف یہ تھا کہ تیسری انٹرنیشنل ایک آزاد خودمختار ادارہ ہے اسے اس کے ساتھ منسلک نہ کیا جائے۔ چنانچہ بالآخر ہندوستان میں برطانوی وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے 2/مئی 1923ء کو ماسکو کو الٹی میٹم دیا کہ وہ اس صورت حال کی اصلاح کرے بصورت دیگر تجارتی معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس پر سوویت حکومت نے پھر یقین دلایا کہ وہ ایشیا میں برطانیہ کی پالیسی میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اس سلسلے میں 4/جون 1923ء کو ماسکو میں جو سرکاری بیان جاری کیا گیا اس میں برطانیہ کی شکایت کا ذکر کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی گئی کہ سوویت حکومت ایسے افراد، اداروں، ایجنسیوں اور انجمنوں کی مالی یا کسی اور طریقے سے امداد نہیں کریگی جن کا نصب العین برطانوی ایمپائر کے خلاف بے اطمینانی پھیلانا یا بغاوت کی ترغیب دینا ہوگا۔ سوویت حکام ان شرائط پر مسلسل اور پوری طرح عمل کریں گے۔'' اس اعلان کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سوویت یونین کو برطانیہ سے تجارت کا سلسلہ قائم رکھنے کی سخت ضرورت تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان سوویت لیڈروں کی زیادہ تر توجہ چین کی طرف مبذول تھی۔ چنانچہ اس کے بعد ہندوستان میں کمیونسٹ سرگرمیوں کی نگرانی کا کام کلی طور پر برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے نوآبادیاتی شعبہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

30ء کے عشرے میں یورپ میں فاشزم کے ابھار اور دوسری عالمی جنگ کی تیاریوں کی وجہ سے برطانیہ اور سوویت یونین کا تضاد نسبتاً کم شدت اختیار کیے رہا لیکن عالمی جنگ میں سوویت یونین جس طرح سرخرو ہو کر نکلا اور ایشیا و افریقہ میں آزادی کی انقلابی مسلح تحریکوں نے زور پکڑا، اسے دیکھ کر اینگلو امریکی سامراج بوکھلا گیا۔ 1947ء کے اوائل میں اینگلو امریکی اور

سوویت یونین کے درمیان عالمی سرد جنگ شروع ہوجانے کے بعد یہ بات بالکل ہی بعید از امکان ہوگئی تھی کہ برطانوی سامراج برصغیر سے رخصت ہوتے وقت کشمیر جیسے انتہائی جنگی اہمیت کے علاقے کو ایسے ہاتھوں میں چھوڑ دے گا جن کی دفاعی صلاحیتوں کے بارے میں وہ مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم مہاراجہ ہری سنگھ اوراس کے کشمیری وزیر اعظم رائے بہادر پنڈت رام چندر کاک کا خیال تھا کہ وہ برصغیر سے انگریزوں کی روانگی کے بعد اپنی ریاست کی مکمل آزادی وخودمختاری کا اعلان کردیں گے اوراس طرح یہ علاقہ افغانستان اور نیپال کی طرح روس، چین اور برصغیر پاک وہند کے درمیان باقاعدہ ایک بفرسٹیٹ کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ لیکن برطانوی سامراج انتہائی جنگی اہمیت کے اس علاقے کو مکمل آزادی وخودمختاری دینے کے سخت خلاف تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ماؤنٹ بیٹن ذاتی طور پر جواہر لال نہرو کے ساتھ سازش اور سودابازی کرکے کشمیر ہندوستان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ یا یہ کہ جناح نے اسے ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل مقرر کرنے کی تجویز کو مسترد کردیا تھا اوراس بنا پر وہ پاکستان کو انتقاماً نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ ''سیسر گپتا نے تسلیم کیا ہے کہ برطانیہ کی لیبر حکومت ریاستوں کو آزادی دے کر ہندوستان کے حصے بخرے کرنے کے خلاف تھی''[5] کیونکہ پروفیسر نارمن براؤن کے بیان کے مطابق ''برطانوی سامراج کا خیال تھا کہ شمال مغربی علاقے میں برصغیر کے دفاع کے لیے ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔''[6]

ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر میں ازخود کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے ہر فیصلے کی پہلے لندن سے منظوری لی تھی اور پھراس نے اس پر کارروائی کے بارے میں باقاعدگی سے رپورٹیں بھیجی تھیں۔ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ مئی 1947ء میں لندن میں ہوا تھا جبکہ ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کی تقسیم کے بارے میں نہ صرف ایٹلی کی لیبر حکومت سے منظوری لی تھی بلکہ چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کی تائید وحمایت بھی حاصل کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے 3/جون کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے اگلے دن یعنی 4/جون کو ہی اشارۃً بتا دیا تھا کہ ضلع گورداسپور کا مسلم اکثریت کا علاقہ ہندوستان کے حوالے کرکے ہندوستان اور کشمیر کے درمیان جغرافیائی رابطہ پیدا کیا جائے۔ اگر بٹالہ اور گورداسپور کی مسلم اکثریت کی تحصیلیں ہندوستان کو نہ دی جاتیں تو کشمیر کے ہندوستان میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب ماؤنٹ بیٹن

نے 4 / جون کو یہ اعلان کیا تھا اس وقت تک جناح نے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز کو مسترد نہیں کیا تھا اور پھر جب ماؤنٹ بیٹن نے جون کے تیسرے ہفتے میں سری نگر جا کر مہاراجہ ہری سنگھ کو غیر مبہم الفاظ میں متنبہ کیا تھا کہ وہ اپنی آزادی وخودمختاری کا اعلان نہ کرے اس وقت تک بھی جناح نے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا تھا۔ لہٰذا اس وقت تک ماؤنٹ بیٹن کی انتقامی کاروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے مہاراجہ ہری سنگھ کو جو مشورہ دیا تھا وہ برطانوی سامراج کے فیصلے کے عین مطابق تھا۔

برطانوی سامراج سوویت یونین اور چین سے متصلہ کشمیر جیسے فوجی اہمیت کے علاقے کو پاکستان کے حوالے نہیں کرسکتا تھا جس کے پیدا ہوتے ہی جاں بحق ہونے کا امکان تھا اور بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہندوستان میں ایسے لیڈروں کی کمی نہیں تھی جو کشمیر کی جغرافیائی اہمیت کے بارے میں برطانوی انڈین سول سروس کے پرانے نقطۂ نگاہ سے متفق تھے۔ ہندوستان کا محکمہ خارجہ ماضی میں روس کی جانب سے خطرہ محسوس کرتا تھا۔ سر اولف کیرو جیسے اعلیٰ برطانوی افسروں کو 1947ء میں بھی یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں بدامنی ہوئی تو روس کو دخل اندازی کا موقع مل جائے گا۔ وہ تاجکستان اور پامیر کی طرف سے یا سنکیانگ کی طرف سے دخل اندازی کرے گا۔ سنکیانگ میں اس صدی کے تیسرے عشرے کے دوران مقامی ''وارلارڈ'' (War Lord) شینگ شیہ زائی کی سرگرمیوں کی وجہ سے روسیوں کا اثر ورسوخ خاص طور بہت بڑھ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ نے 1935ء میں گلگت کا علاقہ پٹہ پر حاصل کرلیا تھا۔ آزادی کے بعد جواہر لال نہرو کی زیرسرکردگی ہندوستان کے محکمۂ خارجہ کو روسیوں کی جانب سے بدستور تشویش لاحق تھی۔ اس محکمہ نے اس تشویش کی بنیاد پر اقتدار کی منتقلی کے تقریباً دو ماہ بعد اور کشمیر کے الحاق سے ایک دن پہلے یعنی 25 / اکتوبر کو برطانوی حکومت کو جو تار بھیجا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ پٹھان قبائلیوں کے خلاف مہاراجہ کشمیر کی امداد اس لیے بھی ضروری ہے کہ کشمیر کی سرحدیں افغانستان، سوویت یونین اور چین سے ملتی ہیں۔ کشمیر کا تحفظ ہندوستان کے تحفظ کے لیے بہت ضروری ہے۔ پروفیسر لیمب لکھتا ہے کہ ان دنوں کشمیر کے علاقے کی فوجی اہمیت کی بنیاد پر ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں جو دلائل پیش کئے جارہے تھے وہ اس بنا پر اور بھی زیادہ معقول نظر آتے تھے کہ برصغیر کی تقسیم کے موقعہ پر بہت سے مبصرین پاکستان کے تصور کو

قابل عمل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نوزائیدہ ریاست لازمی طور پر جاں بحق ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں جو انتشار پیدا ہو گا اگر اسے کشمیر اور فوجی اہمیت کے دوسرے پہاڑی سرحدی علاقوں تک پھیلنے دیا گیا تو سوویت یونین لازمی طور پر دخل اندازی کرے گا۔ پاکستان کے ختم ہونے کا امکان اس لیے بھی زیادہ نظر آتا تھا کہ بہت سے ہندوستانی لیڈر نہ صرف اس کی امید کرتے تھے بلکہ وہ اس مقصد کے لیے عملی اقدامات پر بھی آمادہ تھے۔ فیلڈ مارشل آکن لیک کا مشاہدہ یہ تھا کہ ''پوری ہندوستانی کابینہ پاکستان کو تباہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔''[7]

ماؤنٹ بیٹن نے جب 3/جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا تھا تو اس نے ریڈیو پر اپنی تقریر میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ برطانوی سامراج نے مطالبہ پاکستان بہ امر مجبوری منظور کیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ''میں نے گذشتہ چند ہفتوں میں جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اس سے میری اس پختہ رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ ہو تو فرقہ وارانہ مسئلہ ہندوستان کی یکجہتی کو برقرار رکھ کر بہترین طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے۔''[8] اس نے جون کے تیسرے ہفتے میں سری نگر میں مہاراجہ ہری سنگھ کو متذکرہ مشورہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی اس مضمون کی قرارداد کی منظوری کے بعد دیا تھا کہ ''جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا۔'' ہوڈسن لکھتا ہے کہ ''ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کی تقسیم کو طوعاً و کرہاً منظور تو کر لیا تھا لیکن وہ اپنے ذہن کو اس خیال سے چھٹکارا نہیں دلا سکا تھا کہ تقسیم کے بعد دوستی اور مصالحت کا جذبہ کارفرما ہو گا اور مشترکہ ضروریات کی منطق دونوں ڈومینینوں کو رفتہ رفتہ پھر یکجا ہونے پر مجبور کر دیگی۔ اسے امید تھی کہ مشترکہ دفاعی کونسل سے اتحاد و تعاون کے درخت کی نمود ہو گی لیکن پنجاب کے فسادات اور جونا گڑھ و کشمیر کے تنازعات نے یہ امید خاک میں ملا دی۔''[9] ماؤنٹ بیٹن کے اس خیال کی تائید برطانوی وزیراعظم ایٹلی کی اس تقریر سے بھی ہوئی جو اس نے 10/جولائی کو قانون آزادئ ہند پر بحث کے دوران کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ''مجھے قوی امید ہے کہ برصغیر کی تقسیم عارضی ہو گی۔ دونوں ڈومینین پھر یکجا ہو کر برطانوی کامن ویلتھ کے اندر ایک عظیم ریاست کی تشکیل کریں گی۔'' حزب اختلاف کے ایک لیڈر ہیرلڈ میکمیلن نے کہا تھا کہ ''ہم وزیراعظم کی اس امید میں شریک ہیں کہ اس تقسیم میں کچھ ایسے بیج بھی موجود ہیں جو مستقبل میں کسی نہ کسی نوعیت کے اتحاد کا

باعث بنیں گے'' اور پھر 16 رجولائی کو وزیر ہند لارڈ لسٹوویل (Lord Listowel) نے ہاؤس آف لارڈز میں امید ظاہر کی تھی کہ ''جب تجربے کی روشنی میں تقسیم کے نقصانات نمایاں ہو جائیں گے تو دونوں ڈومینینیں ایک انڈین ڈومینین کی صورت میں پھر متحد ہونے کا برضا و رغبت فیصلہ کریں گی اور یہ واحد انڈین ڈومینین اقوام عالم میں وہ مقام حاصل کرے گی جس کی وہ اپنے علاقے اور وسائل کے لحاظ سے مستحق ہوگی۔''[10]

ماؤنٹ بیٹن نے یکم اپریل 1948ء کو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ دفاعی کونسل کے خاتمہ کے بعد اپنے شہنشاہ معظم کے نام اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ ''میرا ابتدائی خیال یہ تھا کہ یہ کونسل کم از کم مزید ایک سال کے لیے قائم رہے گی اور میں اندر ہی اندر یہ امید کرتا تھا کہ یہ ہمیشہ قائم رہے گی میری خواہش تھی کہ جب تک میں یہاں ہوں اس وقت تک یہ میری صدارت میں قائم رہے گی اور جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو اس کی صدارت اس ڈومینین کا وزیراعظم کرے گا جس میں اس کی میٹنگ ہوگی۔ میں سوچتا تھا کہ اس کونسل کے صدر کا دائرہ کار وسیع ہو جائے گا اور یہ آئندہ نہ صرف مالی اور اقتصادی امور کے بارے میں بلکہ بالآخر خارجی اور مواصلاتی امور کے بارے میں بھی فیصلے کرے گی۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ دونوں ڈومینینں ایک دوسرے سے بالکل ایسے ہی منسلک ہوں گی جیسے کہ امریکہ کی ریاستیں ہیں۔''[11] ماؤنٹ بیٹن کی اس امید کی بنیاد برطانوی سامراج کی اس امید پر تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کی دونوں ڈومینینیں برصغیر اور کامن ویلتھ کے دوسرے سارے علاقوں کے دفاع کے لیے برطانیہ کے ساتھ کسی نہ کسی فوجی انتظام میں شامل ہو جائیں گی۔ چنانچہ انتقال اقتدار سے کچھ عرصہ پہلے برطانوی حکومت نے دونوں ڈومینینوں سے مشترکہ دفاع کی بات چیت کرنے کے لیے اپنی تینوں افواج کے سربراہوں کو بھیجنے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اس وقت دونوں ملکوں کے لیڈروں نے اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے یہ پیش کش قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ پھر انتقال اقتدار کے بعد یہ فیصلہ ہوا تھا کہ برطانیہ کا فوجی وفد اس سلسلے میں مشترکہ دفاعی کونسل سے بات چیت کرے گا لیکن اس فیصلے پر بھی کچھ عرصے تک عمل نہیں ہوسکا تھا۔ 8 ردسمبر 1947ء کو ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو اس کی خواہش کے مطابق درخواست کی تھی کہ وہ بیرونی جارحیت کے خلاف مشترکہ دفاع کے لیے دستاویز پیش کر دے جس میں یہ تجویز کیا گیا تھا

کہ ’’دونوں ڈومینینوں کے چیف آف سٹاف کی میٹنگ ہو جس میں یہ فیصلہ کیا جائے کہ برطانوی فوجی وفد سے مشترکہ دفاع کی بات چیت کے لیے کون سا وقت مناسب ہوگا۔ لیکن دونوں وزرائے اعظم نے اس موقع پر مشترکہ دفاع کی تجویز کو ناقابل عمل قرار دے دیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ سیاسی ہم آہنگی کے بغیر مشترکہ دفاع کی تجویز قابل عمل نہیں ہے۔ دفاعی پالیسی کو خارجہ پالیسی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔‘‘[12] برطانوی سامراج اور ہندوستان کے توسیع پسندوں کی پاکستان کے مستقبل کے بارے میں ان پالیسیوں، منصوبوں اور توقعات کے پیش نظر 1947ء میں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ریاست کا ہندوستان سے الحاق ماؤنٹ بیٹن کی نہرو کے ساتھ ذاتی سازش کا نتیجہ نہیں تھا جیسا کہ چوہدری محمد علی، ظفر اللہ خان اور بعض دوسرے پاکستانی مؤرخین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ یہ برطانوی سامراج اور ہندوستان کے ابھرتے ہوئے قومی بورژوا طبقے کی خفیہ سودے بازی کی پیداوار تھا۔ دونوں نے اس مقصد کے لیے 3/جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے بعد مشترکہ کارروائیاں شروع کر دی تھیں اور پھر اکتوبر میں قبائلی لشکر کی یلغار کے بعد کشمیر میں ہندوستان کی ساری فوجی کارروائی خود ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی نگرانی میں ہوئی تھی جبکہ پاکستان کے قائم مقام برطانوی کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے پاکستانی فوجوں کو کشمیر کے محاذ پر بھیجنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ایس۔ ایم۔ برک ان سارے حقائق کو نظر انداز کر کے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق نہ ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کے گورنر جنرل کے طور پر قبول نہ کر کے ناراض کر دیا تھا۔ یہ شخص پاکستان کے محکمۂ خارجہ میں اعلیٰ عہدے سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مستقل طور پر امریکہ میں مقیم ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ماؤنٹ بیٹن نے 1947ء میں کشمیر کے بارے میں جو کارروائی بھی کی تھی وہ برطانوی سامراج کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ وہ لارڈ اسمے، ولفرڈ رسل، مہر چند مہاجن، بی۔ ایل۔ شرما اور دو روسی مؤرخوں کی تحریروں کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا کہ حکومت برطانیہ اور ماؤنٹ بیٹن کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے حق میں تھے۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کشمیر کو عوام کی رائے معلوم کرنے کا مشورہ دیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہونا چاہیے۔[13] لیکن برک اور اس کے سارے گواہان اپنی یہ رائے قائم کرتے

ہوئے نہ صرف سارے متذکرہ حقائق پر پردہ ڈالتے ہیں بلکہ اس حقیقت کو بھی چھپاتے ہیں کہ کشمیر کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے بارے میں نہرو کا موقف بھی یہی تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ شیخ عبداللہ کی رہائی کے بعد جموں و کشمیر کی آبادی کی اکثریت کی رائے ہندوستان کے حق میں ہوگی۔ وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن نے کسی اور ریاست کے حکمران کو عوام کی رائے معلوم کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ نظام حیدر آباد، نواب بھوپال، اور ٹراونکور کے مہاراجہ کو اس کا غیر مبہم مشورہ یہ تھا کہ بلا چون و چرا ہندوستان میں شامل ہو جاؤ۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں کو ماؤنٹ بیٹن نے جو مشورہ دیا تھا اس کا دستاویزی ریکارڈ موجود ہے لیکن مہاراجہ کشمیر کو اس کی جانب سے دیئے گئے مشورے کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ کیونکہ اس نے سری نگر میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران مہاراجہ کے ساتھ موٹر میں سیر و تفریح کے دوران غیر رسمی طور پر بات چیت کی تھی اور اس نے بعد میں خلاف معمول اپنی بات چیت کو قلمبند بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ برطانوی سامراج اور نہرو کے نمائندہ کی حیثیت سے سری نگر گیا تھا اور اس نے بڑی چالاکی سے مہاراجہ کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کی ترغیب دی تھی۔ 27/اکتوبر کو ہندوستان سے الحاق نامے پر بھی اس کی تجویز پر دستخط ہوئے تھے اور حکومت برطانیہ نے اس کے اس جانبدارانہ کردار پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

لیکن فروری 1948ء کے اوائل میں جب سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بحث ہوئی تو برطانوی سامراج کی متذکرہ پالیسی کے برعکس وزیر امور کامن ویلتھ نوئیل بیکر نے پاکستان کے موقف کی بھرپور تائید و حمایت کی اور ایسی قرارداد منظور کرانے کی کوشش کی جس پر عمل کی صورت میں کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق یقینی ہو جاتا۔ نوئیل بیکر کے اس رویے سے وقتی طور پر یہ تاثر ملا کہ غالباً برطانوی سامراج نے پاکستان اور کشمیر کے بارے میں اپنی ابتدائی پالیسی میں یکا یک تبدیلی کر دی ہے۔ لیکن بعد کے حالات سے یہ پتہ چلا کہ لیبر حکومت کی پالیسی میں یہ عارضی تبدیلی وزیر خارجہ بیون کے زیر اثر ہوئی تھی اور نوئیل بیکر نے بیون کی ہدایت پر ہی پاکستان کی حمایت کی تھی۔

لیکن جب حکومت ہندوستان نے ماؤنٹ بیٹن، سر سٹیفورڈ کرپس اور گارڈن واکر (Gordon Walker) کی وساطت سے وزیر اعظم ایٹلی پر زبردست سفارتی دباؤ ڈالا تو پھر

فوراً ہی پرانی ہندوستان نواز پالیسی اختیار کر لی گئی اور وزیر خارجہ بیون کو اعلانیہ ''ہندوستان کے سفارتی دباؤ اور زبردست پراپیگنڈے'' کی شکایت کرنا پڑی۔[14] ایلن کیمبل جانسن لکھتا ہے کہ ''فروری میں مسئلہ کشمیر پر سلامتی کونسل کے پاکستان نواز رویے کی بنا پر ہندوستان میں امریکی نمائندے وارن آسٹن (Warren Austin) اور برطانوی نمائندے نوئل بیکر پر شدید نکتہ چینی کر کے یہ الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ اقوام متحدہ کو بین الاقوامی سیاسی رسہ کشی کا اکھاڑہ بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ اب ہندوستان کو سوویت روس اور اس کے طفیلی ممالک کی مصالحتی کوشش یا ویٹو سے امید وابستہ کرنی چاہیے۔''[15]

ماؤنٹ بیٹن نے اس سلسلے میں حکومت برطانیہ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ ''پنڈت نہرو کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا ہے کہ اقوام متحدہ میں اخلاقیات کو کلی طور پر امریکی چلا رہے ہیں اور امریکی نمائندے وارن آسٹن نے کھلم کھلا پاکستان کی حمایت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اقوام متحدہ مسئلہ کشمیر کو حقائق کی بنیاد پر نمٹانے کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ وہ محض ہندوستان کے خلاف پاکستان کی امداد کرنا چاہتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برطانوی نمائندے نوئیل بیکر نے بھی ہندوستان کی اتنی ہی مخالفت کی ہے جتنی کہ امریکی نمائندے نے کی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ نوئیل بیکر نے یہ مخالفت محتاط زبان میں کی ہے۔ میں نے فروری کے ابتدائی دو ہفتوں کے دوران پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو یہ باور کرانے کی بار بار کوشش کی تھی کہ سلامتی کونسل کے اکثر ارکان کا رویہ اخلاقیات کی بجائے طاقتی سیاسیات کے زیر اثر نہیں تھا مگر مجھے اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں فروری کے اوائل میں جو تاثر پھیلا تھا اس کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں مسلم یکجہتی کے نصب العین کی حمایت کرنا چاہتا ہے اور امریکہ کی خواہش یہ ہے کہ فلسطین کی تقسیم کی حمایت کرنے کی وجہ سے عربوں میں اس کے وقار کو جو نقصان پہنچا ہے اسے دور کیا جائے...... ہندوستان میں یہ تاثر بھی پھیل رہا ہے کہ سلامتی کونسل کے صرف دو ارکان یعنی سوویت یونین اور یوکرین سے ہمدردی کی توقع کی جا سکتی ہے۔''[16]

ہندوستان کے محکمۂ خارجہ کے شعبۂ کشمیر کے ڈائریکٹر بی۔ ایل۔ شرما کا مؤقف یہ ہے کہ ''برطانیہ یہ سمجھتا تھا کہ کشمیر سے مغربی دنیا کا بنیادی مفاد وابستہ ہے اور سلامتی کونسل کے بیشتر ارکان اس سلسلے میں برطانیہ کی رہنمائی عموماً قبول کرتے تھے...... برطانیہ کا خیال تھا کہ اگر کشمیر

کے بارے میں ہندوستان کے دعوے کو تسلیم کر لیا گیا تو سوویت یونین کے کمزور علاقے کے نزدیک اس قدر اہم چوکی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ کیونکہ ہندوستان فوجی بلاکوں سے الگ رہنے اور غیر وابستہ پالیسی کی باتیں کرتا تھا۔ اگر کشمیر پاکستان میں شامل ہوا تو صورت حال مختلف ہوگی کیونکہ بہت سے برطانوی سول اور فوجی افسروں نے پاکستان میں ملازمتیں اختیار کر لی تھیں اور پاکستان مغربی ایشیا میں برطانیہ کو تیل اور دوسرے مفادات کے تحفظ کے لیے گراں قدر اڈوں کی سہولتیں دینے پر آمادہ تھا۔"[17] سوویت یونین کے دو مؤرخوں کی رائے یہ ہے کہ "برطانوی سامراج کشمیر کو سوویت یونین اور چین کی سرحدوں کے نزدیک ایک فوجی اڈے کے طور پر غیر معمولی اہمیت دیتا تھا اور اس نے کشمیر پر پاکستان کے دعوے کی اس لیے تائید کی تھی کہ پاکستان اس پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔"[18] بی۔ ایل۔ شرما اور روسی مورخوں کا یہ مؤقف جزوی طور پر صحیح ہے۔ برطانوی وزیر خارجہ بیون اور برطانیہ کے کامن ویلتھ امور کے وزیر نوئیل بیکر کی 1948ء کے اوائل میں واقعی یہی رائے تھی۔ لیکن وزیر اعظم ایٹلی، وزیر خزانہ کرپس، گارڈن واکر اور ماؤنٹ بیٹن کی رائے اس وقت بھی اس سے مختلف تھی۔ وہ ہندوستان کی دوستی کو دوسری ساری مصلحتوں پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ اس وقت تک نہرو سے مایوس نہیں ہوئے تھے اور اس بنا پر وہ اس کے سفارتی دباؤ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

ہندوستان کے اس کامیاب سفارتی دباؤ اور لیبر حکومت کے اندر اختلاف کے بارے میں ظفر اللہ خان نے بھی کچھ انکشافات کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب فروری میں ہندوستان کی تحریک پر سلامتی کونسل کے التوا کی مدت کچھ طول پکڑنے لگی تو میرا اندازہ یہ تھا کہ اس وقت کشمیر کا مسئلہ دلی اور لندن کے درمیان زیر بحث ہے۔ چنانچہ میں چوہدری محمد علی کے ہمراہ لندن گیا تا کہ وہاں کچھ کھوج لگایا جائے کہ پس پردہ کیا پخت و پز ہو رہی ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے پہلے وزیر خارجہ بیون سے ملاقات کی۔ وزیر خارجہ بہت صاف گو انسان تھے اور میرے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ انہوں نے میری بات توجہ سے سنی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صورت حال سے واقف ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی بھی ہے اور اتفاق بھی۔ لیکن ہندوستان کے معاملات میں وزیر اعظم پر کرپس کا بڑا اثر ہے۔ وہ اس معاملے میں وزیر اعظم کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم آج وزیر اعظم سے مل رہے ہو۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا کرے

کہ تمہاری قسمت نیک ہو۔'' ظفر اللہ خان مزید لکھتا ہے کہ ''میں اسی دن تین بجے وزیراعظم ایٹلی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ صورت ہی سے پشیمان نظر آتے تھے...... میں نے قریب پون گھنٹہ ان کی خدمت میں صرف کیا۔ اس عرصے میں انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے نظر ملا کر بات نہ کی۔ کبھی ادھر جھانکتے کبھی اُدھر جھانکتے۔ یہی کہتے فکر نہ کرو۔ ہندوستانی وفد جلد نیویارک پہنچ جائے گا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ انہیں آمادہ کروں کہ ہندوستان کے ساتھ اپنا رسوخ استعمال کر کے انہیں ایفائے عہد پر مائل کریں اور اس میلان کا ثبوت سلامتی کونسل کے سامنے پیش کردہ قرارداد کو تسلیم کرنے سے مہیا کریں اور وہ اس طرف آنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کہنے لگے تمہیں اس قرارداد پر کیوں اصرار ہے۔ اصل غرض دوسرے طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر یوں کر دیا جائے یا یوں کر دیا جائے۔ میں ان کی ہر ایک یوں پر تنقید کرتا گیا۔ لیکن وہ راہ پر نہ آئے۔ میں بے نیل و مرام لوٹ آیا اور اپنے رفیق کار چوہدری محمد علی سے کیفیت بیان کر دی اور نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کی خدمت میں بھی رپورٹ بھیج دی۔''[19]

جب وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی رپورٹ کراچی پہنچی تو پاکستان کے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے قائداعظم کی ہدایت کے مطابق برطانوی وزیراعظم ایٹلی کو ایک احتجاجی تار بھیجا جس میں کہا گیا کہ ''سر محمد ظفر اللہ خان نے لندن میں آپ سے اور آپ کے بعض ساتھیوں سے حال ہی میں جو بات چیت کی ہے اس کے بارے میں اس نے مجھے مطلع کیا ہے اس نے مجھے بتایا ہے کہ حکومت برطانیہ اب اپنی اس سابقہ پوزیشن پر نظر ثانی کر رہی ہے جو اس نے کشمیر میں غیر جانبدار انتظامیہ کے قیام اور وہاں سے ہندوستانی فوجوں کے انخلاء کے بارے میں اختیار کی تھی۔ اگر حکومت برطانیہ اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ گئی یا اس سے بالکل ہی انحراف کر گئی تو وہ ایک بہت بڑی غلطی کی مرتکب ہوگی۔ برطانوی نمائندے نے سلامتی کونسل میں جو مؤقف اختیار کیا ہے اس میں پاکستان سے محض انصاف کیا گیا ہے اور اس میں ایک ایسا حل پیش کیا گیا ہے کہ جس پر کوئی معقول اور منصف مزاج شخص اعتراض نہیں کر سکتا۔'' نوابزادہ نے مزید لکھا کہ ''اپنے مؤقف سے اس طرح کا انحراف برطانوی حکومت کو سب کی نظروں میں قابل مذمت ٹھہرائے گا۔ یہ انحراف اخلاقی لحاظ سے صحیح نہیں ہوگا اور سیاسی طور پر تباہ کن ہوگا۔ اگر حکومت برطانیہ نے مبینہ دباؤ کے تحت اپنے اس موقف میں تبدیلی کرنے یا کوئی ہیر پھیر کرنے کی کوشش کی تو پاکستان اسے

دھوکہ دہی تصور کرے گا۔ پاکستان یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ ہندوستان نے دولت مشترکہ چھوڑنے اور اس قسم کی جو دوسری مبینہ دھمکیاں دی ہیں ان کی بنا پر حکومت برطانیہ اپنے دیانتدارانہ اور منصفانہ موقف سے منحرف ہوگئی ہے۔ اگر حکومت برطانیہ نے ایسی کوشش کی تو وہ پاکستان کے لیے بالکل ناقابل قبول ہوگی اور وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ برصغیر میں دونوں ڈومینینوں کے درمیان امن نہیں ہوگا اور اس بنا پر امن عالم کو خطرہ لاحق ہوگا۔ براہ کرم مجھے غلط نہ سمجھیے میرے وزیر خارجہ نے آپ سے ملاقات کے بارے میں مجھے جو رپورٹ بھیجی ہے اس نے مجھے اس قدر مغموم اور پریشان کر دیا ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ آپ سلامتی کونسل کے آئندہ اجلاس میں اپنی حکومت کے مؤقف کو تبدیل کریں، میں اس ذاتی خفیہ تار کے ذریعے پاکستان کے مؤقف کی صاف گوئی سے وضاحت کر دوں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس طرح آپ کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کر دیا ہے۔''[20] کہتے ہیں کہ گورنر جنرل محمد علی جناح نے برطانوی وزیر اعظم کے نام یہ احتجاجی تار بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے پاکستان کے دولت مشترکہ سے الگ ہو جانے کی تجویز پر بھی غور کیا تھا۔ انہوں نے امریکہ کے سفیر کو بلا کر حکومت امریکہ کو یہ پیغام بھی پہنچایا تھا کہ ''پاکستان کے بارے میں برطانیہ کا رویہ منصفانہ نہیں ہے'' اور ''امریکہ کو برطانیہ کی چالوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے'' اور وزیر اعظم لیاقت علی خان نے برطانوی ہائی کمشنر کو بتا دیا تھا کہ ''سلامتی کونسل کی قرارداد کا ایک نیا مسودہ دہلی میں تیار کر لیا گیا ہے جسے حکومت برطانیہ کی تائید حاصل ہے اور یہ مسودہ چیانگ کائی شیک کی حکومت کے مندوب کے حوالے کر دیا گیا ہے۔'' لیاقت علی خان نے برطانوی ہائی کمشنر سے استفسار کیا تھا کہ ''ان حالات میں وہ پاکستان کو برطانوی دولت مشترکہ سے وابستہ رکھنے کا کیا جواز پیش کر سکے گا کیونکہ پاکستان کو ابتداء ہی سے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔'' لیکن پاکستان کے جاگیردار وزیر اعظم کے اس احتجاجی تار اور زبانی دھمکی کا برطانوی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ غالباً اس لیے کہ برطانوی سامراج کو معلوم تھا کہ گورنر جنرل محمد علی جناح سخت علیل ہیں اور پاکستان کا حکمران جاگیردار طبقہ ان کا بہر صورت وفادار رہے گا۔ اس نے پاکستان کے جاگیرداروں کے بازو آزمائے ہوئے تھے۔

ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ ''چند دن بعد جب سلامتی کونسل کا اجلاس پھر شروع ہوا تو وہاں کا سماں بدلا ہوا تھا۔ روس اس معاملے میں غیر جانبدار تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ برطانوی کامن

ویلتھ کا معاملہ ہے،ہم اس میں دخل نہیں دیتے۔ امریکہ اور برطانیہ پیش پیش تھے۔ بلاشبہ سلامتی کونسل کے باقی ارکان اپنی اپنی رائے رکھتے تھے لیکن وہ سب ان دونوں مغربی طاقتوں کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ امریکہ بہت حد تک کامن ویلتھ کا معاملہ ہونے کی وجہ سے برطانیہ کے مشورے پر چلتا تھا۔ برطانیہ کے نمائندے فلپ نوئیل بیکر فریقین کی باہمی مفاہمت سے کسی مؤثر فیصلے کے لیے کوشاں تھے۔لیکن وزیراعظم برطانیہ اب ان کے مشورے پر عمل پیرا ہونے پر تیار نہ تھے۔لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر سٹیفورڈ کرپس کا اثر اپنا کام کر چکا تھا۔ ہمارے وفد کے سیکرٹری مسٹر ایوب کو مسٹر نوئیل بیکر کے سیکرٹری نے بتایا کہ وزیراعظم ایٹلی اور مسٹر نوئیل بیکر کے مابین اختلاف اس قدر بڑھ چکا ہے کہ مسٹر بیکر مستعفی ہونے کی سوچ رہے ہیں۔اس امر کی تصدیق 1951ء میں خود مسٹر نوئیل بیکر نے کی۔ وہ اس وقت وزارت سے علیحدہ ہو چکے تھے۔میرے ان کے 1933ء سے دوستانہ مراسم تھے۔ 1951ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ مسٹر نوئیل بیکر کا گزر پیرس سے ہوا تو مجھے ملنے تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں کشمیر کا ذکر چھڑ گیا۔فرمایا میرے لیے یہ امر نہایت تکلیف دہ ہے کہ اس قضیئے کے خاطر خواہ تصفیہ کی صورت پیدا ہوئی مگر بات بنتے بنتے بگڑ گئی۔ فرمایا 1948ء میں میں نے نیویارک میں بڑی کوشش سے سر گوپالا سوامی آئنگر اور باجپائی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ پنڈت نہرو کو قرارداد منظور کرنے پر رضامند کریں۔ انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کریں گے۔ چنانچہ ہفتہ کے روز دونوں الگ الگ مجھے ملنے کے لیے آئے اور کہا کہ ابھی پختہ اطلاع تو نہیں آئی لیکن ہمارے پیغام کا ردعمل خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے کہ دو ایک دن تک واضح ہدایت آجائے گی اور ہمارا اندازہ ہے کہ سوموار یا منگلوار تک ہم آپ کو پختہ اطلاع دے سکیں گے اور پھر سوموار کے دن مجھے ایٹلی کا وہ منحوس تار موصول ہوا جس نے سارے معاملے کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ میں نے سخت احتجاج کیا لیکن ایٹلی نے میری ایک نہ مانی بلکہ اس نے اس بنا پر اپنے دل میں میرے خلاف گرہ باندھ لی۔ اس نے تھوڑے عرصے بعد مجھے کامن ویلتھ کی وزارت سے علیحدہ کر کے بجلی اور ایندھن کا وزیر بنا دیا اور پھر کچھ عرصے بعد وزارت سے ہی الگ کر دیا۔'' ظفر اللہ خان مزید لکھتا ہے کہ ''آخر کار جب سلامتی کونسل میں چینی نمائندے نے، جو مارچ کے مہینے میں کونسل کا صدر تھا، ایک نئی قرارداد کا مسودہ پیش کیا تو ہمارے سب خدشات صحیح ثابت ہوئے۔ یہ قرارداد ان تجاویز کے مطابق تھی جس

کا ذکر وزیراعظم ایٹلی نے میرے ساتھ لندن میں کیا تھا۔ پہلی قرارداد کے مقابلے میں یہ قرارداد بہت کمزور تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جب مسٹر نوئیل بیکر سر گوپالا سوامی آئنگر اور سر گرما شنکر باجپائی کے ذریعے پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلی مجوزہ قرارداد منظور کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش میں تھے تو پنڈت صاحب، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر سٹیفورڈ کرپس کے ذریعے وزیراعظم ایٹلی پر زور ڈال رہے تھے کہ پہلی مجوزہ قرارداد کے ان حصوں کو ترک کر دیا جائے جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں۔ وزیراعظم ایٹلی جو شروع ہی سے تحریک پاکستان کے حق میں نہ تھے اور جو قائداعظم سے بھی بغض رکھتے تھے نہایت آسانی سے ادھر مائل ہو گئے اور انہوں نے اپنی پہلی ہدایت کے خلاف اپنے رفیق کار وزیر امور کامن ویلتھ کے مشورے کے خلاف پہلا مؤقف بدل لیا جس کے نتیجے میں نہ صرف پہلی مجوزہ قرارداد کی بجائے ایک نسبتاً کمزور قرارداد سلامتی کونسل میں پیش کی گئی بلکہ سلامتی کونسل کی ساری فضا ہی بدل گئی۔ اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کو معلوم ہو گیا کہ سلامتی کونسل کی مساعی کو ریشہ دوانی اور حکمت عملی سے بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ جس طرح فلسطین کا قضیہ صدر ٹرومین کی یہود نوازی کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کے لیے خصوصاً اور اسلامی دنیا کے لیے عموماً ان گنت مشکلات اور مصائب کا موجب بنا ہوا ہے اس طرح کشمیر کے قضیہ کی ذمہ داری، جس کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ تک نوبت پہنچی اور جو تا حال برصغیر پاک و ہند کے لیے خصوصاً اور سارے مشرق کے لیے عموماً بہت سے خطرات کا بیج اپنے اندر لیے ہوئے ہے، ماؤنٹ بیٹن اور بعض شخصیتوں کے علاوہ وزیراعظم ایٹلی کے سر ہے۔"21

اگر محمد ظفر اللہ خان، چوہدری محمد علی اور اس قسم کے دوسرے پاکستانی مورخین کے اس مؤقف کو کلی طور پر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بات ماننا پڑے گی کہ 1948ء میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں حکومت برطانیہ پر ہندوستان کا دباؤ محض اس لیے نتیجہ خیز ثابت ہوا تھا اور پاکستان کی دولت مشترکہ چھوڑ دینے کی دھمکی بے اثر ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانیہ کی دو چار شخصیتیں پاکستان کے خلاف تھیں اور قائداعظم سے بغض رکھتی تھیں۔ اگر برطانیہ میں ایٹلی، کرپس اور گارڈن واکر کی بجائے چرچل، ایڈن اور میکمیلن برسر اقتدار ہوتے تو برطانوی حکومت کا فیصلہ ہندوستان کی بجائے پاکستان کے حق میں ہوتا، سلامتی کونسل میں پہلی مجوزہ قرارداد منظور ہو جاتی اور پھر کشمیر پاکستان کو مل جاتا۔ بظاہر ان پاکستانی بزرجمہروں کی رائے میں لیبر حکومت نے پہلے

فروری 1948ء کے اوائل میں پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرانے کی جو کوشش کی تھی اور بعد میں اس پالیسی میں جو تبدیلی کی تھی ان کا اس وقت کی عالمی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ چرچل کی کنزرویٹو پارٹی نے پاکستان اور کشمیر کے بارے میں لیبر حکومت کی فروری 1948ء کی پالیسی کی اور پھر اپریل میں اس پالیسی میں یکا یک تبدیلی کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ بعد میں جب کنزرویٹو پارٹی برسر اقتدار آئی تو اس نے ہندوستان کی خوشنودی حاصل کرنے کی پالیسی جاری رکھی تھی اور اس بنا پر جواہر لال نہرو کنزرویٹو پارٹی کے اقتدار کے بعد بھی دولت مشترکہ سے الگ نہیں ہوا تھا۔

برطانوی سامراج نے وزیر خارجہ بیون کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے حلقوں کے زیر اثر پہلا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ ان دنوں مشرق وسطیٰ کے سارے عرب ممالک میں تنازعہ فلسطین کی بنا پر اینگلو امریکی سامراج کے خلاف زبردست عوامی تحریک جاری تھی۔ چونکہ پاکستان نے اقوام متحدہ میں اس مسئلہ پر بحث کے دوران عربوں کے مؤقف کی پرزور وکالت کی تھی اس لیے عرب ممالک میں پاکستان کو پہلے کے مقابلے میں قدرے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ بیون مکتب فکر کے زیر اثر ایٹلی کی حکومت کا ابتداً خیال یہ تھا کہ فلسطین کی تقسیم کے باعث مشرق وسطیٰ میں اینگلو امریکی سامراج کے اثر و رسوخ اور وقار کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اسے پاکستان کی اسلامی مملکت کی وساطت سے دور کیا جا سکے گا اور اس نے امریکی حکومت کو بھی اپنے اس خیال سے متفق کر لیا تھا۔ برطانوی سامراج اب پاکستان کے بارے میں اپنی پرانی پالیسی میں یکا یک بنیادی تبدیلی کر کے نہ صرف یہ چاہتا تھا کہ پاکستان قائم رہے بلکہ کشمیر کے اس کے ساتھ الحاق میں مدد دے کر اس کی خوشنودی بھی حاصل کر لے۔ ان دنوں پاکستان میں عالم اسلام کے اتحاد کے زبردست نعرے لگائے جا رہے تھے بلکہ بعض حلقے تو پاکستان کو عالم اسلام کا لیڈر بنانے کے اعلانات کر رہے تھے۔ مگر لیبر حکومت اس پالیسی پر زیادہ دن تک عمل نہ کر سکی اور اسے کرپس مکتب فکر کے زیر اثر پھر ہندوستان کے حق میں قلابازی کھانا پڑی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ کرپس مکتب فکر کو نہ صرف پاکستان کے پشتینی جاگیردار پٹھوؤں سے بغاوت کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے غلام محمد، سر اکرام اللہ، سر ظفر اللہ، اسکندر مرزا، چوہدری محمد علی، اور عزیز احمد وغیرہ پر مشتمل افسر شاہی کے ٹولے کی وفاداری پر بھی پورا اعتماد تھا۔ اس کے برعکس

کرپس اینڈ کمپنی کو ہندوستان میں ''کامن ویلتھ چھوڑ دو اور سوویت یونین سے ناطہ جوڑو'' کا جو زبردست پراپیگنڈہ کیا جا رہا تھا اس سے حقیقی خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ برطانوی سامراج کو نئے ایشیا میں اپنے سامراجی منصوبوں کی تکمیل کے لیے ہندوستان کی بے پناہ افرادی قوت اور دوسرے وسائل کی اشد ضرورت تھی اور جواہر لال نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کی وساطت سے اسے اس سلسلے میں بھرپور تعاون واشتراکِ عمل کا یقین دلا رکھا تھا۔ نہرو اپنی کانگرس پارٹی کے سابقہ اعلانات کے برعکس نہ صرف ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شامل کرنے پر رضامند ہو گیا تھا بلکہ وہ برطانیہ اور ہندوستان کی مشترکہ شہریت کی بھی باتیں کرتا تھا۔

علاوہ بریں نہرو نے آزادی کے فوراً بعد نہ صرف اندرون ملک کمیونسٹوں کی سرکوبی کے لیے وسیع پیمانے پر مہم شروع کر دی تھی بلکہ اس نے برما کی حکومت کو کمیونسٹوں کی ''بغاوت'' کچلنے کے لیے ہر قسم کی عملی امداد دی تھی۔ اس نے حکومت برطانیہ کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ وہ ملایا میں کمیونسٹوں کی زیرِ قیادت تحریک آزادی کو بزور قوت ختم کرنے کے لیے گورکھا فوج کی بھرتی کر لے۔ اس نے ویتنام میں ہوچی مینہہ (Ho Chi Minh) کی زیرِ قیادت تحریک آزادی کی تائید وحمایت کرنے کی بجائے فرانسیسی سامراج سے تعاون کیا تھا۔ وہ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کا محض اس لیے حامی تھا کہ اس کی عنان قیادت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ وہ برطانوی سامراج کی اس رائے سے متفق تھا کہ انڈونیشیا میں اقتدار بورژوا قوم پرست لیڈروں کو بلا تاخیر منتقل کر دیا جائے ورنہ تحریک آزادی پر مقامی کمیونسٹ پارٹی پوری طرح قبضہ کر لے گی۔ یہی وجوہ تھیں کہ ان دنوں سوویت یونین کے اخبارات میں جب کبھی جواہر لال نہرو کا ذکر کیا جاتا تھا تو اسے ہندوستان کا ''چیانگ کائی شیک'' قرار دیا جاتا تھا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اسے ''سامراجی پٹھو'' کہتی تھی۔ وزیر اعظم ایٹلی نے ان سارے حقائق کے پیش نظر کرپس مکتب فکر کی اس رائے سے بالآخر اتفاق کر لیا کہ چونکہ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹوں کی زیرِ قیادت تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے ہندوستان کی ''سیکولر'' ریاست سے بہت فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اس لیے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کی مخالفت نہ کی جائے اور اسی بنا پر اس نے بیون مکتب فکر کے اس مؤقف کو مسترد کر دیا تھا کہ چونکہ مشرق وسطیٰ میں پاکستان کی ''اسلامی'' مملکت کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اس لیے سلامتی کونسل میں کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کی حمایت کرنی چاہیے۔

اس نے جب اپنے سامراجی ترازو میں ہندوستان کے بورژوا طبقے اور پاکستان کے جاگیردار طبقہ کو دوبارہ تولا تھا تو اسے ہندوستانی بورژوا کا پلڑا بہت بھاری نظر آیا تھا۔ سامراجی نقطۂ نگاہ سے بظاہر کرپس مکتبِ فکر کے دلائل میں بہت وزن تھا اور بعد کے حالات نے ان دلائل کو صحیح ثابت کر دیا۔ ہندوستان بدستور کامن ویلتھ میں شامل رہا اس نے سوویت یونین سے گہرا ناطہ جوڑنے کے لیے بھی کوئی اقدام نہ کیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کی حکومت نے پاکستانی رائے عامہ کے زبردست دباؤ کے باوجود کامن ویلتھ کو نہ چھوڑا اور حکومت برطانیہ کے سفارتی دباؤ کے تحت سوویت یونین سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے کوئی کاروائی بھی نہ کی۔ اس طرح اس پہلی بین الاقوامی سفارتی لڑائی میں ہندوستان کے بورژوا طبقے کی فتح ہوئی اور پاکستان کے جاگیردار طبقے نے بری طرح شکست کھائی۔ سوویت یونین اس سفارتی لڑائی میں غیر جانبدار رہا اور اس نے اپریل 1948ء میں سلامتی کونسل کی قرارداد پر رائے شماری میں کوئی حصہ نہ لیا۔ جوزف کوربل کی رائے یہ ہے کہ سوویت یونین کی غیر جانبداری کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی کامن ویلتھ کے دو رکن ممالک کے درمیان تنازعہ جاری رہے۔ یہ تنازعہ سوویت یونین کے مفاد میں تھا[22] اور اینگلو امریکی سامراج کے لیے نقصان دہ تھا۔

اپریل 1948ء کی بے ضرر قرارداد سے اس تنازعہ کے ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا بلکہ یہ پیش بینی کی جاسکتی تھی کہ کشمیر میں لڑائی جاری رہے گی اور اس طرح اینگلو امریکی سامراج کے عالمی مفاد کو نقصان پہنچتا رہے گا۔ جو عناصر یہ کہتے ہیں کہ کشمیر کا تنازعہ برطانوی سامراج نے دانستہ طور پر پیدا کیا تھا اور وہی اسے جاری رکھ رہا تھا تاکہ اسے برصغیر کے حالات میں مداخلت کا موقعہ ملے ان کا نقطۂ نگاہ سراسر موضوعی ہے۔ وہ نہ صرف کھلے تاریخی حقائق سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ سرد جنگ کے اس دور میں اینگلو امریکی سامراج کی عالمی پالیسی کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے۔ ہندوستان اور پاکستان کا یہ تنازعہ اس زمانہ کی عالمی سامراجی پالیسی کے مفاد میں نہیں تھا۔

باب: 16

# اینگلوامریکی سامراج کی طرف سے پاکستان کی نیم دلانہ حمایت

50-1949ء میں اینگلوامریکی سامراج نے پھر کچھ کوششیں کیں کہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوئی تصفیہ ہوجائے اوراگر وادی کشمیر کا علاقہ پاکستان کومل جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔اس نے پہلی کوشش اگست 1949ء میں کی۔

اقوام متحدہ کے کمیشن نے کشمیر سے بیرونی فوجوں کے انخلا کے بارے میں اپنی کوششوں کی ناکامی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ناظم استصواب ایڈمرل نمٹز کواس مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ثالث مقرر کر دیا جائے۔امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے اعلانیہ اس تجویز کی تائید کی اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے اپیل کی کہ وہ اسے منظور کرلیں۔مگرنہرو نے اس تجویز کومسترد کر دیا۔دوسری کوشش مارچ 1950ء میں ہوئی جبکہ کینیڈا کے جنرل میکناٹن نے سلامتی کونسل کی ہدایت کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے سے غیر رسمی بات چیت کرنے کے بعد یہ منصوبہ پیش کیا تھا کہ دونوں طرف کسی کو بھی خطرہ محسوس نہ ہو، بلتستان اور گلگت کا علاقہ اقوام متحدہ کی زیرنگرانی مقامی حکام کے زیرانتظام رہےاوراقوام متحدہ کاایک ایسانمائندہ مقرر کیا جائے جسے کونسل کے فیصلوں پرعمل درآمد کرانے کے لیے وسیع اختیارات حاصل ہوں۔پاکستان نے اس منصوبے کومنظور کر لینے پرآمادگی ظاہر کی مگر ہندوستان نے اسے نامنظور کر دیا۔تیسری کوشش 11/جولائی 1950ء کو ہوئی جبکہ اقوام متحدہ کے مصالحتی نمائندے سراوون ڈکسن نے یہ تجویز پیش کی کہ صرف وادی کشمیر میں استصواب

کرایا جائے اور ریاست کا باقی علاقہ ہندوستان اور پاکستان میں رائے شماری کے بغیر ہی تقسیم کر دیا جائے۔ مگر نہرو نے اس تجویز کو بھی منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

پاکستان کے حق میں ان تینوں کوششوں کی پہلی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی حکومت نے 48-1947ء میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں برطانوی رائے عامہ کی سازش اور دغابازی کے باوجود کامن ویلتھ کو نہیں چھوڑا تھا حالانکہ اندرون ملک رائے عامہ کی جانب سے برطانیہ اور اس کی کامن ویلتھ کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان نے عالم اسلام کے اتحاد یا اسلامستان کا پرچم لہرا کر مشرق وسطیٰ میں اینگلو امریکی سامراج کے فوجی گٹھ جوڑ کے منصوبے کی تکمیل کرنے میں امداد کرنے کی سرگرمی سے کوشش کی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے پہلے خود ہی 1948ء میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی وساطت سے سوویت یونین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی تحریک کی تھی مگر بعد میں وہ اینگلو امریکی سامراج کے کہنے پر اپنے اس وعدے سے عملی طور پر پھر گیا تھا۔ وہ 1949ء میں سٹالن کی دعوت اعلانیہ قبول کر لینے کے باوجود کوئی وجہ بتائے بغیر سوویت یونین نہیں گیا تھا بلکہ اس کی بجائے وہ ٹرومین کی دعوت پر 1950ء کے اوائل میں امریکہ چلا گیا تھا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران اسلامی مملکت پاکستان کو سوویت یونین اور چین کے خلاف اینگلو امریکی سامراج کے ساتھ صف آرا کرنے پر آمادگی کا اعلانیہ اظہار کیا تھا جبکہ جواہر لال نہرو نے اس سے قبل اپنے دورۂ امریکہ کے موقع پر اس قسم کے فوجی گٹھ جوڑ میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پانچویں وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج اور ہندوستانی توسیع پسندوں کے سارے ''سیاسی نجومیوں'' کی پیش گوئیوں کے برعکس پاکستان کی نوزائیدہ ریاست بے شمار مشکلات و مصائب کے باوجود جاں بحق نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ معاشی طور پر ہندوستان سے زیادہ مستحکم نظر آنے لگی تھی۔ چھٹی وجہ یہ تھی کہ چین میں ماؤزے تنگ کی زیر قیادت اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے بعد عالمی طاقت کا توازن سوویت بلاک کے حق میں ہو گیا تھا اور امریکی سامراج اپنے پاکستانی پٹھوؤں کے تعاون سے لداخ اور گلگت میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنا چاہتا تھا۔

ساتویں اور غالباً سب بڑی وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر تھی۔ گردھاری لال ڈوگرہ، جی۔ ایم۔ پی۔ دھر اور بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی کے علاوہ

بہت سے کمیونسٹ عناصر عبداللہ کی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور اس بنا پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ''شیر اور چیتے کی لڑائی میں گیدڑ شکار اٹھا کر لے جائے گا۔'' جوزف کوربل لکھتا ہے کہ ''چونکہ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے کمیونسٹ سنکیانگ اور تبت سے منسلک ہے اس لیے یہ علاقہ اشتراکیوں کی تخریبی کاروائیوں کے لیے بہترین میدان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقوام متحدہ میں سوویت نمائندے اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی...... جب 1946ء میں شیخ عبداللہ نے آل انڈیا کانگرس کی مرضی اور منظوری کے بغیر ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کی تھی تو سوویت یونین کے ایک مبصر ڈایاکوف نے اس کی تائید کرتے ہوئے شیخ عبداللہ کو ایک ترقی پسند اور جمہوری آراء کا حامل لیڈر قرار دیا تھا۔ جب ستمبر 1947ء میں شیخ عبداللہ نے اپنی رہائی کے بعد ''ریاست کے الحاق سے پہلے آزادی'' کی مہم چلائی تھی تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اس کی بھرپور تائید وحمایت کی تھی۔ بمبئی کے ماہنامے ''کمیونسٹ'' نے اپنی اکتوبر کی اشاعت میں لکھا تھا کہ ''سامراج کی چال یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کی زیر قیادت جاری شدہ عظیم جمہوری تحریک میں رخنہ ڈالا جائے...... ہمیں یقین ہے کہ نیشنل کانفرنس سامراج کی ان کوششوں کو ناکام کر کے موجودہ مطلق العنان حکومت کو ختم کرے گی اور اپنے پروگرام کے مطابق کلی طور پر جمہوری حکومت قائم کریگی اور پھر جب شیخ عبداللہ ریاست کی وزارت عظمیٰ کی گدی پر فائز ہوا تھا تو ایک سوویت اخبار نویس اورلسیٹوف کی یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ شیخ عبداللہ کی زیر قیادت نیشنل کانفرنس ہمیشہ برطانوی سامراج کے خلاف عوامی جدوجہد میں پیش پیش رہی ہے۔ قبائلیوں کی سری نگر سے پسپائی کے بعد پورے شہر میں سرخ جھنڈوں کا سیلاب آ گیا تھا۔ ہر سینے پر سرخ گلاب لگا ہوا تھا اور شہر کے مرکزی چوک کا نام ریڈ سکوئر رکھ دیا گیا تھا۔ اگرچہ شیخ عبداللہ کی حکومت عوامی حمایت کے باوجود ہندوستان کے رجعت پسندوں کے مقابلہ میں کمزور ثابت ہوئی ہے تاہم کشمیر کے عوام الناس میں سوویت یونین کے لیے بہت دوستی اور دلچسپی پائی جاتی ہے۔''[1]

31/دسمبر 1948ء میں دہلی کے اخبار سٹیٹسمین نے لکھا تھا کہ ''کشمیر میں کچھ عرصے سے کمیونسٹوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ نیشنل کانفرنس اور موجودہ انتظامیہ کے بارے میں ان کا رویہ قابل توجہ ہے۔ اگرچہ مقامی کمیونسٹوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے ریاست میں کسی حد تک اپنے قدم جما لیے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کہیں کہیں نیشنل کانفرنس کی

کمیٹیوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ تاہم کمیونسٹ عناصر نیشنل کانفرنس اور اس کی حکومت پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دبی زبان میں اور بالواسطہ ہوتی ہے۔ کمیونسٹ مزدور یونینوں اور اس قسم کی دوسری تنظیموں میں بھی گھس گئے ہیں اور عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے دوسر کردہ کمیونسٹ لیڈر کشمیر میں آ گئے ہیں'' اور اسی دن کلکتہ کے ''امرت بازار پتریکا'' نے یہ رپورٹ شائع کی تھی کہ ''کمیونسٹوں نے حیدآباد میں ہزیمت اٹھانے کے بعد کشمیر کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس علاقہ میں انڈین یونین کی گرفت ابھی تک انتہائی ڈھیلی ہے۔ میرے پاس یہ بیان کرنے کی خاصی وجوہ موجود ہیں کہ گذشتہ چند ہفتوں سے ریاست کی موجودہ افراتفری سے فائدہ اٹھانے کے لیے مقامی کمیونسٹ خود کو بڑی تیزی کے ساتھ منظم کر رہے ہیں۔ چند دن ہوئے ہندوستان کا ایک سرکردہ کمیونسٹ لیڈر کلبیر سنگھ خفیہ طور پر کشمیر آیا تھا اور بعض اطلاعات کے مطابق ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری کامریڈ رندیو نے بھی حال ہی میں کشمیر کا دورہ کیا ہے۔''

جوزف کوربل مزید لکھتا ہے کہ ''کمیونسٹوں کو شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس اور اس حکومت میں خاصا اونچا مقام حاصل تھا۔ جی۔ ایم۔ صادق نیشنل کانفرنس کا صدر تھا۔ دُرگا پرشاد دھر نائب وزیر داخلہ تھا اور گردھاری لال ڈوگرہ وزیر خزانہ تھا۔ نرنجن ناتھ رائینا کمیونسٹ پارٹی کا چیف ایجنٹ تھا۔ وہ سری نگر میں کتابوں کی ایک دکان کا مالک تھا اور ایک ہفتہ روزہ ''آزاد'' شائع کرتا تھا۔ جموں میں پارٹی کا چیف دھنومنتری تھا اور وہ ایک روزنامہ ''شمشیر'' شائع کرتا تھا۔ ایک اور کمیونسٹ بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی نے نیشنل کانفرنس کا پروگرام بعنوان ''نیا کشمیر'' لکھا تھا۔ وہ پس پردہ عبداللہ کی حکومت پر اثر انداز ہوتا تھا اور اس کی یورپین بیوی ''فریڈا'' درسی کتابوں کی کمیٹی کی رکن تھی۔ جی۔ ایم۔ صادق لیبر یونین کا بھی لیڈر تھا جس کے ساتھ دوسری متعدد یونینیں ملحق تھیں اور کمیونسٹوں کو سٹوڈنٹس فیڈریشن، ڈیموکریٹک یوتھ لیگ، کلچرل فرنٹ اور پروگریسو رائٹرز لیگ میں بھی خاصا عمل دخل حاصل تھا۔ دوسری طرف سوویت یونین اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی کوشش یہ تھی کہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوئی مصالحت نہ ہونے پائے۔ اقوام متحدہ میں سوویت یونین کا رویہ اسی لیے غیر جانبدارانہ تھا اور اس نے ابتدائی سالوں میں اس مسئلہ پر لب کشائی کرنے سے اس لیے گریز کیا تھا کہ اسے اس تنازعہ کے پرامن تصفیہ کی

کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کوربل کا کہنا ہے کہ ''نیشنل کانفرنس کے غیر کمیونسٹ لیڈر بھی مقامی کمیونسٹوں کے زیر اثر کھلم کھلا مغربی ممالک کے خلاف بولتے تھے۔ جب اپریل 1948ء میں سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر زیر بحث تھا تو نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری مولانا سید مسعودی نے اعلان کیا تھا کہ ''امریکہ اور برطانیہ جیسی سامراجی طاقتوں نے تنازعہ کشمیر میں پاکستان کو ایک بے گناہ فریق کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ ایسا محض اس لیے کر رہی ہیں کہ وہ آئندہ جنگ کے لیے کشمیر میں اپنے فوجی اڈے قائم کر سکیں'' اور شیخ عبداللہ نے یہ کہا تھا کہ ''سامراجی طاقتیں کشمیر کو محض روس کے ہمسایہ کی حیثیت سے دیکھتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ یہ علاقہ ان کی آئندہ جارحیت کے دوران روس کے گھیراؤ کا اہم اڈا بن سکے گا۔''

بمبئی کے کمیونسٹ نواز ہفت روزہ بلٹز (Blitz) نے اپنی 9/جون 1948ء کی اشاعت میں ایک شخص جی۔ کے۔ ریڈی کی طرف ''عظیم سازش'' کے زیر عنوان یہ ''سنسنی خیز انکشاف'' کیا تھا کہ کشمیر پر حملے کا منصوبہ برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں نے بنایا تھا اور انہوں نے اس منصوبے کی تکمیل میں امداد کی تھی۔ اس پر اس ''عظیم سازش'' کا راز اس وقت کھلا تھا جب کہ وہ آزاد کشمیر کی حکومت میں خفیہ طور پر ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے عہدے پر فائز تھا۔'' بمبئی کے کمیونسٹ ہفت روزہ پیپلز ایج (Peoples Age) کا کشمیر کے مسئلہ کے بارے میں اقوام متحدہ، کے کمیشن کی 1949ء کے اواخر کی رپورٹ پر تبصرہ یہ تھا کہ یہ رپورٹ جموں و کشمیر کی جمہوری عوامی تحریک کے خلاف برطانیہ اور امریکہ کے سامراجیوں کی مکروہ سازشوں کا نقطۂ عروج ہے۔ ان سامراجی طاقتوں کی اب تک پالیسی یہ رہی ہے کہ پاکستان کے رجعت پسندوں کی امداد سے کشمیر میں جنگ کو ہوا دے کر اور مداخلت کر کے وہاں کی جمہوری عوامی تحریک کو کچلا جائے، لوگوں کو غلام بنایا جائے اور پھر اس علاقے میں سوشلسٹ سوویت یونین اور چین کی جمہوری قوتوں کے خلاف اینگلو امریکی جنگی اڈے قائم کیے جائیں مگر آئندہ اس مقصد کی تکمیل ''پرامن'' طریقے اور ''آزادانہ وغیر جانبدارانہ استصواب'' کرانے کی آڑ میں کی جائے گی۔ یہ مجوزہ استصواب امریکی سامراج کے فوجی اور سول ایجنٹوں کی نگرانی میں ہوگا جنہوں نے اقوام متحدہ کے کمیشن افسروں کا لبادہ اوڑھا ہوگا اور ایک کمیونسٹ مصنف راج ہنس کرشن کی رائے یہ تھی کہ ''اقوام متحدہ اس کا کمیشن اور اس کا نمائندہ سر اوون ڈکسن اینگلو امریکی جنگ بازوں کے حکم کی تعمیل کرتے رہے

ہیں۔ان کی خواہش یہ رہی ہے کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی ترقی پسند تحریک کو کچلا جائے اور پھر وہاں ہندوستانی اور پاکستانی سرمایہ داروں کی امداد سے سوویت یونین پر حملہ کے لیے فوجی اڈا قائم کیا جائے۔لیکن چیکوسلواکیہ کے نمائندہ ڈاکٹر چائل نے اپنے اختلافی نوٹ میں کشمیر کی جمہوریت کے خلاف سامراجیوں کی اس بہت بڑی سازش کو بے نقاب کر دیا ہے۔''

1949ء کے اواخر میں نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں جو قرار دادیں منظور کی گئیں تھیں ان کے مضمون اور انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مقامی کمیونسٹوں نے اس جماعت پر پوری طرح غلبہ حاصل کرلیا ہے۔ایک قرارداد میں 1948ء کی اس مضمون کی قرارداد کا اعادہ کیا گیا تھا کہ ''چونکہ کشمیر کو نئے کشمیر پر پختہ یقین اور بنیادی مسائل کے بارے میں اس کا نظریہ بہت ترقی یافتہ ہے۔اس لیے نیشنل کانفرنس کی رائے میں یہ ایسے پاکستان میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکتا جس نے آج کل رجعت پسندی اور زوال پذیر جاگیرداری کے سب سے بڑے قلعہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔'' ایک اور قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''چونکہ پاکستان اس سامراجی ریشہ دوانی کی وجہ سے وجود میں آیا تھا جو ہندوستان کی، برصغیر میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی جمہوری تحریک کو کمزور کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس لیے اس کی پیدائش کی اس تاریخ سے ہمارے ان شکوک وشبہات کو تقویت پہنچتی ہے کہ سامراجی جنگباز اس ملک کی وساطت سے کشمیر کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔نیشنل کانفرنس کسی صورت بھی طاقتی سیاسیات اور بین الاقوامی دھڑے بندیوں کی آلہ کار نہیں بنے گی۔''[2]

پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''جب 1948ء کے وسط میں کمیونسٹوں نے تقریباً سارے چین پر قبضہ کرلیا تھا اور کچھ عرصے بعد ان کی فوجیں سنکیانگ اور تبت میں پہنچ گئی تھیں، شیخ عبداللہ نے کمیونزم کا کچھ زیادہ ہی زور شور سے خیر مقدم کرنا شروع کر دیا تھا اور جب جون 1950ء کے وسط میں کوریا کی جنگ شروع ہوئی تھی تو شیخ عبداللہ نے اپنی تقریروں میں کمیونسٹوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے امریکی سامراج کی مذمت کی تھی۔جگہ جگہ کمیونسٹوں کی زیر قیادت امن کمیٹیاں بنی تھیں اور جی۔ایم۔صادق نے سری نگر میں ایک اجتماعی جلوس کی قیادت کی تھی......کمیونسٹوں نے شیخ عبداللہ کی مقامی حریت پسندوں کو کچلنے کی کاروائی کی حمایت کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی، حکومت ہندوستان نے کبھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا اور سارے ہندو یقیناً اس

پالیسی کو پسند کرتے تھے۔تاہم 49-1948ء میں جواہر لال نہرو سوویت یونین کا منظور نظر نہیں تھا اور روسی اخبارات اور ماسکو ریڈیو کے ذریعے اسے ''اینگلو امریکی سامراج کا پٹھو'' قرار دیا جاتا تھا۔ چونکہ نہرو کی حکومت نے 1948ء میں حیدرآباد میں کمیونسٹوں کی مسلح بغاوت کو کچلنے کے لیے وسیع پیمانہ پر مہم چلائی تھی اس لیے ان دنوں کشمیر کے کمیونسٹوں کی پالیسی یہ تھی کہ کشمیر کو ہندوستان سے جس قدر ممکن ہو الگ تھلگ رکھا جائے۔ وہ عبداللہ سے کہتے تھے کہ اگر کشمیر کی مسلم ریاست انڈیا کی ہندو ڈومینین میں مدغم ہوگئی تو اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ جب کبھی مرکزی حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت کی جاتی تھی تو وہ شیخ عبداللہ سے کہتے تھے کہ اپنی جگہ پر ڈٹے رہو۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ کشمیر کو ہندوستان یا پاکستان میں شامل نہیں ہونا چاہیے اور فی الحال آزاد رہنا چاہیے۔ بلاشبہ ان کا خیال تھا کہ مناسب وقت آنے پر اس علاقے کو سوویت یونین کا حصہ بنا دیا جائے گا اور پھر کشمیر کے قوم پرست زعماء اپنے نئے کشمیر کے انقلابی منصوبے پر عمل کر سکیں گے۔ وہ دراصل کشمیر کو ہندوستان کا ''ینان'' (Yenan) بنانا چاہتے تھے اور انہوں نے عبداللہ کو یقین دلایا ہوا تھا کہ ان کا یہ منصوبہ قابل عمل ہے کیونکہ کشمیر کی سرحدیں سوویت یونین کے علاوہ چین سے بھی ملتی ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو گوریلا جنگ کے لیے ان دونوں ممالک سے اسلحہ اور گولا بارود مہیا ہو سکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ عبداللہ نے اپریل 1949ء میں ''لندن آبزرور'' سے ایک انٹرویو کے دوران کشمیر کے ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کی مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ''کشمیر کو آزاد ہونا چاہیے اور ہندوستان، پاکستان، برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ اقوام متحدہ کے دوسرے رکن ممالک کو اس آزادی کی ضمانت دینی چاہیے۔'' لیکن بعد میں 18 رمئی کو حکومت ہندوستان کے دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے اس بیان سے پھر گیا تھا۔

پریم ناتھ بزاز کا مزید بیان یہ ہے کہ کشمیر کے سرکاری حلقوں سے باہر کمیونسٹوں کو کوئی مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ وادی کشمیر کے مسلم عوام ان سے نفرت کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ کشمیر کی کمیونسٹ پارٹی زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھی اور ان ہندو کمیونسٹوں نے مارکسزم کی علمبرداری کے باوجود اپنے فرقہ وارانہ رجحان کو ترک نہیں کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کشمیر کا دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملحق ہونا لازمی ہے تو پھر اسے ہندوستان میں شامل ہونا چاہیے۔ ان کا یہ فرقہ پرستانہ رویہ کشمیری مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا اور اسی بنا پر 1950ء میں کشمیر کمیونسٹ

پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ جب پارٹی کے مسلم ارکان کی اکثریت محی الدین کرا کی قیادت میں ہندو کمیونسٹوں سے الگ ہو گئی تھی تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے کشمیر پارٹی کے ہندو دھڑے کا ساتھ دیا تھا۔ بزاز کا الزام یہ ہے کہ کشمیر کے کمیونسٹ تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کے سخت خلاف تھے کیونکہ اس تنازعے کے باعث نہ صرف انہیں مقامی طور پر سیاسی فوائد حاصل ہو رہے تھے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی سوویت یونین کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس تنازعہ کے پرامن تصفیہ کی کوئی اُمید نظر آتی تھی تو کمیونسٹ پارٹی بہت شور مچاتی تھی اور لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے خوف و خطرات پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کمیونسٹوں کو معلوم تھا کہ اگر تنازعہ کشمیر کا کوئی پرامن تصفیہ ہو گیا تو انہیں مقامی حکومت میں جو مقامات اور مراعات حاصل ہیں وہ ان سے فوراً محروم ہو جائیں گے۔[3]

ظاہر ہے کہ جوزف کوربل، پریم ناتھ بزاز، رسل برائینز اور اسی قسم کے دوسرے مورخین نے 50-1947ء میں کشمیری کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کی جو تفصیل لکھی ہے اس میں کمیونزم دشمنی کا رجحان خاصا نمایاں ہے۔ لہٰذا اس امر کا امکان ہے کہ انہوں نے مبالغہ آرائی کی ہو اور ممکن ہے کہیں کہیں غلط بیانی بھی کی ہو۔ لیکن ان کی یہ ساری تفصیل محض بے بنیاد افسانہ نہیں ہے۔ اس میں درج ذیل بعض باتیں ایسی ہیں کہ جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔

(1) 50-1947ء میں شیخ عبداللہ کی حکومت خاصی حد تک مقامی کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی۔ متعدد سرکردہ کمیونسٹ لیڈر اور ان کے ہمعصر شیخ عبداللہ کی حکومت سے بھرپور تعاون و اشتراک عمل کرتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے ان کا تعاون اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ کوئی ''ترقی پسند اور جمہوریت نواز'' تھا بلکہ اس لیے کہ اسے ان دنوں اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے وسیع المشرب ہندو کمیونسٹوں کی امداد کی ضرورت تھی۔

(2) شیخ عبداللہ اپنی تقریروں میں اشتراکی اصطلاحات استعمال کرتا تھا۔ اس نے 49-1948ء میں عالمی سرد جنگ کے دوران کشمیر کے بارے میں اینگلو امریکی سامراج کے عزائم کی کھلے الفاظ میں مخالفت کی تھی اور پھر 1950ء میں کوریا پر امریکی سامراج کے حملے کی پرزور مذمت کی تھی۔ علاوہ بریں کشمیر نیشنل کانفرنس کی قراردادوں میں بھی اینگلو امریکی سامراج کی مذمت کی جاتی تھی۔

(3) اگرچہ 1947-50ء میں سوویت یونین کے اخبارات اور ماسکو ریڈیو کے ذریعے جواہر لال نہرو کو ''سامراجی پٹھو'' اور ''ہندوستان کا چیانگ کائی شیک'' قرار دیا جاتا تھا لیکن روسی ذرائع ابلاغ شیخ عبداللہ کی ''ترقی پسندی اور جمہوریت نوازی'' کی تعریف کرتے تھے۔

(4) چونکہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی پالیسی کبھی بھی اپنے ملک کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حقائق پر مبنی نہیں رہی تھی بلکہ اس کی بنیاد ابتدا ہی سے سوویت یونین کے مفادات پر استوار ہوئی تھی اس لیے یہ پارٹی 1947-50ء کے دوران دوغلی پالیسی پر عمل پیرا رہی تھی۔ ایک طرف تو اس نے ''سامراجی پٹھو'' نہرو کی حکومت کے خلاف وسیع پیمانے پر مسلح بغاوت شروع کر رکھی تھی اور اس پارٹی کے نظریاتی گرو رجنی پالمے دت کے بیان کے مطابق، اس عرصے میں صرف تلنگانہ میں تقریباً 13 ہزار مربع میل کے علاقے میں عوامی راج قائم ہو چکا تھا۔ یہ آزاد علاقہ تقریباً دو ہزار دیہات پر مشتمل تھا اور اس کی آبادی تقریباً 40 لاکھ تھی۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کی زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں اور ہر جگہ عوامی انتظامی کمیٹیاں قائم ہوگئی تھیں۔[4] لیکن دوسری طرف یہی پارٹی کشمیر میں نہرو کے ''ذاتی دوست'' شیخ عبداللہ کی حکومت سے بھرپور تعاون واشتراک عمل کر رہی تھی۔

(5) جواہر لال نہرو کی حکومت نے ایک طرف تو نہ صرف پورے ملک میں کمیونسٹوں کی سرکوبی کے لیے وسیع مہم شروع کر رکھی تھی بلکہ وہ جنوب مشرقی ایشیا کے سارے ممالک میں کمیونسٹ ''بغاوتوں'' کو کچلنے کے لیے سامراجیوں کی عملی طور پر امداد کر رہی تھی لیکن دوسری طرف وہ کشمیر میں کمیونسٹوں اور شیخ عبداللہ کے گٹھ جوڑ پر کوئی اعتراض نہیں کرتی تھی۔ کشمیر میں کمیونسٹوں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی کھلی چھٹی تھی۔

(6) بلاشبہ سوویت یونین کی پالیسی یہ تھی اور اس کے نقطۂ نگاہ سے یہی ہونی چاہیے تھی کہ مسئلہ کشمیر پر ہندوستان اور پاکستان کے تضاد سے فائدہ اٹھا کر اس علاقے میں اینگلو امریکی سامراج کی سوویت یونین کا گھیراؤ کرنے کی پالیسی کو ناکام کیا جائے۔ تنازعہ کشمیر کا جاری رہنا سوویت یونین کے مفاد میں تھا۔ اس نے 1947-50ء میں اس

تنازعہ کے پرامن تصفیہ کے لیے کوئی مثبت کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اس مسئلہ پر بظاہر غیر جانبدار رہا تھا کیونکہ اسے اس وقت تک اس تنازعہ کے تصفیہ کے لیے اینگلو امریکی سامراج کی کوششوں کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی جبکہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی۔

قدرتی طور پر اینگلو امریکی سامراج کو کشمیر کی یہ صورت حال پسند نہیں تھی۔ وہ سوویت یونین اور چین سے متصلہ جنگی اہمیت کے اس علاقے پر کمیونسٹوں کا غلبہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سامراجی نقطۂ نگاہ سے کشمیر کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن، کرپس اور ایٹلی کی پالیسی کے غلط نتائج برآمد ہوئے تھے۔ چنانچہ پہلے برطانوی سامراج نے اور پھر اس سے متاثر امریکی سامراج نے 50-1947ء میں یہ کوشش کی کہ ہندوستان کو کسی نہ کسی طرح مغربی فوجی گٹھ جوڑ میں شامل کرنے پر آمادہ کیا جائے مگر جب نہرو نے سامراجیوں کی اس خواہش کو پورا کرنے سے صاف انکار کر دیا تو انہوں نے بہ امر مجبوری کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ ملحق رکھنے کی پالیسی میں قدرے تبدیلی کر کے یہ کوشش کی کہ کم از کم وادی کشمیر کا انتہائی جنگی اہمیت کا علاقہ کسی پرامن تصفیہ کے ذریعے پاکستان کو مل جائے کیونکہ کراچی کے حکمران ٹولے کی وفاداری شک وشبہ سے بالا تھی۔ کراچی کا سامراج نواز حکمران ٹولہ نہ صرف وادی کشمیر اور گلگت میں سوویت یونین اور چین کے خلاف سامراجی فوجی اڈے قائم کرنے کی سہولت دینے پر آمادہ تھا بلکہ وہ مشرق وسطیٰ میں بھی اسلامی اتحاد کا پرچم لہرا کر سامراجیوں کی خدمات سرانجام دینے کا برملا اعلان کرتا تھا۔ برطانوی سامراج تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کا اس لیے بھی خواہاں تھا کہ ''ہندوستان اور پاکستان کے درمیان محاذ آرائی سے ایشیا کے بارے میں اس کا فوجی منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ برطانوی فوجی منصوبے کی بنیاد اس دیرینہ تصور پر تھی کہ بحر ہند برطانیہ کی جھیل ہے۔ برطانیہ نہ صرف برصغیر ہند کے وسیع وعریض علاقے کو کنٹرول کرتا ہے بلکہ بحر ہند کے بڑے بڑے دہانوں، یعنی راس امید، نہر سویز، خلیج فارس، آبنائے ملاکا، سنگاپور اور شمالی آسٹریلیا پر بھی اس کا کنٹرول ہے۔ برطانیہ کے فوجی ماہرین کے ذہن میں یہ ''حقیقت'' اس قدر پختگی کے ساتھ جاگزیں تھی کہ وہ اس کے ناپید ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سارے فوجی نظام کا انحصار آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے علاوہ ہندوستان پر تھا جہاں سے وہ افرادی قوت حاصل کرتے رہے تھے اور جہاں انہیں بہت

سی سہولتیں حاصل رہی تھیں۔ وہ اپنے فوجی اخراجات بھی ہندوستان ہی سے پورے کیا کرتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی اور پھر ان دونوں کی محاذ آرائی نے اس سارے فوجی نظام کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔''[5]

لیکن اینگلو امریکی سامراج تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کی اس خواہش اور کوشش میں ہندوستان کو اتنا ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ دولت مشترکہ سے الگ ہو کر اپنے آپ کو سوویت بلاک سے پوری طرح وابستہ کر لے۔ نہرو نے 1949ء میں اپنے دورۂ امریکہ کے موقع پر اینگلو امریکی سامراج کی سوویت یونین کے خلاف عالمی سرد جنگ میں کٹھ پتلی بننے سے معذوری ظاہر کر کے ان کے مجوزہ معاہدوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا تاہم اس وقت تک اس کی داخلی اور خارجی پالیسیاں تقریباً سو فیصد مغربی سامراج کی پالیسیوں سے مطابقت رکھتی تھیں۔ پالمے دت کے بیان کے مطابق ''نہرو کی حکومت پرانے برطانوی سامراج سے بدستور وابستہ تھی۔ اس کی سول اور فوجی مشینری کا ڈھانچہ وہی تھا جو برطانوی سامراجیوں نے تعمیر کر رکھا تھا۔ وہی بیوروکریسی، وہی عدلیہ اور وہی پولیس تھی اور عوام الناس پر جبر و تشدد کے بھی وہی سامراجی طریقے تھے۔ نہتے عوام کو لاٹھیوں اور گولیوں سے مارا جاتا تھا اور انہیں جلسوں اور جلوسوں کی ممانعت تھی۔ لوگوں کو کوئی الزام عائد کئے بغیر نظر بند کر دیا جاتا تھا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں کو دبایا جاتا تھا اور جیلیں بائیں بازو کے ہزاروں سیاسی قیدیوں سے بھری پڑی تھیں۔ سامراج کی سرمایہ کاری اور مالی مفادات کا بڑی سرگرمی سے تحفظ کیا جاتا تھا اور بیرونی سامراجیوں کو غریب عوام کا استحصال کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ فوج پر بھی انگریزوں کا غلبہ تھا اور ابتدائی مراحل میں تو نہ صرف گورنر جنرل انگریز تھا بلکہ اہم صوبوں میں گورنری کے عہدوں پر بھی انگریز متعین تھے۔ نہ صرف تینوں افواج کے کمانڈر انچیف انگریز تھے بلکہ افواج کے بہت سے دوسرے کلیدی عہدوں پر بھی انگریز افسر بطور مشیر فائز تھے۔ عوامی تحریکوں بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کو بری طرح کچلا جاتا تھا۔ 1948ء میں کمیونسٹ پارٹی، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس، مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں اور بائیں بازو کے اخبارات کے خلاف بڑی جارحانہ کاروائی کی گئی تھی۔ پہلے مغربی بنگال اور پھر مدراس میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی تھی اور دوسرے صوبوں میں بھی پارٹی تقریباً غیر قانونی حالت میں ہی تھی۔ مزدوروں کے تقریباً سارے بڑے بڑے لیڈر جیلوں میں بند تھے

اور جیلوں کے اندر و باہر بہت سے نہتے مظاہرین پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے تھے۔ سامراجیوں نے غریب عوام کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے جو قوانین بنائے ہوئے تھے ان میں سے کسی قانون کو منسوخ نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان سب کو مزید سخت کر دیا گیا تھا۔ 1949ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کے بیان میں بتایا گیا تھا کہ ان دنوں مزدوروں اور کسانوں کے تقریباً 25 ہزار لیڈر جیلوں میں تھے اور ان میں سے بیشتر کے خلاف نہ تو کوئی الزام عائد کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی مقدمہ چلایا گیا تھا۔ 1950ء میں حکومت ہندوستان نے ایک سرکاری بیان میں تسلیم کیا تھا کہ 15 راگست 1947ء سے لے کر یکم اگست 1950ء تک پولیس اور فوج نے 1982 مرتبہ گولی چلائی تھی جس سے 3784 افراد مارے گئے تھے اور تقریباً 10000 زخمی ہوئے تھے۔ تقریباً 50000 افراد کو قید کیا گیا تھا جن میں سے 82 قیدی جیلوں کے اندر پولیس کی گولیوں سے جاں بحق ہو گئے تھے۔

رجنی پالمے دت نے نئے ہندوستان کے معاشی اور انتظامی ڈھانچے کا تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ 50-1947ء میں نہرو کی معاشی پالیسی بھی مغربی سامراج کے مفادات کی تابع تھی۔ انڈین نیشنل کانگرس نے آزادی سے پہلے ہندوستانی معیشت پر غیر ملکی کنٹرول کو ختم کرنے کے لیے بڑی بڑی صنعتوں کو قومیانے کا جو پروگرام بنایا ہوا تھا نہرو کی حکومت نے اس پر کوئی عمل نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس نے 17 رفروری 1948ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ ملک کے معاشی ڈھانچے میں یکا یک کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ موجودہ صنعتوں کو حتی الامکان قومی ملکیت میں نہیں لیا جائے گا۔ پھر اپریل 1948ء میں حکومت ہندوستان نے اپنی معاشی پالیسی کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی اُس میں نہرو کے اس اعلان کی رسمی طور پر تصدیق کی گئی تھی۔ اس قرارداد کے مطابق قومیانے کی پالیسی ملکی اور غیر ملکی بڑی بڑی اجارہ دار کمپنیوں کے حق میں ترک کر دی گئی تھی۔ قرارداد کے ساتھ جو میمورنڈم شائع کیا گیا تھا اس میں غیر ملکی سرمایہ داروں کو یقین دلایا گیا تھا کہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو ہندوستان کی صنعتوں میں سرمایہ کاری کرنے کی کھلی چھٹی ہو گی۔ چنانچہ ایک طرف تو لندن کے ہفت روزہ ''اکونومسٹ'' کی رائے یہ تھی کہ اگر ہندوستان نے برطانوی ڈومینین سٹیٹس (Domininion Status) کو ترک کر دیا تو بھی برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان معاشی اور فوجی روابط قائم رہیں گے اور دوسری

طرف ہندوستان کے بڑے بڑے صنعت کار اور تاجر نہرو کی اس بے قید معاشی پالیسی سے بہت خوش تھے۔ وہ نہرو کی خارجہ پالیسی کو بھی بہت پسند کرتے تھے جس پر بمبئی کے ہفت روزہ ''ایسٹرن اکونومسٹ'' کا تبصرہ یہ تھا کہ ساری سیاسی مین میخ اور ہیرا پھیری کے باوجود ہماری خارجہ پالیسی کا قطعی طور پر تعین ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کامن ویلتھ سے ہمارے مراسم دوستانہ ہوں گے۔ چونکہ کامن ویلتھ کی سوویت یونین کی بجائے امریکہ سے بہت دوستی ہے اس لیے ہم بھی امریکہ کی طرف مائل ہوں گے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اقوام متحدہ میں یا کسی اور جگہ بعض غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے مسائل کے سوا کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتے جو کامن ویلتھ اور امریکہ کے رویے سے متصادم ہو۔ جب اپریل 1949ء میں کامن ویلتھ وزرائے اعظم کی کانفرنس نے اعلان کیا کہ ہندوستان ایک آزاد و خود مختار جمہوریہ ہونے کے باوجود برطانوی کامن ویلتھ میں شامل رہے گا تو سارے سامراجیوں نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا تھا۔ جب اکتوبر 1949ء میں نہرو امریکہ گیا تھا تو نیویارک ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ ایشیا میں ایک جمہوری مرکز کے قیام کے لیے واشنگٹن نے اپنی امیدیں ہندوستان سے، جو ایشیا کی دوسری سب سے بڑی قوم ہے اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے، جو ہندوستان کی پالیسی متعین کرتا ہے، وابستہ کر رکھی ہیں اور پھر اسی اخبار نے اگست 1950ء میں نہرو کے 1949ء میں مغربی فوجی معاہدوں میں شرکت سے انکار کے باوجود لکھا کہ نہرو دراصل جمہوریت کی جانب سے ماؤزے تنگ کا جوابی مہرہ ہے۔ اگر پنڈت نہرو ایشیا کی حمایت حاصل کرنے کی جدوجہد میں اتحادی بن جائے تو اس کی قدر و قیمت بہت سی ڈویژنوں کے برابر ہو گی۔[6]

نیویارک ٹائمز نے نہرو کا یہ قصیدہ اس لیے لکھا تھا کہ ''ہندوستان نے جون 1950ء میں کوریا پر امریکی سامراج کے حملے کے متعلق اقوام متحدہ میں اینگلو امریکی سامراج کی قرارداد کی تائید و حمایت کی تھی اور 20/اکتوبر 1950ء کو لندن کے ڈیلی ٹیلی گراف کی ایک رپورٹ کے مطابق چرچل نے امریکی کانگرس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''برطانوی ایمپائر اور کامن ویلتھ میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم اپنے سارے گاہکوں کے ذوق کے مطابق تجارتی لیبل استعمال کرتے ہیں۔''[7]

مشہور امریکی اخبار نویس والٹر لپ مین نے بظاہر ایسے ہی حقائق کی روشنی میں

10 رجنوری 1949ء کے ''نیو یارک ہیرلڈٹر بیون'' میں لکھا تھا کہ ''اب جبکہ قوم پرست چین، نیدرلینڈ اور فرانس ایشیا میں وہ کردار ادا نہیں کر سکے جس کی ہمیں اُن سے توقع تھی تو ہمیں اپنے اتحادیوں کی تلاش کے لیے کس طرف دیکھنا چاہیے؟ ایشیا میں امریکی پالیسی کی تشکیل کے لیے یہ بنیادی مسئلہ حل کرنا ضروری ہے۔ میری رائے میں ہمارے لیے مناسب یہی ہے کہ ہم انڈونیشیا اور چین کے حالات کے بارے میں بلا تاخیر نہرو سے صلاح مشورہ شروع کر دیں۔''[8] غالباً یہ جزوی طور پر اس صلاح مشورے کا نتیجہ تھا کہ 20 رجنوری 1949ء کو نئی دہلی میں انڈونیشیا کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایشین ریلیشنز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں نہرو نے یہ تجویز پیش کی کہ کوئی ایسی تنظیم قائم کرنی چاہیے جس کے ذریعے وہ تمام ایشیائی ممالک، جو اس کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں، آئندہ ایک دوسرے سے رابطہ برقرار رکھ سکیں۔[9] نہرو کی اس تجویز کی فلپائن کے صدر جنرل رومولو نے بھی تائید کی تھی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اس مقصد کے لیے نئی دہلی یا منیلا میں ایک مستقل سیکرٹیریٹ قائم ہونا چاہیے۔[10] اس امریکی پٹھو کا خیال تھا کہ اس طرح ہندوستان کی زیر قیادت اور اینگلو امریکی سامراج کی زیر سرپرستی ایک ایشیائی بلاک وجود میں آ جائیگا جو سوویت یونین اور چین کے خلاف سامراجی عالمی سرد جنگ میں مؤثر کردار ادا کر سکے گا۔ کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں اس قسم کی ''مشینری'' کے قیام کی رسمی طور پر سفارش کی گئی تا کہ ایشیائی ممالک کے درمیان صلاح مشورے اور تعاون کو فروغ حاصل ہو۔ مگر نہرو کی یہ تجویز ٹھوس شکل اختیار نہ کر سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برما، لنکا، پاکستان اور دوسرے چھوٹے ایشیائی ممالک کو خدشہ تھا کہ ہندوستان مجوزہ تنظیم کے ذریعے سارے ایشیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے عزائم رکھتا ہے۔ چونکہ اس کانفرنس میں ویتنام میں ہوچی مینہہ کی حکومت اور سوویت یونین کی ایشیائی ری پبلیکنز کو دعوت نہیں دی گئی تھی اور نہرو اپنے ملک کی آزادی و خودمختاری اور غیر جانبداری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود داخلی اور خارجی طور پر سامراج نواز پالیسی پر عمل کر رہا تھا اس لیے اینگلو امریکی سامراج اور اس کے اخبارات کو اس ایشیائی کانفرنس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نیو یارک ٹائمز کا 30 رجنوری 1949ء کو تبصرہ یہ تھا کہ ایشیا اب طاقت پکڑ رہا ہے تاہم ماضی کے ریکارڈ کی بنا پر پنڈت نہرو اور جنرل رومولو جیسے سیاسی مدبروں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس عمل میں نسلی اور جغرافیائی تعصب کا سدباب کریں گے۔[11] بالفاظ دگر وہ نسلی اور جغرافیائی تعصب

سے بالاتر ہوکر اینگلوامریکی سامراج کی سرپرستی قبول کرلیں گے۔ ماؤزے تنگ کی فوجیں اسی دن پیکنگ میں داخل ہوگئی تھیں اوراس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد چیانگ کائی شیک کی حکومت نانکنگ سے کنٹیان منتقل ہوگئی تھی۔ تاہم لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ کی رائے یہ تھی کہ ایشیا سے برطانیہ کی دستبرداری کے بعد جوطاقت کا خلا پیدا ہوا ہے اسے ہندوستان بخوبی پر کرسکتا ہے کیونکہ نہ صرف اس کے پاس برطانیہ کے سارے روحانی ذرائع موجود ہیں بلکہ اس کے پاس فرانس اور بحرالکاہل کے درمیانی علاقے میں بہترین فوج اورانتظامیہ بھی ہے۔[12]

جواہرلال نہرو کی کمیونزم دشمنی اورسامراج نوازی یہیں پرختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے آئندہ مہینوں میں اپنی اس پالیسی کا دائرۂ عمل وسیع کردیا تھا۔ اس نے پہلے تو ملایا میں کمیونسٹ بغاوت کی سرکوبی کے لیے برطانوی سامراج کوگورکھوں کی بھرتی کے لیے مزید سہولتیں دیں اور پھر فروری 1949ء کے آخری ہفتے میں برطانوی سامراج کی تحریک پر نئی دہلی میں برطانوی ڈومینینوں کی ایک کانفرنس بلائی جس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ مصالحتی کاروائی کے ذریعے برما کی خانہ جنگی بند کرائی جائے لیکن حقیقی مقصد یہ تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے خلاف گٹھ جوڑ کے لیے جاری کردہ اقدامات میں مزید تقویت پیدا کی جائے۔ اس کانفرنس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ پاکستان سمیت برطانوی کامن ویلتھ کے سارے رکن ممالک نے برما کی حکومت کو60لاکھ پونڈ بطورامداد دینے پرآمادگی ظاہر کی تا کہ برما کے بورژوا ارباب اقتدار کمیونسٹوں کی بغاوت کے باعث پیدا شدہ معاشی مشکلات پرقابو پاسکیں۔[13] مارچ میں برطانیہ کے کنزرویٹولیڈر اینتھونی ایڈن نے امریکہ کے محکمۂ خارجہ کے ایشیاسیکشن کی زیرنگرانی نئی دہلی میں ایک خفیہ میٹنگ بلائی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایشیا میں کمیونزم کے سدباب کے لیے کن خطوط پرپراپیگنڈہ کیا جائے گا؟[14] نہرو نے اس میٹنگ کے انعقاداوراس کے مقاصد پرکوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ اس میٹنگ کے فیصلوں کونہرو کی بھرپور ''تائیدوحمایت'' حاصل تھی۔ جب اپریل کے آخری ہفتے میں لندن میں کامن ویلتھ وزارئے اعظم کی کانفرنس ہوئی تو اس میں برما کی حکومت کو فوجی اور مالی امداد دینے کے لیے ''برما ایڈکمیٹی'' قائم کی گئی تھی۔ یہ کمیٹی رنگون میں مقیم ہندوستان، پاکستان، سیلون اور برطانیہ کے سفیروں پرمشتمل تھی۔[15]

نہرو نے اس کانفرنس سے واپس آکر 7رمئی کوبمبئی میں اعلان کیا کہ اسے اکتوبر میں

امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت موصول ہوئی ہے اور 9ر جولائی کو لندن ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق لیبر حکومت کے وزیرخزانہ سر سٹیفورڈ کرپس نے لندن میں انڈین مرچنٹس بیورو کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ایشیائی دنیا کے استحکام کو ہر طرف سے خطرہ لاحق ہے اور اس استحکام کا زیادہ تر انحصار ہندوستان کی قیادت پر ہے اور برٹش کامن ویلتھ ریلیشنز کے پروفیسر بیلی نے کہا کہ'' ہندوستان پر اس کی جغرافیائی پوزیشن اور جنوب مشرقی ایشیا میں قیادت کی صلاحیت کی وجہ سے وسیع ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔''[16]

لہٰذا جب جواہر لال نہرو ہندوستان کے اندر اور جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے سدباب کے لیے اس قدر سرگرم عمل تھا اور اس بنا پر اینگلو امریکی سامراج کے زعماء اور اخبارات ہندوستان اور اس کے وزیراعظم کی اہمیت و وقعت کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا اعلانیہ اظہار کر رہے تھے تو تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کے لیے ان کی جانب سے ہندوستان پر ایک خاص حد سے زیادہ دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ انہیں امید تھی کہ اگر نہرو کے شخصی پندار کی تسکین کر دی جائے تو ہندوستان ان کے مجوزہ فوجی معاہدوں میں شامل ہو جائے گا۔ بالخصوص ایسے حالات میں کہ سوویت یونین اور چین کے ذرائع ابلاغ نہرو کو ''سامراج کا پالتو کتا'' اور ''ہندوستان کا چیانگ کائی شیک'' قرار دے رہے تھے۔[17] یہی وجہ تھی کہ جب ستمبر 1949ء میں جواہر لال نہرو نے صدر ٹرومین اور وزیراعظم ایٹلی کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی کہ کشمیر سے فوجوں کے انخلا کے تنازعہ کے حل کے لیے ایڈمرل نمٹز کو ثالث تسلیم کر لیا جائے تو انہوں نے کوئی برا نہیں منایا تھا۔ اگرچہ اکتوبر میں نہرو نے امریکہ اور کینیڈا کے دورے کے دوران مغربی سامراجیوں کے فوجی معاہدوں میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا تاہم اینگلو امریکی سامراج اس سے بالکل مایوس نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نہرو اس دورے کے بعد بھی جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹوں کی سرکوبی کے لیے برطانوی سامراج سے بدستور عملی تعاون کرتا رہا تھا۔ جب دسمبر میں برما کا وزیراعظم نئی دہلی آیا تھا تو نہرو نے برما میں کمیونسٹوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک مشترکہ جامع منصوبے پر عمل کرنے پر آمادگی کے علاوہ فوجی امداد بھی دی تھی۔ بعض اخباری رپورٹوں کے مطابق ہندوستان کی فوجوں نے برما کی حدود میں داخل ہو کر کمیونسٹ باغیوں کے خلاف کارروائیاں کی تھیں۔ ان اخباری رپورٹوں کی تصدیق 17ر مارچ 1950ء کو ہوئی جبکہ وزیراعظم نہرو نے لوک سبھا میں

تقریر کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ حکومت ہندوستان برما میں کمیونسٹ باغیوں کے خلاف برما کو ہر قسم کی امداد دیتی رہی ہے۔ نہرو نے کہا کہ برما میں گذشتہ دو تین سال سے بہت گڑ بڑ ہو رہی ہے اور اس بناء پر اس ملک کو بہت سی مشکلات در پیش ہیں۔ قدرتی طور پر ہماری حکومت اور عوام برما کے حال اور مستقبل میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن ہم اپنے دوستوں کی حتی الامکان امداد کرتے ہیں۔ ہم نے برما کو اسی قسم کی امداد دینے کی کوشش کی ہے۔[18]

ہندوستان کے ایک ہفت روزہ ''ری پبلک'' کا نہرو کی اس تقریر پر تبصرہ یہ تھا کہ ''حکومت ہندوستان برما کے بارے میں جس پالیسی پر عمل پیرا ہے اسے غیر جانبدارانہ پالیسی نہیں کہا جا سکتا۔ دولت مشترکہ کی طرف سے برما کو جو قرضہ دیا جا رہا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے جیسی کہ امریکہ کی جانب سے ویتنام میں باؤ دائی کی حکومت کو دی جانے والی فوجی امداد کی۔ اگر ہم اس کے باوجود اپنے آپ کو غیر جانبدار یا غیر وابستہ کہتے رہیں تو کوئی سرکاری طور پر ہمیں ایسا کہنے سے روک نہیں سکتا۔ تاہم ہمیں اتنا تو کرنا چاہیے کہ اپنے آپ کو امریکہ کی ملوث ہونے کی پالیسی سے برتر تصور نہ کریں۔''[19]

شنگھائی کے ایک اخباری مبصر کی رائے یہ تھی کہ امریکی سامراج نے ایشیا میں ہندوستان سے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے مالی امداد کے پروگرام میں ہندوستان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ نہرو کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو امریکہ سے امداد حاصل کرنے کا خواہاں ہے اور دوسری طرف ہندوستانی عوام کو فریب دینے کے لیے ترقی پسندی کا منافقانہ کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔[20] 13 رمئی کو پیکنگ ریڈیو کے ایک نشریہ میں چین کے صوبہ تبت کے خلاف ہندوستانی توسیع پسندوں اور امریکی سامراجیوں کی سازش کی شدید مذمت کی گئی۔ ریڈیو کا الزام یہ تھا کہ نئی دہلی میں مقیم امریکی سفیر ہنڈرسن (Handerson) اور حکومت ہندوستان نے ایک معاہدہ کیا ہے جس کے تحت حکومت امریکہ رائفلیں، مشین گنیں اور دوسرے ہتھیار کلکتہ پہنچائے گی اور وہاں سے اسلحہ پہاڑی سڑکوں کے ذریعہ تبت میں پہنچایا جائے گا۔ پیکنگ کے اس الزام کی بالواسطہ تصدیق 17 رجولائی کو ہوئی جب کہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے اعلان کیا کہ ہندوستان نے تبت پر چینیوں کی حاکمیت کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسی دن حکومت برطانیہ نے یونائیٹڈ پریس

انٹرنیشنل کو بتایا کہ اگر چین نے بزورقوت تبت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی تو موخرالذکر برطانیہ کو مداخلت کی درخواست کرسکتا ہے اور پھر 8 راگست کو حکومت ہندوستان نے اعلان کیا کہ ریاست بھوٹان نے بھی اس کے زیر تحفظ علاقے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور تبت نے چین کی حاکمیت کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔[21] ان حالات میں اینگلو امریکی سامراجیوں کو ایشیائی کمیونزم کے خلاف بورژوا ہندوستان کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ وہ جاگیردارانہ پاکستان کی خاطر اتنے بڑے ملک کو اپنے ہاتھ سے کھونا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں پاکستان کے حکمران جاگیردار طبقے اور سامراج نواز افسر شاہی کی جانب سے سرکشی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

لیکن 52-1951ء میں کچھ ایسے بین الاقوامی حالات پیدا ہوئے کہ اینگلو امریکی سامراج نے پھر کھلم کھلا کوششیں کیں کہ تنازعہ کشمیر پاکستان کے حق میں حل ہو جائے۔

پہلی کوشش جنوری 1951ء میں لندن میں کامن ویلتھ وزرائے اعظم کانفرنس کے دوران ہوئی جب کہ تنازعہ کشمیر پر غیر رسمی بات چیت کے دوران آسٹریلیا کے وزیر اعظم رابرٹ مینزیز (Robert Menzies) نے کشمیر میں آزادانہ استصواب کرانے کے لیے تین تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ اس مقصد کے لیے دولت مشترکہ کی فوجوں کو کشمیر میں متعین کیا جائے۔ مگر نہرو نے یہ تینوں تجویزیں مسترد کر دیں۔ دوسری کوشش 30 رمارچ کو کی گئی جب کہ سلامتی کونسل میں ایک قرارداد منظور کرائی گئی۔ جس میں اقوام متحدہ کا ایک اور نمائندہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ''جو تین ماہ کے اندر کشمیر میں سے فوجوں کا انخلا کرائیگا۔'' قرارداد میں مزید کہا گیا تھا کہ ''اگر یہ نمائندہ ناکام ہو گیا تو دونوں حکومتوں کو ایک یا ایک سے زیادہ افراد کی ثالثی قبول کر لینی چاہیے۔'' اگرچہ ہندوستان نے ثالثی کی تجویز کو مسترد کر دیا تاہم اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اپریل میں ایک امریکی سینیٹر ڈاکٹر فرینک گراہم کو اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ 30 رمارچ کی قرارداد پر عمل درآمد کرائے۔ اس شخص نے تقریباً اٹھارہ ماہ تک نئی دہلی اور کراچی میں گفت وشنید کے بعد پانچ رپورٹیں پیش کیں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ چونکہ فوجوں کے انخلا کے بارے میں دونوں حکومتوں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اس لیے اقوام متحدہ کی فوجوں کی نگرانی میں استصواب کرایا جائے۔ حسب معمول اور حسب توقع ہندوستان نے یہ تجویز مسترد کر دی تو ڈاکٹر گراہم نے مارچ 1953ء میں سلامتی کونسل کو اپنی قطعی ناکامی کی رپورٹ پیش

کردی۔اینگلوامریکی سامراج کی ان دونوں کوششوں کی وجوہ یہ تھیں:۔

(1) اگر چہ جواہر لال نہرو نے جون 1950ء میں کوریا پر امریکی سامراج کے حملے کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد کی تائید وحمایت کی تھی لیکن وہ اگست میں پیکنگ میں مقیم اپنے سفیر کے۔ایم۔ پانیکر کے مشورے کے مطابق اپنے اس سامراج نواز مؤقف سے پھر گیا تھا اور اس نے بظاہر غیر جانبدار رویہ اختیار کرکے امریکہ اور چین کے درمیان جنگ بند کرانے کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔امریکی سامراج کو ہندوستان کی اس غیر جانبداری پر سخت غصہ تھا اور وہ مسئلہ کشمیر کی آڑ لے کر ہندوستان کے خلاف اپنی اس خفگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ پانیکر نے نہرو کو کوریا سے متعلقہ پالیسی تبدیلی کرنے کا مشورہ اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ نظریاتی طور پر مغربی سامراجیوں کے خلاف اور کمیونسٹوں کے حق میں تھا بلکہ اس کے اس مشورے کی بنیاد اس کی اس دیرینہ رائے پر تھی کہ ہندوستان کو ایشیا میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے اور نہرو نے یہ مشورہ اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ اس پر یکا یک یہ حقیقت آشکارا ہوگئی تھی کہ امریکہ نے کوریا پر حملہ چین کے خلاف سامراجی عزائم کے تحت کیا ہے بلکہ اس کی جانب سے یہ مشورہ قبول کرنے کی وجہ اس کی اپنی پختہ رائے میں مضمر تھی کہ ہندوستان کے جغرافیہ، اس کی تاریخ اور اس کے وسائل کے پیش نظر اتنا بڑا ملک ایشیا کے کسی بھی علاقے میں رونما ہونے والے حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔[22] اس کی مزید رائے یہ تھی کہ'' سارے ایشیا میں صرف ہندوستان ہی ایک مستحکم اور ترقی پسند مملکت ہے اور اس حیثیت سے وہ قدرتی طور پر ایشیائی ممالک کی لیڈر ہے[23]۔''امریکی سامراج کو ایشیا میں ہندوستان کی قیادت پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس کی برملا تائید وحمایت کرتا تھا۔ وہ چاہتا صرف یہ تھا کہ ہندوستان ایشیائی اقوام کی قیادت کے فرائض اس کی زیر سرپرستی میں سرانجام دے اور کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو مغربی سامراج کے عالمی مفادات کے منافی ہو۔

(2) اگر چہ جنوری 1951ء میں لندن میں کامن ویلتھ کانفرنس کے دوران تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کی غیر رسمی کوشش ناکام ہوگئی تھی اور اس بنا پر پاکستان کے وزیراعظم نوابزادہ

لیاقت علی خان کو بظاہر بڑی مایوسی ہوئی تھی تاہم اس نے اپنی سامراج نواز پالیسی سے انحراف نہیں کیا تھا۔ اس نے لندن سے واپسی کے دوران مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک کا دورہ کر کے انہیں مغربی سامراجیوں کے مجوزہ فوجی گٹھ جوڑ میں شامل ہونے پر آمادہ کرنے کی پھر کوشش کی تھی۔ لہٰذا اینگلو امریکی سامراج سلامتی کونسل میں کشمیر پر بحث کے دوران پاکستان کے موقف کی کسی حد تک حمایت کر کے نہ صرف نوابزادہ کی ان خدمات کا صلہ دینا چاہتا تھا بلکہ وہ پاکستان میں برطانیہ اور اس کی کامن ویلتھ کے خلاف غصہ ونفرت کے جو فلک شگاف شعلے بھڑک رہے تھے انہیں بھی ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔

(3) جنوری 1951ء میں جنرل محمد ایوب خان کے کمانڈر انچیف بننے کے فوراً ہی بعد امریکہ اور پاکستان کے درمیان فوجی معاہدے کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ ایوب خان کے سوانح نگار کرنل محمد احمد کا کہنا ہے کہ اس کے ممدوح کو جولائی 1951ء میں پاکستانی سرحدوں پر ہندوستانی فوجوں کے اجتماع کے فوراً بعد امریکہ سے فوجی معاہدہ کرنے کا خیال آیا تھا اس نے اس گٹھ جوڑ کے لیے پہل کی تھی اور پھر اسے وجود میں لانے کے لیے اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔[24] میجر جنرل فضل مقیم لکھتا ہے کہ ''یہ آخر اگست 1951ء کا ذکر ہے کہ ایوب خان نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان کے دفاع کے مسئلہ کا ایک حل یہ ہے کہ ہمارا ایک مضبوط اور قابل اعتماد دوست ہونا چاہیے۔''[25] سفارتی سطح پر گفت وشنید 1951ء میں ہی شروع ہوئی ہوگی اور غالباً اسی وجہ سے 17 رجنوری 1952ء کو اقوام متحدہ میں روسی نمائندہ نے امریکہ پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ کشمیر میں اپنے ہوائی اڈے قائم کرنا چاہتا ہے۔'' میجر جنرل اکبر خان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ''جنرل ایوب خان 1951ء میں روس اور چین سے حملے کے خطرے کا اکثر ذکر کیا کرتا تھا اور اس کی ان باتوں کی بنیاد یہ تھی کہ مغربی طاقتوں کو ایشیا میں سوویت یونین اور چین کے خلاف فوجی اڈے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان نے بڑی طاقتوں کی اس رسہ کشی میں ملوث ہونے سے انکار کر دیا تھا لیکن پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان جیسے عناصر ملک وقوم کی آزادی

اور خودمختاری کو سامراجیوں کے ہاتھوں فروخت کر دینے پر آمادہ تھے۔''[26] جولائی 1952ء جنرل ایوب خان نے واشنگٹن میں مقیم پاکستانی ملٹری اتاشی میجر جنرل ایم۔جی۔جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی اتحاد کے امکانات کا جائزہ لے۔ 17 ستمبر کو امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت امریکہ نے پاکستان کو 15 ملین ڈالر کی مالیت کی گندم کی سپلائی کی اور پھر نومبر میں بحراوقیانوس کے علاقے کا امریکی کمانڈر انچیف ایڈمرل آرتھر ریڈفورڈ پاکستان آیا اور اس نے 12 نومبر 1952ء کو کراچی سے روانگی سے قبل اعلان کیا کہ پاکستان کا محل وقوع بڑی اہمیت کا حامل ہے اور یہ ملک کمیونزم کے خلاف عالمی جنگ میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

تاہم سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر اینگلو امریکی سامراج کی پاکستان کے حق میں ان نیم دلانہ کوششوں کی ناکامی کی بنیادی وجہ تو وہی تھی کہ وہ جواہر لال نہرو کی کوریا کے معاملے میں ''غیر جانبدارانہ قلابازی'' کے باوجود ہندوستان پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔ انہیں نہ صرف ہمہ وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں اتنا بڑا ملک بالکل ہی کمیونسٹ کیمپ میں نہ چلا جائے بلکہ یہ امید بھی لگی رہتی تھی کہ زود یا بدیر ہندوستان اور چین کے درمیان قومی تضاد منظر عام پر آئے گا اور اس طرح ہندوستان کو کمیونزم کے خلاف مغربی گٹھ جوڑ میں شامل کرنے کا امکان پیدا ہوجائے گا۔

1950ء میں تبت پر چین کی فوجوں کے قبضہ کے بعد ہندوستان نے بھوٹان، سکم اور نیپال کی ریاستوں کو اپنے زیرنگیں رکھنے کے لیے جو کارروائیاں کی تھیں ان میں یہ آثار ملتے تھے کہ ہندوستان اور چین کے درمیان لازمی طور پر محاذ آرائی ہوگی۔ فروری 1951ء میں حکومت ہندوستان اور نیپال کے بادشاہ کے درمیان خفیہ معاہدے کے مطابق نیپال کے اقتدار پر رانا خاندان کی اجارہ داری کو توڑ کر وہاں ایک ایسی مخلوط حکومت قائم کی گئی تھی جس نے ہندوستان نواز لیڈر ڈاکٹر کے۔آئی۔سنگھ کی بغاوت کو کچلنے میں موثر کردار ادا کیا تھا جس کے بعد ڈاکٹر سنگھ ملک سے فرار ہو کر پیکنگ چلا گیا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ کوریا کی جنگ میں چین کے ملوث ہونے اور امریکہ کے صدر

ٹرومین کی جانب سے چین کے خلاف ایٹم بم استعمال کرنے کی دھمکی کے بعد اس جنگ کے بارے میں برطانیہ اور ہندوستان کی پالیسی میں در پردہ ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندہ سر بی۔ این۔ راؤ کے بیان کے مطابق اگرچہ برطانیہ اور بعض دوسرے یورپی ممالک بظاہر کوریا میں امریکہ کی جنگی کارروائیوں کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ جب وہ مختلف کمیٹیوں میں بولتے تھے اور ووٹ دیتے تھے تو امریکہ کی تقلید کرتے تھے لیکن وہ نجی گفتگو کے دوران کوریا میں امریکہ کے طریقۂ کار کی بڑے تلخ الفاظ میں شکایت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہندوستان جنگ کو روک نہیں سکتا تو کم از کم اس کی شدت کو کم کرنے کی کوشش تو کرے۔ ہمیں ان کے اس رویے سے صاف پتہ چل گیا تھا کہ ان پر امریکہ کا دباؤ بہت زیادہ ہے اور یہ اپنی صوابدید کے مطابق کوئی آزادانہ اقدام نہیں کر سکتے۔ [27]

تیسری وجہ یہ تھی کہ سوویت یونین کے نمائندے نے 1952ء میں سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر اپنی غیر جانبداری اور خاموشی کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ اس نے کشمیر کے بارے میں اینگلو امریکی سامراج کے جنگی عزائم کو بے نقاب کرتے ہوئے کشمیر کے عوام کی بذریعہ ''دستور ساز اسمبلی'' رائے معلوم کرنے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس سے ہندوستان کے مؤقف کی حمایت کا پہلو نکلتا تھا اور ہندوستان کے اخبارات میں سوویت نمائندے کی مسئلہ کشمیر پر پہلی مرتبہ اس طرح کی لب کشائی کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا تھا۔ کوریا کی جنگ کے دوران نہرو کی کمیونسٹ بلاک کے حق میں ''غیر جانبداری'' اور اس کے جواب میں سوویت نمائندے کی مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کی جانبداری کی علامتیں اینگلو امریکی سامراج کے لیے خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ انہیں ان علامتوں میں ہندوستان کے کمیونسٹ بلاک کے ساتھ عملاً وابستہ ہونے کا امکان نظر آتا تھا۔ اس سنگین خطرے کی ایک اور علامت یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے 1952ء میں نہرو کی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کی پالیسی یکا یک ترک کر کے پر امن بورژوا جمہوریت کی راہ اختیار کر لی تھی اس نے کشمیر کی خودمختاری کے مؤقف کی حمایت کی بجائے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ مکمل الحاق کا پرچار شروع کر دیا تھا۔ پارٹی نے شیخ عبداللہ پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی تھی جو ان دنوں صوبہ جموں کے انتہا پسند ہندوؤں کی پرتشدد ایجی ٹیشن سے تنگ آ کر وادی کشمیر کی آزادی وخودمختاری کا پہلے سے زیادہ علمبردار بن رہا تھا۔

مارچ 1953ء سے 1956ء کے اواخر تک بین الاقوامی سطح پر تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لیے کوئی کاروائی نہ ہوئی البتہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوطرفہ بات چیت اور خط و کتابت کے ذریعے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوششیں ہوئیں جن کا کوئی نتیجہ نہ برآمد ہونا تھا اور نہ ہوا۔ اس چار سال کے عرصے میں مسئلہ کشمیر کے بین الاقوامی سردخانے میں پڑے رہنے کی کئی وجوہ تھیں:۔

(1) 1953ء کے اوائل میں پاکستان میں غلام محمد کی زیر سرکردگی افسر شاہی کے ایک ایسے ٹولے نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا جو بظاہر جاگیردار طبقے سے بھی زیادہ بے ضمیر، قوم فروش اور سامراج نواز تھا۔ چونکہ اس ٹولے نے امریکہ سے فوجی امداد کے عوض پاکستان کو مغربی سامراجیوں کے فوجی معاہدوں میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے اس کی داخلی اور خارجی پالیسی مکمل طور پر امریکی سامراج کے کنٹرول میں چلی گئی تھی اور امریکی آقاؤں کا انہیں حکم یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر تنازعہ کشمیر کی باتیں مت کرو بلکہ دوطرفہ بات چیت کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ مصالحت کی کوشش کرو۔ ایس۔ ایم۔ برک لکھتا ہے کہ "اگرچہ اس عرصے میں امریکہ نے پاکستان کو اپنے ساتھ ملانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاہم اس نے ہندوستان کے بارے میں بہت ہی محتاط پالیسی اختیار کئے رکھی۔ امریکہ ہندوستان کو بدستور انتہائی اہم غیر وابستہ ملک تصور کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہندوستان فوجی لحاظ سے کوئی بڑی طاقت نہیں ہے لیکن اس کی آبادی کروڑوں عوام پر مشتمل تھی اور یہ کروڑوں عوام اس کے لیے بڑی قدر و قیمت کے حامل تھے۔ وہ اتنے بڑے غیر کمیونسٹ ملک کو مکمل طور پر کمیونسٹ طاقتوں کی گود میں دھکیلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہندوستان کی نکتہ چینیوں کے باوجود اس کے بارے میں انتہائی محتاط پالیسی پر عمل پیرا تھا اور وہ اسے معاشی امداد بھی دیتا تھا۔[28]

(2) حکومت ہندوستان نے اگست 1953ء میں شیخ عبداللہ کو گرفتار کر کے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ مکمل الحاق کے لیے جو کاروائی کی تھی اس سے امریکی سامراج کا

وادی کشمیر میں فوجی اڈہ قائم کرنے کا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ اگر چہ ہندوستانی اخبارات اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اس سلسلے میں شیخ عبداللہ، پاکستانی رجعت پسندوں اور امریکی سامراج کے درمیان سازش کا جو الزام عائد کیا تھا اس کی بظاہر کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں تھی تاہم یہ صحیح ہے کہ شیخ عبداللہ نے 1952ء میں صوبہ جموں اور ہندوستان کے متعصب ہندو عناصر کی پر تشدد ایجی ٹیشن کے پیش نظر مسلم اکثریت والی وادی کشمیر کی مکمل آزادی وخودمختاری کی کھلم کھلا باتیں شروع کر دیں تھیں حالانکہ ان دنوں ریاست میں ہندوستانی فوجوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی موجودگی میں ہندوستان کی مرضی کے بغیر وادی کشمیر کی آزادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان دنوں صرف وادی کشمیر میں استصواب کرانے کی تجویز زیر بحث آچکی تھی۔ قبل ازیں سر اوون ڈکسن اور ڈاکٹر فرینک گراہم بھی اس قسم کی تجویزیں پیش کر چکے تھے اور امریکی سامراج ان تجویزوں کے حق میں تھا۔ سوویت نمائندے جیکب ملک نے اقوام متحدہ میں ان کی مذمت کی تھی۔ امریکی لیڈر ایڈلائی سٹیونسن مئی 1953ء میں سری نگر میں شیخ عبداللہ سے ملاقات کے بعد جب پاکستان آیا تھا تو اس نے جمرود میں ایک انٹرویو کے دوران پیش گوئی کی تھی کہ مسئلہ کشمیر بہت جلد حل ہو جائے گا۔'' وادی کشمیر کا محل وقوع سوویت یونین اور چین کے خلاف فوجی اڈے کے قیام کے لیے بہترین تھا۔

(3) جواہر لال نہرو کے جون 1955ء میں دورۂ ماسکو کے بعد سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان روابط اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ اقوام متحدہ کے ذریعے تنازعہ کشمیر کے امریکی سامراج کے طفیلی ملک پاکستان کے حق میں تصفیہ کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا اور اگر اس سلسلے میں کسی کو کوئی تھوڑی بہت خوش فہمی ہو سکتی تھی تو وہ دسمبر 1955ء میں بلگانن اور خروشچوف کے دورۂ ہندوستان کے دوران دور ہو گئی تھی جبکہ انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ کشمیری عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کشمیر ہندوستان کا ایک جز ولاینفک ہے۔

پاکستان کے مغربی اتحادیوں کی کمزوری یہ تھی کہ وہ پاکستان کی خاطر ہندوستان جیسے بڑے ملک کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں سودا بہت مہنگا لگتا تھا لیکن سوویت لیڈروں کو ہندوستان اور اس کے پچاس کروڑ عوام کی دوستی کے بدلے میں پاکستان اور اس کے دس کروڑ عوام کی دشمنی مول لینے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ سودا بہت سستا تھا۔

ان کے اس دورۂ ہندوستان کے بعد یہ بات بالکل یقینی ہوگئی تھی کہ اگر آئندہ کبھی مغربی طاقتوں نے سلامتی کونسل کے ذریعے تنازعہ کشمیر کا پاکستان کے حق میں تصفیہ کرانے کی کوشش کی تو سوویت یونین اسے ویٹو کر دے گا۔

(4) 1953ء کے بعد ہندوستان اور چین کے درمیان قومی تضاد کے شدید ہونے کے امکانات روز بروز روشن ہو رہے تھے۔ بالخصوص اپریل 1955ء میں بنڈونگ کانفرنس کے بعد چین کے بارے میں جواہر لال نہرو کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کا دور ختم ہوگیا تھا۔ چین کو شکایت یہ تھی کہ حکومت ہندوستان تبت میں باغیوں کی امداد کے لیے اینگلو امریکی سامراج کے ایجنٹوں کو سہولتیں مہیا کر رہی ہے اور ہندوستان کا شکوہ یہ تھا کہ چین تبت پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اسے ان تجارتی اور دوسری مراعات سے محروم کر رہا ہے جو اسے برطانوی سامراج کے زمانے سے حاصل تھیں۔ جنوری 1952ء میں نیپال کی حکومت میں ایسی تبدیلی آئی جو ہندوستان کے خلاف اور چین کے حق میں تھی۔ گنگا پرشاد کی زیر قیادت نیپال کی نئی حکومت نے پہلی مرتبہ نیپال اور چین کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کر کے باہمی دوستی کے ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے اور یہ بات ہندوستان کو پسند نہیں آئی تھی کیونکہ وہ نیپال کو اپنی ایک طفیلی ریاست تصور کرتا تھا۔ مئی 1956ء میں چین نے لداخ کے نزدیک اکسائی چن کے علاقے میں ایک ایسی شاہراہ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا تھا جو چھ سال بعد ہندوستان اور چین کے درمیان

سرحدی جنگ کا باعث بنی اور پھر نومبر 1956ء میں جب تبت کے دلائی لامہ نے ہندوستان کے دورہ کے دوران حکومت ہندوستان سے سیاسی پناہ مانگی تھی تو ہندوستان اور چین کے درمیان خاصی کدورت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ کدورت اتنی زیادہ تھی کہ جب دسمبر 1956ء میں وزیراعظم چو۔این۔لائی نئی دہلی آیا تھا تو اس کی نہرو سے بات چیت کے بعد کوئی مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا تھا اور اس واقعہ کے چند دن بعد جب نہرو امریکہ گیا تھا تو اس کی صدر آئزن ہاور سے بڑی دوستانہ بات چیت ہوئی تھی۔ جس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا تھا کہ 58-1957ء میں امریکہ کی جانب سے ہندوستان کی اقتصادی امداد میں بہت اضافہ کر دیا گیا تھا۔

ان حقائق کے پیش نظر امریکی سامراج اپنے پاکستانی پٹھوؤں کو یہ اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ کشمیر کی خاطر ہندوستان اور امریکہ کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کریں۔ حکومت پاکستان نے جنوری 1957ء میں جب یہ مسئلہ پھر سلامتی کونسل میں اٹھایا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تنازعہ کشمیر کے بذریعہ سلامتی کونسل پرامن تصفیہ کی واقعی کوئی امید پیدا ہوگئی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کو نہر سویز کے بارے میں نہرو کے مخالفانہ رویے پر بہت غصہ تھا اور امریکہ کو شکایت یہ تھی کہ ہنگری کے معاملے میں نہرو کا ابتدائی مؤقف سوویت یونین کے حق میں تھا اور یہ دونوں طاقتیں کشمیر کو بطور ''لیور'' (Lever) استعمال کر کے اس سلسلے میں نہرو کی پالیسی کو اپنی پالیسی کے ہم آہنگ کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے جب سوویت یونین نے 18 رفروری 1957ء کو برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا اور کیوبا کی اس مضمون کی قرارداد کو ویٹو کیا تھا کہ سلامتی کونسل کے صدر کو اقوام متحدہ کے مصالحتی نمائندہ کی حیثیت سے کشمیر میں اقوام متحدہ کی عارضی فوج متعین کرنے کی تجویز کا جائزہ لینا چاہیے تو مغربی طاقتوں نے اس کی مذمت میں کوئی خاص شور وغوغا نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے دو تین دن بعد ایک ایسی بے ضرر سی قرارداد کی منظوری دیدی تھی جس پر سوویت یونین اور ہندوستان کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور پھر جب مارچ 1958ء میں ڈاکٹر گراہم کی آخری رپورٹ پر حکومت پاکستان نے یہ تشویش ظاہر کی تھی کہ کہیں سلامتی کونسل اس کی سفارشات کو بالائے طاق نہ رکھ دے کیونکہ ہندوستان میں اس پر سخت نکتہ چینی کی جارہی تھی اور وزیراعظم نون نے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ''بنیادی'' تبدیلی کرنے کی باتیں کی تھیں تو اسے لندن سے بڑی

جھاڑ پڑی تھی اوراسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ صلح جوئی کی پالیسی پر عمل کرے۔ چنانچہ اس نے 5/جولائی کو اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کسی مسئلے پر اور کسی بھی حالت میں ہندوستان کے ساتھ جنگ نہیں کرے گا اور پھر اس نے 3/اگست کو قومی اسمبلی میں خارجہ پالیسی پر بحث کے دوران اشارۃً بتایا تھا کہ اسے امریکہ کی جانب سے بھی ہندوستان کے ساتھ جنگ کی باتوں کے خلاف متنبہ کیا گیا تھا۔ وزیراعظم نون نے کہا تھا کہ ''جب ہمارے ملک کے بعض ذمہ دار لیڈر جنگ کی باتیں کرتے ہیں تو اس فوجی امداد کے راستے میں جو پاکستان کو مل رہی ہے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔'' اینگلو امریکی سامراج کی طرف سے اپنی پاکستانی پٹھوؤں کی ان سرزنشوں سے بالکل واضح ہو گیا تھا کہ اب ان دونوں سامراجی طاقتوں کو مسئلہ کشمیر کے پاکستان کے حق میں حل ہونے سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی بلکہ اب ان کی خواہش یہ تھی کہ وادی کشمیر اور لداخ کا علاقہ ہندوستان کے پاس ہی رہے کیونکہ اکسائی چن کے علاقے میں چینیوں نے اپنی سڑک کی تعمیر مکمل کر لی تھی اور ہندوستانیوں کا الزام یہ تھا کہ اس طرح ان کی علاقائی سالمیت کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ مغربی سامراجیوں کو یقین تھا کہ اس سرحدی تنازعہ میں ہندوستان اور چین کے درمیان ایک بڑی جنگ کے امکانات مضمر ہیں۔ سامراج اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ان دنوں چین اس کا دشمن نمبر ایک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نہ صرف ہندوستان اور چین کے درمیان محاذ آرائی ہوگی بلکہ ہندوستان کی وساطت سے سوویت یونین اور چین کے درمیان قومی تضاد میں بھی شدت پیدا کی جا سکے گی۔ 1956ء میں سوویت ارباب اقتدار کی جانب سے پرامن بقائے باہمی کی عمومی پالیسی اختیار کرنے کے بعد ان دونوں بڑی کمیونسٹ طاقتوں میں کشیدگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

ہندوستان اور چین کے درمیان قومی تضاد کے آثار دراصل 1947ء میں ہی نظر آنے لگے تھے جبکہ حکومت ہندوستان نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی ایک وجہ یہ بیان کی تھی کہ چونکہ یہ علاقہ چین اور سوویت یونین سے متصل ہونے کی وجہ سے بڑی جنگی اہمیت کا حامل ہے اس لیے اس سے ہندوستان کی اپنی سلامتی وابستہ ہے۔ پھر اس نے مئی 1949ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن کے روبرو یہ موقف اختیار کیا تھا کہ چین میں کمیونسٹوں کی پیش قدمی کی وجہ سے کشمیر کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور اس بنا پر ہندوستان کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ حکومت پاکستان

نے پہلے تو ہندوستان کے اس موقف کی تردید کی تھی لیکن پھر 30 رمئی کو کہا تھا کہ اگر کبھی کشمیر کو شمال سے حملے کا خطرہ لاحق ہوا تو اس سے نمٹنے کے لیے پاکستان سے مشورہ کرنا چاہیے اور اس حملے کے مقابلے کے لیے پاکستانی فوجوں کے استعمال پر بھی غور کرنا چاہیے۔ تبت، نیپال، بھوٹان اور سکم کے بارے میں بھی ہندوستان اور چین کے قومی تضادات 1950ء میں نمایاں ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اینگلو امریکی سامراج اور اس کے اخبارات نہرو کو ایشیا کا لیڈر بنانے کا کھلم کھلا اعلان کرتے تھے اور اس طرح ہندوستان کو اپنی ایشیائی پالیسی کے سب سے بڑے ستون کی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ 51-1950ء کے دوران امریکی سامراج کو نہرو کی کوریائی پالیسی سے مایوسی ہوئی تھی بلکہ اسے قدرے غصہ آیا تھا مگر وہ اسے اس بنا پر اتنا ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ سوویت بلاک سے رسمی طور پر منتھی ہو جائے۔ ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کا زور 1955ء کے اوائل تک رہا۔ مگر اس دوران امریکی سامراج کی پاکستان کی سامراج نواز افسر شاہی کو ہدایت یہ تھی کہ کشمیر کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان کو صلح کی پیش کش کرتے رہو اور اس طرح اسے مغربی کیمپ میں آنے کی ترغیب دیتے رہو۔ اس پالیسی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح وادی کشمیر کے تنازعہ کا اس طرح تصفیہ ہو جائے کہ وہاں سوویت یونین اور چین کے خلاف فوجی اڈہ قائم ہو سکے۔ اپریل 1955ء میں بنڈونگ کانفرنس کے دوران جب ہندوستان اور چین کے درمیان تضاد کھل کر سامنے آیا تو ہندوستان پر صلح پسندی اور محاذ آرائی کے ذریعے دباؤ ڈال کر یہ کوشش کی گئی کہ وہ چین کے خلاف مغربی گٹھ جوڑ میں شامل ہو جائے۔ اس پالیسی پر 57-1956ء میں عمل ہوتا رہا۔ لیکن جب 58-1957ء میں یہ پتہ چلا کہ سنکیانگ میں چین کی شاہراہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد ہندوستان اور چین میں ایسا سرحدی تنازعہ پیدا ہو گیا ہے جو ان دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر سکتا ہے تو کشمیر کے بارے میں اینگلو امریکی سامراج کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ اب وہ وادی کشمیر میں اپنا فوجی اڈہ بنانے کا خواہاں نہیں تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ یہ علاقہ ہندوستان کے پاس ہی رہے اور لداخ میں سرحدی تنازعے کی چنگاری کو اتنی ہوا دی جائے کہ یہ فلک بوس شعلوں کی صورت اختیار کر لے۔ بالآخر یہ پالیسی کامیاب رہی۔ اس بنا پر نہ صرف ہند۔چین تضاد نے معاندانہ صورت اختیار کر لی بلکہ چین کے خلاف سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان پرامن بقائے باہمی یعنی عالمی اشتراک عمل کے دور کا بھی آغاز ہو گیا۔

باب: 17

# مسلم لیگ کی غیر جمہوری و غیر حقیقت پسندانہ ریاستی پالیسی

کشمیر کے بارے میں حکومت پاکستان کی قطعی ناکامی کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ پہلے تو برطانوی سامراج نے آل انڈیا کانگرس کی بورژوا قیادت سے سازش کر کے ریاست جموں وکشمیر کو دھاندلی اور غنڈہ گردی کے ذریعے ہندوستان کے حوالے کر دیا تھا اور پھر جب برطانیہ اور امریکہ کو سامراجی نقطۂ نگاہ سے اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تھا تو انہوں نے تنازعہ کشمیر کا پاکستان کے حق میں فیصلہ کرانے کی کبھی بھی بھرپور کوشش نہیں کی تھی کیونکہ ان کے سامراجی ترازو میں ہندوستان کا پلڑا بہت بھاری تھا بلکہ اس کی ایک بڑی وجہ ریاستوں کے بارے میں مسلم لیگ کی انتہائی غیر جمہوری اور غیر حقیقت پسندانہ پالیسی میں نمایاں تھی۔ اس پالیسی کا سب سے پہلا اعلان 21/اپریل 1947ء کو ہوا جب کہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنی ایک تقریر میں ریاستوں کے مطلق العنان راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کو یقین دلایا کہ اگر وہ برطانیہ کی برصغیر سے دستبرداری کے بعد اپنی آزادی وخودمختاری کا اعلان کریں گے تو مسلم لیگ ان کی تائید وحمایت کرے گی۔ نوابزادہ کے الفاظ یہ تھے کہ ”ہندوستانی ریاستوں کو پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ ایسے معاہدات کرنے کی پوری آزادی ہوگی جو ان کی ریاستوں کے علاقائی روابط یا خود ان کے ذاتی مفادات کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ وہ چاہیں تو مکمل طور پر آزاد وخودمختار حیثیت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔“[1] نوابزادہ نے یہ تاریخی اعلان نہرو کے 18/اپریل کے اس بیان کے جواب میں دیا تھا کہ جو ”ریاست دستور ساز اسمبلی میں شامل نہیں ہوگی اسے ملک کا دشمن تصور کیا جائے گا اور اسے اس

کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔''[2] ان دونوں بیانات کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ حکومت برطانیہ نے برصغیر سے دستبرداری کے بارے میں 20رفروری 1947ء کو جو اعلان کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ کو ہندوستانی ریاستوں پر جو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے وہ ہندوستان کی کسی حکومت کو منتقل نہیں کیا جائے گا بلکہ ریاستی حکمران ازخود گفت وشنید کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔

کانگرس کی قیادت کو جائز طور پر یہ خدشہ تھا کہ اگر ریاستی حکمرانوں کو اپنی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی پوری آزادی دی گئی تو برصغیر صرف دو ریاستوں میں ہی منقسم نہیں ہوگا بلکہ اس کے بے شمار ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لہٰذا وہ ریاستی حکمرانوں کو ڈرا دھمکا کر ہندوستان میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کی قیادت کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ چونکہ حکومت برطانیہ کے اعلان کے مطابق ریاستی حکمرانوں کو قانونی طور پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہوگا اس لیے زیادہ سے زیادہ ریاستی حکمرانوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ برطانیہ کی دستبرداری کے بعد اپنی آزادی وخودمختاری کا اعلان کر دیں۔ اس طرح برصغیر بہت سی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا اور ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کی اہمیت اور طاقت کم نہیں ہو گی۔ مسلم لیگ کو قوی امید تھی کہ کم ازکم بھوپال اور حیدرآباد کے مسلمان حکمران اپنی آزادی وخود مختاری کا اعلان کر دینگے حالانکہ ان کی ریاستوں کی آبادی بہت بھاری ہندو اکثریت پر مشتمل تھی۔ چوہدری خلیق الزمان نے اس امید کی بنیاد پر 13رمئی کو ایک بیان میں بھوپال کے مسلم لیگیوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ چوکنے رہ کر حالات کی رفتار پر نظر رکھیں اور کانگرس ریاستوں میں اپنی پالیسی نافذ کرنے کی جو منظم کوشش کر رہی ہے، اس کے خلاف ریاستوں کی امداد کے لیے تیار رہیں تاکہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کر سکیں۔ حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستی مسلم لیگ کی تنظیم کو جے۔ پرکاش نارائن کی اس تقریر کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں اس نے ان دونوں ریاستوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مسلم لیگیوں کو اپنی تنظیموں کو مضبوط کرنا چاہیے تاکہ وہ یونین ہند کے تسلط کی مزاحمت کر سکیں۔[3]

حکومت برطانیہ کے 20رفروری کے اعلان کے بعد انڈین چیمبر آف پرنسز نے نواب بھوپال کی زیرقیادت ایک کمیٹی قائم کی تھی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کے نمائندوں سے بات چیت کر کے یہ تصفیہ کرے کہ برصغیر سے انگریزوں کی روانگی کے بعد ریاستوں کی حیثیت کیا ہوگی مگر یہ کمیٹی سارے ریاستی حکمرانوں کی جانب سے کوئی فیصلہ نہ کر سکی

البتہ بڑودہ، بیکانیر، کوچین، جے پور، جودھپور، پٹیالہ اور الور کے حکمران مسلم لیگ کے بائیکاٹ کے باوجود کانگرس کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح کانگرس کی ریاستی حکمرانوں کو مرعوب کرنے کی پالیسی بارآور ہوتی ہوئی نظر آئی اور مسلم لیگ کی جانب سے ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی پالیسی کی ناکامی کے آثار نمایاں ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ تاہم 3 رجون کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے دس دن بعد یعنی 13 رجون کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ سرکردہ سیاسی لیڈروں کی ایک میٹنگ میں ریاستوں کے مستقبل کا مسئلہ زیر بحث آیا تو جواہر لال نہرو نے اپنا وہی موقف اختیار کیا کہ ریاستوں کو آزادی کا اعلان کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ برطانوی حکومت کو ریاستوں پر جو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے وہ خود بخود حکومت ہندوستان کو منتقل ہو جائے گا اور ہر ریاستی حکمران کو دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونا ہی پڑے گا۔ لیکن محمد علی جناح نے اس کے بالکل برعکس موقف اختیار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہندوستانی ریاستیں ان معاملات کے سوا جن کے بارے میں انہوں نے برطانیہ سے معاہدے کئے ہوئے ہیں باقی سب معاملات میں خودمختار حیثیت کی حامل ہیں۔ اب اگر ریاستی حکمران رضا کارانہ طور پر خود دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ان معاہدوں کی تجدید نہ کریں تو یہ معاہدے ختم ہو جائیں گے۔[4]

14 رجون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ریاستوں کے بارے میں کانگرس کی قیادت کے مؤقف کا اعادہ کیا گیا اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ حاکمیت ریاستوں کے عوام کو حاصل ہے اور انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔ نہرو نے اس موقعہ پر اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان کے اندر آزاد ریاستوں کا وجود ملک کے تحفظ کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔ اگر کسی بیرونی ملک نے کسی ہندوستانی ریاست کی آزادی کو تسلیم کیا تو حکومت ہندوستان اسے غیر دوستانہ فعل تصور کرے گی اور گاندھی نے اعلان کیا کہ اگر ریاستی حکمرانوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو یہ اقدام ہندوستان کے کروڑوں عوام کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہوگا۔[5] کانگرس کمیٹی کی اس قرارداد کا سب سے بڑا ہدف نظام حیدرآباد تھا جس نے 3 رجون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے چند دن بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس کی ریاست پھر آزاد و خودمختار حیثیت کر لے گی اور روزنامہ ''ڈان'' نے اپنی 14 رجون کی اشاعت میں نظام کے اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ قائداعظم جناح نے 17 رجون کو ایک

بیان میں کانگرسی لیڈروں کے ان دھمکی آمیز اعلانات کے جواب میں مسلم لیگ کی ریاستی پالیسی کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ برطانیہ کا اقتدار اعلیٰ ختم ہونے کے بعد آئینی اور قانونی لحاظ سے ہندوستان کی ریاستیں بالکل آزاد و خودمختار ہوں گی۔ وہ اپنے بارے میں فیصلے کرنے میں آزاد ہوں گی اور جو چاہیں گی راستہ اختیار کر سکیں گی۔ انہیں پورا اختیار ہوگا کہ وہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں یا آزاد رہنے کا فیصلہ کریں۔ اگر وہ آزاد رہنے کا فیصلہ کریں گی تو وہ ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ حسب خواہش معاہدات یا تعلقات استوار کر سکیں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ریاستوں کے بارے میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس کے بارے میں اولین طور پر حکمرانوں اور ریاستی عوام کے درمیان ہی کوئی فیصلہ ہونا چاہیے۔ جو ریاستیں اپنی مرضی سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہیں گی اور وہ اس مقصد کے لیے ہم سے کوئی مذاکرات یا گفت وشنید کرنا چاہیں گی تو ہم اس پر آمادہ ہوں گے۔ اگر وہ آزاد رہنا چاہیں گی اور پاکستان کے ساتھ کسی قسم کے سیاسی، تجارتی، معاشی یا اسی قسم کے کوئی تعلقات قائم کرنا چاہیں گی تو ہم بخوشی اس سلسلے میں ان کے ساتھ بات چیت کر کے ایسے تصفیے کریں گے جو دونوں کے مفاد میں ہوں گے...... میری رائے یہ ہے کہ وزارتی کابینہ نے 12 رمئی 1946ء کو اپنے میمورنڈم میں ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں حکومت برطانیہ کی پالیسی کی جو وضاحت کی تھی اس کے مطابق ریاستوں پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ یہ تعبیر بالکل غلط ہے کہ ریاستیں ایک یا دوسری دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے پر مجبور ہیں اور انہیں کوئی تیسرا راستہ اختیار کرنے کے حق حاصل نہیں۔ میری رائے میں اگر وہ چاہیں تو آزاد رہ سکتی ہیں۔ حکومت برطانیہ یا برطانوی پارلیمنٹ یا کوئی اور جماعت انہیں اپنی مرضی کے خلاف کوئی طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی...... برصغیر سے برطانیہ کی دستبرداری کے بعد اس کا ریاستوں پر سے اقتدار اعلیٰ کسی کو منتقل نہیں ہوگا بلکہ یہ اقتدار اعلیٰ ختم ہو جائے گا اور ریاستیں مکمل طور پر آزاد و خودمختار ہوں گی۔[6]

روزنامہ ''ڈان'' کا 19 رجون کو جناح کے اس بیان پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے قائداعظم کے بیان نے ریاستوں کو اس امر کی کافی ضمانت دیدی ہے کہ ان کی آزادی اور سالمیت کا احترام کیا جائے گا۔ اس معاملے میں مسلم لیگ کے رویہ اور کانگرس کے رویہ

میں اتنا نمایاں فرق ہے اور لیگ کا عدم مداخلت کا وعدہ اتنا زیادہ تیقن آمیز ہے کہ اگر متعدد غیر مسلم ریاستیں بھی بالآخر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوجائیں یا ہندوستان کی بجائے پاکستان کے ساتھ قریبی معاہداتی تعلقات قائم کرلیں تو ہمیں حیرت نہیں ہوگی۔ ہندوستانی ریاستوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، یونین آف پاکستان کے خودمختار ارکان یا پاکستان کے اتحادیوں کی حیثیت سے جو باعزت مقام حاصل ہوگا وہ انہیں کسی اور صورت میں نصیب نہیں ہوگا۔ جہاں تک کانگرس کی دھمکیوں کا تعلق ہے ہمیں یقین ہے کہ حیدرآباد اور ٹراونکور کی ریاستیں سر تسلیم خم نہیں کرینگی اور مرعوب ہونے سے انکار کر دیں گی اور ان کی یہ ثابت قدمی ان سب کے لیے حوصلہ افزائی کا موجب بنے گی جنھوں نے ابھی تک اپنے ذہن میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔[7]

اس کے چند دن بعد جنوبی ہندوستان کی ریاست ٹراونکور کے مہاراجہ نے اعلان کر دیا کہ وہ انڈین ڈومینین میں شامل نہیں ہوگا۔ اس نے اپنے اس فیصلے کی جو وجوہ بیان کیں ان میں ایک یہ وجہ بھی شامل تھی کہ ''انڈین یونین کے لیڈروں نے دنیا کی تاریخ کے اس نازک موقعہ پر سوویت ری پبلک سے سفارتی تعلقات قائم کر لیے ہیں۔'' جون کے اواخر میں اس ریاست کے دیوان سرسی۔ پی۔ راما سوامی آئیر نے نئی دہلی میں جناح سے طویل ملاقات کے بعد اعلان کیا کہ پاکستان اور ٹراونکور کے درمیان نمائندوں کا تقرر ہوگا۔ روزنامہ ''ڈان'' کا ایڈیٹر اس اعلان پر بہت خوش ہوا اور اس نے 23 رجون کے اداریے میں لکھا کہ یہ فیصلہ ایک ہندو ریاست کا ہے کہ وہ سب سے پہلے پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے گی۔ قائداعظم نے ٹراونکور کے نمائندے سے ملاقات کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ محض اس عمومی دوستی کے جذبے کا آئینہ دار نہیں جس کا اظہار عام طور پر ایک ریاست کے نمائندے کی دوسری ریاست کے نمائندے سے ملاقات سے ہوتا ہے بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معمول سے زیادہ مخلصانہ جذبۂ دوستی کا حامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب پاکستان اور ٹراونکور کی آزاد و خودمختار ریاستیں وجود میں آجائیں گی تو یہ دوستی دونوں کے درمیان قریبی سفارتی اور تجارتی تعلقات کی استواری پر منتج ہوگی۔[8]

تاہم ماؤنٹ بیٹن برطانوی سامراج کے نمائندہ کی حیثیت سے کانگرس کی قیادت کا ہم خیال تھا۔ اس کا ثبوت جون کے تیسرے ہفتے میں مل گیا جبکہ اس نے سری نگر میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران مہاراجہ کشمیر کو غیر مبہم الفاظ میں یہ مشورہ دیا کہ ''وہ اپنی ریاست کی آزادی وخودمختاری

کا ہرگز اعلان نہ کرے۔'' ماؤنٹ بیٹن کے سری نگر سے نئی دہلی میں واپسی پر 25؍جون کو ہندوستان کی عبوری کابینہ نے ریاستی امور کا ایک نیا محکمہ قائم کیا۔ سردار پٹیل کو اس نئے محکمے کا وزیر مقرر کیا گیا اور وی۔ پی۔ مینن کو اس کے سیکرٹری کے فرائض سپرد کئے گئے۔ اُسی دن پاکستان کی عبوری کابینہ نے بھی سردار عبدالرب نشتر کو ریاستی امور کے نئے محکمے کا وزیر مقرر کیا اور اکرام اللہ کو اس کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز کیا۔ چند دن بعد کانگرس کی قیادت نے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے یہ درخواست کی کہ وہ ریاستوں کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے کام میں امداد کرے اور ماؤنٹ بیٹن نے یہ درخواست بخوشی قبول کر لی۔ کانگرسی لیڈروں کا خیال تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت، اس کا وقار اور اس کا شاہی خاندان سے تعلق ریاستی حکمرانوں سے نمٹنے میں انتہائی مدد و معاون ثابت ہوگا۔[9] 5؍جولائی کو سردار پٹیل کے محکمے کی جانب سے ایک بیان جاری کیا گیا جس میں بڑے مؤدبانہ الفاظ میں ریاستی حکمرانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ دوستانہ طریقے سے الحاق کر کے صرف تین محکموں یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے فرائض اس کے سپرد کریں۔ باقی سارے معاملات میں وہ حسب سابق آزاد و خود مختار ہوں گے۔ حکومت ہندوستان کا ان پر کوئی غلبہ نہیں ہوگا بلکہ ان کے اور ہندوستان کے درمیان صرف دوستی و خیر سگالی کے جذبات کی کارفرمائی ہوگی۔ تاہم 8؍جولائی کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے اس مؤقف کو دہرایا کہ ہندوستانی ریاستیں کسی ڈومنینین میں شامل ہونے کی پابند نہیں ہیں۔ انہیں آزاد و خود مختار حیثیت اختیار کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

ہوڈسن کا بیان ہے کہ ماؤنٹ بیٹن، جو ریاستوں کے بارے میں مسلم لیگ کی اس پالیسی کے خلاف تھا، ہندوستان کے ریاستی امور کے محکمے کے انچارج وزیر کے طور پر سردار پٹیل کے تقرر اور پھر اس کے محکمے کی جانب سے جاری کردہ اس بیان سے بہت مطمئن ہوا تھا کیونکہ وہ نہرو کی ریاستی حکمرانوں کو بلاوجہ ڈرانے دھمکانے کی پالیسی کے خلاف تھا۔ اس کے رائے یہ تھی کہ ریاستی حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ لالچ دے کر شائستگی اور خوش اخلاقی سے ہندوستان کے ساتھ الحاق پر آمادہ کرنا چاہیے۔

10؍جولائی کو وزیراعظم ایٹلی نے پارلیمنٹ میں قانون آزادیٔ ہند پر بحث کے دوران یہ واضح کر دیا کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریاستوں کی آزادی و خود مختاری کے خلاف اور

ہندوستان کی سالمیت و یکجہتی کے حق میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ لیبر حکومت کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔ ایٹلی نے اپنی تقریر میں ہندوستانی ریاستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ”حکومت برطانیہ کو امید ہے کہ ہندوستانی ریاستیں وقت آنے پر دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں اپنا جائز مقام حاصل کر لیں گی۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ حکومت برطانیہ اس ریاست کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرے گی جو اپنے ہمسایوں سے کٹ کر آزادی کا اعلان کر دے تو میں اس ریاست کے حکمران سے کہوں گا کہ کوئی جلدی نہیں ہے ذرا سوچ لو۔ مجھے امید ہے کہ تم جلدی میں کوئی ناقابل تنسیخ فیصلہ نہیں کرو گے۔“[10] لیکن قائداعظم محمد علی جناح نے وزیراعظم ایٹلی کے اس بیان کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسی دن کشمیر مسلم کانفرنس کے ایک وفد سے ملاقات کے بعد اپنی اس رائے پر اصرار کیا کہ ہندوستانی ریاستیں چاہیں تو آزاد و خودمختار رہ سکتی ہیں۔ انہیں ہندوستان یا پاکستان کی ڈومینین میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔[11] 14 رجولائی کو برطانیہ کے اٹارنی جنرل نے پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا خیال ہے کہ ریاستوں کا مستقبل ناگزیر طور پر برطانوی ہندوستان سے منسلک ہے کیونکہ وہ علاقائی لحاظ سے برطانوی ہندوستان کا جزو لاینفک ہیں اور پھر 16 رجولائی کو وزیر ہند لارڈ لسٹوویل نے ہاؤس آف لارڈز میں غیر مبہم طور پر اعلان کر دیا کہ ”اگر کسی ہندوستانی ریاست نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو ہم اس کی الگ بین الاقوامی حیثیت کو تسلیم نہیں کریں گے۔“[12]

بظاہر برطانوی ارباب اقتدار نے یہ اعلانات جواہر لال نہرو کی 16 رجون کی اس تنبیہ کے پیش نظر کئے تھے کہ اگر کسی بیرونی ملک نے کسی ہندوستانی ریاست کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کیا تو ہندوستان اسے غیر دوستانہ فعل تصور کرے گا۔ گپتا لکھتا ہے کہ برطانوی لیڈروں کے ان اعلانات سے بالکل واضح ہو گیا تھا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو متحد اور مضبوط رکھنے کے حق میں تھی کیونکہ برطانیہ کے مفادات کا تقاضا یہی تھا۔ حکومت برطانیہ دوطرفہ کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف تو ہندوستان کے قوم پرست تھے جن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ کامن ویلتھ سے اپنے روابط رکھیں گے اور دوسری طرف کنزرویٹو حزب اختلاف تھی جو ہندوستانی ریاستوں کی آزادی کے حق کی بھرپور تائید و حمایت کر رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کس قسم کا ہندوستان برطانیہ کے مفادات کے مطابق ہوگا۔ ان مفادات کا تحفظ دہلی میں ایک ایسی حکومت ہند کے ذریعے ہو سکے گا جو متحد،

مضبوط اور دوستانہ ہو اور جسے برطانیہ کی نیت پر کوئی شک وشبہ نہ ہو یا ہندوستان کو کئی کمزور سیاسی یونٹوں میں تقسیم کرنے سے ہوگا۔ اگر ہندوستان کے دو سے زیادہ ٹکڑے کر دیے جاتے تو کمزور یونٹ برطانیہ سے تحفظ لیتے اور ایسی صورت میں بقیہ ہندوستان بالخصوص اس کے زیادہ اہم حصوں اور برطانیہ کے درمیان قریبی تعلقات قائم کرنے کے امکانات ختم ہو جاتے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں جو برطانیہ کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی سلطنت کو کامن ویلتھ میں تبدیل کر دے، یہ سوال بہت اہمیت کا حامل تھا اور یہ جاننے کے لیے کوئی زیادہ پیش بینی کی ضرورت نہیں تھی کہ برطانیہ کے مفادات کا تقاضا کیا تھا۔ حکومت برطانیہ برصغیر کو دو سے زیادہ ریاستوں میں تقسیم کرنے کے حق میں نہیں تھی۔''[13] چوہدری محمد علی اور دوسرے پاکستانی مؤرخین ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی سے متعلقہ ان واضح اعلانات کا کوئی ذکر نہیں کرتے البتہ مسلم لیگ کی اس رائے کا بار بار ذکر کرتے ہیں کہ وزارتی مشن کے 12رمئی کے میمورنڈم کے مطابق آئینی اور قانونی لحاظ سے ریاستوں کو اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔

18رجولائی کو برطانوی پارلیمنٹ میں قانون آزادیٔ ہند منظور ہوا تو ماؤنٹ بیٹن نے شہنشاہ معظم کے نمائندہ کی حیثیت سے 25رجولائی کو ریاستی حکمرانوں کے چیمبر آف پرنسز کو خطاب کیا۔ اس نے اپنی سپریم کمانڈر کی وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کے سینے پر بہت سے تمغے لٹک رہے تھے۔ وہ اس قدر جاہ وجلال اور شان وشوکت کے ساتھ میٹنگ میں آیا کہ اس قسم کی رسومات کے عادی ریاستی حکمران بھی حیران رہ گئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''تمہاری ریاستیں جغرافیائی اور اقتصادی لحاظ سے ہندوستانی ڈومینین کا جزو لاینفک ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ہندوستان کے ساتھ الحاق نامے پر دستخط کرو جس کے مطابق حکومت ہندوستان صرف تین امور یعنی محکمۂ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے انتظام کی ذمہ دار ہوگی اور باقی سارے امور میں تم آزاد وخودمختار ہوگے۔ تمہارے حقوق پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔ تمہاری مراعات برقرار رہیں گی۔ تمہیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ تم اپنے ہمسایہ اور عوام سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔'' 28رجولائی کو ماؤنٹ بیٹن نے ریاستی حکمرانوں کو دعوت دی جس کے دوران اس نے ان حکمرانوں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں جنھوں نے اس وقت تک ہندوستان سے الحاق کرنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا ہوا تھا۔ وی۔ پی۔ مینن کے بیان کے مطابق یہ منظر ایسا ہی تھا جیسا کہ

عام انتخابات میں پولنگ بوتھ کے پاس آخری کنویسنگ کے موقع پر ہوتا ہے۔

چونکہ ریاست ٹراونکور کا کوئی نمائندہ وائسرائے کی طلب کردہ اس میٹنگ میں شامل نہیں ہوا تھا اس لیے کانگرسی لیڈروں نے اس کے دیوان سرسی۔ پی، راما سوامی آئیر کو بری طرح ہدف ملامت بنایا اور ٹراونکور کی ریاستی کانگرس نے دھمکی دی کہ وہ یکم اگست کو ڈائریکٹ ایکشن کی مہم شروع کرے گی۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے دیوان کو بلایا۔ وہ ابتدائی بات چیت میں تو اپنی ریاست کے موقف پر بضد رہا لیکن بالآخر وہ اس رائے سے متفق ہو گیا کہ ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ناگزیر ہے۔ جب دیوان واپس ٹراونکور پہنچا تو اس پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا گیا۔ جس کے بعد مہاراجہ نے بذریعہ تار حکومت ہندوستان کو اپنے الحاق سے مطلع کر دیا۔ جب اس کے فیصلے کا اعلان ہوا تو ان دوسرے حکمرانوں پر اس کا واضح طور پر اثر ہوا جو اس وقت تک الحاق کے معاملے میں پس وپیش کر رہے تھے۔ چوہدری محمد علی کہتا ہے کہ اس طرح ماؤنٹ بیٹن نے ریاستوں کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس نے اس مقصد کے لیے وہ سب کچھ کیا جو کہ اس کے احاطۂ اختیار میں تھا۔ اس نے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے لیے ہر ممکن کاروائی کی بلکہ اس نے اس سلسلے کے ہر متنازعہ معاملے میں ہندوستان کی بھرپور تائید وحمایت کی۔ جودھپور اور جیسلمیر کی ریاستیں جغرافیائی لحاظ سے پاکستان سے متصل تھیں۔ اگرچہ ان ریاستوں کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی اور ان کے حکمران بھی ہندو تھے۔ لیکن وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے خواہاں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کے مفادات کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ جب وی۔ پی۔ مینن کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے فوراً ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا اور ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ جودھپور کو بلا کر کہا کہ بلاشبہ تم قانونی لحاظ سے پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتے ہو لیکن اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے کیونکہ تم ہندو ہو اور تمہاری رعایا کی اکثریت بھی ہندو ہے اور تمہاری ہمسایہ ریاستیں بھی ہندو ہیں۔ اگر تم نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تو یہ اقدام برصغیر کی تقسیم کے اصول کے منافی ہوگا اور اس امر کا خطرہ ہے کہ تمہاری ریاست میں شدید فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جائیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کا یہ انتباہ بارآور ثابت ہوا۔ جودھپور اور جیسلمیر کی دونوں ریاستیں ہندوستان میں شامل ہو گئیں۔[14]

چوہدری محمد علی کو یہ شکایت ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ان دونوں ریاستوں کے بارے

میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ اس رویے سے بالکل مختلف تھا جو اس نے ریاست کپورتھلہ کا الحاق منظور کرتے وقت اختیار کیا تھا۔ اس ریاست کا حکمران سکھ تھا لیکن اس کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کا الحاق ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان سے پہلے منظور کیا تھا اور اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ اس کا یہ اقدام برصغیر کی تقسیم کے اصول کے منافی تھا۔ لیکن چوہدری محمد علی نے یہاں یہ نہیں بتایا کہ ان تلخ حقیقتوں کے باوجود مسلم لیگ نے آخر وقت تک ریاستوں کے بارے میں اپنی غیر جمہوری اور غیر حقیقت پسندانہ پالیسی میں تبدیلی کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کیوں نہیں کی تھی؟ قائداعظم محمد علی جناح نے 30 / جولائی کو بھی اپنے ایک بیان میں بالکل وہی باتیں کیں جو وہ ابتداء ہی سے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ برطانیہ کا اقتدار اعلیٰ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی ساری ریاستیں خود بخود مکمل طور پر آزاد و خود مختار ہو جائیں گی۔ لہٰذا انہیں پوری آزادی ہے کہ وہ دونوں ڈومینینوں میں سے کسی ایک میں شامل ہوں یا آزاد رہیں۔ [15] یہ بیان اس حقیقت کے باوجود دیا گیا تھا کہ اس وقت تک مسلم لیگ کو معلوم ہو گیا تھا کہ بٹالہ اور گورداسپور کی مسلم اکثریت والی تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر کے ریاست جموں و کشمیر اور ہندوستان کے درمیان جغرافیائی رابطہ پیدا کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بظاہر اس بیان کی بنیاد محض قائداعظم کی آئین پسندی پر نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد نہ صرف اس امید پر تھی کہ مسلم حکمرانوں والی بھوپال اور حیدرآباد کی ریاستیں آزاد و خود مختار ہو جائیں گی، بلکہ اس خوش فہمی پر بھی تھی کہ ہندو حکمران والی ریاست جموں و کشمیر بہر صورت پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں گر پڑے گی۔

بھوپال کی آزادی کی امید کی وجہ یہ تھی کہ اس ہندو اکثریت والی ریاست کے مسلمان نواب سر حمید اللہ خان نے اپنے آئینی مشیر سر محمد ظفر اللہ خان کے مشورہ کے مطابق ماؤنٹ بیٹن کی طلب کردہ 25 / جولائی کی میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی کیونکہ وہ ریاست کی آزادی و خود مختاری کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اگست کے اوائل میں یہ امید موہوم ثابت ہوگئی جبکہ ماؤنٹ بیٹن نے نواب کو ہندوستان سے الحاق کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ہوڈسن کا بیان یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نواب بھوپال کو نہرو کے بعد ہندوستان میں اپنا بہترین دوست تصور کرتا تھا۔ اس نے اگست کے اوائل میں نواب کو بلایا اور اس سے الحاق کی طویل بات چیت کی۔ نواب پہلے تو اپنی آزادی کے

فیصلہ پر ڈٹا رہا، پھر کچھ متزلزل ہوا اور پھر اس نے استفسار کیا کہ آیا وہ الحاق کے بغیر ''سٹینڈ سٹل'' Stand Still معاہدہ کرسکتا ہے؟ جب اس سوال کا جواب زوردار نفی میں دیا گیا تو اس نے اپنے آئینی مشیر سر محمد ظفر اللہ خان کو الحاق کی شرائط طے کرنے کے لیے دہلی بھیجا مگر اسے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ حکومت ہندوستان نے ریاستوں کے الحاق کے لیے جو شرائط پیش کر رکھی ہیں ان میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ بالآخر نواب نے ہندوستان کے ساتھ الحاق نامے پر دستخط کر دیئے۔ شرط صرف یہ تھی کہ اس کا اعلان اقتدار کی منتقلی کے دس دن بعد کیا جائے گا۔[16] اس نے دو اڑھائی ہفتے کی مہلت محض اس لیے مانگی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے حق میں ریاست کی گدی سے دستبردار ہو کر پاکستان میں کوئی بڑا عہدہ قبول کرنا چاہتا تھا۔ مگر 22 راگست کو اس نے ماؤنٹ بیٹن اور سردار پٹیل سے ملاقات کرنے کے بعد اپنا یہ ارادہ بدل دیا۔ وہ اسی دن کراچی آیا۔ یہاں اس نے جناح سے ملاقات کی اور پھر اس نے واپس دہلی جا کر اپنی ریاست کے ہندوستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔

بھوپال کے اس اعلان سے پہلے حکومت ہندوستان کو پتہ چل چکا تھا کہ 15 راگست کو کشمیر اور حیدر آباد کے علاوہ صرف جونا گڑھ کی ایک چھوٹی سی ریاست ایسی تھی جس نے خلاف توقع ہندوستان کے الحاق نامے پر دستخط نہیں کیے تھے اور یہ کہ یہ ریاست جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کا جزو ہونے کے باوجود پاکستان سے الحاق کر چکی ہے۔ کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں اس ریاست کا رقبہ صرف 3337 مربع میل تھا اور اس کی آبادی 670719 افراد پر مشتمل تھی۔ جس میں ہندوؤں کی اکثریت 80 فی صد تھی۔ یہ چاروں طرف کاٹھیاواڑ کی ایسی ہندو ریاستوں سے گھری ہوئی تھی جو ہندوستان سے الحاق کر چکی تھیں۔ البتہ اس کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی جس کے ذریعے اس کا براستہ سمندر پاکستان سے رابطہ قائم ہوسکتا تھا۔ اس کا حکمران ایک مسلمان نواب تھا جس کے دیوان نے 25 رجولائی کو ماؤنٹ بیٹن کی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ ایلن کیمبل جانسن کے بیان کے مطابق اس نے اس موقعہ پر از خود یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے نواب کو ہندوستان سے الحاق کا مشورہ دے گا کیونکہ قبل ازیں حکومت جونا گڑھ یہ اعلان کر چکی تھی کہ وہ کاٹھیاواڑ کی دوسری ریاستوں کے ساتھ مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرے گی۔ لیکن اقتدار کی منتقلی سے صرف پانچ دن پہلے جونا گڑھ میں ''محلاتی انقلاب'' آ گیا جبکہ سندھی مسلمانوں کے ایک گروہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ سر شاہ نواز بھٹو دیوان کے عہدے پر فائز ہو گیا اور نواب اپنے محل میں قیدی

بن گیا۔[17] ہوڈسن لکھتا ہے کہ یہ ''محلاتی انقلاب'' دراصل مئی 1947ء میں آیا تھا جبکہ نواب یورپ گیا ہوا تھا۔لیکن ولکوکس (Wilcox) کی اطلاع یہ ہے کہ نواب جونا گڑھ نے مسلم لیگ کے آئینی مشیر سر ظفر اللہ خان سے مشورہ کے بعد سندھ کے ایک مسلم لیگی لیڈر سر شاہ نواز غلام مرتضیٰ بھٹو کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔[18] دیوان سر شاہ نواز بھٹو نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی جناح سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔جس میں قائداعظم نے اس کو حکم دیا تھا کہ وہ ''15/اگست تک بہر صورت کسی سے الحاق نہ کرے۔15/اگست کو اقتدار کی منتقلی ہوئی تو اسی دن حکومت جونا گڑھ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔جس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس طرح ریاست کی زیادہ سے زیادہ امور میں آزادی وخود مختاری محفوظ رہے گی۔

حکومت جونا گڑھ کے اس اعلان سے دہلی میں بہت تشویش پیدا ہوئی۔ ہندوستان کے ارباب اقتدار اس الحاق کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔اگر وہ ایسا کرتے تو حیدر آباد کی آزادی یقینی ہو جاتی۔سردار پٹیل جیسے کانگریسی لیڈروں کی تشویش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جونا گڑھ کرشن اوتار کی جنم بھومی تھی اور اسی جگہ سومنات کا مشہور مندر ہوتا تھا جسے محمود غزنوی نے 1024ء میں تہس نہس کر دیا تھا۔اس واقعہ کو تقریباً ایک ہزار سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ہی اسے ابھی تک فراموش نہیں کیا تھا۔[19] اس اعلان سے کاٹھیاواڑ کی دوسری ریاستوں میں بھی تشویش پیدا ہوئی۔جن کی سلامتی اور فرقہ وارانہ امن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔نواں نگر کے مہاراجہ جام صاحب، ہندوستان کی وزارت ریاستی امور، گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن اور حتیٰ کہ برطانوی وزیر ہند لارڈ لسٹوویل نے، جو ان دنوں دہلی اور کراچی کے دورے پر تھا، بہت کوشش کی کہ نواب اپنا فیصلہ بدل دے یا حکومت پاکستان الحاق قبول کرنے سے انکار کر دے مگر ان کی ساری کوششیں ناکام ہوئیں۔

ہوڈسن کی رائے یہ تھی کہ جناح نے یہ سیاسی چال محض ہندوستان کے لیے ایک ایسا سنگین مسئلہ پیدا کرنے کے لیے چلی تھی جس کا نتیجہ پاکستان کے لیے سودمند ہو سکتا تھا۔جناح نے یہ سوچا ہوگا کہ اگر حکومت ہندوستان نے جونا گڑھ کے پاکستان کے ساتھ الحاق پر اعتراض نہ کیا تو اس طرح وہ عملاً یہ مؤقف تسلیم کر لے گی کہ ہر ریاست کے حکمران کو جغرافیہ اور آبادی کا لحاظ کئے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا قانونی حق حاصل ہے اور پھر اس اصول کا حیدر آباد پر بھی اطلاق

ہو سکے گا۔ اگر ہندوستان نے بزورِ قوت مداخلت کی تو نہ صرف اس کی ساری دنیا میں بدنامی ہوگی بلکہ وہ ایک ایسی مثال قائم کر دے گی کہ اگر مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تو اس کا پاکستان کی جانب سے کشمیر میں اطلاق ہو سکے گا اور اگر ہندوستان نے قوت استعمال کرنے کی بجائے جونا گڑھ میں استصواب کا مطالبہ کیا تو اس مطالبے کو ایک عمومی اصول کے طور پر تسلیم کیا جا سکے گا اور جب اس اصول پر ریاست جموں وکشمیر میں عمل ہوگا تو فیصلہ پاکستان کے حق میں ہوگا ......لیکن حکومت ہندوستان نے ماؤنٹ بیٹن کے زوردار مشورے کو قبول کر کے جونا گڑھ میں فوجی مداخلت نہ کی کیونکہ اس طرح دونوں ڈومینینوں میں جنگ کا خطرہ تھا۔ اس کی بجائے نواب جونا گڑھ پر بلا واسطہ اور بالواسطہ دباؤ ڈالنے کی پالیسی اختیار کی۔[20] اس مقصد کے لیے 19 ستمبر کو ہندوستان کی ریاستی امور کی وزارت کا سیکرٹری وی۔ پی۔ مینن جونا گڑھ گیا لیکن اس کی نواب سے ملاقات نہ ہو سکی اور دیوان سر شاہ نواز بھٹو نے اسے بتایا کہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ سٹیٹ کونسل کی خواہش کے مطابق کیا گیا ہے کیونکہ ''انہیں کمیونزم کا خطرہ ہے۔'' بھٹو کی رائے یہ تھی کہ اس مسئلہ کا فیصلہ ریفرنڈم کے ذریعے ہونا چاہیے اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اس سلسلے میں بات چیت کرنی چاہیے۔[21]

حکومت ہندوستان نے اس مشورے پر عمل نہ کیا البتہ اس نے کاٹھیاواڑ کی ایک دفاعی فوج کی تنظیم کی۔ کاٹھیاواڑ کی ان ہندو ریاستوں میں اپنی فوجیں بھیجیں جو ہندوستان سے الحاق کر چکی تھیں۔ نواں نگر کے مہاراجہ جام صاحب کی جانب سے وزارت ریاستی امور کے نام ایک درخواست دلوائی جس میں لکھا تھا کہ جونا گڑھ کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے اعلان سے کاٹھیاواڑ کی ساری ریاستوں کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اس لیے ان کے تحفظ کے لیے بلا تاخیر مؤثر اقدامات کئے جائیں۔ جونا گڑھ کی معاشی ناکہ بندی کی گئی اور ریلوے کا رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی کسٹم اور ریلوے کی آمدنی میں یکا یک بہت کمی ہو گئی اور غذائی قلت بھی پیدا ہو گئی۔ 25 ستمبر کو بمبئی میں گاندھی کے ایک بھتیجے سمال داس گاندھی کی ''زیر صدارت'' جونا گڑھ کی عبوری حکومت قائم کی گئی اور چند دن بعد اس عبوری حکومت کا صدر مقام جونا گڑھ کے نزدیک راجکوٹ میں منتقل کر دیا گیا جہاں رضا کار بھرتی کئے گئے جنہوں نے فوراً ہی جونا گڑھ پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔[22] دریں اثناء ماؤنٹ بیٹن نے نئی دہلی میں

پاکستان کے وزیراعظم نوبزادہ لیاقت علی خان سے جونا گڑھ کے بارے میں بات چیت کی تو نوابزادہ نے ایک ایسا فقرہ کہا کہ جس سے یہ تاثر ملا کہ پاکستان نے جونا گڑھ کا مسئلہ محض ہندوستان کوایک جال میں پھنسانے کے لیے پیدا کیا ہے۔اس کا فقرہ یہ تھا کہ ''بہت اچھا۔جاؤ! جنگی اقدام کرواور پھر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے'' اور ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے نے یہ تاثر لیا کہ پاکستان جونا گڑھ کو محض کشمیر پر سودابازی کے لیے استعمال کررہا ہے۔[23]

اکتوبر کے اوائل میں ہندوستان نے اپنی فوجیں جونا گڑھ کی دو ذیلی ریاستوں میں بھیج کران پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا جبکہ حکومت پاکستان ان ذیلی ریاستوں کی قانونی حیثیت کے تعین کا مطالبہ کرتی رہی۔ 23راکتوبر کو پاکستان کے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے رسمی طور پر یہ تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتوں کو بذریعہ گفت وشنید جونا گڑھ میں استصواب کی شرائط طے کرنی چاہئیں۔مگراس تجویز کا کوئی جواب موصول نہ ہوااور جونا گڑھ میں گاندھی کے بھتیجے کی عبوری حکومت کے ''رضا کاروں'' کے حملوں کی تعداد اور شدت میں اضافہ ہو گیا۔اس صورت حال کے پیش نظر نواب جونا گڑھ اپنا سارا مال ومتاع اور پالتو کتوں کی ''فوج'' لے کر بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچ گیا جبکہ اس کے دیوان سرشاہنواز غلام مرتضےٰ بھٹو نے 27راکتوبر کو گورنر جنرل پاکستان کے نام ایک خط میں یہ لکھا کہ ہمیں ریلوے اور کسٹم سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ تقریباً ختم ہوگئی ہے۔اگرچہ پاکستان نے ہمیں بڑی فراخدلی سے اناج مہیا کیا ہے تاہم ریاست کی غذائی حالت بہت ہی بری ہے۔ جو مسلمان کاٹھیاواڑ ریلوے سے سفر کرتے ہیں ان سے بہت بدسلوکی کی جاتی ہے۔ ہزہائی نس اور ان کے شاہی خاندان کے افراد کو یہاں سے اس لیے جانا پڑا ہے کہ ہماری خفیہ پولیس نے اطلاع دی تھی کہ ان کی یہاں موجودگی سے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے اوران کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔اگرچہ الحاق کے فوراًبعد ہزہائی نس کواور مجھے مبارک باد کے سینکڑوں پیغامات، زیادہ تر مسلمانوں کی طرف سے موصول ہوئے تھے لیکن اب ہمارے بھائیوں میں عدم دلچسپی اور سردمہری پیدا ہوگئی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں میں پاکستان کے لیے کوئی جوش و خروش باقی نہیں رہا......لہٰذا میری تجویز ہے کہ جونا گڑھ کے مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے دونوں ڈومینینوں کے نمائندوں کی کانفرس کا فوری طور پر انتظام کیا جائے۔[24]

یکم نومبر 1947ء کو ہندوستانی فوجوں نے جونا گڑھ کی دو ذیلی ریاستوں منگرول اور

بابریاواڑ پرقبضہ کرلیا۔مناوادر پر وہ چند دن پہلے ہی قبضہ کر چکی تھی۔ 5رنومبر کو ریاست کی سٹیٹ کونسل نے فیصلہ کیا کہ ریاست کے دونوں ڈومینینوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت میں مکمل ردوبدل کی ضرورت ہے خواہ اس مقصد کے لیے پاکستان کے ساتھ الحاق کے پہلے فیصلے کو بدلنا ہی پڑے۔ 7رنومبر کو دیوان بھٹو نے ہندوستان کے ریجنل کمشنر کے نام ایک خط میں لکھا کہ جونا گڑھ کی سٹیٹ کونسل کا ایک سینئر رکن کیپٹن ہاروے جونز راجکوٹ میں سمال داس گاندھی سے بات چیت کرنے کے بعد بعض تجاویز اپنے ساتھ لایا ہے۔کونسل ان تجاویز کو زیر احتجاج قبول کرنے پر آمادہ ہے لیکن سمال داس گاندھی کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے سے پہلے ہم نے سرکردہ شہریوں کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ آج شام ایک میٹنگ ہوئی جس میں عوامی نمائندوں نے متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ ریاست کی انتظامیہ نام نہاد عبوری حکومت کی وساطت کی بجائے براہ راست انڈین یونین کے سپرد کردینی چاہیے۔[25]

جب دیوان بھٹو یہ خط لکھ رہا تھا اس وقت 20000 افراد پر مشتمل ''آزاد فوج'' جونا گڑھ میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ فوج تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل تھی اور یہ آرمرڈ کاروں اور جدید اسلحہ سے لیس تھی۔ 9رنومبر کو ہندوستان نے رسمی طور پر ریاست کی انتظامیہ کا کنٹرول سنبھال لیا۔حکومت پاکستان نے ہندوستان کی اس کھلی جارحیت پر بہت شور مچایا۔اس کا وکیلانہ مؤقف یہ تھا کہ چونکہ ریاست جونا گڑھ کا آئینی اور قانونی طور پر پاکستان سے الحاق ہو چکا تھا اس لیے دیوان بھٹو کو ریاست کی انتظامیہ ہندوستان کے حوالے کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ ہندوستان نے پاکستان کے ایک علاقے پر قبضہ کر کے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔سردار پٹیل نے 12رنومبر کو پاکستان کے اس واویلا کا جواب دیا۔اس نے راجکوٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم نے ان ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ تعلقات کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی جن کے قدرتی طور پر پاکستان سے تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ہم نے ان کی کسی ریاست کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی۔لیکن انہوں نے اس سلسلے میں اکثر و بیشتر ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ سردار پٹیل نے اس پبلک جلسے میں حلفیہ اعلان کیا کہ ''وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک سومنات کے مندر کی از سرِ نو تعمیر نہیں ہوگی۔''[26]

پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے سردار پٹیل کی اس تقریر کے جواب میں 16 رنومبر کو ایک بیان جاری کیا جس میں جونا گڑھ اور کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے متضاد رویے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ان دونوں تنازعوں کے تصفیہ کے لیے اقوام متحدہ سے رجوع کیا جائے۔ حسب توقع حکومت ہندوستان نے اس وقت پاکستان کی اس تجویز کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے جونا گڑھ پر اپنا کنٹرول مستحکم کرنے کے بعد 20 رفروری 1948ء کو ریفرنڈم کرایا۔ جس میں نئی دہلی کے ایک سرکاری اعلان کے مطابق 19070 لوگوں نے ہندوستان کے حق میں اور صرف 91 افراد نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے۔ جونا گڑھ کی ذیلی ریاستوں میں ریفرنڈم کا بھی اسی قسم کا نتیجہ برآمد ہوا۔ ریفرنڈم کا نتیجہ اس سے مختلف ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ جونا گڑھ کی عبوری حکومت کے سربراہ سمال داس گاندھی نے قبل ازیں مقامی مسلمانوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ ''اگر انہوں نے ہندوستان کے خلاف ووٹ دیئے تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ہم سانپوں اور بچھوؤں کو اپنے تکیوں کے نیچے زندہ رہنے کی اجازت نہیں دینگے۔'' ظفر اللہ خان کے بیان کے مطابق ہندوستانی فوج نے بے پناہ لوٹ مار اور قتل غارت کے ذریعے مقامی مسلمانوں میں دہشت پھیلا دی تھی اور اس فوج کو لوٹ مار کی اتنی جلدی تھی کہ ''اس نے کئی معزز مسلمان گھرانوں کی عورتوں کے زیورات چھیننے کے لیے ان کی چھاتیاں کاٹ دی تھیں۔''[27]

ریاست جونا گڑھ کے اس سہ ماہی ڈرامے کے دوران ریاست جموں وکشمیر میں بھی کچھ اسی قسم کا المیہ ڈرامہ کھیلا گیا۔ ان دونوں ڈراموں میں ایک فرق تو یہ تھا کہ جونا گڑھ پر قبضہ کرنے میں حکومت ہندوستان کی اداکاری کا معیار اونچا تھا اور اس میں جرأت کا عنصر موجود تھا۔ لیکن کشمیر کے ڈرامے میں حکومت پاکستان کی اداکاری کا معیار پست تھا اور اس میں نیم دلی یا بزدلی نمایاں تھی اور دوسرا فرق یہ تھا کہ جونا گڑھ پر قبضے کی کاروائی کا انچارج برطانوی سامراج کا نمائندہ ماؤنٹ بیٹن تھا جبکہ کشمیر کے ڈرامے میں قائم مقام برطانوی کمانڈر انچیف گریسی کا کردار پاکستان کے خلاف تھا۔ اس ڈرامے کی ہدایت کاری پاکستان کی بیوروکریسی کے بعض ایسے عناصر کے سپرد تھی جنہیں قومی کام سے زیادہ لوٹ مار میں دلچسپی تھی۔ جس طرح ہندوستان نے جونا گڑھ کو آزاد کرانے کے لیے رضا کاروں کی فوج کی تنظیم کی تھی بالکل اسی طرح ستمبر کے اوائل میں حکومت پاکستان نے بھی پونچھ کے حریت پسندوں کی امداد کے لیے پنجاب سے رضا کار بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن اس فیصلہ پر اس قدر بزدلی سے عمل ہوا کہ نہ تو کٹھوعہ روڈ کو بند کیا گیا اور نہ ہی سری نگر کے ہوائی اڈے کو ناکارہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میجر جنرل اکبر خان کے بقول یہ کاروائی محض اس لیے نہ ہوئی کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کو خطرہ تھا کہ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان بھرپور جنگ شروع ہو جائے گی۔ جب حکومت ہندوستان ستمبر کے مہینے میں پٹھانکوٹ اور جموں کے درمیان سڑک تعمیر کر چکی، دریائے راوی پر ایک عارضی پل بھی بن گیا اور دہلی سے سری نگر میں مواصلاتی ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ بھی پہنچ گیا تو حکومت پاکستان نے 22/اکتوبر کو قبائلیوں کو کشمیر پر یلغار کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن ان قبائلیوں کی وساطت سے کٹھوعہ روڈ اور سری نگر ہوائی اڈے کو بند کرنے کے لیے پھر بھی کوئی کاروائی نہ کی گئی بلکہ انہیں پونچھ اور وادی کشمیر کے علاقے میں لوٹ مار، قتل و غارت اور آبروریزی کی کھلی چھٹی دی گئی۔ جس طرح ہندوستان نے جونا گڑھ کی اقتصادی ناکہ بندی کی تھی اسی طرح حکومت پاکستان نے بھی کشمیر کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کی کوشش کی مگر یہ کاروائی اس لیے مؤثر نہ ہوئی کہ اس وقت تک پٹھانکوٹ سے کشمیر کو ضروریات زندگی کی سپلائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ریاست کے خزانے میں بھی سرمائے کی کوئی کمی نہیں تھی۔

جس طرح حکومت ہندوستان نے 25/ستمبر کو بمبئی میں گاندھی کے بھتیجے سمال داس گاندھی کی زیر صدارت جونا گڑھ کی ایک عبوری حکومت قائم کی تھی اسی طرح حکومت پاکستان نے بھی 22/اکتوبر کو راولپنڈی میں ایک آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ ان دونوں حکومتوں میں فرق یہ تھا کہ اول الذکر اپنے قومی مشن میں مخلص اور دیانت دار تھی لیکن موخر الذکر کے ارکان کو کشمیر کی آزادی سے زیادہ متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرنے اور ''مال غنیمت'' کی تقسیم میں دلچسپی تھی۔ جس طرح نواب جونا گڑھ 26/اکتوبر کو اپنے مال و متاع، شاہی خاندان کے افراد اور کتوں سمیت فرار ہو کر کراچی پہنچ گیا تھا اسی طرح مہاراجہ کشمیر بھی اسی تاریخ کو اپنی دولت، ہیرے جواہرات، پالتو جانوروں اور قیمتی ساز و سامان سمیت فرار ہو کر جموں پہنچ گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں فرق یہ تھا کہ اس موقعہ پر سمال داس گاندھی کی ''آزاد فوج'' نے جو دراصل ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے تربیت یافتہ اور منظم ارکان پر مشتمل تھی، جونا گڑھ پر حملوں کی تعداد اور شدت میں اضافہ کر دیا تھا اور وہ ریاست پر بھرپور حملے کی تیاریاں بھی مکمل کر چکی تھی۔ لیکن وادی کشمیر میں قبائلی حملہ آوروں کو بارامولا میں لوٹ مار اور زنا کاری سے ہی فرصت نہیں ملی تھی اور

حکومت پاکستان نے اس وقت بھی کٹھوعہ روڈ اور سری نگر کے ہوائی اڈے کو بند کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ان دونوں ڈراموں کے درمیان نمایاں ترین فرق یہ تھا کہ حکومت پاکستان نے جب 5 ستمبر کو جوناگڑھ کا الحاق قبول کیا تھا تو اس نے ریاست کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کے فوجی اور دوسرے ذرائع اتنے محدود تھے کہ وہ ایسا انتظام کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے برعکس حکومت ہندوستان نے 27 اکتوبر کو ماؤنٹ بیٹن کے مشورے کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کا الحاق قبول کرنے کے بعد اسی دن اپنی بہترین فوج سری نگر پہنچا کر تھوڑے ہی دنوں میں کشمیر کے بیشتر علاقے پر قبضہ کر لیا اور اس طرح یہ دونوں ڈرامے ہندوستان کے لیے نہایت خوش کن اور پاکستان کے لیے انتہائی المناک طور پر اختتام پذیر ہوئے۔

جہاں تک ریاست حیدرآباد کا تعلق ہے اس کے الحاق کا ڈرامہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا اس ڈرامے کے ہندوستان کے حق میں آخری ڈراپ سین میں اتنی تاخیر ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس دوران ہندوستان کے ارباب اقتدار فوجی اور سیاسی لحاظ سے کشمیر میں الجھے ہوئے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ کو اس سلسلے میں تحمل اور بردباری کی تلقین کرتا رہا تھا۔ برطانوی سامراج کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ ریاست حیدرآباد کے مستقبل کا مسئلہ پرامن طور پر ہندوستان کے حق میں طے ہو جائے اور اس کے مسلمان حکمران کے مفادات اور وقار کو کوئی زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ اس حکمران کے آباؤ اجداد نے اٹھارہویں صدی میں فرانسیسیوں، حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے خلاف جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ''گراں قدر'' خدمات سرانجام دی تھیں اور پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دوران بھی برطانوی حکومت کے وفادار اتحادی اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان کی خدمات کو بآسانی فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندوستان میں برطانوی راج کے ماتحت وسطی ہند کی اس ریاست کو خاص الخاص مقام حاصل تھا۔ اس کا رقبہ 86000 مربع میل تھا اور آبادی تقریباً 16000000 تھی جس کی 82 فیصد اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اس کی سالانہ سرکاری آمدنی تقریباً 26 کروڑ روپے تھی۔ اس کی اپنی کرنسی تھی اور اپنی ہی ڈاک کی ٹکٹیں تھیں۔ لہٰذا ''حضور نظام'' کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ برصغیر سے انگریزوں کی دستبرداری کے بعد اپنی ریاست کو آزاد وخود مختار قرار دے کر سترہویں صدی کا جاگیرداری نظام قائم رکھ سکے گا۔ اس کی اس خوش فہمی میں ''ملکی'' مسلمان جاگیرداروں و درمیانہ

طبقہ کے حاشیہ برداروں اور ''غیر ملکی'' مسلمان وظیفہ خوار دانشوروں نے پختگی پیدا کر رکھی تھی۔ چنانچہ 3/جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہوا تو چند دن بعد یعنی 11/جون کو ''حضور نظام'' نے اعلان کر دیا کہ میں دونوں ڈومینینوں میں سے کسی میں شامل نہیں ہوں گا۔ اسے امید تھی کہ اس کی ریاست برصغیر میں ایک تیسری برطانوی ڈومینین کا درجہ اختیار کر لے گی۔ اس نے اس مقصد کے لیے 11/جولائی کو اپنا ایک وفد وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پاس بھیجا۔ چونکہ تقریباً ایک ماہ قبل گاندھی یہ الٹی میٹم دے چکا تھا کہ ''اگر کسی ہندوستانی ریاست نے آزادی کا اعلان کیا تو ہندوستان اسے اپنے خلاف اعلان جنگ تصور کرے گا''، نہرو یہ کہہ چکا تھا کہ اگر کسی بیرونی ملک نے کسی ہندوستانی ریاست کی آزادی کو تسلیم کیا تو ہندوستان اسے غیر دوستانہ فعل تصور کرے گا اور ایک دن پہلے 10/جولائی کو برطانیہ کا وزیر اعظم ایٹلی پارلیمنٹ میں یہ واضح کر چکا تھا کہ اگر کسی ہندوستانی ریاست نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو حکومت برطانیہ اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ لہٰذا ماؤنٹ بیٹن نے اس وفد کو صاف بتا دیا کہ حیدرآباد کے لیے ڈومینین سٹیٹس کا خیال ترک کر دو اور بلا حیل و حجت ہندوستان سے الحاق کر لو۔ جب اس وقت اس نے اشارۃً کہا کہ نظام کو ہندوستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کرنے کی صورت میں اس کی ریاست کا پاکستان سے الحاق ہو سکے گا، تو ماؤنٹ بیٹن کا جواب یہ تھا کہ بلاشبہ نظام کو قانونی طور پر ایسا کرنے کا اختیار حاصل ہے...... لیکن ریاست کے جغرافیہ کی وجہ سے پاکستان کے ساتھ الحاق کے راستے میں حقیقی مشکلات حائل ہوں گی...... میں کسی قسم کی دھمکی دیئے بغیر یہ پیش بینی کر سکتا ہوں کہ اگر میرے مشورے پر عمل نہ کیا گیا تو اس کے نتائج پانچ دس سال میں ریاست کے لیے تباہ کن ہوں گے۔''[28]

نظام حیدرآباد اور اس کے حواریوں و مشیروں نے برطانوی سامراج کے نمائندے کے اس انتباہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ جب 15/اگست 1947ء کو اقتدار کی منتقلی ہوئی تو کشمیر کے علاوہ صرف حیدرآباد کی ریاست ایسی تھی کہ جس نے کسی بھی ڈومینیں میں شامل ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ''اعلیٰ حضرت'' کو اپنی ''آزادی و خود مختاری'' پر اصرار تھا البتہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کی بجائے ایک معاہدے کے تحت کوئی نہ کوئی تعلق قائم کرنے پر آمادہ تھا۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان ہندوستان کے مجوزہ الحاق نامے کی بجائے ایک تعلق نامے پر دستخط کئے جائیں جس میں یہ قرار دیا جائے کہ ریاست کے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کی

ذمہ داری ہندوستان کے سپرد ہو گی مگر حکومت ہندوستان کو یہ تجویز اس لیے منظور نہیں تھی کہ اس میں ریاست کی آزادی کی بو آتی تھی۔ حکومت ہند کی پیش کش یہ تھی کہ برطانوی افسروں کی نگرانی میں بذریعہ ریفرنڈم ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کر لیا جائے اور یہ بات نظام اور اس کے مسلمان جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے مسلم شونسٹوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ریاست کی 82 فی صد ہندو آبادی ہندوستان کے حق میں فیصلہ صادر کرے گی۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن کے مشورے کے مطابق اس مسئلے پر خط و کتابت اور بات چیت کا سلسلہ تقریباً تین ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران نظام نے مسلم لیگ کے آئینی مشیر سر ظفر اللہ خان کی بطور وزیر اعظم خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تا کہ اس کی وساطت سے حکومت ہندوستان سے کوئی سمجھوتہ ہو سکے مگر جناح نے یہ درخواست منظور نہ کی اور اس نے ظفر اللہ خان کو پہلے تو اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کا قائد اور پھر پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کر دیا۔

ہوڈسن کے بیان کے مطابق 22/اکتوبر 1947ء کو حیدر آباد کے وفد (جو حیدر آباد کے وزیر اعظم نواب چھتاری، قانونی مشیر سر والٹر مونکٹن اور سلطان احمد پر مشتمل تھا) اور حکومت ہندوستان کے نمائندوں کے درمیان ایک ''سٹینڈ سٹل'' معاہدے کی شرائط پر اتفاق ہو گیا تھا۔ وہ اس معاہدے کا مسودہ لے کر اسی دن حیدر آباد پہنچا تو نظام نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کو یہ ہدایت کی کہ وہ مسلسل تین دن تک اس پر غور کر کے اپنا مشورہ دے۔ حسب ہدایت 25/اکتوبر کو کونسل نے کثرت رائے سے مجوزہ معاہدے کے حق میں مشورہ دیا۔ چھ ووٹ اس کے حق میں تھے اور تین خلاف تھے۔ اسی دن شام کو نظام نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کا یہ مشورہ قبول کر لیا اور وفد کو بتایا کہ وہ اس معاہدے اور منسلکہ خفیہ خط پر دستخط کر دے گا۔ 26/اکتوبر کا دن نظام نے یہ خفیہ خط لکھنے میں گزارا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ ''حیدر آباد کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر کبھی ہندوستان نے برطانوی کامن ویلتھ سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تو حیدر آباد کو اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کرنے کا حق حاصل ہو گا اور اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائی ہو گئی تو حیدر آباد غیر جانبدار رہے گا۔'' لیکن اس دن یعنی 26/اکتوبر کی شام کو نظام نے اس خط اور مجوزہ ''سٹینڈ سٹل'' معاہدے پر دستخط نہ کئے حالانکہ پروگرام کے مطابق اس کے وفد کو اگلے دن صبح دہلی روانہ ہونا تھا۔ 27/اکتوبر کو علی الصبح 3 بجے مقامی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی ایک جماعت

اتحادالمسلمین کے تقریباً 20000 ارکان نے وزیراعظم نواب چھتاری کے مکان کا محاصرہ کرکے اعلان کیا کہ متذکرہ سہ رکنی وفد کو معاہدے کے لیے دہلی جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور صبح 8 بجے نظام نے وفد کو یہ پیغام پہنچادیا کہ ''چند دن کے لیے دہلی مت جاؤ۔''[29]

اتحادالمسلمین کی یہ جماعت عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک اور عطاللہ شاہ بخاری کی مجلس احرار کی قسم کی تنظیم تھی۔اس کا لیڈر ایک انتہائی غیر ذمہ دار اور نیم تعلیم یافتہ شخص قاسم رضوی تھا جسے مجمع گیری اور بڑھک بازی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور جو اشتعال انگیز تقریریں کرنے کا عادی تھا۔ چونکہ اسے ریاست کے بہت سے رجعت پسند مسلمان جاگیرداروں کی تائید حاصل تھی اس لیے اسے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ یہ بیسویں صدی کے وسط میں ریاست کی صرف 18 فی صد مسلمان آبادی کی حمایت سے ہندوستان کے قلب میں قرون وسطیٰ کی قسم کی ''اسلامی ریاست'' قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔اس کا خیال تھا کہ حکومت ہندوستان کشمیر کی لڑائی اور دوسرے معاملات میں بہت بری طرح الجھی ہوئی ہے اس لیے وہ حیدرآباد کے پہلے مجوزہ معاہدے یا تعلق نامے پر دستخط کرنے پر مجبور ہوجائیگی۔ یہ شخص برصغیر کے ان نیم تعلیم یافتہ عناصر میں سے تھا جسے بیسویں صدی کے حقائق کا کوئی شعور نہیں تھا۔ یہ ذہنی طور پر ابھی دسویں صدی میں ہی تھا۔ یہ محض مرصع تحریروں، لچھے دار تقریروں اور پرجوش مذہبی نعروں کے ذریعے فتوحات حاصل کرنے کا خواب دیکھتا تھا۔اس نے احراریوں اور خاکساروں کی طرح مسلمان رضاکاروں پر مشتمل ایک مسلح تنظیم بھی قائم کی تھی اووہ توقع کرتا تھا کہ جب کبھی ہندوستان نے حیدرآباد پرحملہ کیا تو یہ تنظیم اس کا منہ توڑ جواب دے گی۔ چونکہ اس کا نصب العین ''اعلیٰ حضرت'' کے اپنے رجعتی عزائم سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے وقتی طور پر اس کی ''سیاسی فتح'' ہوگئی۔نظام نے نواب چھتاری کی جگہ ایک مقامی صنعت کار اور پی۔ڈبلیو۔ڈی کے سابق ٹھیکیدار میر لائق علی کو اپنا وزیراعظم بنالیا تو ہندوستان کے ساتھ بات چیت کرنے والے وفد کی قیادت کے فرائض ایک شخص نواب معین نواز جنگ کے سپرد کردیئے جو قاسم رضوی اور اس کی اتحادالمسلمین سے ہمدردی رکھتا تھا۔ یہ وفد دہلی گیا مگر اس کی بات چیت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کیونکہ حکومت ہندوستان مجوزہ ''سٹینڈسٹل'' معاہدے میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں تھی اور ماؤنٹ بیٹن بھی اس کے حق میں نہیں تھا۔

بالآخر نظام نے 29 رنومبر 1947ء کو ہندوستان کے ساتھ ایک ''سٹینڈسٹل'' معاہدے

پر دستخط کر ہی دیئے۔ ماؤنٹ بیٹن کے مسلسل دباؤ کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان نے اس وقت تک کشمیر کے بیشتر علاقے پر قبضہ کر کے وہاں اپنی پوزیشن خاصی مستحکم کر لی تھی اور قاسم رضوی اور اس کی پشت پناہی کرنے والے مسلمان جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے رجعت پسند عناصر کو پتہ چل گیا تھا کہ کشمیر میں قبائلیوں کے جہاد کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس معاہدے کے الفاظ کچھ اس طرح کے تھے کہ جن سے تاثر ملتا تھا کہ ہندوستان نے حیدرآباد کی تعلق نامے کی تجویز کو کسی نہ کسی حد تک تسلیم کر لیا ہے۔ اس معاہدے کی پہلی شق یہ تھی کہ چونکہ انڈین یونین اور نظام کا مقصد اور ان کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلق اور دوستی کے جذبے کے تحت کام کریں گے اس لیے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں وہ تمام معاہدے اور نظم ونسق کے انتظامات برقرار رہیں گے جو اقتدار کی منتقلی سے پہلے حیدرآباد اور برطانوی حکومت کے درمیان موجود تھے۔ دوسری شق یہ تھی کہ حیدرآباد اور دہلی میں ایک دوسرے کے ایجنٹوں کا تقرر ہوگا۔ تیسری شق میں حکومت ہندوستان اقتدار اعلیٰ کے کردار سے دستبردار ہو گئی تھی۔ چوتھی شق میں تنازعات کے تصفیہ کے لیے ثالثی پر اتفاق کیا گیا تھا اور پانچویں شق یہ تھی کہ اس معاہدے کی میعاد ایک سال ہو گی۔

حکومت ہندوستان نے ریاستوں کے بارے میں اپنی پالیسی کے خلاف الحاق کے بغیر اس قسم کے پہلے ''سٹینڈسٹل'' معاہدے پر اس لیے دستخط کئے تھے کہ اولاً ماؤنٹ بیٹن یعنی برطانوی سامراج کا بالاصرار مشورہ یہی تھا اور ثانیاً وہ کشمیر میں اپنی فتح سے ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری محمد علی کا بیان ہے کہ کانگرس کا ابتدائی منصوبہ تو یہ تھا کہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے مہاراجہ ہری سنگھ سے خفیہ مفاہمت کر لی جائے گی مگر اس الحاق کا اعلان حیدرآباد کے ہندوستان میں شامل ہونے کے بعد کیا جائے گا۔ اس منصوبے کی بنیاد یہ تھی کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اس کا حکمران ہندو تھا اور اس کے برعکس حیدرآباد میں ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن اس کا حکمران مسلمان تھا۔ ہندوستان کے لیے حیدرآباد کی پوزیشن ہر لحاظ سے ویسی ہی تھی جیسی کہ پاکستان کے لیے کشمیر کی تھی۔ اگر کشمیر کا ہندو مہاراجہ حیدآباد سے پہلے ہندوستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کر دیتا تو ہندو اکثریت والی ریاست حیدرآباد پر کانگرس کا دعویٰ بہت کمزور ہو جاتا اور نظام کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا امکان پیدا ہو جاتا۔ چوہدری محمد علی

کو تقسیم کے دنوں میں کانگرس کے ''حیدرآباد پہلے اور کشمیر بعد میں'' والے منصوبے کی اطلاع کی تصدیق ہوگئی تھی۔[30] لیکن کشمیر پر قبائلیوں کی یلغار کی وجہ سے کانگرس کے اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ لہٰذا بہ امر مجبوری دوسرا منصوبہ بنایا گیا کہ پہلے کشمیر کا مسئلہ نمٹایا جائے گا اور پھر حیدرآباد سے نمٹا جائے گا۔ حیدرآباد سے نمٹنے کے لیے مزید مہلت کی سخت ضرورت تھی۔ ہوڈسن کہتا ہے کہ جب حیدرآباد کے ساتھ ''سٹینڈسٹل'' معاہدے پر دستخط ہوئے تھے تو نہرو نے وی۔ پی۔ مینن کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایک سال کے لیے امن مل گیا ہے۔''[31]

گویا نہرو کے اندازے کے مطابق ایک سال کی مہلت کافی تھی۔ اس کی تصدیق حیدآباد میں ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے۔ ایم۔ منشی کی اس گفتگو سے بھی ہوتی ہے جو اس نے اپنے تقرر کے بعد گاندھی سے کی تھی۔ منشی کے اپنے بیان کے مطابق '' گاندھی نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم تصفیے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لاؤ گے۔'' میں نے یہ وعدہ دے دیا لیکن پوچھا کہ گفت وشنید کا سلسلہ کب تک جاری رہنا چاہیے۔ کیا یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا۔ اس پر گاندھی ہنس پڑا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ '' گفت وشنید تین چار ماہ تک جاری رہے گی اور اگر یہ ناکام ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟'' گاندھی کا مختصر جواب یہ تھا کہ '' تو ایسی صورت میں ان سارے معاملات کا خاتمہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''[32]

اس ''سٹینڈسٹل'' معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد حکومت ہندوستان نے حیدرآباد کے معاملے میں بھی وہی کچھ کیا جو وہ ستمبر اور اکتوبر میں جوناگڑھ کے بارے میں کامیابی سے کر چکی تھی اور جو حکومت پاکستان نے کشمیر کے معاملے میں کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس نے بظاہر تو تین چار ماہ تک مصالحانہ گفت وشنید کا سلسلہ جاری رکھا لیکن دراصل وہ اس عرصے میں بالواسطہ اور بلاواسطہ نظام پر ہر قسم کا دباؤ ڈالتی رہی۔ اس نے پہلے تو ریاست کی مکمل ناکہ بندی کی اور پھر سرحدوں پر خونریز جھڑپوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ حکومت ہندوستان نے نظام پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ اس نے خفیہ طور پر پاکستان کو 20 کروڑ روپے کی امداد دے کر اور اندرون ریاست اتحاد المسلمین کے رضا کاروں کی مسلح تنظیم قائم کر کے 29 نومبر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ فروری 1948ء میں فریقین کی جانب سے اعلانیہ الزامات عائد کرنے کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ حیدرآباد کے ''مجاہد اعظم'' قاسم رضوی نے ایک انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز تقریر کر کے

ہندوستان کو اپنے منصوبے کے آخری حصے پر بھی عمل کرنے کا جواز مہیا کر دیا۔ قاسم رضوی کی تقریر یہ تھی کہ ''ہندوستان سے گفت وشنید کا سلسلہ فوراً بند کرکے پاکستان کے ساتھ معاہدے کے لیے فوراً بات چیت شروع کی جائے۔ سٹینڈسٹل کے معاہدے کو پھاڑ کر اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ حکومت ایسا کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور میں اس مقصد کے لیے اسے مزید مہلت نہیں دے سکتا۔ میرے اس اعلان کو اعلان جنگ تصور کیا جاسکتا ہے۔''[33]

حکومت ہندوستان اس قسم کے بہانے کی منتظر ہی تھی۔ چنانچہ اس نے مارچ میں حیدرآباد کے خلاف فوجی جارحیت کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ یہ منصوبہ میجر جنرل چوہدری نے بنایا تھا اور اس کے تحت مجوزہ فوجی کاروائی کا نام ''آپریشن پولو'' رکھا گیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ حکومت ہندوستان حیدرآباد سے تعلقات منقطع کرکے ''سٹینڈسٹل'' معاہدے کو منسوخ کر دے گی، پھر مکمل اقتصادی ناکہ بندی کرکے ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ اندرون ریاست وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو جائیں گے اور پھر امن وامان بحال کرنے کے لیے پولیس ایکشن کیا جائے گا۔ برطانیہ کے اعلیٰ افسروں کو اس منصوبے کا پتہ تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن کو اس سلسلے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ غالباً اس لیے کہ وہ مسلسل احتیاط وتحمل کی تلقین کیے جا رہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس منصوبے کی اطلاع پہلی مرتبہ حیدرآباد کے قانونی مشیر سر والٹر مونکٹن نے دی تھی۔ 19 اپریل کو وزیراعظم نہرو نے وزیر دفاع بلدیو سنگھ کے نام ایک خط لکھا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ ایک آرمرڈ ڈویژن کو حیدرآباد کی سرحدوں کے نزدیک مجتمع کر دیا جائے اس پر آرمرڈ ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل چوہدری نے یہ لکھا کہ فی الحال اس قسم کی فوجی کاروائی ممکن نہیں ہوگی۔ ایسی کاروائی کو خزاں کے موسم تک ملتوی رکھنا چاہیے۔ لیکن 25 اپریل کو برطانوی کمانڈر انچیف بچر دورے سے واپس آیا تو اس نے نہرو کے حکم کی تعمیل کر دی اور آرمرڈ ڈویژن پونا کے علاقے میں بھیج دی۔ 24 اپریل کو جواہر لال نہرو نے بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں اس منصوبے کا اشارۃً اعلان کر دیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''حیدرآباد کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں...... جنگ یا الحاق...... جنگ ایک طویل معاملہ ہے اور اگر ہم نے جنگ شروع کی تو بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ یہ مسئلہ گفت وشنید کے ذریعے طے ہو جائے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم جنگ سے ڈرتے ہیں۔''[34]

مئی 1948ء کے اوائل میں جب نظام نے مقامی کمیونسٹ پارٹی سے پابندی اٹھادی اور پارٹی نے اپنے زیر تسلط دیہات کے عوام کو ہدایت کی کہ اگر ہندوستانی فوج ان کے علاقے میں داخل ہوتو اس کی مزاحمت کی جائے تو نئی دہلی کے ارباب اقتدار کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر اتحادالمسلمین کے رضاکاروں اور کمیونسٹ گوریلوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا تو ریاست کے حالات بہت سنگین اور پیچیدہ ہوجائیں گے۔ چنانچہ 13رمئی کو ماؤنٹ بیٹن کی زیرصدارت حکومت ہندوستان کی دفاعی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں میجر جنرل چوہدری کی یہ تجویز زیرغور آئی کہ حیدرآباد کے خلاف فوجی کاروائی مون سون کے بعد یعنی ستمبر میں ہونی چاہیے۔'' تاہم وی۔ پی۔ مینن اور جواہر لال نہرو کی رائے یہ تھی کہ اگر مجوزہ فوجی کاروائی میں تاخیر کی گئی تو حکومت کے وقار کو نقصان پہنچے گا اور پھر اندرون ریاست امن وامان بحال کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ بالآخر تین گھنٹے کی بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ حیدرآباد کے خلاف فوجی کاروائی کی تیاریاں جاری رکھی جائیں گی اور فوج کو اس مقصد کے لیے دس دن کا نوٹس دیا جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس فیصلے سے اتفاق کرلیا کیونکہ اسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ کاروائی 21رجون کو اس کی گورنر جنرل کے عہدے سے سبکدوشی سے پہلے نہیں ہوگی۔ جون میں مون سون شروع ہوجائیں گی جو ستمبر تک جاری رہیں گی۔[35]

یکم جون کو قائداعظم محمد علی جناح نے ایک بیان میں نہرو کی 24راپریل کی تقریر پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ حیدرآباد ایک آزاد وخودمختار ریاست ہے اور اس کے آئینی سربراہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ریاست کا ہندوستان سے الحاق کرے یا اسے آزاد ڈومینین کے طور پر قائم رکھے۔ حکومت ہندوستان کو بزورقوت اور جبر وتشدد کے ذریعے حیدرآباد کو ہندوستان سے الحاق کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا ایک آزاد وخودمختار ہمسایہ ریاست کے خلاف یہ اقدام اخلاق وانصاف کے منافی ہوگا۔ 21رجون کو ماؤنٹ بیٹن کی روانگی سے پہلے حیدرآباد کے وزیراعظم میر لائق علی نے حکومت ہندوستان کی اگست 1947ء کی یہ تجویز مان لی کہ اس سوال پر استصواب کرایا جائے کہ ریاست کو ہندوستان میں شامل ہونا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ مگر اب ''آپریشن پولو'' کے فیصلے کے بعد حکومت ہندوستان کے لیے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ پہلے ریاست کا دفاع، خارجی امور اور مواصلات کے معاملات میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا جائے پھر بذریعہ استصواب اس فیصلے کی توثیق کرائی جاسکتی

ہے۔اس کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ ریاست میں ایک عبوری نمائندہ حکومت قائم کی جائے جس سے عوام کی اکثریت مطمئن ہو۔اس قسم کی نمائندہ حکومت کے بغیر استصواب محض ایک فراڈ ہوگا۔

بالآخر ستمبر 1948ء آ گیا تو اس کی 9ر تاریخ کو حکومت ہندوستان نے حیدرآباد پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس وقت تک کشمیر میں قبائلیوں کی یلغار بالکل ناکام ہوچکی تھی اور اقوام متحدہ کا کمیشن تنازعہ کشمیر کا پرامن تصفیہ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔کشمیر کے میدان جنگ میں بھی ہندوستان کا پلہ بھاری تھا کیونکہ پاکستانی فوج کو محض دفاعی جنگ لڑنے کا حکم تھا اور اسے ہوائی فوج کی بھی امداد حاصل نہیں تھی۔ 11ر ستمبر کو پاکستان کے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا کراچی میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں انتقال ہو گیا اور 13ر ستمبر کو علی الصبح حیدرآباد پر حملہ ہو گیا۔ حیدرآباد کی تقریباً بیس ہزار فوج اور مجمع باز قاسم رضوی کے رضا کاروں کی مسلح تنظیم ہندوستان کے اس سہ طرفہ حملے کی چار دن سے زیادہ عرصے تک مزاحمت نہ کرسکیں۔اس چار روزہ حیران کن ڈرامے میں صرف 800 افراد ہلاک ہوئے۔''آپریشن پولو'' ہندوستانی ارباب اقتدار کی توقع سے زیادہ کامیاب ہوا۔حکومت ہندوستان نے کشمیر کے بعد برصغیر کی آخری ریاست پر بھی اپنا اقتدار قائم کرلیا اور برطانوی سامراج کے''انتہائی وفادار اتحادی، رستم دوراں، ارسطوئے زماں، آصف جاہ اعلیٰ حضرت نظام الملک میر عثمان علی خان بہادر سپہ سالار اور فتح جنگ'' کی شخصی سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔نظام نے آخری حربے کے طور پر 25ر اگست 1948ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مداخلت کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔مگر 17ر ستمبر کو میجر جنرل چوہدری کے حیدرآباد کا فوجی گورنر بننے کے ایک ہفتہ بعد یعنی 23ر ستمبر کو یہ درخواست واپس لے لی گئی۔برطانیہ اور امریکہ کے بعض لیڈروں اور اخبارات نے ہندوستان کی جارحیت کی مذمت کی مگر اس کا کیا اثر ہوسکتا تھا جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ڈاکٹر جے۔نائیڈو کے بیان کے مطابق حیدرآباد پر ہندوستانی افواج کے قبضہ کے بعد مقامی مسلمان آبادی پر بے پناہ مظالم کئے گئے۔تقریباً دو ہزار مسلمان مارے گئے جن میں سے 50 جیلوں میں جاں بحق ہوئے۔تقریباً 500000افراد کو گرفتار کیا گیا اور ایک ہزار گھروں کو لوٹا گیا یا نذر آتش کیا گیا۔دیہات پر دس ہزار حملے کئے گئے جن عورتوں کی آبروریزی کی گئی ان کی صحیح تعداد محض اس لیے معلوم نہ ہوسکی کہ جب ان سے اس سلسلے میں کچھ پوچھا جاتا تھا تو وہ اس سوال کا جواب دینے کی بجائے صرف آہ وزاری کرتی تھیں۔ [36]

باب: 18

# مسلم لیگ کی ریاستی پالیسی کی ناکامی کی وجوہ

مسلم لیگ کی ریاستی پالیسی کی ہر محاذ پر عبرتناک شکست کی وجوہ یہ تھیں:۔

(1) اس کی مدمقابل قوتیں ہر لحاظ سے اس سے برتر تھیں۔ کانگرس کی بورژوا قیادت نہ صرف سیاست کے میدان میں مسلم لیگ کی قیادت کے مقابلے میں زیادہ تجربہ کار تھی بلکہ اس کے پاس فوجی، معاشی اور دوسرے وسائل بھی بہت زیادہ تھے۔ اس قیادت نے بہ امر مجبوری برصغیر کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ تو عارضی طور پر منظور کر لیا تھا لیکن یہ بقیہ ہندوستان کی یکجہتی اور سالمیت کو بہر قیمت قائم رکھنے کا پختہ عزم رکھتی تھی۔ گاندھی، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ کسی بھی ہندوستانی ریاست کی آزادی و خودمختاری برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بالخصوص ہندوستان کے قلب میں حیدرآباد کی آزادی تو ان کے لیے بالکل تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اس ریاست میں کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت غریب کسانوں کی مسلح بغاوت کی آگ روز بروز پھیل رہی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کا خیال یہ تھا کہ اگر حیدرآباد کا ہندوستان کے ساتھ الحاق نہ ہوا تو پانچ دس سال میں پوری ریاست میں کمیونسٹوں کے اقتدار کا سرخ جھنڈا لہرائے گا اور وی۔ پی۔ مینن کو بھی حیدرآباد میں کمیونسٹوں کی روز افزوں بغاوت سے سخت خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ حکومت ہندوستان کی دفاعی کمیٹی کے 13 رمئی 1948ء کو ماؤنٹ بیٹن کی زیر صدارت حیدرآباد پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ نظام نے مئی کے اوائل میں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اٹھادی تھی اور پارٹی نے اپنے زیر تسلط تقریباً 4000 دیہات کے عوام کو ہدایت کی تھی کہ اگر ہندوستانی فوج ان کے علاقے میں داخل ہو تو اس کی

مزاحمت کی جائے۔اس پرنئی دہلی کے ارباب اقتدار کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اتحاد المسلمین کے رضا کاروں اور کمیونسٹ گوریلوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا تو ریاست کے حالات بہت سنگین اور پیچیدہ ہو جائیں گے۔ [1]

(2) برطانوی سامراج نے بھی برصغیر کی دو ریاستوں میں تقسیم بہ امر مجبوری کی تھی۔ جولائی 1947ء کے وسط میں قانون آزادیٔ ہند پر پارلیمانی بحث کے دوران برطانوی لیڈروں نے کھلم کھلا اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان کا وجود عارضی ثابت ہو گا۔ دونوں ڈومینینیں پھر متحد ہو جائیں گی اور اس طرح برصغیر کی ایک متحدہ حکومت عالمی سٹیج پر سامراج کے حق میں اپنا روایتی کردار ادا کرے گی۔ انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اگر کسی ہندوستانی ریاست نے آزادی کا اعلان کیا تو حکومت برطانیہ اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ریاستوں کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے جو گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں سارے ہندوستانی مؤرخین اس کے معترف ہیں۔ اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسے مسلم لیگ یا پاکستان سے ذاتی طور پر پرخاش تھی بلکہ سیسر گپتا اور متعدد دوسرے ہندوستانی مؤرخین کے بیان کے مطابق اس لیے کیا تھا کہ برطانوی سامراج کے عالمی مفادات ہندوستان کی یکجہتی اور سالمیت سے وابستہ تھے۔ حکومت ہندوستان کا سیاسی مشیر سر کونرڈ کورفیلڈ (Conrad Corfield) لکھتا ہے کہ "وائسرائے ماؤنٹ بیٹن ریاستوں کے بارے میں نہرو، پٹیل اور مینن کے سوا کسی اور کا مشورہ قبول نہیں کرتا تھا۔ اس نے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کی بات سننا اس دن سے بند کر دیا تھا جس دن سے اس نے ولبھ بھائی پٹیل سے ریاستوں پر محدود اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے بارے میں سودا بازی کر لی تھی اور میں نے اس کے اس فیصلے کی تائید و حمایت کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے پٹیل کو ہندوستان کی ریاستوں سے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات تک وابستگی محدود رکھنے پر رضا مند کر لیا ہے۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ اس نے مقتدر اعلیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے ایک ایسے سودے کی سفارش کرنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے جسے آزادی

کے بعد برقرار رکھنے کی کوئی ضمانت نہیں اور جو ناگزیر طور پر وسیع کر دیا جائے گا۔ اسی دن سے میری بجائے وی۔ پی۔ مینن عملاً اس کا سیاسی مشیر بن گیا۔ مینن کا اس پر پہلے بھی بہت اثر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک خاص ریاست کے بارے میں اسے بعض حقائق بتائے تو اس نے کہا کہ تم ضرور غلط کہتے ہو کیونکہ نہرو نے مجھے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے برعکس ہے۔ میرا خیال ہے کہ مینن نے نہرو کو یہ باتیں بتائی ہوں گی...... کشمیر اور حیدر آباد کے بارے میں بھی مجھے ماؤنٹ بیٹن سے اختلاف تھا۔ میری تجویز یہ تھی کہ اگر ان دونوں ریاستوں کو آزادی کے بعد سودا بازی کرنے کی اجازت دی جائے تو اس امر کا امکان ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر لیں گے۔ یہ دونوں ریاستیں ایک دوسرے کے لیے توازن پیدا کرتی تھیں۔ ایک ریاست کا حکمران ہندو تھا لیکن اس کی رعایا کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور دوسری ریاست کا حکمران مسلمان تھا اور رعایا کی اکثریت ہندو تھی۔ دونوں کا سمندر سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور یہ دونوں ریاستیں دونوں نئی ڈومینینوں کو پانی اور مواصلات کی گراں قدر سہولتیں مہیا کرتی تھیں۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے میری یہ بات نہ سنی اور جب وہ کشمیر گیا تو وہ خلاف معمول اپنے ساتھ اپنے سیاسی مشیر کو بھی نہیں لے گیا تھا۔ میں کشمیر کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کو جو کچھ کہتا تھا اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی تھی کیونکہ نہرو نے کشمیر کو ہندوستان میں شامل کرنے کا بڑی دیر سے تہیہ کیا ہوا تھا۔"[2]

لیکن مسلم لیگ کی قیادت اور حیدر آباد کا مسلمان جاگیر دار طبقہ آخر وقت تک یہ خواب دیکھتے رہے کہ جس طرح برطانیہ اور کانگرس کی قیادت نے پاکستان کے قیام کو بہ امر مجبوری منظور کیا ہے اس طرح وہ حیدر آباد کی آزادی کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوہدری محمد علی لکھتا ہے کہ "کانگرس اور مسلم لیگ کے ریاستوں کے الحاق کے بارے میں طریق کار سے متعلقہ رجحانات مختلف تھے۔ کانگرس ریاستوں کا الحاق حاصل کرنے کے لیے دباؤ اور جبر کا ہر ذریعہ استعمال کرنے کو تیار تھی جبکہ مسلم لیگ پوری سختی سے قانونی اور آئینی طریقوں پر کاربند تھی۔ جون اور جولائی 1947ء میں قائداعظم نے کئی مواقع پر کہا کہ قانونی پوزیشن یہ ہے کہ انگریزوں کی

طرف سے انتقال اقتدار کے ساتھ اقتدار اعلیٰ ختم ہو جائے گا اور سب ریاستوں کی آزاد و خود مختار حیثیت از خود بحال ہو جائے گی۔ لہٰذا ریاستوں کو آزادی ہے کہ وہ ایک ڈومینین میں شامل ہوں یا دوسری میں یا آزاد و خود مختار رہیں۔ مسلم لیگ ہر ریاست کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ مسلم لیگ کسی ریاست کو کوئی خاص راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی...... یہ محض قائداعظم کا آئین پسندی کا میلان خاطر ہی نہیں تھا جس کے تحت وہ یہ اعلانات کر رہے تھے بلکہ ان کا ایک مقصد حیدرآباد کی آزادی کا تحفظ بھی تھا۔ اس انداز کے اعلانات سے اس امر کا امکان تھا کہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق مخدوش ہو جائے گا لیکن اسے کوئی بڑا خطرہ نہیں سمجھا گیا تھا۔''[3] چوہدری محمد علی مزید یہ لکھتا ہے کہ ''برصغیر کی تقسیم کے وقت کشمیر کی مسلم آبادی اور جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر قائداعظم کو پورا یقین تھا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ضرور ہو جائے گا۔ وہ کہا کرتے تھے ''کشمیر ہماری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرے گا۔'' لیکن جب 27/اکتوبر کو ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان ہوا اور ہندوستانی فوجیں سری نگر پہنچ گئیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان سے دھوکہ کیا گیا ہے اور ان کی سابقہ رجائیت کی جگہ شدید مایوسی نے لے لی۔ انہوں نے کہا ''ہمیں غلط گاڑی پر سوار کر دیا گیا ہے۔''[4]

(3) کانگرس کی قیادت نے کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے لیے 3/جون کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان سے پہلے ہی بھرپور کوششیں شروع کر دی تھیں۔ سر ظفر اللہ خان اور دوسرے پاکستانی مؤرخین کا یہ الزام بے بنیاد نہیں ہے کہ اس مقصد کے لیے 10/مئی 1947ء کو شملہ میں ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے درمیان خفیہ سودا بازی ہوئی تھی۔ اس الزام کی تائید میں کئی دستاویزی اور واقعاتی شہادتیں موجود ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے 4/جون کو ہی اپنی پریس کانفرنس میں اشارۃً بتا دیا تھا کہ مسلم اکثریت والا ضلع گورداسپور ہندوستان کے حوالے کر کے کشمیر اور ہندوستان کے درمیان جغرافیائی رابطہ پیدا کیا جائے گا اور پھر ریڈکلف اور لارڈ اسمے نے سرحد بندی کے ایوارڈ کے اعلان سے بہت پہلے جو نقشے تیار کئے تھے ان میں بھی ضلع گورداسپور ہندوستان کو دیا گیا تھا۔ لیکن ان حقائق کے باوجود مسلم لیگ کی قیادت اس سلسلے میں

وسط اکتوبر تک غفلت اور بے عملی کا مظاہرہ کرتی رہی اور آخر وقت تک یہ امید بھی کرتی رہی کہ کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں گر پڑے گا۔ برطانوی سامراج کشمیر اور دوسری ہندوستانی ریاستوں کی آزادی کے خلاف تو تھا ہی وہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں اس لیے بھی تھا کہ وہ جنگی اہمیت کے اس علاقے کو ایسے پاکستان کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جس کا مستقبل بالکل غیر یقینی تھا اور جسے کانگرسی زعماء ابتدا ہی میں تباہ و برباد کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ سر اولف کیرو اور دوسرے برطانوی ماہرین کا خیال تھا کہ اگر اس علاقے میں بدامنی ہوئی تو سوویت یونین اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے سیاسی، سفارتی اور فوجی محاذوں پر بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ کشمیر میں ہندوستان کی ساری فوجی کاروائی براہ راست اس کی نگرانی میں ہوئی اور اعلیٰ برطانوی فوجی افسروں اور ان کے پٹھو پاکستانی اعلیٰ افسروں اور جاگیرداروں نے کشمیر میں پاکستان کی فوجی مداخلت کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ مسلم لیگ کی نحیف و نزار قیادت کشمیر کے معاملے میں اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے اتنے بڑے گٹھ جوڑ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ان دشمنوں کو جماعت اسلامی، جمعیت العلمائے ہند، شیعہ کانفرنس اور مجلس احرار جیسے مذہب فروش عناصر کی بھی تائید و حمایت حاصل تھی۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے مہر چند مہاجن لکھتا ہے کہ ''جب میں 11/ اکتوبر کو نہرو سے ملا تھا تو اسے اس کے الحاق کی اتنی فکر نہیں تھی۔ اس کی اولین خواہش یہ تھی کہ مہاراجہ کو ریاست کا اقتدار شیخ عبداللہ کے حوالے کر دینا چاہیے۔ نہرو کا خیال تھا کہ اگر ریاست کی انتظامیہ عوامی ہاتھوں میں ہوگی تو الحاق کے بارے میں عوامی حکومت سے مناسب طریقے سے بات چیت ہو سکے گی۔''[5] نہرو کشمیر کے عوام کی رائے معلوم کرنے کا اس لیے ذکر کرتا تھا کہ گاندھی کے تجزیے کے مطابق فوجی اہمیت کے اس علاقے کی مسلم اکثریت میں ''مقامی حب الوطنی'' کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے۔ نہرو کا خیال تھا کہ اگر شیخ عبداللہ کو کشمیر کی ''خود مختاری'' کا وعدہ دیا جائے گا تو وہ وادی کشمیر کی رائے عامہ کو ہندوستان کی حمایت کرنے پر آمادہ کر لے گا۔ اسے یقین تھا کہ

شیخ عبداللہ کا جناح سے تضاد لاینحل ہے اور ہندوستان اس تضاد سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ چونکہ مسلم لیگ ریاستوں کے معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ وہ ریاستی حکمرانوں کو ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے بارے میں کلی اختیار دینے کی حق میں تھی اور اس کا آئینی مؤقف یہ تھا کہ برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے خاتمہ پر ریاستیں موجودہ حکمرانوں کے زیر اقتدار خود بخود آزاد و خود مختار ہو جائیں گی اس لیے اسے قوی امید تھی کہ وہ اپنے ''ذاتی دوست'' شیخ عبداللہ کو اقتدار اور خود مختاری کا لالچ دے کر اس سے ہندوستان کے الحاق نامے پر دستخط کرا لے گا۔

چوہدری محمد علی کے بیان کے مطابق جب اس نے 1948ء کے اوائل میں شیخ عبداللہ سے ملاقات کی تھی تو شیخ نے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان کشمیر کے حق خود ارادیت کا پورا احترام کرتا ہے اور وہاں امن بحال ہونے کے بعد استصواب کرایا جائے گا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''شیخ عبداللہ اور میں کالج میں ایک ساتھ تھے۔ اب نیو یارک میں اقوام متحدہ کے ایوان میں بیس سال کے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کے مدمقابل تھے لیکن ہم نے نیو یارک کے ایک ہوٹل میں آپس میں ایک نجی ملاقات کا انتظام کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے سیاق و سباق میں ہم نے مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا تو مجھے پتہ چلا کہ شیخ عبداللہ کو اس امر کا یقین ہے کہ نہرو کشمیر کو عملاً ''آزادی'' عطا کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے کشمیر کے پاس فوجی استعداد نہیں۔ لہٰذا اسے اپنی سلامتی کے لیے کسی ہمسایہ ملک پر انحصار کرنا پڑے گا۔ اگر وہ ملک ہندوستان ہوا اور ہندوستان کی افواج کشمیر میں مقیم ہوئیں تو اس کی ''آزادی'' محض برائے نام ہوگی جسے کسی وقت بھی ختم کیا جا سکے گا۔ کیا مسلم کشمیر بے خوف و خطر اپنی قسمت غیر مسلموں کی بھاری اکثریت والے ہندوستان کو سونپ سکتا ہے۔ لیکن میری کسی بھی بات سے شیخ عبداللہ کا ان یقین دہانیوں پر اعتماد متزلزل نہ ہوا جو نہرو نے اسے ذاتی طور پر دلا رکھی تھیں۔''[6] یہی وجہ تھی کہ اس نے 4 رفروری 1948ء کو سلامتی کونسل میں جو تقریر کی تھی اس میں کشمیر کی ''آزادی'' کے امکان کا بھی ذکر تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب کشمیری عوام کو آزادی ملے گی تو وہ خود الحاق یا ''آزادی'' کے سوال پر رائے شماری کے ذریعے فیصلہ کریں گے۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت ریاست کے اقتدار سے الگ نہیں کر سکتی۔ لیکن نہرو نے اس کے اس بیان کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ کشمیر کے مستقبل کے

فیصلے کا انحصار ہندوستانی افواج پر ہوگا۔ شیخ عبداللہ کی خواہش پر نہیں ہوگا۔ شیخ عبداللہ نے چوہدری محمد علی کے اس بیان کی کبھی تردید نہیں کی اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ شیخ عبداللہ کے اپنے ''ذاتی دوست'' نہرو پر اندھے اعتماد کی دراصل کوئی حقیقی بنیاد نہیں تھی۔ اگر کوئی بنیاد تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ شیخ عبداللہ اور جناح کے درمیان شدید تضاد تھا اور ''شیر کشمیر'' نے اپنی اس توہین کو فراموش نہیں کیا تھا جو کہ اس نے 1939ء میں محسوس کی تھی جبکہ جناح نے بطور ثالث یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کو مسلم کانفرنس میں شامل ہو جانا چاہیے۔ جناح کے ساتھ اس تضاد نے شیخ عبداللہ کو اندھا کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کا ''ذاتی دوست'' نہرو کس طرح ہر عہد و پیماں کی خلاف ورزی کرے گا اور اسے یک لخت کشمیر کی وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے گیارہ سال تک مقید رکھے گا۔

(4) کانگرس کے برعکس مسلم لیگ کی ریاستی پالیسی انتہائی غیر جمہوری اور غیر حقیقت پسندانہ تھی۔ بلاشبہ یہ پالیسی برطانوی آئین اور قانون کے لحاظ سے صحیح تھی لیکن اس کا وقت کے سیاسی حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ پالیسی ریاستوں کے کروڑوں غریب عوام کے مفاد کے منافی تھی جو صدیوں سے بدکردار حکمرانوں کے جبر واستبداد کا شکار تھے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ بیسویں صدی کے وسط میں، جبکہ برطانوی ہند کے عوام کا سیاسی شعور اس قدر بلند ہو چکا تھا، ریاستی عوام سترہویں صدی کے نظام حکومت کے خلاف کوئی احتجاج یا جدوجہد نہ کرتے۔ جو لوگ ریاست حیدرآباد کو محض 18 فی صد مسلم اکثریت کی تائید وحمایت سے قرون وسطیٰ کی سی جاگیری اسلامی مملکت بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے ان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے سیاسی شعور کی پستی کی کوئی انتہا نہیں تھی اور جو لوگ یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ مہاراجہ کشمیر کو آزادی وخودمختاری کا لالچ دے کر اسے ہندوستان سے الگ رکھا جا سکتا ہے ان کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ خواب وخیال کی دنیا میں رہتے تھے۔ انہوں نے کانگرس کی بورژوا قیادت اور برطانوی سامراج کے گٹھ جوڑ کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔

بعض برطانوی اور ہندوستانی مؤرخین کا خیال ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت نے ریاستی حکمرانوں کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر حکومت ہندوستان نے ان

حکمرانوں پر زیادہ دباؤ ڈالا تو وہ وسیع پیمانے پر خانہ جنگی شروع کر دیں گے اور نتیجتاً ہندوستان بے شمار آزاد ریاستوں میں منقسم ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہ ریاستی حکمران دراصل کاغذی شیر تھے۔ ان کا جاہ وجلال اور دبدبہ محض برطانوی راج کا مرہون منت تھا۔ انہوں نے اپنی ریاستوں میں سترہویں صدی کا نہایت ظالمانہ نظام حکومت قائم کر رکھا تھا۔ ان کی حکومتیں عوام کے سامنے جوابدہ نہیں تھیں اور عوام ان سے بے انتہا نفرت کرتے تھے۔ ''مہاراجہ بہادر'' ہری سنگھ نے معدودے چند مراعات یافتہ ہندوؤں کے تعاون سے لاکھوں کشمیری مسلمانوں کو بے پناہ جبر وتشدد کا شکار بنایا ہوا تھا اور ''اعلیٰ حضرت'' میر عثمان علی خان نے مٹھی بھر مسلمان اور بعض ہندو جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے رجعت پسندوں کے تعاون سے ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کو انکے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق سے جبراً محروم رکھا ہوا تھا۔ حیدرآباد کے ہندوؤں کو کشمیر کے مسلمانوں کی طرح حکومت میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں تھی۔ ادھر کشمیر کی چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں پر ہندو اقلیت کی اجارہ داری تھی اور ادھر حیدرآباد کے اعلیٰ اور ادنیٰ سرکاری عہدوں پر مسلم اقلیت کا پورا غلبہ تھا۔ کشمیر میں سرکاری خرچ پر عوام کی معاشرتی وثقافتی بہبود کا کام صرف ہندوؤں کے لیے ہوتا تھا اور حیدرآباد میں معاشرتی وثقافتی بہبود کی سرگرمیاں زیادہ تر مسلمانوں تک محدود تھیں۔ جیسے برصغیر کے رجعت پسند ہندو عناصر کشمیر کو مذہبی لحاظ سے مقدس سرزمین تصور کر کے مسلم اکثریت کے اس علاقے پر ہندو مہاراجہ کی حکمرانی کو قائم رکھنا اپنا مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح برصغیر کے رجعت پسند مسلمان عناصر حیدرآباد کو اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ قرار دے کر ہندو اکثریت والی اس ریاست پر میر عثمان علی خان کی ظالمانہ شخصی حکومت کو مذہب کے نام پر جائز تصور کرتے تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کا پولیٹکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان ''اعلیٰ حضرت'' نظام حیدرآباد کے مسلمانوں پر ''فیض خسروانہ'' اور ''شاہانہ فیاضی'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اعلیٰ حضرت نے اپنی زندگی میں کروڑ ہا روپیہ مساجد کی تعمیر، تعلیمی اداروں کی شاہانہ مالی امداد، ذہین طلبا کے وظائف، مقامات مقدسہ میں حجاج اور زائرین کے آرام کے لیے رباط کا قیام، خراب وخستہ حال ادیبوں، شاعروں اور عالموں کا وظیفہ مقرر کر کے اور معاشرتی شعبہ جات کی کئی مدوں میں نہایت وسعت قلب سے خرچ وصرف کیا۔ یہ ایسے شاندار کارنامے ہیں جن کی بنا پر انہیں ''حاتم ثانی'' کہیں تو بجا ہوگا[7]۔'' لیکن اس نواب نے یہ نہیں بتایا

کہ ''اعلیٰ حضرت'' نے اپنی 82 فیصد غریب ہندو رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کچھ کیا تھا۔ ''اعلیٰ حضرت'' میر عثمان علی خان کی طرح ''مہاراجہ بہادر'' ہری سنگھ نے بھی ہندوؤں کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی فلاح و بہبود کے لیے بے پناہ خدمات سرانجام دی تھیں لیکن اس نے اپنی 80 فی صد غریب مسلمان رعایا کے لیے اس قسم کا کوئی کام کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ظاہر ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد بدلتے ہوئے حالات میں ریاستوں کا اس قسم کا نظام قائم نہیں رہ سکتا تھا مگر مسلم لیگ کی قیادت کو اصرار تھا کہ چونکہ ریاستی حکمرانوں کو آئینی وقانونی طور پر آزاد وخود مختار ہونے کا حق حاصل ہے۔ اس لیے سارے جمہوری، سیاسی اور انسانی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر انہیں اپنا یہ حق استعمال کرنے کی کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔ اس پالیسی کا مرکزی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ ٹکڑے کئے جائیں مگر اس مقصد کے تکمیل نہ ہوسکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اکثر و بیشتر ریاستی حکمران نہایت بدکردار، بداخلاق اور بداعمال تھے۔ دہلی میں ایک سکھ اخبار نویس دیوان سنگھ مفتوں، ''ریاست'' کے نام سے ایک ہفت روزہ رسالہ شائع کرتا تھا۔ اس کا یہ رسالہ بہت مقبول تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس میں راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے سیکنڈل چھپتے تھے اور دیوان سنگھ مفتوں ان بدکردار ریاستی حکمرانوں کو بے نقاب کرنے کی دھمکیاں دے کر انہیں کھلم کھلا بلیک میل کیا کرتا تھا۔ اس رسالے کی وجہ سے جوناگڑھ، رامپور، میسور، پٹیالہ، کشمیر اور دوسری بہت سی ریاستوں کے حکمرانوں کی شرمناک بدکرداریوں، بداخلاقیوں اور عیش وعشرت کے قصے زبان زد عام تھے۔ مثلاً نواب مہابت خان رسول خانجی آف جوناگڑھ کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ ''یہ کتوں کا بہت دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے 800 کتوں کی رہائش اور خوراک کے لیے جو سہولتیں مہیا کی ہوئی تھیں وہ اس کی رعایا کے ایک فیصد لوگوں کو بھی نصیب نہیں تھیں۔ جب اس کا کوئی کتا مر جاتا تھا تو اس کا باقاعدہ جنازہ نکلتا تھا اور اسے سنگ مرمر کی قبر میں دفن کیا جاتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنی ایک کتیا ''روشنا'' کی اپنے ایک کتے بوبی کے ساتھ شادی کی تقریب اس قدر شاندار طریقے سے منائی کہ اس میں بہت سے ریاستی حکمرانوں، بڑے بڑے جاگیرداروں، وڈیروں اور دوسرے خاندانی رئیسوں نے شرکت کی۔ اس نے اس تقریب میں وائسرائے کو بھی مدعو کیا تھا مگر اس نے کسی وجہ سے اس میں شرکت نہیں کی تھی۔ تاہم کتے کی بارات میں نواب کے گھوڑ سوار باڈی گارڈز اور سجے سجائے شاہی ہاتھی

بھی شامل تھے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگوں نے سڑک کے دورویہ کھڑے ہوکر اس بے مثال بارات کا نظارہ کیا تھا۔ رات کو اس ''شادی خانہ آبادی'' کی خوشی میں بہت بڑی دعوت کا انتظام تھا جس میں سینکڑوں ''معززین'' نے شرکت کی۔'' ہوڈسن کی اطلاع کے مطابق اس تقریب پر تقریباً 20 لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔[8] لیکن دوسرے مؤرخین نے اس خرچ کا اندازہ ''صرف دس بارہ لاکھ روپے بتایا ہے۔ مسلم لیگ نے اپنی ریاستی پالیسی کی کامیابی کا انحصار اس قسم کے مکروہ عناصر پر کر رکھا تھا۔ جب یہ بداخلاق نواب 26/اکتوبر 1947ء کو بذریعہ ہوائی جہاز فرار ہوکر کراچی پہنچا تھا تو یہ اپنے ساتھ اپنے کتے بھی لایا تھا اور اس نے پھر اپنے کراچی میں قیام کے دوران اپنے اس طرز زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ اس کی تمام تر دلچسپی طوائفوں، کتوں اور گھوڑوں تک ہی محدود رہی۔ اسی طرح کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کی عیاشیوں اور بدمعاشیوں کی داستانیں بھی پردۂ راز میں نہیں تھیں۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ شخص اپنی غریب رعایا کی خون پسینے کی زیادہ تر کمائی بمبئی اور لندن کے عشرت کدوں میں خرچ کرتا تھا۔ یہ بدکردار شخص گھڑدوڑ اور رنڈی بازی کا بڑا شوقین تھا۔ یہ اس مقصد کے لیے تقریباً ہر مہینے بمبئی جاتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ جموں میں ایک طوائف کا مجرا کرنے پر تقریباً دس لاکھ روپے خرچ کئے تھے اور لندن کی ایک رنڈی نے اسے بلیک میل کر کے اس سے ہزاروں پونڈ وصول کئے تھے۔ یہ مقدمہ برطانیہ کی ہائی کورٹ میں بھی زیر سماعت رہا اور بہت دیر تک مقامی اخبارات میں اس کی تشہیر ہوتی رہی تھی۔

مسلم لیگ کی جس پالیسی کا انحصار اس قسم کے عوام دشمن عناصر پر تھا اس کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی طاقت سراسر نمائشی تھی۔ اس کی کوئی بنیادیں نہیں تھیں۔ یہ بظاہر بہت ڈراؤنے تھے لیکن درحقیقت ایسے نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت ہندوستان کی ایک ذرا سی ٹھوکر سے ان کے جعلی اقتدار کے قلعے تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح پیوست زمین ہو گئے۔ چوہدری محمد علی نے دبی زبان میں مسلم لیگ کی اس غیر حقیقت پسندانہ پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے رائے ظاہر کی ہے کہ اگر مسلم لیگ ریاستوں کے بارے میں کانگرس کے ساتھ افہام وتفہیم کی پالیسی پر عمل کرتی تو شاید کشمیر کا المیہ رونما نہ ہوتا۔ وہ لکھتا ہے کہ'' کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ہی کے مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں مشترکہ پالیسی اختیار کی جاتی۔ اگر یہ دونوں جماعتیں اس پالیسی پر اتفاق کر لیتیں

کہ ہندوستانی ریاستیں برصغیر کی تقسیم کے اصول کی بنیاد پر متصلہ ڈومینین میں شامل ہوں گی تو بعد میں پیدا ہونے والی بہت سی مشکلات کا سدباب کیا جا سکتا تھا۔ مگر دونوں جماعتوں میں شک وشبہ کی اس قدر وسیع خلیج حائل تھی کہ ان میں اس مسئلہ پر صاف اور بار آور تبادلۂ خیالات ممکن نہیں تھا۔ مزید براں کشمیر اور حیدر آباد کے بارے میں دونوں جماعتوں کے مفادات میں تصادم تھا۔ کشمیر پاکستان سے متصل تھا۔ اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اس کا حکمران ہندو تھا۔ ہندوستان کشمیر اور حیدر آباد دونوں ہی کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ کشمیر پاکستان کے تصور کا ایک جزو لاینفک تھا اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو حیدر آباد کی آزادی کی خواہش سے بھی گہری ہمدردی تھی۔''[9]

چوہدری محمد علی نے اپنی اس رائے کی تائید میں ایک ایسا واقعہ بیان کیا ہے جس کی روشنی میں مسلم لیگ کی ریاستوں کے بارے میں پالیسی کا دیوالیہ پن بہت ہی نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ایک مرتبہ نومبر 1947ء میں دہلی میں مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس کے دوران لیاقت علی خان نے جونا گڑھ اور کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے مؤقف کے تضاد پر ذرا تفصیل سے تبصرہ کیا۔ اس نے کہا کہ اگر جونا گڑھ اپنے مسلمان حکمران کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے باوجود، ہندوستان کی محض اس لیے ملکیت ہے کہ اس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے تو پھر کشمیر، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ایک ہندو حکمران کے ایک مشروط الحاق نامہ پر دستخط کرنے سے ہندوستان کا حصہ کیسے بن سکتا ہے۔ اگر جونا گڑھ کے مسلمان حکمران کے دستخط شدہ الحاق نامے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے تو کشمیر کے ہندو حکمران نے جس الحاق نامے پر دستخط کیے ہیں وہ بھی قانونی طور پر ناجائز ہے۔ اگر جونا گڑھ میں عوام کی رائے کی برتری ضروری ہے تو پھر کشمیر میں بھی رائے عامہ کی لازمی طور پر برتری ہونی چاہیے۔ ہندوستان جونا گڑھ اور کشمیر دونوں ہی پر ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جب لیاقت علی خان نے یہ ناقابل تردید دلائل پیش کئے تو پٹیل خاموش نہ رہ سکا۔ وہ پھٹ پڑا۔ اس نے کہا کہ ''تم جونا گڑھ کا کشمیر کے ساتھ موازنہ کیوں کرتے ہو۔ حیدر آباد اور کشمیر کی بات کرو تو ہم میں کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔'' چوہدری محمد علی مزید لکھتا ہے کہ ''اس وقت اور اس کے بعد بھی پٹیل کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان مسلم اکثریت کے علاقے کو وہاں کی رائے عامہ کی مرضی کے خلاف اپنے قبضہ میں رکھنے کی جو کوشش کر رہا ہے اس سے ہندوستان کو کوئی تقویت نہیں ملتی بلکہ یہ کمزور ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اگر ہندوستان اور

پاکستان اس بات پر اتفاق کر لیں کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہوگا اور حیدرآباد ہندوستان کا حصہ بنے گا تو کشمیر اور حیدرآباد کے مسائل پر امن طریقے سے حل ہو جائیں گے اور اس سے ہندوستان اور پاکستان ہی کو فائدہ پہنچے گا۔"[10]

ملک فیروز خان نون نے بھی اپنی سوانح حیات میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے چوہدری محمد علی کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ نون لکھتا ہے کہ "کانگرس پارٹی اور وائسرائے کے ساتھ مسلم لیگ کی جو بات چیت جاری تھی، میں اس میں شریک نہیں تھا۔ تاہم قائداعظم مجھے اکثر طلب کرتے تھے اور مشورہ فرماتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ بات درست ہوگی کہ ہندوستانیوں کو حیدرآباد پر اس شرط کے تحت قبضہ کا حق دے دیا جائے کہ کشمیر ہمارے تصرف میں آجائے۔ میرا خیال ہے کہ قائداعظم کو یہ پیش کش پٹیل نے کی تھی۔ میرا نظریہ یہ تھا کہ کابینہ کے منصوبے کے تحت حیدرآباد ایک آزاد مملکت کے طور پر قائم رہ سکے گا جس کا فرمانروا مسلمان ہی ہوگا لیکن کشمیر ہر صورت میں ہمارے ساتھ شامل ہوگا کیونکہ وہ مسلمان آبادی کی بہت بڑی اکثریت کا علاقہ ہے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ حیدرآباد کے عوام کی اطلاع یا اجازت کے بغیر ان کی آزادی کا یوں سودا کر لینا ہمارے لیے ایک غیر اخلاقی بات ہوگی۔ قانون کی پابندی ان کے طرز فکر کا لازمہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے کبھی بھی کوئی ایسی بات نہ کی جو انہیں اصولی طور پر غلط نظر آئی۔ جیسا کہ بعد کے تاریخی واقعات سے ثابت ہوا برطانیہ کی جانب سے حیدرآباد دکن کو مکمل آزادی کی پیش کش صریح غلطی تھی اور پھر اس صورت میں جب کہ برطانیہ حیدرآباد کو بچانے کے لیے ہندوستان سے لڑنے پر بھی تیار نہ تھا۔"[11] کیمبل جانسن کے بیان سے بھی بالواسطہ طور پر اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یکم دسمبر 1947ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "کانگرس میں ہندو قوم پرستوں کے خلاف گاندھی۔ نہرو۔ عبداللہ گٹھ جوڑ کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ کانگرس کے جو عناصر ہندوستان کو ایک ہندو ریاست بنانا چاہتے ہیں وہ کشمیر نہیں چاہتے لیکن کشمیر میں حکومت کے اقدام نے انہیں عارضی طور پر خاموش کر دیا ہے۔"[12]

لیکن چوہدری محمد علی نے یہ نہیں بتایا کہ لیاقت علی خان نے پٹیل کی اس تجویز کا کیا جواب دیا تھا۔ غالباً اس سلسلے میں اس کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ لیاقت علی خان نے یا تو اس تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اگر کوئی جواب دیا تھا تو وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ فیروز خان نون نے

قائداعظم کو دیا تھا۔لہٰذا محمد علی کی افسرانہ تابعداری نے اسے بے نقاب کرنے کی اجازت نہیں دی۔
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے! شاید نومبر 1947ء تک بھی مسلم لیگ کی قیادت کو حیدرآباد کی
''اسلامی مملکت'' کی آزادی کی امید لگی ہوئی تھی۔۔شاید اس وقت تک بھی اس پر برطانیہ کی لیبر
حکومت اور کانگرس کی قیادت کے ریاستوں کی آزادی کے خلاف غیر مبہم اعلانات کا کوئی اثر نہیں
ہوا تھا اور شاید اس وقت تک بھی وہ یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی بالآخر نہ صرف
حیدرآباد کو آزادی دلا دے گی بلکہ وہ کشمیر کو بھی پاکستان میں شامل کروا دے گی۔چوہدری محمد علی نے
اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر کے برصغیر کی تاریخ سے بڑی بے انصافی کی ہے۔اس کی کتاب میں
اس قسم کی اور بھی متعدد کوتاہیاں اور خامیاں موجود ہیں۔اس نے دراصل تاریخ نویسی نہیں کی بلکہ
مسلم لیگ اور پاکستان کے حکمرانوں کے ''کیس'' کی وکالت کی ہے۔ایس۔ایم۔برک کہتا ہے کہ
''پٹیل کی یہ تجویز اس لیے بارآور نہ ہوئی کہ نہرو اس کے خلاف تھا''لیکن اس نے اپنی اس اطلاع
کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ لیاقت علی خان کا اس تجویز کے بارے میں کیا
مؤقف تھا۔اس نے امریکی سفیر چیسٹر باؤلز (Chester Bowles) اور برطانوی وزیراعظم
ایٹلی کے حوالے سے صرف یہ لکھا ہے کہ نہرو تنازعہ کشمیر پر بات کرنے سے ہمیشہ تامل کرتا تھا اور
وہ کشمیر کے بارے میں بالکل اندھا تھا۔''[13]

ولکوکس کی رائے یہ ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت نے ریاستوں کے بارے میں یہ پالیسی
غالباً اس خیال کے تحت اختیار کی تھی کہ آزادی کے موقع پر ہندوستان بہت کمزور ہوگا اور پاکستان
ریاست جموں وکشمیر کو بزور قوت حاصل کر لے گا۔''مسلم لیگی لیڈروں کو نظام حیدرآباد کی دفاعی
صلاحیت پر بھی خاصا بھروسہ تھا۔ان کا خیال تھا کہ نظام حیدرآباد تقسیم شدہ ہندوستان کے خلاف
اپنا دفاع کم ازکم اتنی دیر تک ضرور کر لے گا کہ پاکستان اس عرصے میں اپنے مغربی اور مشرقی
علاقوں کو مستحکم کر سکے گا......ان کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ 15/اگست کو جب اقتدار کی منتقلی ہوئی تو
کشمیر اور حیدرآباد کی ریاستیں کسی بھی ڈومینین میں شامل نہ ہوئیں اور یہ بات اس وقت ہندوستان
کی بڑی ڈومینین کے حق میں جاتی تھی......جناح نے آزادی سے پہلے پاکستان کی تکمیل کے لیے
ریاستوں کے مسئلہ کے سوا تقسیم کے ہر مسئلہ پر برطانیہ پر بہت زیادہ اعتماد کیا تھا اور کانگرس پر ذرا
سا بھی بھروسہ نہیں کیا تھا۔لیکن انہوں نے گفت وشنید میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے

ریاستی حکمرانوں کو جو ڈھیل دی اس کی بنا پر وہ سلامتی کی حد سے باہر نکل گئے۔ اس سے نہ صرف کشمیر اور حیدرآباد کے معاملے میں نقصان ہوا بلکہ اس سے ان مسلمان ریاستی حکمرانوں پر بھی برا اثر پڑا جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوئے...... مسلم لیگ نے غیر مسلم ریاستی حکمرانوں کو بہت دلکش رعایتیں پیش کر کے انہیں پاکستان میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اس نے اس مقصد کے لیے جودھپور اور جیسلمیر کی سرحدی ریاستوں پر بہت توجہ مرکوز کی تھی۔ کہتے ہیں کہ جناح نے ان دونوں ریاستوں کے حکمرانوں کو سفید کاغذ دے کر کہا تھا کہ اس پر جو شرائط بھی لکھ دو وہ پاکستان کے لیے قابل قبول ہوں گی۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ پاکستان میں ان کی ریاستی آزادی محفوظ رہے گی۔ لیکن ان حکمرانوں کو اپنی جائیدادوں کی بہت فکر تھی۔ لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ہندو اور سکھ ریاستی حکمران اس داخلی دباؤ کو برداشت نہ کر سکے جو ان پر کانگرس کی تحریک پر پاکستان کے ساتھ الحاق کے خلاف ڈالا گیا تھا۔ علاوہ بریں کس کو معلوم تھا کہ پاکستان ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رہے گا۔ انہوں نے مختصر عرصے کی جنت پر تھوڑے اور پکے الاؤنس کو ترجیح دی۔"[14]

چنانچہ جہاں یہ کہنا درست ہے کہ ہندو بورژوا اور برطانوی سامراج نے اپنے اپنے مفاد کی خاطر کشمیری عوام کو آزادی سے محروم کر دیا وہاں یہ بھی سچ ہے کہ مسلم لیگ کی غیر حقیقی اور غیر عوامی ریاستی پالیسی نے ہندو بورژوا اور برطانوی سامراج کا کام آسان کر دیا۔ کشمیری عوام جو افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے مظالم کا مسلسل نشانہ بنتے چلے آرہے تھے، ان کا یوم نجات مزید دور چلا گیا...... ان کو اپنی آزادی کے حصول کے لیے ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد سے دوچار ہونا پڑا...... تاہم تاریخ کا یہ سبق ہے کہ مسلسل مزاحمت بارآور ثابت ہوتی ہے اور حریت پسند آزادی کی صبح طلوع ہوتے ہوئے ضرور دیکھتے ہیں۔

# حوالہ جات

## باب 1:   مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام اور قومی تضاد کی نمود

1- V.P Menon. The Transfer of Power in India. Longmans, London And Calcutta 1957; Princeton University Press, Princeton, New Jersey 1959, p. 418

2- S.M Ikram. Modern Muslim India And The Birth of Pakistan, Sh. Mohammad Ashraf, Second Ed. Lahore 1970, p. 445

3- (i) The Transfer of Power 1942-7, Editor - in - Chief: Nicholas Mansergh, Editor: Penderal Moon, Her Majesty's Stationery Office 1983, Vol. 12. pp. 537-38, 580-81, 636-37.

(ii) Alan Campbell - Johnson, Mission with Mountbatten, Robert Hale Limited, London 1951, p. 149.

4- H.V. Hodson, The Great Divide, Hutchinson of London 1969, p. 241.

5- The Transfer of Power 1942-7, Editor - in - Chief: Nicholas Mansergh, Editor: Penderal Moon, Her Majesty's Stationery Office Vol. 10, 1981, pp. 506, 529, 598, 605 - 606

6- *Ibid.,* p. 632

7- H.V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 241

8۔ زاہد چوہدری/ حسن جعفر زیدی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ پاکستان کیسے بنا؟ ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور۔ 1989ء۔ جلد2۔ صفحہ 456 تا 459

9- Quoted In S. M. Ikram, *Op. Cit.,* p. 414

10- For a United India ------ Speeches of Sardar Patel, 1947-50, Publication Division, New Delhi, Revised Edition, p 125, 127

11- Penderal Moon, Divide And Quit, Chatto & Windus, London, Third Edition 1964, p. 72

12- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 271

13- Ian Stephens, Pakistan, Penguin Books, Harmondsworth 1964, p. 169

14- Foundations Of Pakistan, Edited By Syed Sharifuddin Pirzada, National Publishing House 1970, Vol. 11, pp. 520-21

15- The Pakistan Times, Lahore May 7, 1947

16- Transfer Of Power 1942-7, Vol. 9, 1980, pp. 729-30

17- Quoted in Ch. Mohammad Ali, The Emergence Of Pakistan. First Pub. by Columbia University Press, New York and London, 1967; Second Impression by Research Society of Pakistan, Lahore 1973, p. 192

18- The Times of India, Delhi, June 5, 1947

19- Alan Campbell - Johnson, *Op. Cit.,* p. 118

20- Khushwant Singh, A History Of The Sikhs, Oxford University Presss Delhi, Third Impression 1981, p. 276

21۔ روزنامہ نوائے وقت۔20/جون 1947ء

22- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 338

23- Transfer Of Power 1942-7, Vol. 12, pp. 72-74

24- Ian Stephens, *Op. Cit.,* p. 209

25- Abul Kalam Azad, India Wins Freedom, Orient Longmans, Calcutta, First Published 1959; Reprinted 1964, p. 190

26- Sir Francis Tuker, While Memory Serves, Cassell & Company, London 1950, p. 400

27- C. H. Phillps And Mary Doreen Wainwright, Editors, The Partition Of India, London 1970, p. 147

28- Francis Tuker, *Op. Cit.,* p. 402

29- Penderel Moon, *Op. Cit.,* p. 95

30۔ نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ لاہور 1966ء۔ صفحہ 329

31- Transfer Of Power 1942-7, Vol. 12, pp. 537-38

32- *Ibid.,* p. 559

33- *Ibid.,* pp. 580-81, 636-37

34- *Ibid.,* pp. 667-68

35۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔10/اگست 1947ء

36۔ ایضاً۔22/اگست1947ء

37- Ian Stephens, *Op. Cit.,* pp. 222-23

38- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,*p. 258

39- Alan Campbell - Johson, *Op. Cit.,* p. 178

40- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 413

41- Larry Collins And Dominique Lapierre, Freedom At Midnight, Collins, St. James Place, London 1975, pp. 314-16

42- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* pp. 214-215

43- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 261

44- *Ibid.,* p. 259

45- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 411

46- G. W. Choudhary, Pakistan's Relations With India 1947-1966, Pall Mall Press, London 1968, p. 50

47- *Ibid.,* p. 50

## باب2: پنجاب کا قتل عام اور فوجی سامان کی تقسیم میں بے انصافی

1- G. W. Chaudhary, *Op. Cit.,* p. 51

2- Quoted in G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* P. 52

3- Quoted in Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 260

4- Dawn, Karachi, October 26, 1947

5- Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, Speeches As Governor General Of Pakistan 1947-1948, Pakistan Publications, Karachi pp. 32-33

6- S. M. Ikram, *Op. Cit.,* pp. 408-11

7- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* pp. 254-55

8- G.W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 46

9- The Transfer of Power 1942-7, Vol. 12. p. 636

10- Penderal Moon, *Op. Cit.,* p. 14

11- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* pp. 84-85

12- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,*p. 157

13- G.W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 84

14- Michael Brecher, Nehru: A Political Biography, Oxford 1959, p. 378

15- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 84

16- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* p. 185

17- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 84

18- Mohammad Ayub Khan, Friends Not Masters, Oxford University Press, Karachi 1967, p. 115

19- The Pakistan Times, Lahore, July 15, 1947

20- M. Aslam Qureshi, Anglo-Pakistan Relations 1947-1976, Research Society of Pakistan, Lahore 1967, p. 69

21- Quoted in Ch. Mohammad Ali *Op. Cit.,* pp. 190-91

22- G.W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 61

23۔ فضل مقیم خان، میجر جنرل۔ تگ و تاز جاودانہ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ لاہور۔ 1967۔ صفحہ 44

24- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 62

## باب 3: واجبات کی عدم ادائیگی، نہری پانی کی بندش اور معاشی جنگ

1- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,*p. 216

2- Michael Edwards, Nehru: A Political Biography, Penguin Books, Harmondswoth 1971: Pelican Books 1973, p. 231

3- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* p. 214

4- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 84

5 *Ibid.,* p. 88

6- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* pp. 216-17

7- Michael Edwards, p. 233

8- Alan Campbell - Johnson, *Op. Cit.,* pp. 368-69

9- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* pp. 81-82

10- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* pp. 83-84

11- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* p. 221

12- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 423

13- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* p. 221

14- Dawn, Karachi, January 20, 1948

15- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 423

16- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 85

17- *Ibid.,* p. 87

18- Ibid

19- Dawn, Karachi, July 30, 1948

## باب 4: لیاقت۔نہرو معاہدہ اور بھرپور بین المملکتی جنگ کے خطرات

1- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 148

2- W. Norman Brown, The United States And India And Pakistan, 2nd Ed. Revised And Enlarged, Harvard University Press, Massachusetts 1963, p. 171

3- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 188

4- (i) Dawn, Karachi, March 25, 1950
(ii) The Times, London, March 30, 1950

5- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 190

6- *Ibid.,* p. 192

7- Ian Stephens, Horned Moon, Chatto & windus, London 1953, p. 193

8- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 375

9- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 200

10- Ian Stephens *Op. Cit.,* pp. 214-15

11- Mohammad Ayub Khan, *Op. Cit.,* p. 40

12- Prem Nath Bazaz, The History Of Struggle For Freedom in Kashmir. Kashmir Publishing Company, New Delhi 1954, p. 638

13- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 200

## باب 5: تنازعہ کشمیر کا تاریخی پس منظر

1- V. P. Menon, The Story Of the Integeration Of the Indian States, Orient Longmans, Calcultta 1956, p. 413

2- Sisir Gupta, Kashmir: A Study In India-Pakistan Relations, Asia Publishing House, Bombay, First Ed. 1966; Reprinted 1967, p. 120

3- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 6

4- *Ibid.,* p. 8

5- *Ibid.,* p. 9

6- *Ibid.,* p. 10

7- *Ibid.,* pp. 47-49

8- Ghulam Mohyud Din Sufi, Kashir, The University Of the Punjab, Lahore 1948, Vol, I, pp. 77-78

9- Khawaja Nizamuddin Ahmad (Bakhshi), The Tabaqat-i-Akbari, Translated And Annotated by Brajendra Nath, Royal Asiatic Society Of Bengal, Calcutta 1939 Vol. 3, pp. 648-50 (With Footnotes)

10- G.M.D Sufi, *Op. Cit.,* pp. 247-48

11- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,*p. 73

12- *Ibid.,* p. 76

13- G.M.D. Sufi, *Op. Cit.,* p. 277

14- *Ibid.,* pp. 291-92

15- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 111

16- G.M.D Sufi, *Op. Cit.,* p. 309

17- *Ibid.,* p. 319

18- *Ibid.,* p. 338

19- Prem Nath Bazaz *Op. Cit.,* pp. 118-19

20- Lord Birdwood, Two Nations And Kashmir, Robert Hale, London 1956, p. 27-28

21۔ سردار محمد ابراہیم خان۔ کشمیر کی جنگ آزادی۔کلاسیک۔لاہور 1966ء۔صفحہ 22

22- W. Norman Brown, *Op. Cit.,* p. 42

23- Josef Korbel, Danger In Kashmir, Princeton University Press, Princeton (N.J.) 1954, p. 16

24- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 129

25- Josef Korbel,, *Op. Cit.,* p. 14-15

26- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 128

27- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 22

28- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* pp. 129-139

29۔ محمد ابراہیم خان۔ محولہ بالا۔ صفحہ 25۔24

30۔ ایضاً۔ صفحہ 27۔26

31- Alstair Lamb, Crisis In Kashmir 1947-1966, Routledge And Kegan Paul, London 1966, p. 27

32- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* pp. 133-34

33- *Ibid.,* pp. 140-41

34- *Ibid.,* pp. 153-54

## باب 6: کشمیر کے الحاق کے لیے کانگرس اور برطانوی سامراج کا اشتراکِ عمل

1- Abul Kalam Azad, *Op. Cit.,* p. 133

2- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 262

3- Dawn, Karachi, May 11, 1947

4- *Ibid.,* April 22, 1947

5- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 272

6- Sisir Gupta, p. 95

7- S. M. Burke, Pakistan's Foreign Policy, Oxford University Press, Karachi And London 1973, p. 22

8- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 273

9- The Transfer of Power 1942-7 Editor-in-Chief Nicholas Mansergh, Editor Penderal Moon, Her Majesty's Stationery Office London 1982, Vol. 11, pp. 399-400

10- E. W. R. Lumby, The Transfer Of Power In India, George Allen And Unwin Ltd. London 1954, p. 233

11- The Transfer Of Power 1942-7, Vol. 11, p. 391

12- *Ibid.,* pp. 322-23

13- The Pakistan Times, Lahore, June 18, 1947

14- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 65

15- Dawn, Karachi, July 5, 1947

16- White Paper On The Jammu And Kashmir Dispute, Ministry of Foreign Afairs, Government Of Pakistan 1977, p. 7.

17- The Pakistan Times, Lahore July 11, 1947

18- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 77

19- The Pakistan Times, Lahore, July 18, 1947

20- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 76

21۔ محمد ابراہیم خان۔محولہ بالا۔صفحہ 55

22- Aman-Ullah Khan, Free Kashmir, Central Printing Press, Karachi 1970, p. 173

23- Abdul Mannan Khalifa, Kashmir Story, abko Publishers, Lahore 1970, p. 115

24- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 318

25- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 96-97

26- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,*p. 287

27- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 274

28- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 97

29- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 288

## باب 7: حکومت ہند کی مستعدی اور پاکستانی ارباب اختیار کی غفلت

1- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* p. 74

2- Mehr Chand Mahajan, Looking Back, Asia Publishing House, Bombay 1963, p. 116

3- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* p. 50

4- Ibid

5- Mehr Chand Mahajan, *Op. Cit.,* p. 267

6- White Paper *Op. Cit.,* p. 8

7- Mehr Chand Mahajan, *Op. Cit.,* pp. 126-28

8- White Paper *Op. Cit.,* p. 8

9- *Ibid.,* p. 9

10- The Pakistan Times, Lahore, September 27, 1947

11- White Paper *Op. Cit.,* p. 10

12- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 71

13- Mehr Chand Mahajan, *Op. Cit.,* p. 130

14- The Pakistan Times, Lahore, October 17, 1947

15- White Paper *Op. Cit.,* p. 11

16- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 325

17۔ نور احمد۔ صفحہ 246

18۔ محمد ابراہیم خان۔ محولہ بالا۔ صفحہ 2۔101

19- Mehr Chand Mahajan, *Op. Cit.,* p. 131

20- *Ibid.,* pp. 142-43

21- Akbar Khan (Ex Maj. Gen.) Raiders in Kashmir, Pak Publishers Ltd., Karachi 1970, pp. 15,16,22

22- White Paper *Op. Cit.,* p. 17

23۔ محمد ابراہیم خان۔ محولہ بالا۔ صفحہ 76

24- Lord Birdwood, *Op. Cit.,*p. 55

25- Ch. Mohammad Ali. *Op. Cit.,* p. 293

## باب 8: دوطرفہ بات چیت کی ناکامی اور اقوام متحدہ سے رجوع

1- Josef Korbel, *Op. Cit.,* pp. 79-80

2- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* p. 64

3۔ محمد ابراہیم خان۔ محولہ بالا۔ صفحہ 73۔72

4- Ian Stephens, Pakistan, *Op. Cit.,* pp. 109-10

5- Alastair Lamb, *Op. Cit.,* p. 46

6- White Paper *Op. Cit.,* p. 17

7- Josef Korbel, *Op. Cit.,* pp. 85-86

8- Mohammad Ayub Khan, *Op. Cit.,* p. 31

9- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 120-22

10- H.V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 452

11- Alastair Lamb, *Op. Cit.,* p. 40

12- *Ibid.,* pp. 41-2

13- Foreign Affairs, July 1947

14- Alastair lamb, *Op. Cit.,* p. 42

15- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* pp. 298-99

16- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* pp. 461-62

17- *Ibid.,* pp. 462-63

18- *Ibid.,* pp. 463-64

19- *Ibid.,* pp. 467-68

20- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 136

## باب 9: تنازعہ کشمیر اور اینگلو امریکی سامراج

1۔ محمد ظفر اللہ خان۔ تحدیث نعمت۔ ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن۔ ڈھاکہ 1971، صفحہ 541

2- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 306

3- Josef Korbel, *Op. Cit.,* pp. 127-30

4- *Ibid.,* pp. 135-36

5- *Ibid.,* p. 154

6۔ فضل مقیم خان۔محولہ بالا،میجر جنرل۔صفحہ 32۔131،134

7- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* pp. 72-73

8- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 190

9- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* pp. 307-8

10- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* pp. 459-60

11- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 192-93

12- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 154

13- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 197-98

14- *Ibid.,* p. 207

15- *Ibid.,* pp. 204-8

16- *Ibid.,* p. 222

17- Josef Korbel, *Op. Cit.,* pp. 175-76

18- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 227

19- *Ibid.,* pp. 229-30

20- *Ibid.,* pp. 224-45

21- *Ibid.,* p. 245

## باب 10: جموں میں ہندوؤں کی ایجی ٹیشن اور شیخ عبداللہ کی گرفتاری


1- Mehr Chand Mahajan, *Op. Cit.,* pp. 162-63

2- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 111

3- Perm Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 560

4- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 227

5- *Ibid.,* p. 222

6- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* pp. 568-69

7- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 222

8- *Ibid.,* p. 223

9- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 572

10- *Ibid.,* p. 573

11- Ibid

12- *Ibid.,* pp. 573-74

13- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 233

14- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 665

15- *Ibid.,* p. 666

16- *Ibid.,* p. 667

17- B.M. Kaul (Lt. Gen.). The Untold Story, Allied Publishers, Bombay 1967, *Op. Cit.,* pp. 142-44

18- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 673

19- Josef Korbel, *Op. Cit.,* pp. 237-38

20- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 265

21- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 238

22- The Civil And Miltary Gazette, Lahore, February 3, 1954

23- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* pp. 667-68

24- Josef Korbel. *Op. Cit.,* p. 242

25- *Ibid.,* p. 244

26- *Ibid.,* p. 247

## باب 11: آزاد کشمیر میں شرمناک کشمکش اقتدار

1- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 133

2- *Ibid.,* p. 201

3- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 647

4- Ibid

5- Dawn, Karachi, June 17, 1954

6- The Pakistan Times, Lahore, July 29, 1954

7۔ نوائے وقت۔ لاہور۔ 28/اکتوبر 1954

8۔ ایضاً۔ 19/دسمبر 1954

9۔ ایضاً۔ 26/دسمبر 1954

10- The Pakistan Times, Lahore, March 14, 1955

11۔ نوائے وقت۔ لاہور۔ 20/اکتوبر 1955

12۔ ایضاً۔12رجنوری1956

13- Mohammad Ayub Khan, *Op. Cit.,* pp. 63-64

14- *Ibid.,* p. 65

15۔ محمد ظفر اللہ خان۔محولہ بالا۔صفحہ548 تا 549

16۔ محمد ابراہیم خان۔محولہ بالا۔صفحہ77 تا 178

## باب 12: سامراج نواز افسر شاہی کی جانب سے دوطرفہ بات چیت کا ڈھونگ

1- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 257

2- *Ibid.,* p. 258

3- *Ibid.,* p. 259

4- *Ibid.,* pp. 261-62

5- White Paper *Op. Cit.,* pp. 39-40

6- *Ibid.,* p. 40

7- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* pp. 120-21

8- White Paper *Op. Cit.,* p. 42

9- *Ibid.,* pp. 42-3

10- *Ibid.,* p. 43

11- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 281

12- White Paper *Op. Cit.,* p. 45

13- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 281

14- *Ibid.,* p. 283

15- *Ibid.,* p. 286

## باب 13:    ازسرنو محاذ آرائی اور سوویت یونین کی مداخلت

1- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 135

2- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 287

3- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* p. 202

4- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 289

5- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* pp. 202

6- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 290

7- *Ibid.,* p. 291

8- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* p. 203

9- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 291

10- *Ibid.,* p. 293

11- *Ibid.,* p. 291

12- *Ibid.,* pp. 293-94

13- S.M. Burke, Mainsprings Of Indian And Pakistani Foreign Policies, Oxford University Press, Karachi Lahore 1975. p. 59

14- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 294-95

15- *Ibid.,* p. 296

16- *Ibid.,* p. 300

17- White Paper *Op. Cit.,* p. 49

18- *Ibid.,* pp. 49-50

19- S.M. Burke, *Op. Cit.,* p. 59

## باب 14: ہند۔چین سرحدی تنازعہ اور پاکستان کی غیر مشروط صلح جوئی


1- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 303

2- *Ibid.,* p. 311

3- *Ibid.,* p. 317

4- Lord Birdwood, *Op. Cit.,* p. 189

5- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* pp. 128-29

6- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 328

7- Dawn, Karachi, January 18 and February 2, 1958

8- White Paper *Op. Cit.,* pp. 52-53

9۔ نوائے وقت۔لاہور۔6رجولائی1958

10- Mohammad Ayub Khan, *Op. Cit.,* p. 62


## باب 15: سامراج کی پالیسی میں اتار چڑھاؤ کی وجوہ


1- W. Norman Brown. *Op. Cit.,* p. 150

2- Alastair Lamb, *Op. Cit.,* p. 26

3- (i) Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* pp. 132-33

(ii) Alastair Lamb, *Op. Cit.,* pp. 28-29

4- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 22

5- *Ibid.,* p. 77

6- W. Norman Brown, *Op. Cit.,* p. 150

7- Alastair Lamb, *Op. Cit.,* pp. 40-42

8- The Transfer Of Power 1942-7, Vol. 11, p. 86

9- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 513

10- S. M. Burke, *Op. Cit.,* p. 73

11- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 512

12- *Ibid.,* p. 514

13- S. M. Burke, *Op. Cit.,* pp. 70-71

14- White Paper *Op. Cit.,* pp. 23

15- Alan Campbel Johson, *Op. Cit.,* p. 287

16- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* pp. 469-70

17- S. M. Burke, *Op. Cit.,* p. 69

18- Ibid. p. 70

19۔ محمد ظفر اللہ خان۔ محولہ بالا۔ صفحہ 38۔537

20- White Paper *Op. Cit.,* pp. 23-24

21۔ محمد ظفر اللہ خان۔ محولہ بالا۔ صفحہ 39۔538

22- Josef Korbel, *Op. Cit.,* p. 116

## باب 16: اینگلوامریکی سامراج کی طرف سے پاکستان کی نیم دلانہ حمایت

1- Josef Korbel, *Op. Cit.,* pp. 249-50

2- *Ibid.,* pp. 250-58

3- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* pp. 418-28

4- R. Palme Dutt, The Crisis Of Britain And The British Empire, Lawrence And Wishart, London 1957, p.223

5- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* pp. 515-16

6- R. Palme Dutt, *Op. Cit.,* pp. 203-6

7- *Ibid.,* p. 36

8- S. M. Burke, *Op. Cit.,* pp. 126-27

9- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 40

10- *Ibid.,* pp. 40-41

11- *Ibid.,* p. 41

12- S. M. Burke, *Op. Cit.,* p. 132

13- Girilal Jain, Panchsheela And After, Asia Publishing House, Bombay 1960, p. 11

14- *Ibid.,* p. 10

15- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 75

16- Richard Symonds, The Making of Pakistan, Faber And Faber, London 1949, p. 170

17- Girilal Jain, *Op. Cit.,* pp. 8-9

18- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 76

19- *Ibid.,* p. 77

20- Girilal Jain, *Op. Cit.,* p. 15

21- *Ibid.,* pp. 18-19

22- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 8

23- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 236

24- Mohammad Ahmad (Col.), My Chief, Longmans, Green And Co. Pakistan Branch Lahore, 1960, pp. 73-76

25۔ فضل مقیم خان۔محولہ بالا، میجر جنرل۔صفحہ 175

26- Akbar Khan, *Op. Cit.,* pp. 160-62

27- G. H. H. Jansen, Afro Asia And Non Alignment, London 1966, p. 107

28- S. M. Burke, *Op. Cit.,* pp. 143-44

29۔ نوراحمد۔محولہ بالا۔صفحہ 495


## باب 17: مسلم لیگ کی غیر جمہوری اور غیر حقیقت پسندانہ ریاستی پالیسی


1- Wayne Ayres Wilcox, Pakistan: The Consolidation Of A Nation, Columbia University, New York 1963 p. 47

2- Ch. Mohammad Ali. *Op. Cit.,* p. 227

3- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 49

4- The Transfer Of Power 1942-7, Vol. 11, pp. 320-23

5- E.W.R. Lumby, *Op. Cit.,* p. 237

6- The Pakistan Times, Lahore, June 19, 1947

7- Dawn, Karachi, June 19, 1947

8- *Ibid.,* June 23, 1947

9- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 368

10- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 77

11- The Pakistan Times, Lahore, July 11, 1947

12- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 76-77

13- *Ibid.,* p. 77

14- (i) Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* pp. 232-34

(ii) V. P. Menon, *Op. Cit.,* pp. 113, 116-117

15- Dawn, Karachi, July 31, 1947

16- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 375

17- Alan Campbell Johson, *Op. Cit.,* p. 192

18- Wayne Ayres Wilcox, *Op. Cit.,* p. 56

19- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 428

20- *Ibid.,* pp. 429-31

21- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* p. 81

22- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 277

23- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 432

24- Sisir Gupta, *Op. Cit.,* pp. 82-83

25- *Ibid.,* p. 83

26- Prem Nath Bazaz, *Op. Cit.,* p. 360

27- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 75

28- V. P. Menon. *Op. Cit.,* p. 319

29- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* pp. 478-79

30- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 284

31- H. V. Hodson, *Op. Cit.,* p. 480

32- *Ibid.,* p. 481

33- *Ibid.,* p. 482

34- Ibid. pp. 488-91

35- *Ibid.,* p. 492

36- G. W. Choudhary, *Op. Cit.,* p. 82

## باب 18: مسلم لیگ کی ریاستی پالیسی کی ناکامی کی وجوہ

1- Russel Brines, The Indo-Pakistani Conflict, Pall Mall Press, London 1968, p. 61

2- C. W. Philips and Mary Doreen Wainwright, *Op. Cit.,* p. 531

3- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 230

4- *Ibid.,* p. 297

5- Mehr chand Mahajan, *Op. Cit.,* p. 126

6- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* p. 301

7۔ صدیق علی خان۔ بے تیغ سپاہی۔ الائڈ بک کارپوریشن۔ کراچی 1971ء۔ صفحہ 108

8- H. V. Hodson. *Op. Cit.,* p. 428

9- Ch. Mohammad Ali, *Op. Cit.,* pp. 229-30

10- Ibid

11۔ فیروز خاں نون۔ چشم دید۔ فیروز سنز لاہور۔ 1974ء صفحہ 11۔310

12- Alan Campbell Johnson, *Op. Cit.,* p. 246

13- S. M. Burke *Op. Cit.,* p. 98

14- Wayne Ayres Wilcox, *Op. Cit.,* pp. 47-48

# کتابیات

# کتب (انگریزی)

1- Ahmad (Bakhshi), Khawaja Nizamuddin Ahmad. The Tabaqat-i-Akbari, Translated And Annotated by Brajendra Nath, Revised and Edited by Baini Prasad, Royal Asiatic Society of Bengal, Calcutta 1939.

2- Ahmad, Muhammad (Col.), My Chief, Longmans, Green And Co. Pakistan Branch Lahore, 1960.

3- Ali, Ch. Muhammad, The Emergence Of Pakistan, Columbia University Press, New York And London 1967; Research Society of Pakistan, Lahore 1973.

4- Azad, Abul Kalam, India Wins Freedom, Orient Longmans, Calcutta 1959; Reprinted 1964.

5- Bazaz, Prem Nath, The History of Struggle For Freedom in Kashmir, Kashmir Publishing Company, New Delhi 1954.

6- Birdwood, Lord, Two Nations And Kashmir, Robert Hale, London 1956.

7- Brecher, Michael, Nehru: A Political Biography, Oxford 1959.

8- Brines, Russel, The Indo-Pakistani Conflict, Pall Mall Press, London 1968.

9- Brown, W. Norman. The United States And India And Pakistan, 2nd Ed. Revised And Enlarged, Harvard University Press, Massachusetts 1963.

10- Burke, S. M. Pakistan's Foreign Policy, Oxford University Press, Karachi And London 1973.

11- Burke, S.M. Mainsprings of Indian And Pakistani Foreign Policies, Oxford University Press, Karachi Lahore 1975.

12- Choudhary, G. W., Pakistan's Relations With India 1947-66, Pall Mall Press, London 1968.

13- Collins, Larry And Lapierre, Dominique, Freedom At Midnight, Collins, St. James Place, London 1975.

14- Dutt. R. Palme. The Crisis of Britain And The British Empire, Lawrence And Wishart, London 1957.

15- Edwards, Michael, Nehru: A Political Biography, Penguin Books, Harmondsworth 1971: in Pelican Books 1973.

16- Gupta, Sisir. Kashmir: A Study in India-Pakistan Relations. Asia Publishing House, Bombay, First Ed. 1966; Reprinted 1967.

17- Hodson, H. V., The Great Divide. Hutchinson Of London, 1969.

18- Ikram, S.M., Modern Muslim India And The Birth Of Pakistan, Sh. Muhammad Ashraf, Second Ed. Lahore 1970.

19- Jain, Girilal, Panchsheela And After, Asia Publishing House, Bombay 1960.

20- Jansen, G.H.H. Afro Asia And Non Alignment, London 1966.

21- Johnson, Allan Campbell, Mission With Mountbatten, Robert Hale Limited, London 1951.

22- Kaul, B. M. (Lt. Gen.) The Untold Story, allied Publishers Bombay 1967.

23- Khan, Akbar (Ex. Major General). Raiders in Kashmir, Pak Publishers Ltd., Karachi 1970.

24- Khan, Amanullah, Free Kashmir, Central Printing Press, Karachi 1970.

25- Khan, Muhammad Ayub. Friends Not Masters, Oxford University Press, Karachi 1967.

26- Korbel, Josef. Danger In Kashmir, Princeton University press, Princeton (N.J.) 1954.

27- Lamb, Alastair. Crisis in Kashmir 1947-1966, Routledge & Kegan Paul, London 1966.

28- Lumby, E.W.R. The Transfer Of Power In India, George Allen And unwin Ltd., London 1954.

29- Mahajan, Mehr Chand. Looking Back, Asia Publishing House, Bombay 1963.

30- Menon, V. P. The Transfer Of Power in India, Longmans, London And Calcultta 1957; Princeton University Press, Princeton, N. J. 1959.

31- The Story Of Integeration Of the Indian States, Orient Longmans, Calcultta 1956.

32- Moon, Penderal. Divide And Quit, Chatto And Windus, London Third Ed. 1964.

33- Philiphs, C. H. And Wainwright. Mary Doreen (Editors). The Partiton Of India, London 1970.

34- Qureshi, M. Aslam. Anglo-Pakistan Relations 1947-76, Research Society Of Pakistan, Lahore 1976.

35- Singh, Khushwan. A History of The Sikhs, Oxford University Press, Delhi, Third Impression 1981.

36- Stephens, Ian. Horned Moon, Chatto And Windus, London 1953.

37- Pakistan, Penguin Books, Harmondsworth 1964.

38- Sufi, Ghulam Mohyud din Kashir, (2 Vols.) The University Of the Punjab, Lahore 1948.

39- Tuker, Sir Francis. while Memory Serves, Cassell And Company, London 1950.

40- Wilcox, Wayne Ayres, Pakistan: The Consolidation of A Nation, Columbia University, New York 1963.

# (کتب اردو)

1۔ زاہد چوہدری/حسن جعفر زیدی، پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 1،2۔ پاکستان کیسے بنا؟ ادارہ مطالعہ تاریخ۔ لاہور 1989

2۔ سردار محمد ابراہیم خان۔ کشمیر کی جنگ آزادی۔ کلاسیک۔ لاہور 1966ء

3۔ صدیق علی خان۔ بے تیغ سپاہی۔ الائنز بک کارپوریشن۔ کراچی 1971ء

4۔ فضل مقیم خان، میجر جنرل۔ تگ وتاز جاودانہ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لاہور۔ 1967ء

5۔ فیروز خاں نون۔ چشم دید۔ فیروز سنز لاہور 1974ء

6۔ محمد ظفر اللہ خان۔ تحدیث نعمت۔ ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن۔ ڈھاکہ 1971ء

7۔ نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ لاہور 1966ء

# شائع شدہ سرکاری دستاویزات


1- For A United India - Speeches of Sardar Patel, 1947-50, Publications Division, New Delhi, Revised Ed.

2- Foundations Of Pakistan (2 Vols), Edited By Syed Sharifuddin Pirzada, National Publishing House 1970.

3- Jinnah, Quaid-i-Azam Muhammad Ali, Speeches As Governor General of Pakistan 1947-48, Pakistan Publications, Karachi.

4- The Transfer of Power in India 1942-7, Editor-in-Chief Nicholas Mansergh. Editor Penderal Moon. Her Majesty's Stationery Office, 1981 Vol. 10. 1982 Vol. 11, 1983 vol. 12

5- White Paper On The Jammu And Kashmir Dispute, Ministry Of Foreign Affairs, Government Of Pakistan 1977.

# اخبارات وجرائد


1- Dawn, Karachi (Files: 1947, 1948, 1950, 1954, 1958)

2- Foreign Affairs

3- Round Table

4- The Civil & Military Gazette, Lahore

5- The Pakistan Times, Lahore (Files: 1947, 1954, 1955, 1956)

6- The Times of India, Delhi

7- The Times, London

8۔ نوائے وقت ۔لاہور فائل(1947ء، 1954ء، 1955ء، 1956ء، 1958ء)

# اشاریہ

آ



ا

## چ



## ح

## ڈ

## ز



## س

## ص



## ظ



## ع

## و

## ی